اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ



جلد ۲، شمارہ ۱، جمادی الاول تا رجب ۱۴۰۵ھ / فروری تا اپریل ۱۹۸۵ء

مقاصد

كلمة التوحيد
و
توحيد الكلمه

قرآن و سنت و سیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔

علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔

اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔

فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔

عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی فکری و سماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلادیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی نبش فرصت
تہران - اسلامی جمہوریہ ایران



اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد ۲، شمارہ ۱،

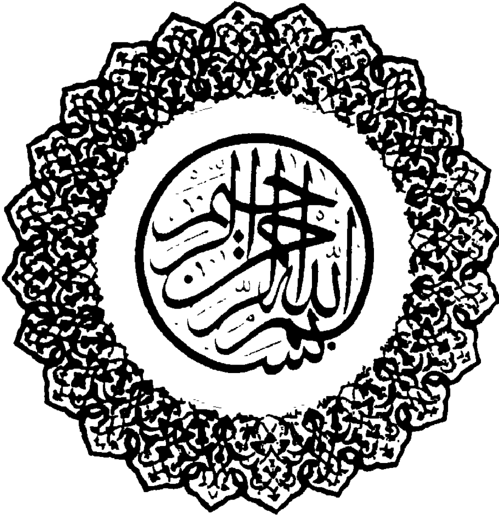
ترتیب



مجلۂ توحید، اردو، پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۳۱۹۵
تہران۔ جمہوری اسلامی ایران
فون ۲۵۔ ۲۲۔ ۸۲۵۰

جمادی الاوّل تا رجب ۱۴۰۵ھ / فروری تا اپریل ۱۹۸۵ء

فکر و فلسفہ :



نوٹ: ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔

شذرہ

ساری دنیا مانتی ہے مسلمان ایک قوم ہیں۔ ہم بھی مسلمان کو ایک قوم اور اسلام کو ایک دین مانتے ہیں۔ یہی "فطرۃ اللہ" ہے اور اسی فطرت پر سب پیدا کیے گئے ہیں۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام.. ۔ اللہ کے نزدیک، خدا کے حضور میں صرف اسلام ہی دین ہے، باقی مذاہب و دبستانوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، جو بھی اسلام کے علاوہ کسی اور طور طریقے اور مفروضہ دین کو پسند کرے گا وہ تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

رسولِ اسلام یہ کامل و مکمل دین لائے۔ آئین؟ قرآن ـ قانون؟ شریعت۔ معاشرہ؟ شریعت ـ اخلاق؟ اسوۂ حسنۂ پیغمبر ـ فلسفہ؟ توحید ـ عمل؟ تقویٰ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر و عبادات۔

اسلام کا مقصد، انسانیت کو اعلیٰ اقدار کا مالک بنانا، صلاح و فلاح بشر کو عام کرنا۔ فرد اور قوم کی تعمیر کرنا۔ اور سب سے پہلے "بندۂ خدا" بن کر دوسروں کی بندگی، غلامی اور دست نگری سے آزاد ہونا۔ ایسا معاشرہ، ایسی حکومت، ایسی فضا قائم کرنا، جہاں مسلمان، مسلمان کا بھائی بن کر رہے۔ جہاں انسان دوستی کا جذبہ عام ہو ـ یعنی جو لوگ کلمہ پڑھیں، فلسفۂ اسلام، عقائد و اعمال، احکام و نظام و معاشرۂ اسلام کو تسلیم کریں، وہاں اللہ اور صرف اللہ کو حاکم مانا جائے۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کو نافذ کیا جائے اور مشرکینِ مکہ سے آج تک ان نعرہ باز استعماریوں کو جھوٹا ثابت کیا جائے جو کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں:

"اسلام اور اس کی شریعت عملی نہیں ہے۔
آج اسے کون مانے گا، اس پر کون عمل کرے گا؟"

اسلام ہمیشہ اپنی زندگی اور توانائی عمل آفرینی ثابت کرتا رہا ہے۔ وقت نزول قرآن دشمنوں نے دو بڑی شخصیتوں کا نام لیا، دو بڑے جغرافیائی اور سماجی اہمیت رکھنے والی بستیوں کا نعرہ لگایا:

لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (۳۱)

قرآن دو بستیوں کے کسی ایک بڑے شخص پر کیوں نہ اتارا گیا؟ (الزخرف)

یعنی مکہ و طائف میں بڑے بڑے لوگ ہیں، متمدن، بت پرست، طاغوتی اور سرمایہ دار ان کے سامنے سب جھکتے ہیں، ان کی بڑائی کا سب اقرار کرتے ہیں مکے میں ولید بن مغیرہ یا عتبہ بن ربیعہ یا اخنس بن شریق تھے اور طائف میں عروۃ ثقفی یا حبیب بن عمرو یا کنانہ بن عبد یالیل تھے وجیہ و ناموز سیاست کار اور رودار، ان کے ہوتے ہوئے ۔ محمد بن عبد اللہ؟ — روحی لھا الفدا ۔ کا رہبر بنایا جانا، یعنی چہ؟ نہ کوئی پارٹی ان کے ساتھ نہ کوئی جمعیت آپ کے پاس۔ نہ زمین کی بات نہ معاشرے سے ہم آہنگی۔ دلیرانہ خانہ جنگی۔ میلے اور ان کی رنگینیاں۔ شاعری اور اس کے مزے، رقص و موسیقی اور ان کے فائدے، شراب اور سود، سب کچھ چھوڑ کر آدمی اللہ کا ہو جائے؟ بھلا کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم اس آواز کو روک دیں گے۔ اس شخص کو فنا کر دیں گے اور عوام اس کے پیام کو مسترد قرار دیں گے۔

روم اور ایران جیسی بڑی طاقتوں اور حبشہ جیسے قریب ملک کے سیاسی، اقتصادی اور فوجی اقتدار کے زیر سایہ پھیلنے والے افکار و خیالات کو رد کرنا ممکن نہیں ہے۔ "محمد" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ترقی یافتہ قوموں سے رشتہ توڑ لیں؟

اللہ نے فرمایا:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق

لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (۳۳)

اللہ ہی نے اپنے رسول (محمدؐ) کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دستور و نظام پر چاہے اسے مشرک برا ہی مانیں (التوبہ)

اس کے ساتھ ہی دنیا نے دیکھا، بڑی قوتیں ٹوٹ گئیں، بڑی شخصیتیں فنا ہو گئیں،

اکثریتی گروہ و معاشرہ۔ مشرکانہ دستور و رواج ۔ اور مسلمہ افکار و عقائد باطل ہو گئے۔
اسلام کی حکومت قائم ہوئی ۔ اور مسلمان جبر کے مقابلے میں صبر، ظلم کے جواب میں نشانِ
عدل بلند کرتے رہے ۔ اسلامی فلسفہ و عقائد و احکام کو خود مکے اور مدینے میں بلا اظہارِ
قوت عوام نے مان لیا ۔ اور طائف سے مدینے تک، یمن سے حبشے تک اللہ اللہ ہونے
لگا ۔ اور جب شکست خوردہ لیڈر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے کرایے کے سپاہیوں کی
فوج لے کر میدانِ نبرد میں آئے تو مٹھی بھر مسلمانوں نے اللہ کی توحید اور محمدؐ کی نبوت و
قرآن کی حقانیت کے زیرِ سایہ فتح پائی ۔

اسلام نے قومیت و رنگ و نسل کا فلسفہ مسترد کرنے کے لیے اور قرآن کی دعوت
میں سب کو شریک بنانے کی خاطر، ہمہ گیر و ہمہ جہاتی و آفاقی ہونے کا دعویٰ کیا اور حضرتِ
خاتم الانبیاؐ نے اسے ثابت کرنے کے لیے، پہلا وفدِ تبلیغ حبشہ بھیجا ۔ کالوں کا ملک اور عیسائی
حکومت ۔ وفد نے حبشہ جاکر جلوس نہیں نکالے، گوریلے نہیں تیار کیے ۔ ان کا کام قرآن کا پیام
عام کرنا تھا۔ نتیجہ میں افریقہ، اللہ اکبر کے نعروں سے آج بھی گونج رہا ہے ۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ اسلام اپنے جزئیات و کلیات، اپنے فلسفہ و تعلیمات کے ساتھ
اس وقت بھی عملی تھا، آج بھی عملی ہے ۔ اس وقت بھی انقلابی تھا، آج بھی انقلابی ہے اور اس کے
نتائج اس وقت بھی مثبت تھے آج بھی مثبت ہیں ۔ آج کے ثقافتی ترقی یافتہ دور ۔ نام نہاد ۔
فکری بلندی کے عہد میں ۔ بقولِ دشمنانِ دین ۔ اور پروپیگنڈے کی بنیاد پر دو سپر
طاقتوں کے ہوتے ہوئے انقلابِ اسلامی نے جو بلند پایہ نتائج دکھائے ہیں اس سے غیر مسلم بھی
انکار کرنے کی جرأت نہیں کرتے ۔

دو قریوں کے رہنے والے تھر تھرا رہے اور روس و امریکہ کے بخیال خود بڑے
اس انقلاب کی فتحِ عظیم کو دل و جان سے مان کر ار د گرد، توپوں کے دہانے کھولے
آگ برسا رہے ہیں ۔ زہریلے بموں سے فضا کو مسموم کر رہے ہیں، کردار کشی اور جھوٹے
پروپیگنڈے طوفان برپا کیے ہوئے ہیں، مگر اسلام کی حقانیت دنیا بھر کے گوشے گوشے
سے اللہ اکبر ۔ اور ۔ انقلاب اسلامی کے لیے صدائیں بلند کرا رہی ہے ۔ ایشیا ،

توحید ،

افریقہ اور یورپ میں جہاں جہاں مسلمان ہیں وہاں وہاں حرکت ہے، بیداری اور احساسِ خود اعتمادی ہے۔

حکومتیں لاکھ جتن کر رہی ہیں مگر پنج وقتہ اذان اور ہمہ آن صوت و صدائے قاریانِ قرآن بشارتِ فتحِ اسلام دے رہی ہے۔

اہلِ قلم، صاحبانِ فکر، اربابِ بصیرت کروٹ لے چکے ہیں، دانش گاہیں وہ سلیبس وہ نظامِ تعلیم وہ تنائج تربیت مسترد کر چکے ہیں جو اسلام کے خلاف فکر و عمل کو پروان چڑھاتے، یہی نوید

لیظہرہ علی الدین کلہ

کا مستقبل ہے۔

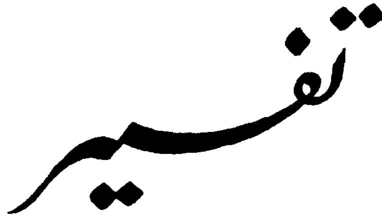
قومیت کا فلسفہ جو رنگ و نسل و جغرافیہ پر مبنی تھا وہ باطل ہو چکا۔ قومیت کا نظام جو سوشلزم و کیمونزم و امپریلزم پر قائم تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔

بصیرت سے کام لے کر آگے بڑھنے والے، برستی آگ سے گذر کر اپنے پاک خون میں تیر کر راہیں کھول چکے ہیں، مسلمان پر فرض ہے اور اس کی ادائیگی آج سے پہلے اتنی زیادہ آسان نہ تھی۔ دشمن شکست کھا رہا ہے۔ بس مسلمان عوام کے متحد ہونے کی دیر ہے اور انہیں متحد کرنا صاحبانِ تقریر و تحریر کا کام ہے۔

مجلہ توحید نے بتائیدِ الٰہی دوسرے سال میں قدم رکھا ہے۔ گذشتہ چار شمارے بحمدہ تعالیٰ وقت پر شایع ہوئے اور وقت پر ارسال کیے گئے۔ امید ہے دوستوں نے چاروں شماروں کو حوالہ و مطالعہ کے لیے محفوظ رکھا ہوگا۔ آخری شمارے میں فہرستِ عام بھی مہیا کر دی گئی ہے۔ اگر کوئی پرچہ ضایع ہو گیا ہو تو ہمیں لکھیے۔

برادرانِ محترم! ہمارا نصب العین اور اندازِ ترتیب و موضوعات ملاحظہ فرماتے رہے ہیں۔ فکری نہضت و انقلاب کے لیے پڑھے لکھے لوگوں سے بجا امید کی جاتی ہے، وہی اہلِ فکر و نظر، بصیرت و ایمان کی بنیاد پر سب کچھ کر سکتے ہیں "مجلہ توحید" کے صفحات آپ کے علمی و تحقیقی مقالات کے منتظر ہیں۔

●●



- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

قُلْ

إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ
دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ
يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿۹۵﴾
وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا
يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ
الْعَذَابِ أَنْ يُعَمَّرَ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

ترجمہ

ان سے کہیے ، اگر (دعوے کے مطابق) منزل آخرت خدا کی طرف سے تمہارے ہی لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں ہے ۔ تو موت کی تمنا کرو ۔ اگر سچے ہو ﴿۹۴﴾ لیکن یہ لوگ ایسی تمنا ہرگز نہیں کریں گے کیونکہ یہ اپنے ہاتھوں کیے ہوئے کرتوت وہاں بھیج چکے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ﴿۹۵﴾ تم ان لوگوں کو زندگانیِ دنیا پر بے حد گرویدہ (لالچی) پاؤ گے حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی زیادہ ، ان میں کا ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس جیے ، حالانکہ اتنی طویل عمر بھی انھیں عذاب سے بچا نہیں سکے گی ۔ اور جو کچھ یہ کرتے ہیں اللہ ان کے بارے میں (دانا اور) بینا ہے ﴿۹۶﴾

تفسیر

۹۴۔ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ . . . . .

دار آخرت ، جنت بھی ہے ، جہنم بھی ۔ اگرچہ یہودی دعویداران جنت ہی تھے ، مگر قرآن نے " دار آخرت " کہہ کر ادبی معجزہ برتا ہے جو اس کی خصوصیت ہے مطلب

یہ ہے کہ یہودی پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ جنت ان کی ہے وہ جہنم جائیں گے ہی نہیں اور اگر گئے بھی تو چند روز وہاں رہیں گے اور اس مدت میں آگ ان کے جسم کو نہ چھوئے گی۔ آیت نمبر ۸۰ بھی دیکھیے ۔۔۔ جہنم میں چند روز کے لیے جانا اور آتش جہنم کی اذیت سے بچے رہنا ایمان کامل وعمل صالح کے بعد اللہ کی رضا چاہتا ہے اور اگر تم نے سند لکھوا رکھی ہے ؟ ! اور جنت تمھاری ہی ہے تو پھر دنیا میں کیوں ہو، دعا کرو، جلدی موت آئے کہ جنت ملے ۔ دنیا چھوڑو اور آرزوے آخرت میں سرگرمی دکھاؤ۔ سچائی کا تقاضا تو یہی ہے۔

۹۵۔ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا . . . . . .

چونکہ انبیا کی تعلیم سن چکے ہیں کہ خدا عادل ہے۔ وہ مجرم کو سزا دے گا۔ اور یہ لوگ ظلم و بداعمالیاں کرتے رہے ہیں، اس لیے جہنم سے ڈرتے اور موت سے بھاگتے ہیں۔ اسلام میں آرزوئے شہادت کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ اگر مومن ہو تو آگے بڑھو، راہِ خدا میں ہر لمحہ ایسا جہاد کرو جو سنت و سیرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ اس راہ میں مر گئے تو جنت پاؤ گے اور مردہ نہ کہلاؤ گے ۔

۹۶۔ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ . . . . . .

ان یہودیوں کی طرف سے جنت کے دعوے اور جہنم سے معافی کا پروپیگنڈا غلط ہے، یہ لوگ بڑے لالچی اور عہد شکن ہیں انھیں بہر صورت دولت چاہیے ۔ حصولِ زر کے لیے ان کو قتلِ نبی یا تحریفِ توریت سے بھی عار نہیں، اسی دولت کی خاطر وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہیں ۔ تو کیا ہے، سو نہیں ہزار سال جی کے دیکھ لیں آخر کار جہنم میں ٹھکانا ہوگا۔ کیونکہ ان کے اعمال ہی اتنے بد ہیں کہ جنت کی بو سونگھنے کا حق بھی نہیں رکھتے جنت میں جانا تو بڑی بات ہے۔

رسولِ اسلامؐ کی تعلیم ہے کہ حساب کے دن سے پہلے اپنا حساب روز کا روز کرتے رہو۔ اس کے بعد جمع تفریق میں غلطی ہوگی تو خدا رحمن و رحیم ہے۔ مگر یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ

جنت تمہاری ہے۔ یہی تقوے کی بنیاد ہے۔ اُمید نجات سے مایوس نہ ہونے اور قربِ الٰہی کی سعادت حاصل کرنے کی خاطر مومن آدمی موت سے خوشی محسوس کرتا ہے ۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

قُلْ مَنْ كَانَ

عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّلَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَرُسُلِهِ وَجِبْرِيلَ وَمِيكَالَ فَإِنَّ اللَّهَ عَدُوٌّ لِّلْكَافِرِينَ ۝ وَلَقَدْ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ ۖ وَمَا يَكْفُرُ بِهَا إِلَّا الْفَاسِقُونَ ۝

ترجمہ :

اس سے کہہ دیجیے جو جبریل کا دشمن ہے کہ بلا شبہ وہی تو اللہ کے حکم سے آپ کے قلب پر قرآن لائے وہ ان چیزوں (کتب آسمانی و دین خدا) کی تصدیق کرتا ہے جو اس (قرآن) کے سامنے موجود ہیں اور مومنوں کے واسطے ہدایت و خوش خبری ہے (۹۷) جو شخص اللہ اور اس کے ملائکہ اور پیغمبروں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ بھی کافروں کا دشمن (۹۸) اور ہم نے آپ پر واضح و روشن آیتیں اتاریں اور ان کا انکار نہیں کریں گے۔ مگر بدکار و نافرمان لوگ (۹۹)

تفسیر :

۹۷۔ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ . . . . . .

۹۸ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ ....

یہودی جبریل علیہ السلام سے دشمنی رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ابن صوریا، فدک سے چند یہودی لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور حضرت سے مختلف سوالات کے اطمینان بخش جواب سن کر کہنے لگا۔ اچھا، یہ بتائیے کہ آپ کے پاس وحی لانے والے فرشتے کا نام کیا ہے؟ اگر آپ نے اس کا بھی صحیح جواب دیا تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ حضرت نے جبرئیل کا نام لیا۔ یہ جواب بھی صحیح ملا تو اس نے بدباطنی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: جبریل تو ہمارا بڑا دشمن ہے۔ اس نے تو ہمیشہ ہمارے لیے مشکلات ہی پیدا کی ہیں۔ البتہ میکائیل اچھا فرشتہ ہے اگر وہ وحی لاتے تو ہم اسے مان کر اسلام لے آتے۔

اللہ نے فرمایا: جبریل ہوں یا میکائیل یا کوئی اور فرشتہ یا پیغام بر، سب اللہ کے محبوب ہیں ان کا دشمن اللہ کا دشمن ہے اور کافر ہے۔ اور کافر سے خدا محبت نہیں فرماتا۔ آیت میں جبریل کے دشمن کو اللہ نے پہلے اپنا دشمن قرار دیا ہے۔ اور ملائکہ و مرسلین کے بعد جبریل و میکائیل کا نام ان کی اہمیت جتانے کے لیے لیا ہے۔

جبریل علیہ السلام تو قرآن جیسی کتاب لائے اور قرآن گذشتہ نازل شدہ کتابوں اور انبیا کے تعلیمات کی تائید کرتا اور اللہ کے پیام کو آگے بڑھاتا ہے وہ ہدایت ہے اور مومنوں کو بشارت ہے۔ گویا، جبریل ع بھی قابل ستائش اور قرآن بھی لائق محبت ہے۔

[قرآن مجید میں جبریل کا نام سورۂ نحل سمیت تین مرتبہ ہے اور ی سے پہلے ہمزہ نہیں ہے اور دو جگہ ان کی صفت "روح القدس" اور "روح الامین" بتائی گئی ہے۔ صحیفۂ کاملہ و نہج البلاغہ خصوصی طور پر ان ملائکہ کی تعریف دیکھنے کے قابل ہے]

۹۹ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ....

ابن صوریا جیسے لوگ کہتے ہیں۔ آج بھی اگر کوئی یہ بات کہتا یا سوچتا ہے کہ آپ کوئی

ایسی دل کش بات کہیے کہ ہم سنتے ہی مان لیں ؟ جواب دیا گیا کہ بدکار و غلط اندیش لوگوں کی بات بیکار ہے، رہے اہل فکر و دانش تو ان کے لیے یہ آتیں واضح بھی ہیں اور روشن بھی ایمان افروز اور عقل کو اپیل کرنے والی ہیں ہی ۔

أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا

عَهْدًا نَّبَذَهُ فَرِيقٌ مِّنْهُم ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ

فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ كِتَابَ اللَّهِ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ

كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ :

کیا جب بھی کوئی قول و قرار کریں گے تو ایک فرقہ ان میں سے اسے (ضرور) مسترد کرے گا ۔ بلکہ ان میں سے اکثر لوگ ایمان رکھتے ہی نہیں (۱۰۰)
اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے رسول آیا جو تائید (تصدیق) کرتا ہے اس کی جو ان لوگوں کے پاس (توریت) ہے ۔ تو جن لوگوں کو کتاب دی گئی تھی ان کے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو پسِ پشت ڈال دیا گو یا وہ لوگ جانتے ہی نہیں ۔ (۱۰۱)

تفسیر :

۱۰۰۔ أَوَكُلَّمَا عَاهَدُوا . . . .

ان یہودیوں پر آج بھی بھروسہ نہ کرنا ، ان کا دستور رہے کہ جب یہ کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو فوراً انھیں میں سے ایک گروپ اسے توڑ دیتا ہے ۔ کوہ طور پر میثاق لیا گیا کہ تورات پر عمل کریں گے ، مگر عمل نہ کرنا تھا نہ کیا ۔
بنو نضیر و بنو قریظہ نے آنحضرتؐ سے معاہدہ کیا مگر خندق میں مشرکین مکہ سے جا ملے ۔

ان پر بھروسہ عقل مندی کے خلاف ہے۔

۱۰۱ وَلَمَّا جَاءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ . . . . . .

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے بارے میں یہودی اپنی مقدس کتاب اور اکابر اہل علم سے سنتے چلے آتے تھے۔ مگر جب وہ وقت سعید آیا اور حضورؐ نے اعلانِ دعوت فرمایا تو ان لوگوں نے انھیں یوں جھٹلایا جیسے تورات بھول گئے اس کے تعلیمات پسِ پشت ڈال کر لاعلم بن گئے۔ حالانکہ آنحضرتؐ تورات و تعلیمات انبیا کے مؤید تھے اسے مسترد کرنے والے نہ تھے۔

وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيَاطِينُ عَلَىٰ
مُلْكِ سُلَيْمَانَ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمَانُ وَلَٰكِنَّ الشَّيَاطِينَ
كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ
بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمَانِ مِنْ أَحَدٍ حَتَّىٰ
يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۖ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ
بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا
بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا
لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا
بِهِ أَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ
مِنْ عِنْدِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ:

اور پیچھے پڑ گئے اس کے جو شیاطین، سلیمان کی بادشاہی میں جپا کرتے تھے،

حالانکہ سلیمان نے کفر اختیار نہیں کیا تھا، لیکن شیطانوں نے کفر اختیار کیا، وہ عوام کو جادو سکھاتے تھے اور بابل میں دو فرشتوں، ہاروت و ماروت پر جو (علم) نازل کیا گیا۔ حالانکہ وہ دونوں کسی کو تعلیم ہی نہ دیتے تھے جب تک وہ یہ نہ کہہ دیتے تھے کہ ہم دونوں تو فقط آزمائش ہیں لہٰذا تم اس پر عمل کر کے بے ایمان نہ ہو جانا۔ اس کے بعد بھی لوگ ان سے وہ (عمل) سیکھتے تھے جس سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ حالانکہ حکم خدا کے بغیر وہ کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ اور یہ لوگ وہ چیز تو سیکھتے ہیں جو انھیں نقصان پہنچائے اور فائدہ کچھ نہ دے۔ باوجودیکہ وہ حتماً جان چکے تھے کہ جو شخص ان برائیوں کا خریدار ہوا اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ اور بلاشبہ بہت ہی برا ہے جس کے بدلے انھوں نے اپنے نفس (خودی وذات) کو بیچا، کاش وہ لوگ یہ جان جاتے (۱۰۲) اور اگر یہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ برتتے تو یقیناً اللہ کے حضور ثواب اس سے کہیں بہتر ہوتا کاش یہ لوگ اتنا تو سمجھ لیتے (۱۰۳)

تفسیر:

مدینے کے یہودیوں نے معاشی اقتدار کے ساتھ کچھ سماجی چونچلے اور مقامی کہانیاں گڑھ رکھی تھیں ان کے کاہن اور ربی عوام کو طرح طرح سے گمراہ کرتے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں بھی وہ عجیب عجیب قصے سناتے اور انبیا پر تہمتیں لگاتے تھے اس سے عوام میں ان کے معلومات کی دھاک بیٹھی تھی۔ ان میں سے ایک من گھڑت حضرت سلیمان علیہ السلام سے جادو کی نسبت اور ھاروت و ماروت کی کہانی بھی تھی۔
قرآن مجید نے تفصیلات میں جائے بغیر چند اہم حقائق بیان فرما کر ان تمام داستانوں کی تردید کر دی جن سے یہودیوں نے ساکھ بنا رکھی تھی۔

جادو کا حضرت سلیمانؑ سے کوئی تعلق نہیں، ان کو کافر کہنا غلط ہے اور یہ نبی پر بہت بڑا بہتان ہے۔

عہد سلیمان علیہ السلام یا ان کے بعد جادو کا چرچا شیطانوں، منکرین دین و اخلاق نے کیا اور وہ کافر تھے۔ اسلام جادو ٹونے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

بابل کی تاریخ و سماج کے حوالے سے ہاروت و ماروت کو جادوگر بتانا بھی غلط ہے وہ دونوں جو کچھ بتاتے تھے وہ کفر نہ تھا، لوگوں نے اس کا استعمال غلط کیا۔

نام نہاد جادوگر، ٹونے ٹوٹکے کرنے والے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں، آخرت میں انھیں سزا ملے گی۔ نیز یہ کہ وہ اپنے کسی عمل سے کسی کا کچھ بگاڑ یا سنوار نہیں سکتے، نفع رسانی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہی قادر و توانا ہے۔

جو لوگ یہ کام کرتے ہیں ان کے لیے بہتر یہی تھا۔ اور ہے۔ کہ علم کتاب حاصل کریں، ایمان و تقویٰ کے راستے پر چلیں، اور کتاب خدا کے خلاف عمل نہ کریں۔ خواہ مخواہ عوام فریبی اور ان کو دین سے منحرف کرنے کی مہم چلانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اور ہوا بھی یہی کہ اسلام کی روشنی نے کاہنوں اور ساحروں کے چراغ گل کر دیے۔

اگر یہ لوگ جادوگری کے بجائے ایمان لے آتے اور متقی بن جاتے تو اجر و ثواب کے مستحق ہوتے اور نفرین و عذاب سے بچ جاتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَن يُنَزَّلَ عَلَيْكُم مِّنْ خَيْرٍ مِّن رَّبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ۝

ترجمہ: اے ایمان لانے والو! "راعنا" نہ کہا کرو۔ "انظرنا" کہا کرو۔ اور

(توجہ سے) سنا کرو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے (۱۰۴)
اہل کتاب میں کافر اور مشرک لوگ یہ نہیں چاہتے کہ تمہارے رب کی
طرف سے تم پر کوئی نیک بات اترے اور اللہ اپنی رحمت سے جسے
چاہتا ہے خاص کر لیتا ہے اور اللہ فضلِ عظیم کا مالک ہے۔ (۱۰۵)

تفسیر

۱۰۴ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا ......

قرآن مجید میں تقریباً ۸۹ جگہ "یاایھا الذین آمنوا" سے خطاب ہوا ہے اور یہ سب آیتیں مدنی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ اسلام قبول کرنے والے مدینے میں علم و عمل، اعتقادات و احکام کی بنا پر ایک توصیفی خطاب سے ممتاز ہو گئے تھے۔ زیرِ نظر آیت میں ان لوگوں کو آداب ہم نشینی و گفتگو سے باخبر اور تربیت اخلاق سے نوازا جا رہا ہے ارشاد ہے کہ "راعنا" سے بات روکنا۔ اور ایسا کلمہ کہنا جس میں ذم کا پہلو نکلتا ہو مناسب نہیں۔ اس کے بجائے، جب نبی سے کسی بات کو دوبارہ یا آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر کہنے کی درخواست کرنا ہو تو "انظرنا" کہہ کر متوجہ کیا کرو۔

"راعنا" ذو معنیین ہے۔ اس کے ایک معنی ہیں۔ ذرا ہمارا خیال رکھیے۔ ہمیں بات سمجھنے کا موقع دیجئے۔ بات آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر کیجیے۔ دوسرے معنی ہیں ہمارے چرواہے۔ سنو۔ کاش بہرے ہوتے۔

یہودی "راعنا" کہہ کر توہین رسالت کرتے تھے لہذا اسے ممنوع قرار دیا۔ "انظرنا" کے معنی ہیں؛ ذرا مہلت دیجئے۔ ذرا آہستہ آہستہ۔

جس حرف، کلمہ اور بات سے دشمنوں کو مذاق اڑانے کا موقع ملے، جب قرآن کریم ہمیں اس محاورے کی اجازت نہیں دیتا، تو ایسے کام اور ایسے معاملات کی اجازت کیسے مل سکتی ہے جس سے دشمنانِ اسلام، یہودی یا ان جیسے لوگ مسلمانوں کا یا اسلام

کا تمسخر کر سکیں۔ مسلمانوں کو غیروں کی بات اپنانے سے پہلے سو مرتبہ سوچ لینا چاہیے کہ یہ پسندیدگی کہیں ادب آموزی قرآن وسنت کے خلاف تو نہیں ہے۔ (سورۃ النساء کی ۴۶ ویں آیت بھی ملاحظہ کریں۔)

۱۰۵ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا ....

نام نہاد اہل کتاب اور مشرک دونوں یہ چاہتے ہیں کہ دنیا جہاں کی بھلائی اور ہر طرح کا اعزاز انھیں کے پاس رہے۔ تم مسلمانوں کے پاس کتاب خدا کا آنا، تمھارے رسول پر وحی کا اترنا انھیں گوارا نہیں۔ اس لیے مسلمان ان سے خلوص ومحبت کی امید نہ رکھیں۔ خدا سے لو لگائیں فضل وکرم کا مالک تو وہی ہے۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے — وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۝

ترجمہ:

جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت نازل بھی کر دیتے ہیں۔ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ ہر چیز پر (ہر طرح کی) قدرت رکھتا ہے۔ ⑩ کیا تم کو معلوم نہیں کہ اللہ ہی کے لیے زمین وآسمان کی سلطنت ہے۔ اور تمھارا، اللہ کے سوا کوئی حامی ومددگار نہیں ہے ⑩

تفسیر:

دونوں آیتوں میں ایک سوال کا جواب دو مخاطبین کو دیا گیا ہے۔ یہودی اپنی عادت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا، خدا پر اعتراض کرتے تھے کہ بھلا یہ کیا ہوا کہ خدا ایک مرتبہ آیت (آیات یا حکم یا احکام) نازل کرتا ہے پھر اسے منسوخ کردیتا ہے، توریت نازل کی منسوخ ہوگئی، انجیل بھیجی پھر قرآن نے اسے منسوخ کردیا، بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا پھر بدل دیا، ایک ہی مرتبہ ایسا حکم کیوں نہ دیا جس کے بدلنے کی ضرورت نہ پڑتی؟ اس کا جواب پہلے اہل کتاب کو یہ دیا کہ ہم قادر و مختار ہیں، تمہارے پابند نہیں، ہم جب کسی آیت یا حکم کو منسوخ کرتے یا اسے مؤخر کردیتے ہیں تو اس سے بہتر فرمان جاری کرتے ہیں یا اس سے ملتا جلتا اور زیادہ مناسب مصلحت حکم دیدیتے ہیں حکیم و علیم کا مطلب ہی یہ ہے کہ ارتقاء فکری و عملی کو پیش نظر رکھ کر دستور بنائے۔ پھر اسلام تو دائمی دستور ہے اس میں تو ماضی کو یوں باقی رکھتا ہے کہ مستقبل تک کوئی ترمیم نہ ہوسکے ہماری حکمت کے مطابق نہیں گذشتہ پیغمبروں کے دور ہمارے نبیؐ نے ختم کردیے تو ہمارے حکم کے بعد دیگرے گذشتہ احکام کو منسوخ کیوں نہ کریں۔

پھر مسلمانوں سے خطاب ہے کہ تم ان یہودیوں اور مشرکوں کی باتوں کو سمجھتے ہو، یہ نہ پیغمبروں کو مانتے تھے نہ کتابوں پر ان کا ایمان، یہ ان نکتوں کو کیا سمجھیں کہ اللہ، زمین وآسمان وکائنات کا مالک ہے وہی حامی و ناصر ہے، ان دشمنان اسلام و مخالفین مذہب کی دل جوئی سے کیا فائدہ نہ ان کی مدد کسی کام کی نہ ان کی حمایت کا کوئی فائدہ۔ یہ کچھ ہے ہی نہیں۔ آخر اتنے دن بیت المقدس قبلہ رہا، انھوں نے تمہارا کیا ساتھ دیا جو آئندہ ہم نوائی کی امید رکھی جائے۔

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا
سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ

فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ
عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا
حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ وَاَقِيْمُوا
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ
تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

ترجمہ:

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے ویسے ہی سوال (جواب) کرو جیسے پہلے زمانے میں موسیٰؑ سے سوال کیے گئے تھے؟ اور جس نے ایمان کے بدلے کفر اختیار کیا تو وہ ضرور سیدھے راستے سے بھٹک گیا (۱۰۸) اہل کتاب میں بہت سے لوگ اس امید میں ہیں کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد دوبارہ کفر میں واپس لائیں، یہ (بات) ان کے دلوں میں حسد کی بنا پر ہے۔ یہ ان پر حق ظاہر ہونے کے بعد کی بات ہے۔ لہٰذا تم ان سے درگذر کرو انھیں معاف کردو، یہاں تک کہ خدا اپنا حکم جاری کرے۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے (۱۰۹) اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیک عمل اپنے لیے پہلے سے بھیج دو گے اس کو اللہ کے حضور میں پاؤ گے۔ جو عمل تم کر رہے ہو اللہ اسے ضرور دیکھ رہا ہے (۱۱۰)

تفسیر:

۱۰۸ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْئَلُوْا . . . . . .

ادب آموزی و شخصیت سازی کی بات ہو رہی ہے، یہودی کے واقعات ان کے اقدامات اور نتائج دیکھ چکے۔ اس سے سبق لو اور مسلمانو! تم ان کا طریقہ نہ اپناؤ، تم ان کی طرح اپنے رسول اعظمؐ سے ویسی کٹھ حجتی نہ کرو۔ اس طرح سے ایمان کفر سے بدل جائے گا۔ سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔

۱۰۹ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ . . . .

یہ رجحان کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سوالوں کی بوچھار کر دو۔" دراصل ایک سازش ہے۔ یہود و نصاریٰ اسلام کی حقانیت اور اپنے افکار کے غلط ہونے سے باخبر ہو چکے ہیں۔ ان کے پاس دلائل تو ختم ہو گئے اب وہ تمھیں شبہوں میں مبتلا کر کے غلط اقدام کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح تم اسلام سے منحرف ہو جاؤ اور ان کے دل کی آگ بجھ جائے گی۔ مگر تم یاد رکھو کہ ایمان سے انحراف سیدھے راستے اور منزل سے انحراف ہے جو بہت خطرناک کام ہے۔

تم ان کی باتیں سنتے اور درگذر کرتے رہو، تمھارا خدا ان کے کرتوت دیکھ رہا ہے۔ حکمِ جہاد یا حکم اخراج آجائے پھر کچھ کرنا ابھی ان کو طاقت آزمائی کر لینے دو۔ ان کو حسد کی آگ میں جلنے دو۔

۱۱۰ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ . . . .

آج اور ہمیشہ دشمنانِ دین کو رسوا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے نماز قائم کرنے میں غفلت اور زکاۃ ادا کرنے میں سستی نہ برتو یہ کام دشمن کے شرمندہ و ذلیل ہونے کا سبب ہے۔

خود تمھارے لیے ذات و روح کی تقویت اور معاشرے کے لیے خوش حالی و ترقی کے فوائد حاصل ہوں گے۔ یہ بات ذہن میں رکھو کہ رضاءِ خدا ہدف ہے، اور خدا عمل و نیت عمل سے خوب واقف ہے۔

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾

ترجمہ:

اور وہ کہتے ہیں جنت میں ہرگز نہیں جا سکتا مگر وہی جو یہودی ہو یا نصرانی۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ آپ ان سے کہیے، تم اپنی دلیل لاؤ اگر سچے ہو (۱۱۱) ہاں، جو بھی اللہ کے سامنے اپنا سر جھکا دے اور نیک عمل ہو، اس کا اچھا بدلہ اس کے پروردگار کے یہاں ہے۔ ایسے لوگوں کو نہ خوف ہوگا نہ وہ (آخرت) میں غمگین ہوں گے (۱۱۲)

تفسیر:

عرب میں یہودیوں اور ان سے زیادہ عیسائیوں کی تبلیغی سرگرمیاں تیز تھیں، اسلام کے آنے سے انھیں ایک عقلی و استدلالی دعوت کا سامنا کرنا پڑا۔ سادہ لوح قبیلوں میں دونوں گروہوں کے مبلغ کہتے پھرتے تھے بس ان کے مذہب والے ہی جنت میں جائیں (دیکھیے آیت ۸۰) عوام اس اعلان سے متاثر ہوتے تھے۔ اسلام نے انھیں للکارا، ان کی سیرت و کردار، ان کی تاریخ اور قدیم عادتوں کی تفصیل بیان کی اور کہا، تم اور جنت میں جاؤ گے؟ نہ خدا کا کہنا مانتے ہو، نہ کتاب کی حفاظت کرتے ہو، خدا پر بہتان، تورات میں تحریف، عقائد میں تغیر، پھر بھی جنت میں جانے کی خام خیالی میں مبتلا ہو۔ اچھا، اگر تمھارا عقیدہ اور تمھارا اعلان ٹھیک ہے تو دلیل لاؤ،

عقل سے ثابت کرو اور عمل کا دفتر پیش کرو۔ مذہب کے علاوہ بھی اچھائی اور اچھے نتائج کی آرزو اسے کرنا چاہیے جو کم از کم اللہ کے سامنے سر جھکا کر اسے مالک وقادر تو مانے۔ خوش کردار اور نیک عمل تو ہو۔ اس کے بعد آخرت میں بھلائی کی امید رکھے تو عقل مان بھی لے گی۔ بدکرداری و بدعقیدگی کے بعد تو یہ دعوے انسانیت کا مذاق ہیں۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَیْءٍ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ

ترجمہ :

یہودی کہتے ہیں، مسیحی کسی چیز (عقیدۂ صحیح) پر نہیں اور مسیحی کہتے ہیں، یہودی کسی بنیاد پر (قائم) نہیں ہیں، حالانکہ دونوں اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں جیسی بات جاہلوں (لاعلم مشرکوں) نے بھی کی ہیں۔ تو، اللہ، قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ کرے گا جس میں بھی یہ جھگڑتے ہیں (۱۱۳)

تفسیر :

میدان میں تین حریف تھے۔ یہود جو تورات والے تھے۔ عیسائی جن کے پاس انجیل تھی۔ مشرک جن کے بتوں کی تعداد بہت تھی۔ یہ لوگ کعبہ کے پڑوسی اور مدینہ کے اصلی باشندے ہونے پر مغرور تھے۔ عیسائی اور موسائی اپنی منطق بگھارتے اور مذہبی تبلیغ کرتے تو یہ بے علم و کتاب لوگ بھی پانچویں سواروں میں کھڑے ہوتے اور شور کرتے تھے۔ قرآن مجید نے انتہائی حسین و معجز نما پیرائے میں اس کی نقشہ کشی

کی ہے ۔ گذشتہ آیات میں ان کے یہ پروپیگنڈے گذر چکے ہیں کہ ہر ایک کہتا ہے کہ جنت ہماری، دوسرے کا دخل نہیں اور یہاں یہ ہے کہ ہر گروہ کہتا ہے کہ دوسرا کچھ ہے ہی نہیں نہ عقیدہ صحیح نہ عمل درست ہے ۔ ہم ہی حق پر ہیں ۔ لطف یہ ہے کہ اپنے دعوے پر دلیل کسی کے پاس نہیں ۔ کتنے افسوس کی بات ہے رسول وکتاب کے باوجود دو گروہ آپس میں لڑتے تھے، حالانکہ تورات و انجیل جھگڑے ختم کرنے کے لیے اتری تھیں جب وہ موسیٰؑ اور یہ عیسیٰؑ پر متفق نہیں تو آنحضرتؐ کو کیسے مانیں گے ۔ نتیجہ یہ کہ قیامت کے دن اللہ انہیں سزا دے گا ۔ کیونکہ اس کی حجت تمام ہو چکی ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ
وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَا
اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ
اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝

ترجمہ :

اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس کا نام لینے سے روکے اور انہیں ویران کرنے کے درپے ہو ۔ ایسے لوگوں کو حق نہیں کہ مسجدوں میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور ان ہی لوگوں کے لیے آخرت میں بہت بھاری عذاب ہے (۱۱۴) اور اللہ کا مشرق و مغرب ہے، تو جدھر بھی منہ کرو ادھر ہی اللہ کا سامنا ہے ۔ بے شک اللہ وسعتوں کا مالک اور بہت بڑا صاحب علم ہے (۱۱۵)

تفسیر

۱۱۴ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ ......

یروشلم میں عیسائیوں نے یہودیوں کو شکست دی تورات جلائی۔ بیت المقدس کو نقصان پہنچایا۔ یہود کا داخلہ بند کر دیا۔ مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حج سے روک دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیبیہ سے واپس چلے آئے۔ دونوں واقعات کے پس منظر میں عمومی بات ارشاد فرمائی کہ مسجدوں میں جو بھی ذکر خدا و عبادت سے منع کرے اور اللہ کے گھر کو جو بھی ویران کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ بہت بڑا ظالم ہے۔ اللہ کے گھر پر کسی کو تسلط کا حق نہیں ہے۔ ایسے اشخاص اگر اللہ کے گھر میں جاتے ہیں تو ذرا ڈر کر جائیں وہ ادب کی جگہ عاجزی و تقویٰ کے ساتھ داخل ہونے کا مقام ہے وہاں قوت کا مظاہرہ کیسا ؟ اللہ، جب چاہے گا ان کے ظلم کا پانسہ پلٹ دے گا۔ یہ بیت المقدس اور مکہ و کعبہ مسلمانوں کے پاس ہوگا دشمن رسوا ہوں گے اور انھیں آخرت میں عذاب ملے گا۔ ایسا ہی ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں مکہ اور یروشلم مسلمانوں نے فتح کر لیا۔

ہر مسجد کی تعمیر و آبادی مومن کا شیوہ ہے، وہاں جائے دوسرے لوگوں کو بلائے نماز و تسبیح و تہلیل سے مسجد کو گونجتے رہنا چاہیے کہ وہ خانۂ خدا ہے اس کا حق ہی یہ ہے۔

اور مسجد میں نماز سے روکنا، اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے ظلم ہے۔ مسجد کی ویرانی مسلمان نہیں کر سکتا اور اگر کوئی شخص یا اہل محلہ، گروہ یا ایک طبقہ آبادیٔ مسجد میں خلل ڈالتا ہے تو مجرم ہے۔

مسجد کو عبادت و درس قرآن و عقائد و اعمال کا مرکز رہنا چاہیے۔ وہاں ہر قسم کی دینی سرگرمیوں کا سرچشمہ اور اسلام دشمن اعمال و افکار کے خلاف فکر و عمل ساز تربیتی مدرسہ اور کردار ساز ادارہ اور دشمن کے خلاف مورچہ ہونا چاہیے۔

۱۱۵۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ......

یہ جھگڑا بے معنی ہے کہ عیسائیوں کا قبلہ اچھا یا موسائیوں کا، یا مشرکوں کا قبلہ اچھا؟ جہتیں اور سمتیں اللہ کی ملکیت ہیں جدھر رخ کروگے اللہ ہی اللہ ہے۔ وہ زمان و مکان کا پابند نہیں۔ یہ کیا، کہ بیت المقدس کی طرف رخ کیا گیا تو اہل مکہ ناراض ہوں یا کعبہ کی طرف رخ ہو تو یہود و نصاریٰ جلیں؟ قبلہ اللہ کی رضا کی ایک علامت ہے وہ مشرق ہو یا مغرب۔ جدھر اللہ کا حکم ہو ادھر سجدہ صحیح ہے اور بس۔

فقہاء کہتے ہیں کہ حالت سفر میں مستحبی نمازوں اور جسے سمت قبلہ معلوم نہ ہو اس کے بارے میں یا اگر کسی کو سمت قبلہ نہیں مل رہی ہے تو جدھر چاہے رخ کر کے نماز پڑھ لے یہ مسئلہ فقہی ہے اپنے مجتہد کا فتویٰ معلوم کرنا چاہیے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ
بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۞ بَدِیْعُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ
فَیَكُوْنُ ۞

ترجمہ:

اور انھوں نے کہا، اللہ اولاد رکھتا ہے۔ وہ پاک ہے۔ بلکہ زمین آسمان میں جو کچھ ہے سب اسی کا ہے اور سب اسی کے فرماں بردار ہیں (۱۱۶) وہی آسمانوں اور زمین کو وجود بخشنے والا ہے۔ جب وہ کسی فرمان کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے۔ ہو جا۔ اور وہ چیز فوراً وجود میں آجاتی ہے (۱۱۷)

تفسیر:

۱۱۶۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ......

یہود، نصاریٰ اور مشرک سب نے عقیدہ گڑھ لیا ہے کہ اللہ کی اولاد ہے، یہود عزیرؑ کو، نصاریٰ مسیح کو، مشرک فرشتوں کو اولادِ خدا کہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ انبیاءؑ نے انھیں بتایا کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے، وہ ہر چیز کا مالک اور تمام مخلوق اس کی فرماں بردار ہے تو وہ اولاد کیسے بنا سکتا ہے؟ یہ بات توحید و تعلیمات تورات و انجیل کے برخلاف ہے۔ عقلِ سلیم ان باتوں کو تسلیم نہیں کرتی۔

۱۱۷ بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ .....

اللہ کی حکمت جیسے ہی کسی تخلیق کا تقاضا کرتی ہے۔ بلا کسی وقفہ کے وہ شے وجود میں آجاتی ہے۔ کسی سابقہ مثال کے بغیر یہ فضاء محیط اور یہ زمین اس کی عظیم تخلیق کا نمونہ ہیں۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا:

مخلوق کا ارادہ، ضمیر میں کسی چیز کا خطور اور اس سے آثار کا ابھرنا ہے اور اللہ عزوجل کا ارادہ خود فعلِ تخلیق ہے، وہ فکر اور تیاری نہیں کرتا۔ "کن فیکون" ایک تعبیر ہے مراد، مشیّت و خلق ہے۔ یعنی اس کی مشیت کا ظہور خلق ہے۔

●●

ڈاکٹر محمد جواد سہلانی
ترجمہ:۔ سید محمد ظفر حسینی

قرآن میں

رسالت کے جلوے

تعلیم و تربیت کی بنیاد

* بسم اللہ الرحمن الرحیم *

یسبح للہ مافی السمٰوات وما فی الأرض الملک القدوس العزیز الحکیم.
ھوالّذی بعث فی الأمیین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفي ضلال مبین.

ہیں قرآن مجید سے اصول تربیت دریافت کرنا ہیں، اس لیے آیۂ مذکورہ سے بات کا آغاز ٹھیک ہے۔ آیت کا سادہ سا مطلب یہ ہے کہ ۔ " زمین و آسمان کی ہر شے اس خدا کی تسبیح میں مصروف ہے جو حاکم ہے پاک و پاکیزہ ہے اور حکیم مطلق ہے "۔
اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب تمام مخلوق اللہ کی تسبیح و تہلیل کرتی ہے تو انسان کو بھی اس امر میں سب کے ساتھ ہونا چاہیے چونکہ خداوند عالم نے انسان کو فاعل مختار خلق کیا ہے

لہٰذا اس کی تسبیح و تہلیل نیّت و ارادے سے ہونا چاہیے اور اس کے لیے انسان علم و آگہی کا محتاج ہے۔

یہ آگاہی ذاتی (حضوری طور پر) ہوگی یا حصولی طور پر۔ علم حضوری (ذاتی) بھی مادی و روحانی دونوں طرح کا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح اس علم کا اکتساب و حصول کبھی وحی سے ہوتا ہے اور کبھی اس کا سرچشمہ تحقیق و تجربہ ہوتا ہے۔ علم ذاتیِ مادی کا لازمہ جسمانیات و طبعیات پر مشتمل وہ ظاہری اسباب ہیں جن کے عطا کئے جانے کے بارے میں خداوند عالم نے قرآن مجید میں نشاندہی فرمائی ہے، چنانچہ سورۂ نحل (۸۷) میں ارشاد ہوا ہے:

«وجعل لكم السمع والأبصار والأفئدة»

یعنی (اللہ نے) تمہیں کان، آنکھ اور دل کی نعمتوں سے نوازا۔

علم ذاتیِ معنوی بھی انسان کو خداوند عالم کی جانب سے ودیعت ہوا ہے، اور یہ مفہوم سورۂ روم کی تیسویں (۳۰) آیت سے اخذ ہوتا ہے جس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

" فطرة الله التی فطرالناس عليها... "

اللہ نے انسان کو وہ علوم جن کا سرچشمہ وحی و الہام ہیں، بالواسطہ اور بلاواسطہ دو مختلف مستقیم راستوں سے مرحمت فرمائے ہیں، بلاواسطہ سے الہام باطنی مراد ہے جس کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے:

«ونفس وماسواها، فألهمها فجورها وتقوٰها» (الشمس/۸،۷)

اور بالواسطہ سے مراد انبیاؑ و مرسلینؑ کی تبلیغات و ارشادات ہیں چنانچہ سورۂ جمعہ کی دوسری آیت (جو آغاز مقالہ میں درج ہے) اور تیسری آیت اس مضمون پر مشتمل اور گواہ ہے۔

انسان کے تجرباتی، مطالعاتی اور مشاہداتی علوم سے مراد اس کی وہ معلومات

ہیں جو اسے خداوند عالم کی جانب سے عطا کی گئی صلاحیتوں اور قوتوں کے استعمال کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں تاکہ انسان مخلوقات عالم کا ایک جز ہونے کی حیثیت سے اپنے تمام فرائض اور شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرسکے ورنہ اسے جواب دہ ہونا پڑے گا اور سزاوار مواخذہ و مستحق عقاب ٹھہرے گا، یہ مفہوم قرآن کریم کی متعدد آیتوں سے اخذ ہوتا ہے مثلاً سورۂ الشمس کی نویں اور دسویں آیتیں بھی ہیں، جن میں ارشاد ہوا ہے:

«قد افلح من زکّاھا وقد خاب من دسّٰھا»

اب اگر ہم آج کی موجودہ اصطلاحات کو پیش نظر رکھ کر تعلیم و تربیت کی تعریف یوں کریں: "وہ سورسز (مآخذ) جن کے ذریعے انسان کو مہارتیں اور صلاحیتیں حاصل ہوتی اور ان کی اقدار معلوم ہوتی ہیں۔"

مقصدِ تعلیم و تربیت:

"انسان کو ترقی و کمال کے لیے زیادہ صلاحیتیں مہیا کرنا۔"

تعلیم کے بعد نتیجہ:

"انسان کو مفید و مؤثر زندگی کے لیے تیار کرنا اور نامساعد حالات میں نفسیاتی اعتدال کا مالک بنانا۔"

یہ بات جاننے کے بعد سمجھ سکیں گے کہ انسان کو ایک مسلسل و دوامی ہم آہنگی درکار ہے جو اپنے اور دوسروں کے درمیان برقرار رکھے۔

اب قرآن کو دیکھتے ہیں وہ اس بارے میں کیا رہنمائی کرتا ہے، ارشاد باری ہے:

«الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً»

(الملک(۲))

ــ موت و حیات کی تخلیق تمہارے حسن عمل کے امتحان کی خاطر ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کا فریضہ یہ ہے کہ وہ بہترین کردار کے حصول کے لیے

پیہم کوشاں رہے اب یہ دیکھیں کہ قرآن میں "حسنہ" یعنی نیکوکاری کا معیار کیا ہے؟ ارشاد ہے:

لقد كان لكم فى رسول الله أسوة حسنة (الاحزاب/٢١)

نیکوکاری کا معیار پیغمبر خدا کا کردار ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:۔

لقد منّ الله على المؤمنين إذبعث فيهم رسولاً من انفسهم يتلوا
عليهم آياته ويزكيهم و يعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفى
ضلال مبين (آل عمران/١٦٤)

یعنی بہ تحقیق، خدا کا لطف و احسان ہے صاحبان ایمان پر جن کے درمیان سے اس نے انھیں میں کا ایک رسول منتخب کیا جو ان کے سامنے آیات الٰہی کی تلاوت اور ان کا تزکیہ نفس کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت سے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر انسان پیغمبران خدا کی سیرت و کردار کو اپنے لئے معیار عمل قرار نہیں دے گا تو ہمیشہ کھلی ہوئی گمراہیوں میں مبتلا رہے گا۔ یہاں اگر کسی ذہن میں یہ بات آئے کہ "ضلال مبین" (یعنی کھلی ہوئی گمراہی) کا تعلق صرف اسلاف اور گذشتہ زمانے کے افراد سے ہے تو اس وہم کی تردید سورۂ جمعہ کی تیسری آیت میں موجود ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے:

«وآخرين منهم لما يلحقوا بهم» (الجمعة/٣)

یعنی وہ دوسرے افراد جو ابھی تک ان لوگوں (اسلاف) سے نہیں جا ملے ہیں۔ لہذا، قرآن کریم صحیح اور الٰہی وحقیقی تربیت کی اساس۔ تلاوت آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت کو بہترین ذریعہ قرار دیتا ہے اور درجہ بدرجہ ضرورت کے مطابق تعلیم و تربیت کی ترویج اور پھیلاؤ یا نئی داغ بیل ڈالنے کے مسئلے کو واضح کرتا ہے۔ اب ہمیں یہ تجزیہ کرنا ہے کہ اس کام کی ضرورت کے واقعی اسباب کیا ہیں؟ قرآن مجید نے

چند ایسے امور بنیاد بتایا ہے جو نقصان کا سبب اور انسان کے باطن میں پوشیدہ ہیں، مثلاً:

۱۔ انسان کمزور و ناتوان خلق ہوا ہے۔ خلق الانسان ضعیفا (النساء/۲۸)

۲۔ انسان جلد باز خلق ہوا ہے۔ خلق الانسان من عجل (الانبیاء/۳۷)

۳۔ انسان حریص خلق ہوا ہے۔ ان الانسان خلق هلوعا (المعارج/۱۹)

۴۔ انسان ظالم و جاہل ہے۔ انه کان ظلوماً جهولاً (الاحزاب/۷۲)

۵۔ انسان سرکش اور نافرمان ہے۔ ان الانسان لیطغیٰ... (علق/۶)

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ انسانی زندگی کے یہ منفی پہلو حیات میں توازن اور روح بشری میں اعتدال برقرار رکھنے کے لیے بے حد ضروری ہیں اور آزادی و اختیار ان کے انتہائی لازمی اجزا سمجھے جاتے ہیں اور یہ راز درج ذیل آیۂ کریمہ سے بخوبی آشکار ہے:

«لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم» (التین/٤)

ہم نے انسان کو بہترین شکل و شمائل میں خلق کیا ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سب سے پہلی منزل میں انسان کو دنیا میں عمل صالح کی طرف پوری توجہ دینی چاہیے کیونکہ وہ امتحان الٰہی کی منزل میں ہے، دوسرے اسے نیک اعمال کے سلسلے میں معیار اور رسول پیغمبر خدا کو قرار دینا چاہیئے۔ تیسرے چونکہ انسان کی زندگی میں کچھ منفی رخ بھی پائے جاتے ہیں لہٰذا اسے وہ راستہ اپنانا چاہیئے جس کے ذریعہ وہ برے اور منفی پہلوؤں کو اچھے اور مثبت پہلوؤں میں تبدیل کر سکے، چوتھے یہ کہ اس ارتقا سے مراد مختصر الفاظ میں آیات الٰہی کا مطالعہ، تزکیۂ نفس اور کتاب و حکمت کی تعلیم ہے۔

آیئے اب یہ جائزہ لیں تزکیہ و تعلیم پر مشتمل آیتوں سے کون سے اہداف اور اغراض و مقاصد مراد ہیں؟

الف: آیات الٰہی کے مطالعہ سے قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت بھی مراد ہے جیسا کہ ارشاد ہو رہا ہے: «ان فی ذٰلک لأیات لقوم یؤمنون (الزمر/۵۲) اور اس سے عالم طبیعت میں فطرت کی کاریگری اور قدرت کی صناعیوں کا مطالعہ و مشاہدہ بھی مقصود ہے، چنانچہ ارشاد ہو رہا ہے:

«وكأين من آية فى السمٰوات والأرض» (يوسف/١٠٠)

اور اس سے مراد خود انسان، اپنا ذاتی وجود بھی ہے، چنانچہ اس سلسلے میں قرآن کا ارشاد ہے:

«بل هو آيات بينات فى صدور الذين أوتوا العلم...

(العنكبوت/٤٩)

خلاصہ یہ کہ جب انسان عمیق نظروں سے معجزات اور رحمت الٰہی کے کرشموں اور اسکی ان روشن نشانیوں کا مطالعہ کرتا ہے جن کے ذریعہ ذات الوہیت کا یقین ہوتا ہے، جن کی ایک مثال اس آیۂ کریمہ میں موجود ہے:

«وجعلنا ابن مريم وامه آية... (المؤمنون/٥٠)

تو اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ موجودات عالم اور خدا کی بیشمار رنگا رنگ نشانیوں کے بارے میں غور و خوض فکر و نظر اور تحقیق و مطالعات کے ذریعہ بیشمار علمی نتائج اور تربیتی ذخائر ہمارے ہاتھ آسکتے ہیں۔

ب :- تزکیۂ نفس :

اس سے مراد ہر طرح کی کثافتوں اور آلائشوں سے جسم و روح کی تطہیر نیز ان کا بُری تاثیرات سے پاک رکھنا اور آزادیِ بشر کے اصولوں کی مکمل مراعات ہے، تزکیہ، سچی تعلیم اور صحیح تربیت کے اصولوں میں سرفہرست قرار پاتا ہے۔

یہ مفہوم سورۂ بقرہ کی ۱۲۹ ویں اور ۱۵۱ ویں آیتوں میں، سورۂ آل عمران کی ۱۶۴ ویں آیت اور سورۂ جمعہ کی دوسری آیت میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے، ان چاروں آیتوں میں تزکیہ اور تعلیم ایک دوسرے کے لازم و ملزوم کی حیثیت سے ذکر ہوئے ہیں، جس میں سے تین جگہوں پر تزکیہ کا تذکرہ تعلیم سے پہلے سے کہا گیا ہے۔ ہم اس قرآنی تربیت کے ذریعہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ تزکیۂ نفس کے مرحلے کو تعلیم سے پہلے سر کرنا چاہیے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ قرآن میں تزکیہ و تعلیم ہر مقام پر ساتھ ساتھ آئے ہیں لہٰذا جسم و روح کی تطہیر اور تعلیم و

تربیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے، یعنی خواہ حصول علم سے پہلے یا اس کے بعد، دونوں ہی صورتوں انسان کو علم کے صحیح استعمال کے لیے توازن واعتدال برقرار رکھنے کے واسطے ایک کنٹرولنگ مشین کی ضرورت ہے جسے ہر وقت اپنی توجہ کا مرکز رکھنا چاہیے اور اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیے چنانچہ یہ کنٹرولنگ مشین یہی انسان کی صفائے قلب اور تطہیر و تزکیۂ نفس ہے جس کے ضمن میں اخلاقی مباحث سامنے آتے ہیں۔ دوسری طرف اگر انسان اس تربیت سے مالامال نہیں ہو پاتا جو اس کی خداداد فطرت کا تقاضا ہے تو پھر اس کے ارتقا کی راہ میں ایک زبردست پہاڑ حائل ہو جاتا ہے جس کے بعد وہ زندگی کے حقیقی مسائل پر غور و فکر نہیں کر سکتا بلکہ اپنی شخصیت اور ذاتی صلاحیتوں پر توجہ کیے بغیر یہ چاہنے لگتا ہے کہ دوسروں کے ایسے نظریات وافکار پر خود کو منطبق کرے جو انھوں نے اس کی صلاحیت و استعداد اور کردار و اعمال کے بارے میں قائم کیے ہیں۔ آگے بڑھ کر یہی لوگ اپنے آپ کو بے شمار قیود اور اوہام وخیالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر زندگی کی مختصر و معمولی سرگرمیوں اور بے بنیاد مسرتوں کو ہمراہ لیے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ قرآن نے ان کے حالات کی تصویر کشی کی ہے:

«ضاقت علیهم الأرض بما رحبت وضاقت علیهم انفسهم»

(التوبة/۱۱۸)

یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے زمین اپنی تمام تر وسعتوں اور کشادگیوں کے باوجود تنگ ہوگئی اور انھوں نے خود ہی اپنی زندگی کو تنگیوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔

لیکن جب انسان اسوۂ حسنہ یعنی کردار پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ ہو جاتا ہے تو اوہام کی زنجیریں ٹوٹ کے گر پڑتی ہیں اور اس کی روح ہلکی اور پرسکون ہو جاتی ہے، جیسے قرآن نے اس آیہ کریمہ میں بیان فرمایا ہے:

«الذین یتبعون الرسول النبي الأمي... ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم» (الاعراف/۱۵۷)

یعنی وہ لوگ جو اللہ کے اس رسول کی پیروی کرتے ہیں جس نے کسی کے پاس

تعلیم نہیں حاصل کی ہے، یہ وہ رسول ہے جو ان کے بھاری بوجھ ہلکا کرتا ہے (یعنی انھیں بیجا رسم و رواج اور اوہام پرستی سے نجات دلاتا ہے) اور ہر طرح کے قید و بند نیز غلط افکار و خیالات کی مضبوط زنجیروں سے آزادی دلاتا ہے۔

اب اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ علم اسے ڈسنے نہ پائے اور وہ حرص و ہوس اور خواہشات نفسانی میں پھنسنے نہ پائے، نیز دوسروں کے ظلم و زیادتی اور فریب و جعلسازی کا شکار نہ ہونے پائے اور خود کو دنیا کی جھوٹی رعنائیوں اور رنگینیوں کا اسیر نہ ہونے دے تو اس پر واجب و لازم ہے کہ علوم و فنون حاصل کرتے وقت نیز اس سے پہلے اور بعد حقیقی ترقی کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرے، یعنی بالفاظِ قرآن تزکیہ نفس کو اپنا نصب العین قرار دے۔

ج: مسئلہ تعلیم:

قرآن میں جس قدر تعلیم و تعلّم پر زور دیا گیا ہے کسی دوسری کتاب میں اس مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے غیر مسلم محققین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

قرآن کریم کی آیتوں میں جو آیت سب سے زیادہ اس سلسلے میں روشنی ڈالتی ہے وہ سورۂ زمر کی نویں آیت ہے:

«هل يستوي الذين يعلمون والذين لايعلمون»

جس کا مفہوم فارسی کے شاعر شیخ سعدی کی زبان میں یوں بیان ہوا ہے ؎

کجاجانِ داناونادان یکیست

یعنی عالم و جاہل دونوں کی زندگی کی قیمت کب برابر ہے؟

یا پھر قرآن کی وہ آیت اہمیت علم کی وضاحت کرتی ہے جس میں خدائے وحدہٗ لاشریک نے عادل علما کے ہمراہ خود اپنی ذات کو بھی گواہی کے لیے پیش فرمایا ہے:

«شهد الله انه لا إله إلّا هو والملائكة وأولوا العلم قائماً بالقسط لااله الاهوالعزيز الحكيم» (آل عمران/۱۸)

نتیجۂ گفتگو :

تعلیم و تربیت کے سلسلے میں قرآن کریم کی تاکید تحصیل علم اور حضرت خاتم الانبیا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم تعلیم و تربیت کے نتیجے میں مسلمانوں کی فکر روشن کا کرشمہ تھا کہ چودہ سو سال قبل دنیا کی انتہا سے زیادہ ایک غیر متمدن اور پسماندہ قوم میں ایک مثالی تمدن نے جنم لیا اور دیکھتے دیکھتے عالمی ثقافت و تمدن کا روح رواں بن گیا۔

اس فلسفے کے نتائج :

یہ علمی و تربیتی کارنامہ کچھ اتنا عظیم اور محیر العقول تھا کہ جب غیر اسلامی دنیا متمدن ہوئی تو اس کے بڑے بڑے علماء و محققین نے اسلام کی اس عظمت کو مجبوراً تسلیم کیا ہم ذیل میں ان معترفین میں سے چند کے نام تحریر کر رہے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب یا مقالہ تحریر کیا ہے:۔

۱۔ انگریز محقق، برٹرنڈ رسل، "مغربی فلسفہ کی تاریخ"۔
۲۔ فرانسیسی مصنف، گوستاو لوبون۔ کتاب" اسلام اور عرب کی تاریخ تمدن"۔
۳۔ امریکی مصنف، جارج سارٹن، "تاریخ علم پر مقدمہ"
۴۔ امریکی مصنف، ویل ڈیورانٹ، "تاریخ تمدن"
۵۔ فرانسیسی مصنف، آن فرمانتل، "عصر اعتقاد"
۶۔ فرانسیسی مصنف، فرانسوا جوزف پی کا وے، "اسلامی فلسفہ پر ایک مقدمہ"
۷۔ امریکی مصنف، ہرمن رینڈل، "ذہن جدید کا سفر ارتقا"
۸۔ آئرلینڈ کے جان برنان، "علم تاریخ کے آئینے میں"
۹۔ فرانسیسی مصنف، پی روسو، "تاریخ علوم"
۱۰۔ فرانسیسی مصنف، والٹیر نے اپنے متعدد مقالات میں اعتراف کیا ہے۔

ان مشہور مصنفین میں تاریخ علم کے نامور محقق۔ جارج سارٹن کے خیالات ملاحظہ کریں۔ جو اپنی ایک کتاب "علم کی کہانی" میں رقمطراز ہے:

"اسلامی تمدن نے علم کو جو دولت عطا کی ہے اسے اس مقالہ میں فہرست کے طور پر بیان کرنا ممکن نہیں ہے . . . . . دو صدیوں سے بھی کہیں کم عرصہ میں ایک جدید علمی، عالمی اور نہایت عظیم الشان تمدن کی تخلیق ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس سے کچھ سیکھنا اور سبق لینا چاہیے اور اس حق کو پامال نہ کرنا چاہیئے۔"

ہاں! یہ بات کیسے ممکن ہے کہ لوگ اس حقیقت کا اعتراف نہ کریں جبکہ آخری چار صدیوں کے دوران انسانس کے مشہور دور کی دھماکہ خیزیوں کے بعد انہوں نے حصول علم اور اس کی جمع آوری کے تمام پہلوؤں کو مسلمان علماء سے حاصل کیا ہے، جاہے طالب علموں نے درس کے وقت یادداشت کے طور پر لکھنے کے آداب اور خود یادداشت کرنے کو اور طلاب کو سند عطا کرنے کے سلیقوں کو بھی، (جو ایک علمی اور تربیتی نظام کے جدید ترین لوازم میں سے ہیں) مسلمانوں ہی کی کتابوں سے سیکھا، یہاں تک کہ ان لوگوں نے ایک دو صدی قبل ان میں سے بعض کتابوں کا ترجمہ بھی کر ڈالا جیسے کتاب "ادب الاملاء و الاستملاء" جس کے مصنف عبدالکریم سمعانی ہیں اور اس کا ترجمہ جرمن زبان میں ہوا اور کتاب "الاجازہ فی فنون التدریس عند الاسلام" جس کا ترجمہ ۱۸۵۵ء میں فرانسیسی زبان میں پیرس میں ہوا۔

یورپ والے ایک طویل عرصہ تک اپنی یونیورسٹیوں کے نصاب کی کتابوں کا انتخاب تدوین شدہ اسلامی مآخذ سے کرتے تھے، وہ مشہور و معروف کتابیں جن سے وہ اپنی یونیورسٹیوں کی تعلیم میں پیہم استفادہ کرتے رہے، درج ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الحساب تصنیف خوارزمی — ۲۔ مساحۃ الاشکال تصنیف بنی شاکر
۳۔ الرسائل " ابومشعر بلخی — ۴۔ الرسائل مصنف محمد بن جابر بتانی
۵۔ الھیئت " فرغانی — ۶۔ صور الکواکب " عبدالرحمان صوفی
۷۔ المناظر و المرایا " کندی — ۸۔ کتاب الریح والمطر مصنف کندی
۹۔ نزھۃ المشتاق " ادریسی — ۱۰۔ تقویم البلدان " ابوالفداء
۱۱۔ المفردات " ابن بیطار — ۱۲۔ الحاوی " رازی

۱۳۔ طب المنصوری	تصنیف رازی	۱۴۔ القانون	تصنیف ابن سینا
۱۵۔ المناظر	〃 ابن ہیثم	۱۶۔ اصلاح المجسطی	〃 جابر بن افلح
۱۷۔ کتاب التصریف (فنِ جراحت)	〃 ابو القاسم زہراوی	۱۸۔ تقویم الابدان	〃 ابن قزلہ
۱۹۔ الکلیات	〃 ابن رشد	۲۰۔ الرسائل	〃 فارابی
۲۱۔ الرسائل	〃 ابن سینا	۲۲۔ کتاب الموسیقی	〃 ابن باجہ
۲۳۔ مقاصد الفلاسفہ	〃 غزالی		

درحقیقت اہلِ مغرب کی یونیورسٹیوں کا قیام، علمائے اسلام کے ذریعہ علوم و فنون کی باریک درجہ بندیوں سے حاصل شدہ نتائج کا مرہونِ منت ہے۔ وہ مسلمان علماء جنھوں نے علوم کی تقسیم اور درجہ بندی کے سلسلے میں اہم کتابیں تحریر کی ہیں، ان میں سے چند اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔ فارابی ـــ "احصاء العلوم"
۲۔ ابن سینا ـــ "رسالۃ فی اقسام العلوم" اور "شفا"
۳۔ ابن خلدون ـــ "مقدمہ"
۴۔ ابن حزم ـــ "مراتب والعلوم"
۵۔ شہید ثانی ـــ "منیۃ المرید"

مختلف علمی شعبوں میں مسلمانوں کی تالیفات اور مغربی تمدن پر ان کے اثرات کچھ اتنے زیادہ ہیں کہ ہر شعبہ میں صرف فہرست کی تدوین کے لیے ایک مستقل اور ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ اس مقام پر ہم مسلمانوں کے درمیان رائج چند مشہور علمی شعبوں کے تذکرے پر اکتفا کرتے ہیں۔

۱۔ حکمت و اخلاق:

قرآن اور رسولِ خدا کے بعد اس شعبہ کے واضع اور مدوّن ابن ابی الحدید کے نظریہ کے مطابق امام علی ابن ابیطالبؑ ہیں اور نہج البلاغہ اس دعوے کی بہترین دلیل ہے۔
نہج البلاغہ کے بعد "صحیفۂ سجادیہ" امام علی بن حسینؑ کی اور اس کے بعد "الکافی" کلینی، "تحف العقول" حرّانی، "خصال" شیخ صدوق، "تحصیل السعادۃ" فارابی، "اخلاقیات الشفا" ابن سینا

"اخلاق ناصری" خواجہ نصیرالدین طوسی، "احیاء العلوم" غزالی، "مصابیح القلوب" بوعلی بیہقی، "الآداب الدینیہ" شیخ طبرسی، "ارشاد القلوب" شیخ ابو محمد حسن دیلمی "مکارم الاخلاق" شیخ ابو منصور طبرسی، "عیون الحکم والمواعظ" شیخ علی بن محمد لیثی واسطی، اور "اخلاق جلالی" ملا جلال الدین دوانی۔

۲۔ فقہ، حقوق، قانون

ان موضوعات پر اتنی زیادہ تعداد میں بیش بہا جواہر پارے موجود ہیں جنکی حیثیت سچ مچ ایک بیکراں سمندر کی ہے، ان میں سے کچھ نام درج ذیل ہیں،

- کتاب الالفاظ والمباحث: از ہشام بن حکم
- "کتاب الخصوص والعموم": از ابو سہل نوبختی
- عدۃ الاصول: از شیخ ابو جعفر طوسیؒ
- تہذیب الاصول: از علامہ حلی
- کتاب مختصر الاصول: از ابن حاجب
- کتاب الموافقات: از ابو اسحاق شاطبی
- کتاب اختلاف الحدیث ومسائلہ: از یونس بن عبد الرحمن
- الذریعہ الی اصول الشریعہ: از علم الہدیٰ، سید مرتضیٰ
- کتاب المصادر: از سدید الدین حمص۔
- کتاب المستصفی: از ابو حامد غزالی۔
- کشف الاسرار: علاء الدین بخاری۔

۳۔ علوم عقلی

یہ موضوع بھی اتنا زیادہ وسیع اور بے پایاں ہے کہ اس کی سرحدیں اور کنارے بھی ہمارے لیے ناپید و ناآشکار ہیں، یہاں پر ہم چند ایسے بااثر مفکرین کے اسماء کا تذکرہ کرنا چاہتے ہیں جو رنسانس کے بعد یورپ والوں کے یہاں معارف عقلی کا خاکہ مرتب کرتے ہیں براہ راست اثر انداز ہوئے ہیں جن میں یعقوب بن اسحاق کندی، ابو نصر فارابی، ابن الولید بن رشد، ابو علی سینا، ابن خلدون، ابن طفیل اور سہروردی کے نام سر فہرست ہیں۔

۴۔ اسلامی فنون :

متأخر مغربی فنکاروں کے آراء و نظریات پر اسلامی فن کس قدر اثر انداز ہوا ہے؟ اس کے جواب کا جواب اور تفصیلی اعتراف بہت سے مصنفین نے کیا ہے، مثلاً یہ تین کتابیں :

- "اسلامی فن کی تاریخ" تصنیف کرسٹن پرایس ۔ "اسلامی صنعت کی رہنما"
- "اسلامی صنعت کی رہنما" از ایم ایس ڈیمانڈ ۔
- "میراث اسلام" از آربری و پروفیسر گب ۔

نیز بہت سے مصنف

۵۔ اسلامی ادبیات :

اگر ہم ادبیات اسلام کے موضوع سے متعلق بھی مختصراً کچھ لکھنا چاہیں تو خلاصہ کے طور پر کچھ قلم بند کرنا ممکن نہیں ہے ۔ لہٰذا ہم اس سلسلے میں بھی ایک دو باتوں کی طرف اشارے پر اکتفا کرتے ہیں ۔

"حی بن یقظان کا تربیتی فلسفی قصہ" جو ابن طفیل اندلسی کی تصنیف ہے ، نہ صرف یہ کہ یہ کتاب ۱۳۴۹ء سے لیکر ۱۹۶۳ء تک عبرانی ، لاطینی ، ہولینڈی ، انگریزی ، جرمنی ، اسپینی ، فرانسیسی ، روسی اور .... زبانوں میں ترجمہ ہو کے بارہا چھپ چکی ہے بلکہ اہل مغرب کے متعدد فلمی پہلوؤں پر بھی اثر انداز ہوئی ہے ۔

ہم یہاں کتاب "میراث اسلام" کے ادبی حصے کے مصنّف ، پروفیسر کا ایک قول نقل کر رہے ہیں :

> "ہمیں یہ راز جان لینا چاہیے کہ وہ مشرق یعنی اسلام ہی ہے جس نے یورپ والوں کے لیے ایسی نئی نئی راہیں کھولیں جن کے ذریعہ وہ آج ادبیات کے شعبہ میں اس موجودہ منزل پر پہنچے ہیں ۔"

تیسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ اہل مغرب کے ادب پر اسلامی ادبیات نہ صرف

یہ کہ قابل صد تعریف تاثیر کے حامل رہے ہیں بلکہ ادبی علوم سے متعلق ایسی کتابیں جن کا انحصار کسی ایک فرد پر ہو، صرف مسلمانوں ہی نے تالیف کی ہیں اور یورپ کے محققین نے ان کا ترجمہ کیا اور انھیں سنوارا ہے۔ جن میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

عبدالوہاب زنجانی کی کتاب "التصریف" کا ترجمہ لاطینی میں متن کے ہمراہ ۱۶۱۰ء میں فلورنس میں زیمونڈیس نے کیا۔

محمد بن داؤد صنہاجی کی کتاب "الاجرومیۃ" کا ترجمہ لاطینی میں ۱۶۳۱ء میں کشیش اوبیشینی" نے اور فرانسیسی میں ۱۸۴۶ء میں بر برز نیئر نے کیا۔

زین الدین ابوالحسن یحییٰ کی کتاب "الفیہ" کا ترجمہ متن اور تعلیقات سمیت ہولینڈ کی زبان میں ۱۸۹۵ء میں، لیپزگ میں کے۔ وی۔ زیٹرسٹی نے کیا اور فرانسیسی زبان میں ۱۸۸۷ء میں قسطنطنیہ میں ایل پنٹو نے اور ۱۸۸۸ء میں بیروت میں اے۔ گوگیٹ نے کیا۔

ابن ہشام انصاری کی کتاب "شرح قطر" کا ترجمہ متن سمیت فرانسیسی میں ۱۸۸۷ء لندن میں اے۔ گوگیٹ نے کیا۔

سیبویہ کی کتاب "شرح الکتاب" کا ترجمہ مقدمہ اور حواشی سمیت فرانسیسی زبان میں ۱۸۸۹ء میں ایچ۔ ڈیرر برگ نے کیا۔

ابن حاجب کی کتاب "الکافیہ" کا ترجمہ انگریزی زبان میں ۱۸۳۲ء میں کیمبرج میں جے۔ جے۔ ایس بیراؤن نے کیا۔

حریری بصری کی کتاب "ملحۃ الاعراب" کا ترجمہ شرح اور تعلیقات سمیت فرانسیسی میں ۱۹۰۴ء میں، پیرس میں ایل پنٹو نے کیا۔

کتاب "الخزرجیہ" کا ترجمہ متن سمیت فرانسیسی میں ۱۹۰۲ء میں، الجزائر میں رینی بیسیٹ نے کیا۔

۶۔ دیگر علوم

ہمارے امکان سے باہر ہے کہ ہم مسلمانوں کی علمی و تربیتی اقدامات اور جدوجہد

نیز عالمی تمدن پران کے ناقابل انکار اثرات سے متعلق کچھ بیان کر سکیں لہٰذا یہاں صرف چند اشاروں پر اکتفا کرنا ہی مناسب سمجھیں گے۔

فلسفہ، منطق، ریاضی، اجسام، کیمیا، طبیعیات، طب، نجوم، صنعت اور مشین سازی وغیرہ جیسے علوم وفنون کی دنیا میں مسلمانوں کی حیثیت موجدکی ہے، اس سلسلے میں کوئی ان سے سابق نہیں، ان کے کارنامے حیرت انگیز ہیں جن میں سے ہر ایک کو ایک علمی اور تحقیقی کارنامہ کہنا چاہیئے۔

یہ بات پورے اطمینان و وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ:

اقوام کے تمدن و آداب کی معرفت کے سلسلے میں ابوریحان بیرونی کی "الآثار الباقیۃ" علوم کی تعداد شماری اور درجہ بندی کے سلسلے میں فارابی کی "احصاء العلوم" قرآنی علوم و ادبیات کے موضوع پر سیوطی کی "الاتقان" فلسفۂ وجود عرفانی کے موضوع پر ملا صدرا کی "الاسفار" حیوانیات شناسی کے موضوع پر جاحظ کی "الحیوان" تقابلی مطالعۂ فقہ کے موضوع پر شیخ طوسی کی "الخلاف" عالم کے بارے میں اسلامی رجحانات، ان کے دبستان و اختلافات کے فلسفہ و مباحث پر سید مرتضیٰ کی "الشافی" کتاب شناسی کے موضوع پر ابن الندیم کی "الفہرست"۔ عربی نحو کے موضوع پر سیبویہ کی "الکتاب" علمی مباحثات کے موضوع پر سید شرف الدین کی "المراجعات" روشنی اور شعاعوں کے موضوع پر ابن ھیثم کی "المناظر"۔ ستاروں کی پہچان اور زیج کے سلسلے میں بتانی کی "الزیج الصابی" فلسفہ میں ابن سینا کی "الشفا" مثلثات کے بارے میں خواجہ نصیر الدین طوسی کی "شکل القطاع" طب کے موضوع پر ابن سینا کی کتاب "القانون" فن تاریخ کے موضوع پر مسعودی کی "مروج الذھب"۔ دائرۃ المعارف علوم کے موضوع پر طاشکبری زادہ کی "مفتاح السعادۃ" علم آبادکاری اور فلسفۂ تاریخ کے موضوع پر مقدمۂ ابن خلدون، استدلالی فقہ اور اقتصادیات کے موضوع پر شیخ انصاری کی "مکاسب" علوم کے لغت نامہ کے موضوع پر محمد بن احمد خوارزمی کی "مفاتیح العلوم" فخر الدین رازی کی "جامع العلوم" سراج الدین سکاکی کی "مفتاح العلوم" اور قطب الدین شیرازی اور سیوطی کی "درۃ التاج" علمی اصطلاحات

کے موضوع پر سید شریف جرجانی کی "التعریفات" اور محمد بن علی تھانوی کی" کشاف اصطلامات الفنون" جغرافیہ کے موضوع پر حموی کی" معجم البلدان" دواؤں کی پہچان کے سلسلے میں ابن البیطار کی "مفردات" اور لغت واعلام میں زبیدی کی "تاج العروس" اور تفسیر واحادیث کے موضوع پر علامہ مجلسی کی "بحار الانوار" یہ سب مسلمانوں کی بیکراں کوششوں کے ایسے مشہور ومعروف نتائج اور شہ پارے ہیں جو آج کے علوم جدیدہ کی ایجاد کا ذریعہ ثابت ہوئے ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہم ان تفصیلات سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ قرآن پر ایمان و یقین نے مومنین کے قلوب کو وہ جوش و ولولہ اور تحرک بخشا جس سے نہ صرف یہ کہ وہ تنہا مرکز و محور قرار پائے بلکہ قرآنی تعلیمات کے سانچے میں انھوں نے اپنے کردار و اعمال کو یوں ڈھال لیا کہ غیر مسلم افراد کو تیزی کے ساتھ ان کی عظمت کا اعتراف کرلیتے تھے، جہاں بھی ان کے قدم پہنچتے تھے وہاں کے باشندے دین اسلام کی طرف مائل ہو کر اس کے واقعی پابند ہو جایا کرتے تھے۔ اگر آج کی دنیا میں پھر تمام مسلمان انھیں اسلامی آداب کو اپنا وطیرہ بنالیں تو نہ صرف یہ کہ دم زدن میں دنیا کی تمام ایجادات واختراعات کے مالک بن جائیں گے بلکہ اسلامی تربیت کے ذریعہ پوری دنیا کو اسلام اور قرآن کی حقیقتوں سے روشناس کر کے خود ان کے روح رواں سمجھے جانے لگیں گے۔

آیئے! اس مقالہ کے اختتام پر ذرا اسلامی تعلیم و تربیت کے موضوع پر صدیوں قبل خواجہ نصیر الدین طوسی کی ایک کتاب کی چند فصلوں اور ان کے عنوانات پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے چلیں اور یہ دیکھیں مسلمان ماہرین تعلیم اس نکتے پر کس قدر توجہ دیتے تھے کہ علم و عمل اور اخلاق و حکمت کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے پائیں۔ خواجہ نے اپنی اس کتاب "آداب متعلمین" کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اور ان کے عنوانات یہ قرار دیئے ہیں:

۱۔ علم کی حقیقت و ماہیت اور اس کی فضیلت۔
۲۔ حصول علم کے لیے خلوص نیت۔
۳۔ شعبۂ علم، استاد اور ہم درس کے انتخاب میں باریک بینی۔

۴۔ ضروری جدوجہد۔
۵۔ علم کی جمع آوری اور اس کے حصول کی مدّت۔
۶۔ زمانۂ طالب علمی میں توکل بخدا۔
۷۔ زمانۂ طالب علمی۔
۸۔ بخل اور حسد سے پرہیز۔
۹۔ وقت کی بربادی سے اجتناب۔
۱۰۔ تقویٰ کا ہونا۔
۱۱۔ حافظہ کی تقویت اور مطالب کو سمجھنے کا طریقہ۔
۱۲۔ صحت و تندرستی، کسب معاش کا جاری رکھنا، دین کے احکام کی پابندی اور حصول علم کے دوران صبر و قناعت۔

خواجہ طوسی آٹھویں باب میں اپنے نظریات کو ان لفظوں میں بیان فرماتے ہیں کہ:
"استاد کی نیت اور اس کا جذبہ یہ ہونا چاہیے کہ شاگرد خود اس کے دور اور اسی کے عہد میں ایک مشہور و معروف عالم اور استاد بن جائے۔"

ہاں! سچ مچ یہی قرآنی تعلیمات ہیں، خداوند عزّوجل نے اپنی مقدس کتاب میں تزکیۂ نفس و حکمت و باریک اور تہہ تک پہنچنے اور سب کو بامقصد بنانے پر زور دیا ہے۔ حق و صداقت ہے میرا پروردگار:

«... ذلک الکتاب لاریب فیه، هدیً للمتقین...»
(البقرة/۲)

حاشیہ:

۱ مزید بین آیتیں:

الف:۔ یتلوا علیهم آیاتک و یعلمهم الکتاب والحکمة و یزکیهم
(البقرة/۱۲۹)

(ب) ــ كما أرسلنا فيكم رسولاً منكم يتلوا عليكم آياتنا ويزكيكم
(البقرة/١٥١)
(ج) ــ يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة
(آل عمران/١٦٤)

۲ـ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین مشہور حدیثیں ہیں۔

الف: ــ طلب العلم فريضة على كل مسلم
ب: ــ اطلبوا العلم من المهد إلى اللحد
ج: ــ اطلبوا العلم ولو بالصين

پہلی حدیث سے ہر مسلمان پر تحصیل علم کا وجوب۔ دوسری حدیث سے طالب علمی کے لیے سن و سال کی پابندی کا نہ ہونا اور تیسری روایت سے طلب علم کے لیے کسی جگہ کا معین نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

۳ـ علوم دین کے طلبہ میں مشہور درسی رسالہ۔
۴ـ علم نحو کی مشہور کتاب جس کی بہت سی شرحیں لکھی جا چکی ہیں۔
۵ـ الفیہ کا پورا نام ہے "الدرۃ الالفیہ فی علم العربیہ"
نحو میں ہزار شعروں پر مشتمل مشہور درسی کتاب۔



تقابلی مطالعہ

جناب شیخ محمود فانصوہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

خطبے کے درمیان گفتگو

روایات اہل بیت ؑ:

١ ـ روى الفقيه باسناده عن شعيب بن واقد عن الحسين بن زيد عن الصادق (ع) عن آبائه (ع) (في حديث المناهي) قال: نهى رسول الله (ص) عن الكلام يوم الجمعة والإمام يخطب فمن فعل ذلك فقد لغى ومن لغى فلاجمعة له.[1]

١ ـ ..... حسین بن زید نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اور امام نے اپنے آباء کرام ؑ سے روایت کی ہے (حدیث مناہی) ... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، جمعہ کے دن، امام کے خطبے کے دوران بات کرنے سے منع کیا ہے۔ جس نے یہ کام کیا (دوران خطبہ بات کی) اس نے مہمل بات کی اور جس نے مہمل بات کی اس کی نماز جمعہ ہی نہ ہوئی۔

٢ ـ وروى الفقيه مرسلاً، عن أميرالمؤمنين (ع): لا كلام والإمام يخطب، ولا التفات إلاّ كما يحل في الصلاة، وانما جعلت الجمعة ركعتين من أجل الخطبتين جعلتا مكان الركعتين الأخيرتين

فهما صلاة حتى ينزل الإمام (ع).[2] ونقله في الوسائل عن المقنع أيضاً[3] ونقله البحار عن المقنع أيضاً.

۲۔ . . . . امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا: امام خطبہ دے رہا ہو تو بات نہ نہ کرو، ادھر ادھر نہ دیکھو ۔ صرف اتنی ہی اجازت ہے ۔ جس قدر نماز میں جائز ہے ۔ جمعہ کی نماز دو رکعتیں دو خطبوں کی وجہ سے ہیں ہر خطبے کو ایک ایک رکعت کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ امام کے منبر سے اترنے تک دونوں خطبے نماز ہیں ۔

؂ الوسائل میں المقنع سے اور بحار میں بھی المقنع سے روایت ہے ۔

۳ ـ البحار عن كتاب العروس باسناده عن الاصبغ بن نباتة عن علي (ع) قال: إذا قال الرجل يوم الجمعة صه فلا صلاة له[4].
قلت: يظهر أن المراد بيوم الجمعة أثناء الخطبة.

۳۔ . . . . . . اصبغ بن نباتہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے: جمعہ کے دن اگر کوئی کہے "چپ" تو اس کی نماز نہ رہی ۔ میں سمجھتا ہوں "جمعہ کے دن" سے مراد ۔ درمیانِ خطبہ ۔ ہے ۔ یعنی اثنائِ خطبہ بات کرنے والا، دو حرف کیوں نہ بولے، نماز جمعہ کا کمال اس کو نصیب نہیں ہوتا ۔

روایات اہل سنت:

۱ ـ حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنا الليث عن عقيل عن ابن شهاب قال أخبرني سعيد بن المسيب أن أبا هريرة أخبره أن رسول الله (ص) قال: إذا قلت لصاحبك يوم الجمعة أنصت والإمام يخطب فقد لغوت[5]. ورواه مسلم باسناده عن الليث عن عقيل مثله ورواه بعدة أسانيد عن سعيد بن المسيب وعبدالله بن ابراهيم بن قارظ وكذا مثله عن الأعرج عن أبي هريرة[6]. ورواه النسائي عن قتيبة عن الليث عن عقيل عن الزهري عن سعيد مثله بتغيير[7] وأخرجه عبدالرزاق عن ابن جريج عن ابن شهاب بقيد السند. وفي اسناد آخر عن ابن شهاب عن عمر بن عبد العزيز عن ابراهيم بن عبدالله بن قارظ عن أبي هريرة

مثله^٨ وفي اسناد آخر أيضاً عن مالك عن ابن شهاب نحوه. وروى نحوه بأسانيد أخر فراجع^٩.

۱۔ . . . . ابو ہریرہ نے سعید بن میسب کو بتایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا ہے۔ جمعہ کے دن اگر تم اپنے ساتھی سے اثناء خطبۂ امام "چپ" کہتے ہو تو شور کرتے ہو مسلم نے اپنی سند سے لیث اور لیث نے عقیل سے اسی طرح روایت کی ہے۔ پھر اور سندوں سے سعید بن میسب۔ اور۔ عبداللہ بن ابراہیم . . . اسی طرح کی روایت ــــ ابوہریرہ سے نقل کی ہے۔ نسائی نے یہی روایت قتیبہ . . . سعید سے ذرا اختلاف کے ساتھ نقل کی ہے۔ عبدالرزاق نے ابن جریح عن ابن شہاب بہ قید سند روایت کی ہے۔ اور متعدد اسانید . . . ۸ و ۹ دیکھے۔

٢ ــ حدثنا القعني عن مالك عن ابن شهاب عن سعيد عن أبي هريرة أن رسول الله (ص) قال: إذا قلت انصت والإمام يخطب فقد لغوت^١٠. وروى نحوه النسائي باسناد آخر ابراهيم بن قارظ وسعيد معاً عن أبي هريرة^١١.

۲۔ . . . . ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: خطبۂ امام کے درمیان اگر تم نے "چپ رہو" کہہ دیا تو شور کیا۔
نسائی نے بھی یہ روایت متعدد اسناد سے نقل کی ہے۔

٣ ــ أخبرنا أبوعبد الله الحافظ، أنبأ أبوبكر أحمدبن الحسن الفقيه ببغداد، حدثنا أحمدبن ابراهيم بن ملحان، حدثنا يحيى ابن بكير، حدثنا الليث عن عقيل عن ابن شهاب، أنه قال أخبرني سعيد ابن المسيب أن أبا هريرة أخبره أن رسول الله (ص) قال: اذا قلت لصاحبك أنصت يوم الجمعة فقد لغوت^١٢ وفي عدم الكلام اخرج مجمع الزوائد أحاديث كثيرة لم نخرجها خشية الإسهاب، فمن شاء فليراجع مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٨٤ و١٨٥ و١٨٦ وكنزالعمال ج ٧ ص ٥٢٩ و٥٣٠.

۳ــ . . . . ابوہریرہ نے سعید بن میسب سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر جمعہ کے دن تم نے اپنے ساتھی سے کہا "چپ رہو" تو شور کیا۔
گفتگو نہ کرنے کے سلسلے میں مجمع الزوائد . . . . . اور کنز العمال . . . . ہم نے طول

سے بچنے کے لیے روایات نقل نہیں کیے۔

خطبوں اور نماز کے درمیان گفتگو کا جواز

روایات اہل بیتؑ:

١ ـ روى الفقيه باسناده عن العلا عن محمد بن مسلم عن أبي عبدالله (ع): قال: لابأس أن يتكلم الرجل إذا فرغ الإمام من الخطبة يوم الجمعة ما بينه وبين أن تقام الصلاة وان سمع القراءة أولم يسمع أجزأه[١٢].

١۔ .... محمد بن مسلم نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ۔ جمعہ کے دن امام کے دونوں خطبوں کے تمام ہونے کے بعد سے نماز تک درمیانی وقفے میں بات کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امام کی قرأت سنے یا نہ سنے نماز صحیح ہوگی۔

٢ ـ محمد بن يعقوب بن يحيى عن أحمد بن محمد عن الحسين بن سعيد عن صفوان بن يحيى عن العلاء عن محمد بن مسلم عن أبي عبدالله (ع) قال: إذا خطب الإمام يوم الجمعة فلا ينبغي لأحد أن يتكلم حتى يفرغ الإمام من خطبته فإذا فرغ الإمام من الخطبتين تكلم ما بينه وبين أن يقام للصلاة فإنْ سمع القراءة أولم يسمع اجزأه[١٣]

٢۔ .... محمد بن مسلم نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ حضرتؑ نے فرمایا: جمعہ کے دن، جس وقت امام خطبہ دے رہا ہو، کسی کو بات نہ کرنا چاہیے یہاں تک کہ امام خطبہ تمام کرے، جب دونوں خطبے امام تمام کرے تو اس وقت سے نماز کے لیے کھڑے ہونے تک بات کر سکتے ہیں، تلاوت امام کی آواز آئے یا نہ آئے، کافی ہے۔

۳ ـ البحار عن جعفر بن محمد(ع) أنه قال: لا كلام حتى يفرغ الإمام من الخطبة، فإذا فرغ منها فتكلم مابينك وبين افتتاح الصلاة إنْ شئت[۱۴].

وهذه الأحاديث تفيد في الباب المتقدم.

۳۔ . . . . امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: جب تک امام خطبہ مکمل نہ کرلے اس وقت تک بات نہیں ہوسکتی، امام کے تمام خطبہ وآغاز نماز تک درمیانی وقفہ میں اگر چاہو تو بات کرلو۔

• یہ حدیثیں گذشتہ بات میں بھی مفید ہیں۔

روایات اہل سنت:

۱ ـ أخبرنا أبوزكريا بن ابي اسحاق، حدثنا أبوالعباس الأصم، أنبأ الربيع، أنبأ الشافعي، حدثنا ابن ابي فديك عن ابن ابي ذئب عن ابن شهاب، قال حدثني ثعلبة بن ابي مالك: أن قعود الإمام يقطع السبحة، وان كلامه يقطع الكلام، وانهم كانوا يتحدثون يوم الجمعة وعمر جالس على المنبر، فإذا سكت المؤذن قام عمر فلم يتكلم أحد حتى يقضي الخطبتين كلتيهما، فإذا قامت الصلاة ونزل عمر تكلموا[۱۵].

۱۔ . . . . ثعلبہ ابن ابی مالک نے بیان کیا: امام کا بیٹھنا تسبیح اور اس کی تقریر، گفتگو منقطع کرتی ہے۔ لوگ جمعہ کے دن باتیں کررہے تھے اور عمر بالائے منبر بیٹھے تھے۔ مؤذن نے اذان ختم کی اور عمر کھڑے ہوئے، لوگوں نے باتیں بند کردیں تا اینکہ انھوں نے دونوں خطبے مکمل کیے، جب حضرت عمر منبر سے اترے اور نمازی کھڑے ہوئے تو باتیں کرنے لگے۔

۲ ـ أخبرنا أبوالحسين بن الفضل القطان ببغداد، أنبأ عبدالله بن جعفر، حدثنا يعقوب بن سفيان، حدثنا ابواليمان، أنبأ شعيب عن الزهري، قال أخبرني ثعلبة بن أبي مالك القرظي وقد أدرك عمر بن الخطاب رضي الله عنه قال: كنا نتحدث حتى يجلس عمر بن الخطاب رضي الله عنه المنبر حتى يقضي المؤذن تأذينه ويتكلم

عمر، فإذا تكلّم عمر انقطع حديثنا فصمتنا فلم يتكلم أحد منّا حتى يقضي الإمام خطبته[16].

۲۔ . . . . ثعلبہ بن ابی مالک قرظی نے آنحضرتؐ کا دور پایا تھا۔ انھوں نے کہا: حضرت عمر کے منبر پر بیٹھنے تک ہم گفتگو کرتے تھے، مؤذن اذان تمام کرتا اور عمر کلام کا آغاز کرتے ان کی تقریر ہمارا سلسلۂ گفتگو منقطع کر دیتا تھا۔ ہم چپ ہو جاتے اور ہم میں سے کوئی شخص بات نہ کرتا تھا تا ایں کہ امام خطبہ تمام کرتے۔

٣ ــ أخبرنا أبوسعيد محمدبن الفضل، حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا العباس بن الوليد بن يزيد، أخبرني أبي، حدثنا ابن جابر، حدثني عطاء الخراساني عن مولى لامرأته أم عثمان، قال: سمعت علياً رضي الله عنه على المنبريقول... (في حديث) واذا جلس فيه مجلساً فنأى وانصت ولم يلغ كان له كفل من الأجر... الى أن يقول في آخر ذلك قد سمعت رسول الله (ص) وهويقول ذلك[17].

۳۔ . . . . . عطاء خراسانی اپنی زوجہ ام عثمان کے آزاد کردہ غلام سے روایت کرتے ہیں: حضرت علیؑ منبر پر فرما رہے تھے (حدیث) . . . اور جب وہ کسی مجلس میں خاموش و ساکت بیٹھتا اور شور نہیں کرتا تو وہ اجر عظیم کا مستحق ہو جاتا ہے... (آخر میں کہا) . . . رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے سنا، آنحضرتؐ یہی فرما رہے تھے۔

٤ ــ أخبرنا أبوزكريا بن أبي اسحاق المزكي وغيره، قالوا حدثنا ابوالعباس محمد بن يعقوب، أنبأنا الربيع بن سليمان، الشافعي، أنبأنا مالك (ح وأخبرنا) أبوأحمد المهرجاني، أنبأنا أبوبكر ابن جعفر المزكي، حدثنا محمدبن ابراهيم العبدي، أنبأنا ابن بكير، حدثنا مالك عن ابي النضر مولى عمربن عبدالله عن مالك بن ابي عامر، أن عثمان بن عفان رضي الله عنه كان يقول في خطبته، قلّما يدع ذلك إذا خطب: إذا قام الإمام يخطب يوم الجمعة فاستمعوا وأنصتوا فإنّ للمنصت الذي لايسمع في الحظ مثل ماللسامع المنصت، فإذا قامت الصلاة... الحديث)[18].

۴۔ .... مالک ابن ابی عامر سے روایت ہے کہ عثمان ابن عفان، اپنے خطبے میں کہتے اور بہت کم یہ جملہ چھوڑتے تھے: جب امام جمعہ کا خطبہ دینے کھڑا ہو تو سنو اور چپ رہو، کیونکہ خاموش بیٹھنے والا جسے خطبہ نہ سنائی دے وہی اجر پائے گا جو خاموشی سے سننے والے کو ملے گا۔ پھر جب نمازی کھڑے ہوں......

نماز میں قرأت

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ محمد بن يعقوب عن علي بن ابراهيم عن أبيه عن حماد عن حريز عن محمد بن مسلم قال: سألته عن الجمعة، فقال: بأذان وإقامة... الى أن قال: ثم ينزل فيصلي بالناس فيقرأ بهم في الركعة الأولى بالجمعة وفي الثانية بالمنافقين[19].

۱۔ .... محمد بن مسلم نے امام سے جمعہ کے بارے میں پوچھا، فرمایا: ایک اذان و اقامت..... (یہاں تک کہ) حضرتؑ منبر سے اترتے لوگوں کو نماز پڑھاتے اور پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری رکعت میں سورۂ منافقین پڑھتے تھے۔

۲ ـ في المجالس والاخبار عن الحسين بن عبيد الله عن هارون بن موسى عن الحكيمي عن سفيان بن زياد عن عباد بن صهيب عن جعفر بن محمد عن عبدالله بن أبي رافع: أن أمير المؤمنين (ع) كان يقرأ في الجمعة في الأولى الجمعة وفي الثانية المنافقين[20].

۲۔ .... عبداللہ ابن ابی رافع کہتے ہیں: امیرالمومنین علیہ السلام جمعہ کی پہلی رکعت میں سورۂ جمعہ اور دوسری میں المنافقون پڑھتے تھے۔

۳ ـ محمد بن يعقوب عن محمد بن الحسين واحمد بن محمد جميعاً عن عثمان بن عيسى عن سماعة (في حديث) قال: قال أبوعبد الله (ع): يخطب يعني إمام الجمعة وهو قائم... الى أن قال:

فاذا فرغ من هذا أقام المؤذن فصلى بالناس ركعتين يقرأ في الأولى بسورة الجمعة وفي الثانية بسورة المنافقين[21].

والحديث الثالث والأول يفيدان في أبواب متعددة. وفي الباب روايات كثيرة فراجع[22].

۳- ...... سماعہ (ایک حدیث کے ذیل میں) - ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: امام جمعہ کھڑے ہوکر خطبہ دے ..... جب اس سے فارغ ہو۔ تو مؤذن اقامت کہے اور امام دو رکعت نماز پڑھائے پہلی رکعت میں سورۂ الجمعہ اور دوسری میں سورۂ المنافقین پڑھے۔

تیسری اور پہلی حدیث متعدد ابواب میں فائدہ مند ہیں۔ ان روایات کے علاوہ بہت سی روایتیں اور بھی ہیں۔ دیکھئے مصادر

روایات اہل سنت:

۱ ــ حدثنا ابوبكر بن ابي شيبة، حدثنا عبده بن سليمان عن سفيان عن مخول بن راشد عن مسلم البطين عن سعيد بن جبير عن ابن عباس (في حديث)... ان النبي (ص) كان يقرأ في صلاة الجمعة سورة الجمعة والمنافقين[23].

وروى البيهقي باسناده عن مخول عن مسلم نحوه[24].

وروى النسائي باسناده مخول عن مسلم نحوه[25]. ورواه عبد الرزاق عن الثوري عن مخول نحوه بتغيير.

۱- ...... (ابن عباس کی ایک روایت کے ذیل میں ہے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز جمعہ میں سورۂ الجمعہ اور المنافقین پڑھا کرتے تھے۔

بیہقی نے اپنے اسناد سے مخول، انہوں نے مسلم سے ایسی ہی روایت کی ہے۔

نسائی نے اپنے سلسلہ سند میں "مخول عن مسلم" سے اسی طرح کی روایت کی ہے۔

اور عبدالرزاق نے ثوری سے انھوں نے مخول سے ذرا تبدیلی کے ساتھ روایت کی ہے۔

٢ ــ حدثنا عبدالله بن مسلمة بن قعنب، حدثنا سليمان وهو ابن بلال عن جعفر عن أبيه عن ابن أبي رافع، قال: استخلف مروان أبا هريرة على المدينة، وخرج الى مكة، فصلى لنا ابوهريرة الجمعة، فقرأ بعد سورة الجمعة في آخر ركعة: إذا جاءك المنافقون،قال: فأدركت أبا هريرة حين انصرف، فقلت له أنك قرأت بسورتين كان علي بن ابي طالب (ع) يقرأبهما بالكوفة، فقال أبو هريرة اني سمعت رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم يقرأبهما يوم الجمعة[٢٦].

ورواه البيهقي باسنادين بتغيير في اللفظ، وكذا في لفظ السند عن جعفر بن محمد عن ابيه[٢٧]. وهذا الحديث ذكره في البحار نقلاً عن أمالي الطوسي عن الحسين بن عبيد الله عن التلعكبري عن الحكيمي عن سفيان بن زياد عن عباد بن صهيب عن جعفر بن محمد (ع) مثله[٢٨]. ورواه أبو داوود بنفس الاسناد[٢٩]. ورواه في المنتقى[٣٠]. وفي قراءة النبي (ص) لسورة الجمعة والمنافقين في صلاة الجمعة أحاديث عديدة فراجع[٣١].

۲۔ .... امام جعفر صادقؑ نے اپنے والد انھوں نے ابن ابی رافع سے روایت کی ہے: مروان نے مکے جاتے ہوئے ابو ہریرہ کو مدینے میں اپنی جگہ نائب مقرر کردیا، ابو ہریرہ نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور سورۂ جمعہ کے بعد دوسری رکعت میں اذا جاءك المنافقون پڑھا۔ جب نماز پڑھا کر پلٹے تو میں ان سے ملا اور کہا آپ نے تو وہ سورتیں پڑھیں جو حضرت علیؑ کوفہ میں پڑھا کرتے ہیں۔ ابو ہریرہ نے کہا: جمعہ کے دن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہی دو سورتیں پڑھتے سنیں۔

یہ حدیث بیہقی نے دو سندوں اور کچھ لفظی اختلاف سے اور دوسری سند میں بالفاظ "عن جعفر بن محمد عن ابیہ" کے ساتھ نقل کی ہے ....

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز جمعہ میں سورۂ جمعہ و منافقین پڑھا کرتے تھے اس سلسلے میں متعدد احادیث ہیں۔

تیسری اذان

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمد بن الحسن باسناده عن محمد بن احمد بن يحيى عن أبي جعفر عن أبيه عن حفص بن غياث عن جعفر بن محمد عن ابيه عليهم السلام، قال: الأذان الثالث يوم الجمعة بدعة[۳۲].

قال المحقق في المعتبر «الأذان الثاني بدعة وبعض أصحابنا يسميه الثالث لأن النبي (ص) شرع للصلاة أذاناً وإقامة فالزيادة ثالث»[۳۳].

ورواه في الوسائل عن محمد بن يحيى عن محمد بن الحسين عن محمد بن يحيى الخزاز عن حفص بن غياث عن ابي جعفر (ع) عن أبيه (ع) مثله[۳۴].

۱ــ . . . . امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے : جمعہ کے دن تیسری اذان بدعت ہے۔

ــ محقق (نجم الدین حلیؒ) نے "المعتبر" میں لکھا ہے : دوسری اذان بدعت ہے، اسی کو ہمارے کچھ علما نے تیسری اذان کہا ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز کے لیے ایک اذان واقامت کی تشریع فرمائی ہے لہذا زائد اذان تیسری اذان ہوئی

وسائل میں بھی روایت بسند . . . . ہے۔

اہل سنت کی روایات :

۱ ــ حدثنا أبونعيم، قال حدثنا عبدالعزيزبن أبي سلمة الماجشون عن الزهري عن السائب بن يزيد: أن الذي زاد التأذين الثالث يوم الجمعة عثمان بن عفان رضي الله عنه حين كثر أهل المدينة، ولم يكن للنبي (ص) غير مؤذن واحد، وكان التأذين يوم الجمعة حين يجلس الإمام يعني على المنبر[۳۵].

۱ــ . . . . . . زہری نے سائب بن یزید سے روایت کی ہے : جمعہ کے دن تیسری

اذان حضرت عثمان بن عفان نے بڑھائی ۔ اہل مدینہ بہت ہو گئے تھے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مؤذن ایک ہی تھا ۔ جمعہ کی اذان منبر پر امام کے بیٹھنے کے وقت ہوتی تھی۔

۲ ـ حدثنا محمد بن مقاتل، قال أخبرنا عبد الله، قال أخبرنا يونس عن الزهري، قال سمعت السائب بن يزيد يقول: أن الأذان يوم الجمعة كان أوله حين يجلس الإمام يوم الجمعة على المنبر في عهد رسول الله (ص) وأبي بكر وعمر (رض) فلما كان في خلافة عثمان رضي الله عنه وكثروا أمر عثمان يوم الجمعة بالأذان الثالث فأذن به على الزوراء فثبت الأمر على ذلك[۳۶]. وأخرج عبد الرزاق نحوه بسندين الأول عن ابن المسيب والثاني عن عمرو بن دينار وأخرج الترمذي عن السائب بن يزيد نحوه[۳۷].

۲۔ . . . . زہری نے سائب بن یزید سے سنا: جمعہ کی اذان کا آغاز امام کے منبر پر بیٹھنے کے وقت ہوتا تھا، زمانہ رسول اللہ اور عہد ابو بکر و عمر تک یہی دستور رہا، خلافت حضرت عثمان میں آبادی بڑھی تو انھوں نے جمعہ کی تیسری اذان کا حکم دیا۔ یہ اذان زوراء میں دی گئی اس کے بعد یہ رسم جاری ہو گئی۔

عبد الرزاق نے حدیث کی تخریج دو سندوں سے کی ہے . . . . .

واجبات خطبہ

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ محمد بن يعقوب عن محمد بن يحيى عن أحمد بن محمد عن الحسين بن سعيد عن النضر بن سويد عن يحيى الحلبي عن يزيد بن معاوية عن محمد بن مسلم عن أبي جعفر(ع) في خطبة يوم الجمعة وذكر خطبة مشتملة على حمد الله والثناء عليه والوصية بتقوى الله والوعظ (الى أن قال) واقرأ سورة من القرآن وآدع ربك وصلِّ على النبي (ص) وآدع للمؤمنين والمؤمنات ثم تجلس قدر مايمكن هنيئة ثم تقوم وتقول وذكر الخطبة الثانية وهي مشتملة على

حمد الله والثناء والوصية بتقوى الله والصلاة على محمد وآله والأمر بتسمية الأئمة عليهم السلام... الحديث[٣٨].

۱۔ .... امام محمد باقر علیہ السلام نے خطبۂ جمعہ کے بارے میں گفتگو فرماتے ہوئے کہا کہ خطبہ حمد و ثنا پر مشتمل اور وعظ و تقویٰ کے بارے میں ہونا چاہیے (یہاں تک کہ) امام نے فرمایا: قرآن کی ایک سورۃ پڑھو اور دعا کرو۔ پھر رسول اللہؐ پر درود اور مومنین کے لیے دعا۔ اس کے بعد کچھ دیر بیٹھو۔ پھر کھڑے ہو اور کہو۔ دوسرا خطبہ لکھا ہے۔ جو حمد و ثنا اور وصیت تقویٰ اور محمدؐ و آل محمدؐ پر درود اور ائمہ علیہم السلام کے نام لینے کی تاکید پر مشتمل ہے .... تا آخر حدیث۔

٢ ـ محمد بن يعقوب عن محمد بن الحسين وأحمد بن محمد جميعاً عن عثمان بن عيسى عن سماعة (في حديث) قال: قال أبوعبد الله (ع): يخطب ـ يعني إمام الجمعة وهو قائم يحمد الله ويثني عليه ثم يوصي بتقوى الله ثم يقرأ سورة من القرآن صغيرة (قصيرة) ثم يجلس ثم يقوم فيحمد الله ويثني عليه ويصلي على محمد (ص) وعلى أئمة المسلمين ويستغفر للمؤمنين والمؤمنات... الخ الحديث[٣٩]. وهذا الحديث يفيد في أبواب الخطبة.

وراجع ماذكر في الخطب في هذا الباب[٤٠]. فقد تقدّم مايشيراليه.

۲۔ .... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: خطبہ دے ـ یعنی امام جمعہ کھڑے ہو کر جس میں حمد و ثنا اور تقویٰ کی وصیت کے بعد قرآن کی ایک مختصر سورت پڑھے، پھر بیٹھے۔ اس کے بعد کھڑے ہو کر حمد و ثنا کے بعد آنحضرتؐ اور ائمہ مسلمین پر درود بھیجے، مؤمنین و مؤمنات کے لیے دعا مغفرت کرے ... تا آخر حدیث۔

— یہ حدیث ابواب خطبہ میں بھی کارآمد ہے۔

— باب خطب میں کچھ اشارات گذر چکے۔

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا علي بن أحمد بن عبدان، أنبأنا أحمدبن عبيد الصفار، حدثنا اسماعيل بن اسحاق القاضي، حدثنا ابن أبي اويس والفروي، قالا حدثنا سليمان بن بلال بن جعفر.. يعني ابن محمد ــ عن أبيه عن جابربن عبد الله انه سمعه يقول: خطب رسول الله (ص) يوم الجمعة يحمد الله ويثني عليه... الخ الحديث[41]. ورواه مسلم باسناده عن جعفربن محمد (ع) ج ٣ ص ١١.

١۔ .... جابر بن عبد اللہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جمعہ کے دن خطبہ دیا۔ حمد و ثنا بجا لائے .... تا آخر حدیث اور مسلم کے اسناد جعفر بن محمد تک الگ ہیں دیکھیے ج ۳ ص ۱۱۔

٢ ــ أخبرنا أبوالحسن علي بن أحمد بن عبدان، أنبأنا أحمدبن عبيد، حدثنا زياد بن الخليل، حدثنا مسدد، حدثنا أبو الأحوص [ح وأنبأ] محمد بن عبدالله الحافظ، أنبأنا أبوبكربن اسحاق، أنبأنا اسماعيل بن قتيبة، حدثنا يحيى بن يحيى، حدثنا أبو الأحوص عن سماك بن حرب عن جابربن سمرة، قال: كانت للنبي (ص) خطبتان يجلس بينهما ويقرأ القرآن ويذكر الناس[42].

قلت: وفي قراءة النبي (ص) للقرآن في الخطبة روايات عديدة فراجع[43].

۲۔ .... جابر بن سمرہ نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دو خطبے دیتے اور ان کے درمیان بیٹھتے تھے، قرآن کی تلاوت فرماتے اور لوگوں کو نصیحت کرتے تھے۔

۔ خطبے میں تلاوت قرآن کے سلسلے میں آنحضرتؐ کی سنت پر متعدد روایتیں ہیں۔

٣ ــ أخبرنا أبوعلي الروذ باري، أنبأنا محمد بن بكر، حدثنا أبو داوود، حدثنا مسدد، حدثنابشربن المفضل، حدثنا عبد الرحمن يعني ابن اسحاق عن عبد الرحمن بن معاوية، حدثنا ابن ابي ذباب عن سهل بن سعد، قالزما رأيت رسول الله (ص) شاهراً يديه قط يدعو

على منبره ولا على غيره ولكن رأيته يقول هكذا وأشار بالسبابة وعقد الوسطى بالإبهام[44]. قال البيهقي: والقصد من الحديثين (هذا الحديث مع غيره ذكر من قبل) اثبات الدعاء في الخطبة[45]. وأخرجه أبوداوود كما في متن السند وأخرج حديثاً آخر نحوه عن عمارة بن رؤيبة[46].

وراجع ماذكر من الخطب وماشابه[47].

۳۔ .... سہل بن سعد نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب بھی دعا کرتے دیکھا، ہاتھ اٹھائے ہوئے منبر پر ہوں یا منبر پر نہ ہوں حضرت یوں کرتے تھے۔ کلمہ کی انگلی سے اشارہ اور انگوٹھے سے درمیانی انگلی بند کرکے دکھائی۔ بیہقی نے کہا: دونوں حدیثوں (ایک حدیث اس سے پہلے لکھی ہے) کا مقصد ہے خطبے میں دعا کا اثبات ۔ ابوداؤد.......

نیز خطبوں جیسے مسائل میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسے بھی دیکھیے۔

ایک رکعت مل جائے تو نماز جمعہ ورنہ نماز ظہر پڑھنا چاہیے

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمد بن علي بن الحسين باسناده عن الفضل بن عبدالملك عن أبي عبد الله (ع) قال: إذا أدرك الرجل ركعة، فقد أدرك الجمعة، وإنْ فاتته، فليصلِّ أربعاً[48]. وروى مثله الكافي باسناد آخر عن ابي العباس والفضل جميعاً عن أبي عبدالله (ع).

۱۔ .... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: جس نے ایک رکعت پائی اس نے جمعہ پالیا اور اگر وہ رکعت بھی نہ ملی تو چار رکعت (ظہر) پڑھے۔

- اسی طرح کافی میں .....

۲ ــ محمد بن يعقوب عن علي بن ابراهيم عن أبيه عن ابن ابي عمير عن حماد بن عثمان عن الحلبي، قال: سألت أبا عبدالله (ع) عمّن لم يدرك الخطبة يوم الجمعة: قال: يصلّي ركعتين، فإنْ فاتته الصلاة فلم يدركها، فليصلِّ أربعاً، وقال: إذا أدركت الإمام قبل أن يركع الركعة الأخيرة فقد أدركت الصلاة، وإنْ أنت أدركته بعد ماركع فهي الظهر[49].

ونحوه في البحار عن كتاب العروس وفي آخره ــ إذا أدركت بعد مارفع رأسه فهي أربع..... الخ[50].

۲- .... حلبی نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس شخص کے بارے میں پوچھا جس سے دونوں خطبے چھوٹ گئے۔ حضرت نے فرمایا: وہ دو رکعت نماز جمعہ پڑھے، لیکن اگر اس سے نماز جمعہ ہی چھوٹ گئی تو پھر چار رکعت (ظہر) پڑھے۔ امام نے فرمایا: اگر آخری رکعت کے رکوع میں بھی امام کے ساتھ شریک ہو گیا تو پوری نماز جمعہ مل گئی، لیکن امام رکوع (رکعت دوم) تمام کر چکے اور پھر کوئی شخص آئے تو ظہر کی نماز پڑھے۔

• - بحار الانوار میں کتاب العروس سے یہی حدیث نقل ہے لیکن آخری عبارت یہ ہے: اگر یہ شخص اس وقت آیا کہ امام رکوع سے سر اٹھا چکا (سیدھا کھڑا ہو چکا) تو چار رکعت ......

۳ ــ الجعفريات أخبرنا محمد، حدثني موسى، حدثنا أبي عن أبيه عن جده جعفر بن محمد (ع) عن أبيه (ع) أن علياً (ع) كان يقول من أدرك من الجمعة ركعة فقد أدركها فليضف اليها أخرى[51].

وفي الباب أحاديث عديدة فراجع[52].

۳- .... امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جس نے جمعہ کی ایک رکعت پالی اس نے پوری نماز پالی، اسے دوسری (رکعت) مزید پڑھنا چاہیے۔

اس سلسلے میں اور حدیثیں بھی ہیں۔

روایات اہل سنت :

ماورد من طريق أهل السنة:

١ ــ أخبرنا ابوبكر بن الحارث الفقيه، أنبأنا علي بن عمر الحافظ، حدثنا يوسف بن يعقوب بن اسحاق البهلول، حدثنا جدي، حدثنا يحيى بن المتوكل عن صالح بن ابي الأخضر عن الزهري عن ابي سلمة عن أبي هريرة قال: قال رسول الله (ص): من أدرك من الجمعة ركعة، فليصل اليها أخرى فإنْ أدركهم جلوساً صلّى أربعاً[٥٣].

قال البيهقي وروى ذلك من أوجه أخرعن الزهري قد ذكرناها في الخلاف[٥٤].

وفي النسائي عن قتيبة ومحمد بن منصور ــ واللفظ له ــ عن سفيان عن الزهري ــ بقية السند والحديث بنقصان الآخر وزيادة فقد أدرك [٥٥]. ونحو هذا في

المستدرك باسناده[٥٦] وكذا في الترمذي[٥٧] وكذا في سنن ابن ماجة[٥٨].

ا۔ . . . . ابو ہریرہ کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: جسے جمعہ کی ایک رکعت مل جائے اسے دوسری رکعت (فرادیٰ پڑھ کر پہلی سے) ملا دینا چاہیے لیکن اگر لوگ تشہد میں ہوں تو یہ شخص چار رکعت (ظہر) پڑھے۔

۔ بیہقی نے دوسرے طریقوں سے بھی روایت کی ہے . . . .

۔ نسائی میں، قتیبہ اور محمد بن منصور سے . . . .

٢ ــ أخبرنا أبوعبد الله الحافظ، حدثنا محمدبن صالح بن هانيء، حدثنا الفضل بن محمد الشعراني، حدثنا سعيد بن ابي مريم، حدثنا يحيى بن ايوب، حدثنا أُسامة بن زيد الليثي عن ابن شهاب عن ابي سلمة بن عبد الرحمن عن ابي هريرة أن رسول الله (ص) قال: مَنْ ادرك من الجمعة ركعة، فليصل اليها أخرى[٥٩].

وأخرج عبد الرزاق بمعناه عن ابن عمر بعدة أسانيد وعن أبي هريرة وغيرهما[60] وأخرج أبوداود عن القعنبي عن مالك عن ابن شهاب عن أبي هريرة ونحوه[61].

۲۔ .... سلمہ بن عبدالرحمٰن نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے انہوں نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے جمعہ کی ایک رکعت پالی وہ دوسری رکعت (فرادیٰ پڑھ کر) ملا دے۔

۔ عبدالرزاق نے متعدد سندوں سے اسی مفہوم کی بروایت عبداللہ بن عمر...

لوگوں کے سروں پر سے گذرنا

روایاتِ اہل بیت:

۱ ـ في البحار عن دعائم الإسلام عن جعفر بن محمد (ع) أنه قال: لأن أجلس عن الجمعة أحب اليَّ من أن أقعد حتى إذا جلس الإمام جئت أتخطى رقاب الناس[62].

۱۔ .... امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: نماز جمعہ نہ جانا اس سے بہتر ہے کہ اطمینان سے گھر میں آدمی بیٹھا رہے اور جیسے ہی امام منبر پر بیٹھے فوراً لوگوں کے سروں پر سے ہوتا ہوا صف میں جا پہنچے۔

۲ ـ قرب الاسناد عن السندي بن محمد عن أبي البختري عن جعفر عن أبيه؛ أن علياً كان يقول: لابأس يتخطى الرجل يوم الجمعة الى مجلسه حيث كان، فإذا خرج الإمام فلا يتخطان أحد رقاب الناس وليجلس حيث يتيسر... الخ الحديث[63].

۲۔ .... ابوالبختری نے امام جعفر صادقؑ سے انہوں نے اپنے والدؑ سے روایت کی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: جمعہ کے دن اپنی جگہ تک پہنچنے کے لیے لوگوں کو (چیرتے پھاڑتے) کچلتے گذرنے میں کوئی حرج نہیں لیکن جب امام نکل آئے تو

پھر لوگوں کے سروں پر سے نہ گذرنا چاہیے، جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھ جانا چاہیے ...

روایاتِ اہل سنت :

١ ـ حدثنا ابوبكر بن فورك ، أنبأنا عبدالله بن جعفر، حدثنا يونس بن حبيب، حدثنا أبوداود، حدثنا شريك عن سماك بن حرب عن جابر بن سمرة قال: كنا إذا أتينا رسول الله (ص) جلسنا حيث ننتهي[٦٤].

١۔ ...... جابر بن سمرہ نے کہا: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے آتے تھے تو ہم جہاں تک پہنچتے تھے وہیں بیٹھ جاتے تھے ۔

٢ ـ أخبرنا أبوعبد الله محمد بن عبدالله الحافظ، حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا بحر بن نصر بن سابق الخولاني، حدثنا عبدالله بن وهب، قال: سمعت معاوية بن صالح عن أبي الزاهرية عن عبدالله بن بشر قال: كنت جالساً الى جانبه يوم الجمعة، قال فجاء رجل يتخطى رقاب الناس، فقال له رسول الله (ص) أجلس فقد آذيت وآنيت... الخ الحديث[٦٥] ورواه النسائي عن وهب بن بيان عن ابن وهب مثله[٦٦] وأخرجه أبوداود عن هارون بن معروف عن بشر عن معاوية عن أبي الزاهرية هكذا قال: كنا مع عبدالله بن بشر فساق الحديث نحوه. ولعل الإختلاف من تحريف النساخ أوالنقل[٦٧] وأخرجه ابن ماجة في السنن عن الحسن عن جابر[٦٨].

٢۔ .... عبد اللہ بن بسر نے کہا جمعہ کے دن، میں حضرتؐ کے پہلو میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص لوگوں کو روندتا آگے بڑھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ بیٹھ جاؤ، لوگوں کو تکلیف دے رہے ہو ...... نسائی نے ..... اور ابن ماجہ نے .....

٣ ـ حدثنا ابو كريب، حدثنا رشدين بن سعد عن زبان بن فائد عن سهل بن معاذ بن أنس عن أبيه قال: قال رسول الله (ص)

«من تخطى رقاب الناس يوم الجمعة اتخذ جسراً الى جهنم»[69].

وروى مجمع الزوائد أحاديث في ذم تخطي الرقاب يوم الجمعة[70]

وكذا أخرج عبدالرزاق أحاديث متعددة في ذم التخطي[71] ●

۳- . . . . انس نے اپنے والد سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جمعہ کے دن جو شخص لوگوں کو نانگھتا پھلانگتا جاتا ہے وہ جہنم تک جانے کے لیے پل بناتا ہے . . . . .

۔ مجمع الزوائد میں جمعہ پر لوگوں پر نانگھتے پھلانگتے گذرنے کی مذمت میں متعدد حدیثیں ہیں۔

۔ عبدالرزاق نے بھی کئی روایتیں اس بات کی مذمت میں نقل کی ہیں ۔

---

١ ــ الوسائل ج ٥ ص ٣٠ وبهامشه عن الفقيه ج ٢ ص ١٦٩. والبحارج ٨٩ ص ١٨٣ ونقله في ص ١٨٦ عن مجالس الصدوق وص ١٧٤ عن المقنع ومستدرك الوسائل عن كتاب العروس ج ١ ص ٤٠٩.

٢ ــ الوسائل ج ٥ ص ٢٩ والفقيه ج ١ ص ٢٦٩ ونقل أوله بزيادة يوم الجمعة في المستدرك ج ١ ص ٤١٠ عن كتاب فقه الرضا.

٣ ــ الوسائل ج ٥ ص ٢٩ في الهامش عن المقنع ص ١٢، والبحارج ٨٩ ص ١٧٦، وفي هامشه عن المقنع ص ٤٥، ٤٦، وباختلاف يسير نقله ص ١٩٣عن فقه الرضا.

٤ ــ البحارج ٨٩ ص ١٨٣.

٥، ٦، ٧ ــ البخاري ج ١ ص ١٠٩ ومسلم ج ٣ ص ٤ و ٥ والنسائي ج ٣ ص ١٠٣ وعبدالرزاق ج ٣ ص ٢٢٢ ح ٥٤١٤ والترمذي نحوه ج ٢ ص ٣٨٧ ورواه ابن ماجه بسنده عن الزهري مثله ج ١ ص ٣٥٢ وأخرجه في المشكاة ص ٢٢ أوقال متفق عليه والدار قطني ج ١ ص ٣٦٤ والموطأ المطبوع مع تنوير الحوالك ج ١ ص ١٢٦.

٨، ٩ ــ عبدالرزاق ج ٣ ص ٢٢٣ ح ٥٤١٥ و٥٤١٦ و٥٤١٧ و ٥٤١٨ و٥٤١٩.

١٠ ــ أبوداود ج ١ ص ٢٩٠ والنسائي ج ٣ ص ١٠٤ والمنتقى نقله عن الجماعة إلا ابن ماجة ج ٢ ص ٢٩ وروى أحاديث أخرى في ذم

الكلام.

١١ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢١٨. وذكر في الباب أحاديث كثيرة بأسانيد متعددة فراجع ص ٢١٨ و٢١٩ و ٢٢٠.

١٢ ــ الوسائل ج ٥ ص ٢٩ والفقيه ج ١ ص ٢٦٩.

١٣ ــ الوسائل ج ٥ ص ٢٩ والتهذيب ج ٣ ص ٢٠ بتغيير بسيط حيث قال (وبين أن تقام الصلاة) وقال (فاذا فرغ من خطبته). وأسنده باسنادين والكافي ج ٣ ص ٤٢١ ولكن بدل (يقام للصلاة) قوله (تقام الصلاة) ويظهر أن هذا هو الصحيح ومافي الوسائل خطأ.

١٤ ــ البحار نقلاً عن الدعائم ج ٨٩ ص ٢٥٦ وفي هامشه دعائم الإسلام ج ١ ص ١٨٢ ومستدرك الوسائل عن دعائم الإسلام كما يظهر ج ١ ص ٤٠٩.

١٥ ــ البيهقي ج ٣ ص ١٩٣.

١٦ ــ البيهقي ج ٣ ص ١٩٩.

١٧ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٢٠ ونقله عن أبي داوود في السنن وقد أخرجه أبو داوود بتمامه ج ١ ص ٢٧٦ وتقدّمت أحاديث فيها فضل الإنصات فراجع.

١٨ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٢٠ والموطأ المطبوع مع تنوير الحوالك.

١٩ ــ الوسائل ج ٥ ص ١٥ و ٣٩ والكافي ج ٣ ص ٤١٤.

٢٠ ــ الوسائل ج ٤ ص ٨١٦ وفي الباب روايات عديدة راجع ص ٨١٥ و٨١٦ و٨١٧ و٨١٨.

٢١ ــ الوسائل ج ٥ ص ٣٨ والكافي ج ٣ ص ٤٢١.

٢٢ ــ التهذيب ج ٣ ص ٦ ح ١٣ و ١٤ و ١٥ و ١٦ و ص ٧ ح ١٧ و ١٨ ويفيد ذلك ج ٣ ص ٧ ح ١٩ و ٢٠ و ٢١ وكذا الاستبصار ج ١ ص ٤١٣ ح ١٥٨١ و ١٥٨٢ و ١٥٨٣ و ١٥٨٤ و ١٥٨٥ و ١٥٨٨ ويفيد ذلك أيضاً ح ١٥٨٦ و ١٥٨٧ و ١٥٨٩ و ١٥٩٠ والفقيه ج ١ ص ٢٦٨ ح ١٢٢٣ ويفيد ذلك ح ١٢٢٥ والكافي ج ٣ ص ٤٢٥ و ٤٢٦.

ــ مسلم ج ٣ ص ١٦. والبيهقي ج ٣ ص ٢٠٠ والنسائي ج ٣ ص ١١١ ومصنف عبدالرزاق ج ٣ ص ١٨٠ ح ٥٢٣٤ رواه بسنده عن ابي هريرة.

٢٦- .٢٣ ــ مسلم ج ٣ ص ١٥ ورواه باسناد آخر في نفس الصفحة بتغيير بسيط والبيهقي ج ٣ ص ٢٠٠ ورواه عبدالرزاق عن ابن جريح عن جعفر بن محمد (ع) بغير هذا الاسناد نحوه ج ٣ ص ١٧٩ ح ٥٢٣١ وأخرج نحوه بتغيير عن الثوري عن جعفر بن محمد (ع) بقية الاسناد ج ٣ ص ١٨٠ ح

٥٢٣٢ أبوداوود ج ١ ص ٢٩٣. المنتقى ج ٢ ص ٣١ ح ١٦٣٠ والترمذي ج ٢ ص ٣٩٧ وابن ماجة ج ١ ص ٣٥٥ ونحوه منحة المعبود ج ١ ص ١٤٥.

ـ البحار ج ٨٩ ص ١٩٨ عن الأمالي وفي الهامش أمالي الطوسي ج ٢ ص ٢٦١.

ـ مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٩١ وغيره.

ـ الوسائل ج ٥ ص ٨١ والتهذيب ج ٣ ص ١٩ ح ٦٧ والكافي ج ٣ ص ٤٢١.

ـ الوسائل ج ٥ ص ٨١.

ـ البخاري ج ١ ص ١٠٧.

ـ البخاري ج ١ ص ١٠٧ وفي هذا المعنى روايات أخرى.

ورواه أبو داوود في سننه باسناده الى ابن شهاب عن السائب مثله باختلاف يسير ج ١ ص ٢٨٥ ورواه بأسانيد متعددة بزيادة في صدره ص ٢٨٥ أيضاً ورواه المنتقى بتغيير ونقله عن البخاري والنسائي ج ١ ص ٢٤ ح ١٦٠٣ و ١٦٠٤ عبدالرزاق ج ٣ ص ٢٠٦ ح ٥٣٤٢ و٥٣٤٣ الترمذي ج ٢ ص ٣٩٢ وابن ماجة ج ١ ص ٣٥٩ نحوه. وكذا ذكر نحوه في المشكاة ص ١٢٣ ونصب الراية ج ٢ ص ١٩٦.

٣٨ ـ الوسائل ج ٥ ص ٣٨ والكافي ح ٣ ص ٤٢٢ ذكر الخطبة بكاملها.

ـ الوسائل ج ٥ ص ٣٨ والكافي ج ١ ص ٤٢١.

ـ الفقيه ج ١ ص ٢٧٥ ح ١٢٦٢.

ـ البيهقي ج ٣ ص ٢١٣ و٢٠٨ وباسناد آخر ص ٢١٤ ونقله عن مسلم.

ـ البيهقي ج ٣ ص ٢١٠ ونقله عن مسلم وأخرجه أبوداوود ج ١ ص ٢٨٦ وذكره الحاكم في المستدرك بزيادة ج ص ٢٨٦.

ـ البيهقي ج ٣ ص ٢١١ وابوداوود ج ١ ص ٨٨ ومنحة المعبود ج ١ ص ١٤٤.

ـ البيهقي ج ٣ ص ٢١٠ وفي هذا المعنى أحاديث متعددة عن سهل وعن عمارة بن رويبة في نفس الصفحة والمنتقى نحوه ج ٢ ص ٢٨ و ٢٩ ح ١٦٢١ و ١٦٢٢ وأخرج نحوه عبدالرزاق ج ٣ ص ١٩٢ ح ٥٢٧٩ وابوداوود ج ١ ص ٢٨٩.

ـ النسائي ج ٣ ص ١٠٤ و١٠٥ و١٠٦ و١٠٧ والحاكم في المستدرك ج ١ ص ٢٨٧ و٢٨٩ والمنتقى ج ٢ ص ٢٦ و٢٧ و٢٨ و عبدالرزاق ج ٣ ح ١٩٣ و ١٩٤ ومجمع الزوائد ج ٢ ص ١٨٧ و١٨٨ و

١٩٠ وأبوداوود ج ١ ص ٢٨٧ و٢٨٨ و٢٨٩.

٤٨ــ الوسائل ج ٥ ص ٤١ ونحوه مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٢ حديث ٣ باب ٢٠ ورواه الإستبصار باسناده ج ١ ص ٤٢٢ ح ١٦٢٣ والفقيه ج ١ ص ٢٧٠ ح ١٢٣١.

٤٩ـ٥٠ــ الوسائل ج ٥ ص ٤١ وفي الباب أحاديث متعددة فراجع والبحار ج ٨٩ ص ٢٠٨ ومستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٢ عن كتاب العروس حديث ٢ باب ٢٠ وكذا الإستبصار ج ١ ص ٤٧١ ح ١٦٢٢ بتغيير في آخره وكذا بتغيير عن الفقيه ج ١ ص ٢٧٠ ح ١٢٣٣ وكذا في الكافي بزيادة (أربع) في آخره ولعل مافي الوسائل اشتباه في النقل وهذا الأصح لموافقته بقية الروايات ج ٣ ص ٤٢٧.

٥١ــ مستدرك الوسائل ج ١ ص ٤١٢ عن الجعفريات.

٥٢ــ الإستبصار ج ١ ص ٤٢٢ ح ١٦٢٥.

٥٣ـ٥٨ ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٠٣ والنسائي ج ٣ ص ١١٢ والمستدرك ج ١ ص ٢٩١ الترمذي ج ٢ ص ٥٢٤ وسنن ابن ماجة ج ١ ص ٣٥٦ روى في ذلك أحاديث. ونقل نحوه في المشكاة وقال متفق عليه ص ١٢٤.

٥٩-٦١ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٠٣ والحاكم في المستدرك عن محمد بن صالح مثله ج ١ ص ٢٩١ وله في هذا المعنى ثلاثة أسانيد ثم قال: كل هؤلاء الأسانيد الثلاثة صحاح وعبدالرزاق ج ٣ ص ٢٣٤ و٢٣٥ وبهذا المعنى مجمع الزوائد ج ٢ ص ١٩٢ وابوداوود ج ١ ص ٢٩٢ وكنزالعمال ج ٧ ص ٥١٣ نقله عن ابن ماجة والحاكم في المستدرك ونقل أيضا نحوه عن الحاكم فيه وعن النسائي. والحاكم ج ١ ص ٢٩١ ونحوه في الموطأ المطبوع مع تنوير الحوالك ج ١ ص ١٢٧ والدارقطني ج ٢ ص ١١ و١٢.

٦٢ــ البحار ج ٨٩ ص ٢٥٦ نقله عن دعائم الاسلام وفي الهامش أنه ج ١ ص ١٨٣.

٦٣ــ الوسائل ج ٥ ص ٩٤ والبحار ج ٨٩ ص ١٧٤ وفي الهامش انه في قرب الاسناد ص ٧٢ ط حجر و ص ٩٤ ط نجف.

٦٤ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٣١.

٦٥ـ٦٨ــ البيهقي ج ٣ ص ٢٣١ والنسائي ج ٣ ص ١٠٣ ورواه الحاكم باسناده وبتغيير ج ١ ص ٢٨٨ وقال هذا حديث صحيح على شرط مسلم ولم يخرجاه والمنتقى عن عبدالله بن بسر ولعله تصحيف في أحدهما ج ٢ ص ١٧ ح ١٥٨٢ وابوداوود ج ١ ص ٢٩٢. وروى الترمذي في ذم التخطي ج ٢ ص ٣٨٨. ابن ماجة ج ١ ص ٣٥٤ وكنزالعمال ج ٧ ص ٥٢٩ نقله عن عدة.

٦٩ ـ ابن ماجة ج ١ ص ٣٥٤ ورواه الترمذي ج ٢ ص ٣٨٨ ورواه في المشكاة ص ١٢٢.

٧١-٧ ـ عبدالرزاق ج ٣ ص ٢٤٠ و ٢٤١ ومجمع الزوائد ج ٢ ص ١٧٨ و ١٧٩.

جناب ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
پنجاب یونیورسٹی لاہور
پاکستان
ترجمہ و تلخیص :- جناب خادم حسین ایم اے علیگ

مِراکل یا معجزہ اسلامی فلسفہ میں

تمہید

"معجزہ" ایسا وسیع موضوع ہے جس پر تفصیلی بحث و گفتگو کے لئے ضخیم کتاب درکار ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ بعض اسلام ناشناس اس ضمن میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ مثلاً ڈیوڈ ہیوم (DAVID HUME) اور اسپی نوزا (SPINOZA) جیسے نقادوں نے اُسے بے بنیاد اور غیر قابل یقین ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن دوسری طرف اس کی حمایت میں کچھ نامور اہل علم نے اس کے ممکن الوقوع اور فطری[1] ہونے پر بھی لکھا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ انجیل معجزوں[2] کے تذکرے سے لبریز ہے۔ ہم نے جہاں تک دیکھا ہے یہی اندازہ لگایا کہ معجزہ کے بارے میں اسلامی تصوّر پر بہت کم مطالعہ اور بحث کی گئی ہے۔ خصوصاً مغرب اور مستشرقین کے یہاں۔

ہم اس مقالے میں ایک مطالعہ کا ماحصل نذر ناظرین کر رہے ہیں۔

مراکل (MIRACLE) کی تعریف: لفظ (MIRACLE) فرانسیسی زبان کے ذریعے یونانی ولاتینی (MIRACULUM)[3]

سے لیا گیا ہے جس کے لغوی معنی ہیں: کسی شئی کے بارے میں اظہار تعجب۔ حیرت انگیز شئی۔ فطرت کی حسب معمول رفتار سے انحراف یا انسان کی توانائی اور فطرت کے دائرے سے خارج شئی۔

اکثر و بیشتر افراد نے معجزہ کو اس فطری حقیقت سے تعبیر کیا ہے جو خدا پر ایمان رکھنے والوں کے جذبات ابھارتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ معجزہ کسی خاص مذہبی یا اخلاقی وجہ سے فطرت کی حسب معمول رفتار میں مافوق فطرت مداخلت کا نام ہے۔ لیکن معجزہ (Miracle) کی سب سے مختصر اور مفید تعریف یہ ہے کہ (Miracle) وہ علامت یا واقعہ ہے جو خدا کی قدرت کی نشاندہی کرتا ہے۔

مذکورہ تعریف سے (اس بات سے قطع نظر کہ معجزہ "ایک فطری حقیقت" یا فطرت کی حسب معمول رفتار سے انحراف) یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ غیر اسلامی فلسفۂ دینیات میں پیغمبر اور اولیا کے معجزے میں کوئی فرق نہیں اور دونوں کے لیے لفظ (Miracle) استعمال ہوتا ہے، لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے انبیا علیہم السلام کے حیرت انگیز کارناموں کو معجزہ، اولیاء اللہ کے کارناموں کو کرامات اور ریاضت کے نتیجہ میں غیر مسلم افراد کی روحانی قوت کے مظاہرے کو "استدراج" کہتے ہیں۔

معجزہ کی دوسری تعریف

اسلامی مصادر و مآخذ میں معجزہ کا مصدر عجز ہے اور اس کے معنی راغب اصفہانی کے بقول یہ ہیں:

«العجز أصله التأخر عن الشيء أو حصوله عند عجز الأمر أي مؤخره وصار في التعارف إسماً للقصور عن فعل الشيء»[۱۲]

بنیادی طور پر عجز کے معنی کسی چیز کا آخری حصہ ہے، یا کسی چیز کے آخری حصوں کا نام ہے۔ روزمرہ میں عجز کسی شئی کو انجام دینے میں کوتاہی کا نام ہے۔

قرآن مجید میں یہ کلمہ اصل لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

«قال يٰويلتي أعجزتُ أن أكون مثل هذا الغراب فأواري سوءة أخي»[۱۳]

یعنی مجھ پر افسوس کہ میں اس کوے جیسا بھی کام نہیں کر سکتا کہ میں اپنے بھائی

کی لاش چھپا دیتا۔

لفظ عجز کے معنی کمزور و معذور بنانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"فاعلموا أنكم غير معجزي الله،[14]
وما أنتم بمعجزين فى الأرض،[15]

معجز یا معجزہ یعنی ہر وہ شئ جو[16] عاجز کردے۔ تفتازانی نے معجزہ کی تعریف یوں کی ہے:

"وہ خارق عادت عمل جو پیغمبری کا دعویٰ کرنے والے کے ذریعے
انجام پائے اور چیلنج کے طور پر مخالفوں کے لیے ثابت ہو۔ یعنی وہ عمل
جس کے انجام دہی سے وہ لوگ (مخالفین) قاصر ہوں۔ درحقیقت
معجزہ پیغمبروں کے صدق و صفا سے متعلق اللہ عز اسمہ کی گواہی ہے۔

معجزہ کی مزید مختصر و مفید تعریف ابوالبرکات نسفی کی کتاب "عمدۃ عقیدۃ اہل السنہ والجماعۃ" میں پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب دینی علوم کے اکثر و بیشتر بنیادی اصولوں پر بحث کرتی ہے نسفی نے لکھا ہے:

«المعجزة وهي ظهور أمر إلهي خارق للعادة فى دارالتكليف
لاظهار صدق مدعي النبوة»

دنیا میں جس الٰہی اور خارقِ عادۃ عمل کا ظہور نبوت و پیغمبری کی تصدیق کے لیے ہو وہ معجزہ کہلاتا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی تعریف ایجی نے اصول و عقائد پر مشتمل جامع کتاب "المواقف" میں کی ہے، جو (Wensinck) وین سینک کے مطابق اس کی سب سے مناسب اور اچھی تعریف ہے:

«المعجزة وهي بحسب اصطلاح عندنا عبارة عن ما قصد به
اظهار الصدق من ادعىٰ انه رسول الله»[2]

ہماری اصطلاح کے مطابق معجزہ وہ شئی ہے جس کے ذریعہ اس فرد کی تصدیق ہوتی ہے جو رسول خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

لفظ معجزہ پر مستشرقین کا بے بنیاد اعتراض

لفظ معجزہ کا ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ لیکن قرآن میں معجزہ کی جگہ

آیات" کا عموماً استعمال ہے، حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مستشرقین نے اس واضح حقیقت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور غلط نتیجہ اخذ کیا ہے: چونکہ لفظ معجزہ کا ذکر قرآن میں نہیں ہے، لہٰذا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا کوئی واسطہ ثابت نہیں ہوتا۔ جہاں کہیں آیات کا ذکر ہوا ہے وہاں آیاتِ قرآن مراد ہے۔ یہاں تک کہ متأخرین کی کتابوں میں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تنہا عظیم معجزہ قرآن درج ہے۔ انبیا و رسل اور خاص طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا ذکر سیرت و حدیث میں ملتا ہے۔ لیکن جس طرح سے معجزہ کے متعلق قدیم مصحفوں میں بیان ہوا ہے اس طرح سے نہیں ہے۔ فقہ اکبر[21] میں مؤلف نے آیات کو پیغمبروں اور کرامات کو اولیاء کا حصہ مانا ہے، ابوحفص عمر نسفی کے "قال اقول" میں بھی معجزہ کی بحث ہے۔ ان مصادر کا مطالعہ موضوع کے بارے میں نہایت اہم ہے۔

مستشرقین اور ان کے ذہنی و علمی مشکلات ایسے ہیں کہ جن کے نتیجے میں وہ منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ مثلاً

۱۔ مستشرقین میں سے اکثر افراد اسلامیات کو تعصب کی نظر سے پڑھتے ہیں یہاں تک کہ اسلام یا پیغمبر اسلامؐ سے متعلق تحریروں میں بھی اس کے آثار نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔

۲۔ وہ، اسلامیات اور عربی زبان و ادب سے بالکل بے بہرہ ہوتے ہیں حضرت نوح، ہود، صالح، ابراہیم، لوط، یعقوب، یوسف، داوٴد، سلیمان، یونس، ایوب، زکریا، عزیر اور خاص طور پر حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام اجمعین کے معجزات کا ذکر نہ صرف سیرت و حدیث بلکہ قرآن میں بھی ملتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن نے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب تمام معجزوں کی واضح طور پر نفی نہیں کی ہے۔ بعنوان مثال، شق قمر[22] (چاند کو دو ٹکڑے کرنا)، معراج[23]، تبلیغ و تحدی کفار[24]، رحمۃ للعالمین ہونا[25]، رومیوں کا غلبہ[26]، غار ثور[27] میں مدد الٰہی، اللہ تعالیٰ کی طرف

سے آنحضرت[۲۷] پر رموز و اسرار[۲۸] کا انکشاف فتح مکہ و بدر[۲۹]، اللہ کے حکم سے[۳۰] ملائکہ کی مدد، اور دوسرے بہت سے معجزات جن کا ذکر قرآن میں موجود ہے، اور تو اور قرآن بذات خود پیغمبر اسلام[۳۱] صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک حیرت انگیز معجزہ ہے۔ دراصل معجزہ کوئی نیا عقیدہ نہیں بلکہ وہ تصوّر ہے جس کو قرآن و حدیث سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن مجید میں لفظ معجزہ کے بجائے "آیات" پر زور دیا گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ تفسیر میں آیات کے متعلق زیادہ تفصیلی بحثیں ہوئی ہیں۔ قرآن مجید میں بے مثال انداز میں معجزے[۳۲] کی جگہ "آیت" یا "آیات" کا استعمال، جو نسبتاً زیادہ وسیع معنوں پر مشتمل ہے۔

مثلاً:

۱۔ قرآن کا ایک حصہ[۳۳] یا جزء۔ چونکہ قرآن کی ہر آیت اپنی جگہ بے مثال ہے۔

۲۔ حکم[۳۴] کے معنوں میں۔

۳۔ نشانی[۳۵] اور بے مثل حقیقت۔

۴۔ معجزہ[۳۶]۔

اللہ عز اسمہ کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا: تم ہماری آیات (نشانیاں) لے کر فرعون کے پاس جاؤ، یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں، اس کی تمام باتیں سنیں گے۔ جب فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی دیتے ہوئے کہا: اگر ہمارے علاوہ کسی دوسرے کو خدا مانو گے تو ہم یقیناً تمہیں قید کر لیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: اگر ہم یہ ثابت کر دکھائیں کہ خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں! اس نے کہا اگر تم سچے ہو ثابت کر کے دکھاؤ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا پھینکا — اچانک ایک عظیم الجثہ اژدھا نمودار ہوا۔ اور جیسے ہی جیب سے ہاتھ باہر نکالا تو اتنا نور پھیلا کہ لوگوں کی آنکھیں چکا چوندھ ہو گئیں، فرعون نے یہ اعجاز دیکھ کر اردگرد بیٹھے ہوئے ندیموں اور مصاحبوں سے کہا: یقیناً یہ ایک عقلمند اور ماہر[۳۷] جادوگر ہے۔

قرآن مجید میں آیات بینات (آیت ۲۶/۱۵) سے مراد، ہی معجزہ ہے۔ معجزہ کے بدلے

آیت یا آیات استعمال کرنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ معجزہ بذات خود پیغمبر کا ذاتی فعل نہیں بلکہ اللہ عزاسمہ کی عنایات شامل حال ہوتی ہیں۔

جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے فرماتے ہیں، "میں تمھارے پالنے والے کی طرف سے ایک نشانی (معجزہ) لے کر آیا ہوں۔ وہ یہ کہ مٹی کا ایک پرندہ بناؤنگا اس میں روح پھونک دونگا تو اللہ کے حکم سے قابل پرواز پرندہ بن جائے گا۔ مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو خدا کے حکم سے شفا دوں گا اور مردوں کو زندہ کروں گا[38]" تو دو بار خدا کے حکم اور آیات کو معجزہ گردانتے ہیں۔

حدیث میں بھی لفظ آیات کا استعمال معجزہ کے معنوں میں ہوا ہے۔ عبداللہ بن مسعود کا کہنا ہے: "کنا نعدّ الآیات[39] برکۃ" (ہم معجزوں کو باعث برکت سمجھتے تھے)۔ قرآن وحدیث کے علاوہ (آیات) نشانی کا مطلب بائبل میں بھی معجزہ ہے۔

"اور وہ لوگ (اپنے علاقے سے) تبلیغ کرنے کی غرض سے باہر نکلے، انھوں نے ہر جگہ تبلیغ کی اور حضرت عیسیٰ مسیح بھی ان کے ہمراہ معجزوں[40] کے ذریعے انہیں استحکام بخشتے رہے" لفظ آیات کا اردو ترجمہ معمولاً معجزات[41] کیا جاتا ہے۔

معجزہ کی جگہ لفظ آیات کو استعمال کرنے پر مذہبی ترقی پسندوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا، چونکہ "اعمال" "علامات" اور "طاقتیں" یہ ایسے الفاظ ہیں، جن کو مسیحی مبلّغوں، نقادوں، دوستوں اور خود حضرت عیسیٰ مسیح نے اپنے شاگردوں کو معجزہ کا مفہوم سمجھانے کے لیے رائج کیا[42] ہے۔ یوں تو معجزہ کے متبادل الفاظ محدود ہیں۔ لیکن زیادہ زور انہیں الفاظ پر دیا جاتا ہے جو عشق خداوندی کی نشاندہی کرتے ہیں[43]"

جہاں تک آخری دور کے مذہبی لٹریچر میں لفظ معجزہ کے استعمال پر اعتراض کی بات ہے، تو یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ تمام علمی اصطلاحیں (خواہ وہ علم حدیث، فقہ، تصوّف، لغت، قواعد، فلسفہ، سماجیات، نفسیات یا دیگر علوم سے متعلق ہی کیوں نہ ہوں) اس وقت تیار ہوئی ہیں جب متعلقہ علوم کی جمع وتدوین ہو چکی۔ شاید مستشرقین نے خود لفظ بائبل پر توجہ نہ کی۔ خود یہ نام بھی صدیوں بعد رکھا گیا، خود یہ کتاب مقدس

بھی بائبل کے نام سے خالی ہے۔ اس کا یہ نام نوصدیوں کے بعد رکھا گیا ہے جبکہ لفظ آیات وسیع معنوں پر مشتمل ہوتے ہوئے بھی اسلامی لٹریچر میں معجزہ[45] کے معنوں میں خصوصیت سے استعمال ہوتا تھا، البتہ جب سے معجزہ کو علمی اصطلاح مان لیا گیا اس وقت سے اسلامی لٹریچر میں اسی کا رواج ہوگیا۔ غزالی نے "احیاء العلوم[46]" کا ایک باب

«بیان المعجزات و آیاته الدالة علی صدقه»

قرار دیا ہے اور اس کا آخری فقرہ یوں لکھا ہے[47]:

«الیٰ غیر ذلک من آیاته ومعجزاته صلّی اللہ علیه وسلم»

اس سے واضح ہوا کہ چھٹی صدی ہجری تک آیات و معجزات بالکل مترادف سمجھے جاتے تھے۔

علامہ باقلانی نے کتاب "التمھید" میں ایک باب کا عنوان رکھا ہے[48]:

«ماظهر علی یده صلی اللہ علیه وسلم من الآیات الباهرة والمعجزات القاهرة»[49]

اور ابو حفص عمر نسفی نے لکھا ہے:

«و أظهره القرآن فهو من أعجب الآیات وأبین الدلالات إذهو آیة عقلیة باقیة دون کل مُعجز»[49]

اسی طرح "فرقان[50]" "برہان[51]" اور "بیّنات[52]" جیسے کلمات بھی معجزہ کے ہم معنی قرآن مجید میں موجود ہیں۔

متقدمین علماء نے، "دلائل"، "علامات" اور "خارق العادۃ" جیسے الفاظ کو بھی معجزہ کا مترادف قرار دیا ہے۔

دستور طبیعت پر معجزہ کا اثر

لفظ و معنی ـ استعمال و مباحث اصطلاح سے گذر کر ایک اور بحث شروع ہوتی ہے۔

ـ طبیعی نظام کا معجزے سے کیا ربط ہے؟ آیا معجزہ نظام طبیعی کو متاثر کرتا ہے؟

طبیعت دو قسم کے قوانین پر مشتمل ہے، "معتاد" اور "غیر معتاد" ویسے تو[53] قانون نظام ربّانی پوری کائنات پر حکم فرما ہے، جس کے ہم عادی بن چکے ہیں، لیکن ایک قانون اور بھی ہے جو طبیعت کے عام قانون سے ذرا ہٹ کر نظر آتا ہے (اگرچہ درحقیقت اس

میں کوئی انحراف نہیں ہے) اسی موڑ پر عقلیت پسند اُلجھ گئے اور انہوں نے معجزہ کو انحراف از نظام طبیعی سمجھ کر رد کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ نظام طبیعی میں انحراف ہو ہی نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف مستشرقین نے کہا: اسلامی عقیدے میں "طبیعت" داخل ہی نہیں۔ یہ لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ علماء اسلام نے عام طبیعی نظام کے علاوہ دوسرے قانون کو خارق عادت کے نام سے یاد کیا ہے۔ چونکہ معجزہ، طبیعت سے انحراف نہیں بلکہ محض عادت کے خلاف ہے اور خالق کائنات کے یہ دونوں قانون فطری ہیں۔ آیا حضرت آدمؑ، حوّا اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی ولادت حسب عادت (حسب معمول) ہوئی؟ سب سے پہلا پرندہ، گائے، بھینس، یعنی مخلوق اوّل بلکہ پوری کائنات کس طرح معرض وجود میں آئی؟ ظاہر ہے کہ طبیعت بذات خود قانون طبیعت کی تابع ہے۔ بنیادی غلط فہمی عقلیت پسندوں اور سائنسدانوں کو معجزہ کی تردید پر مجبور کرتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اصول "علّت و معلول" کے قائل ہیں اور ڈاکٹر قادری نے اس کلیہ پر یوں تبصرہ کیا ہے: "غزالی نے یہ ثابت کر دیا کہ عقلی نقطۂ نظر سے کلیۂ علّت و معلول غلط ہے۔" سو سال بعد ہیوم (Hume)، جان سٹاوٹ میل (John Staurt Mill)، سپنسر (Spencer) اور کمٹ (Comte) بھی اسی نتیجہ پر پہنچے[۵۵]۔ پروفیسر روحی اس مسئلہ کا حل کچھ اور طریقوں سے پیش کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے:

> "ہم یہ مانتے ہیں کہ معجزہ ایک اثر ہے لیکن اللہ کا ارادہ اس کی بنیادی علّت ہے، تمام پوشیدہ اور حیرت انگیز علّتیں اس طرح عمل کرتی ہیں کہ ہم ان کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔"[۵۶]

وہ مزید اضافہ کرتے ہیں:

> "اگر معجزہ کا منکر اس کی علت نہ جاننے کا دعویٰ کرتا ہے تو حقیقت سے اس کی ناواقفیت معجزہ کے عدم یا بے حقیقت ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی۔"[۵۷]

مشہور فلسفی ابن سینا، معجزہ کو طبیعت سے انحراف تسلیم نہیں کرتا۔ وہ اپنی مشہور تصنیف "اشارات" میں معجزہ کے وجود پذیر ہونے کے امکان پر تبصرہ کرتے

ہوئے کہتا ہے :

«إذا بلغک ان عارفاً أمسک نفسه عن القوت المرزوق مدة معتادة فاسجع بالتصديق واعتبر ذلک من مذاهب الطبيعة»[58]

اگر کسی عارف کے بارے میں یہ سنو کہ اس نے اپنا روزمرہ کھانا ایک عرصہ تک چھوڑے رکھا، تو اسے مان لو، کیونکہ ایسا ہونا فطرت کے مطابق ہے۔

«إذا بلغک ان عارفاً أطاق بقوته فعلاً أوتحريكا أو حركة تخرج عن وسع مثله فلا تتلقه بكل ذلک الإستنكار فلقد تجد الى سببه سبيلاً في اعتبارک مذاهب الطبيعة»[59]

اگر یہ معلوم ہو کہ کوئی عارف اپنی صلاحیت سے بڑھ کر کسی خارق عادت حرکت یا عمل کو انجام دینے کی طاقت رکھتا ہے، تو اس سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔ چونکہ اس کی علت کو یقیناً قانون فطرت کے مطابق پاؤ گے۔

«اذا بلغک ان عارفاً حدث عن غيب فأصاب مقدماً ببشرىٰ أو نذير فصدق ولا يتعسرن عليک الايمان به فان لذلک فى مذاهب الطبيعة اسباباً معلومة»[60]

اگر یہ معلوم ہو کہ کسی عارف نے نامعلوم شئ کے بارے میں پیش گوئی کی اور وہ صحیح ثابت ہوئی، خواہ وہ خوش خبری ہو یا کسی طرح کی دھمکی، اس پر شک کرنے کے بجائے یقین کرنا چاہیے۔ کیونکہ فطرت کی راہوں میں ان باتوں کے اسباب موجود و معلوم ہیں۔

«ولعلک قد تبلغک عن العارفين اخبار تكادتأتي بقلب العادة فتبادر الى التكذيب وذلک مثل ما يقال ان عارفاً استسقى للناس فسقوا أو استشفى لهم فشفوا أو دعا عليهم فخسف بهم وزلزلوا أوهلكوا بوجه آخر أو دعالهم فصرف عنهم الوباء والموتان أوالسعير أوالطوفان أو خشع لبعضهم سبع أولم ينفر عنه طيراً ومثل ذلک مما لايأخذ في طريق الممتنع فتوقف ولا تعجل فان لأمثال هذه أسباباً في أسرار الطبيعة»[61]

ممکن ہے کہ کسی عارف کے بارے میں یہ معلوم ہو کہ ضابطۂ فطرت کے خلاف باتیں کرتا ہے اور تم اس کی تردید کرنے لگو۔ مثلاً کوئی عارف بارش کے لئے دعا کرتا ہے، بارش ہونے لگتی ہے، کسی بیمار کے لئے دعا کرتا ہے اور اُسے شفا ملتی ہے، کسی قوم یا گروہ کے لئے بد دعا کرتا ہے اور زلزلہ آتا ہے یا زمین انہیں نگل جاتی ہے یا دوسرے اسباب کے ذریعے لوگ تباہی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یا وہ دعا کرتا ہے جس سے لوگ تباہ نہیں ہوتے۔ یا کوئی وحشی درندہ اس کے سامنے بے آزار بن جاتا ہے، پرندے اس سے اُنسیت رکھتے ہیں... تمام چیزیں ایسی ہیں جن کو انجام دینا کسی عارف کے لیے مشکل نہیں۔ لہٰذا تمہیں جلدبازی کے بجائے صبر اور سوچ سمجھ سے کام لینا چاہئے۔

ابن سینا اپنی بحث کو یوں ختم کرتا ہے:

«والـذي يـقع له هذا في جبلة النفس فيكون خيراً مزكياً لنفسه فهو ذو معجزة من الأنبياء أو كرامة من الاولياء وتزيده تزكيته لنفسه في هذا المعنى زيادة على مقتضى جبلة فيبلغ المبلغ الأقصى والذي يقع له هذا ثم يكون شريراً ويستعمله في الشهر فهو الساحر الخبيث»[۶۲].

جس شخص کی جبلت میں یہ چیز مضمر ہو اور وہ نیک، سچا اور راہ راست پر چلنے والا ہو، وہ صاحب معجزہ پیغمبر یا صاحب کرامت ولی ہو سکتا ہے۔ معجزہ سے اس کی نفس کی مزید پاکیزگی بڑھتی ہے، وہ ارتقا کی اعلیٰ ترین منزلیں طے کرتا ہے۔ لیکن وہ شخص جو خارق عادت عمل شیطانی پہلو کے ساتھ انجام دیتا ہے، یقیناً خبیث جادوگر ہے۔[۶۳]

فخر الدین رازی اور خواجہ نصیر الدین طوسی نے ابن سینا کے اشارات کی شرح میں ان نکات کی عمدہ طریقے سے وضاحت کی ہے لیکن مستشرقین ابن سینا کے خیال و طرز فکر پر اظہار افسوس کرتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ راسخ العقیدہ مسلمان ان تمام باتوں کو نہ صرف قبول کرتے بلکہ فلسفیانہ بھی مانتے ہیں۔ خواہ وہ ابن خلدون جیسے مؤرخ یا ابن سینا

جیسے متبحر فلسفی ہی کیوں نہ ہوں۔"[65]

اشعری مکتب فکر کے مطابق معجزہ دلیل نبوت ہے۔علماء متاخرین نے بھی اسے مانا ہے۔[67] ابن حزم معجزہ کا اعتقاد رکھنے کے باوجود، اشعریوں پر سخت تنقید کرتے ہیں کہ وہ معجزہ کو دلیل نبوت کیوں مانتے ہیں۔[68] مگر یہ لفظی اختلاف سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی ۔ ابو حنیفہ کہتے ہیں :

«والآيات ثابتة للأنبياء والكرامات للأولياء حق»[69]

یہ سچ ہے کہ معجزے پیغمبروں اور کرامات اولیاء کے لئے ہیں۔

ابو المنتہیٰ نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

«والآيات اي المعجزات ثابتة للأنبياء عليهم السلام يعني ان خوارق العادة التي تصدر عن الأنبياء كإحياء الأموات وانفجار الماء من بين الأصابع وكعدم احراق النار وغيرها تسمى آيات لأن الله تعالىٰ يريد بصدورها عنهم ان تكون علامة ودليلاً على نبوتهم وصدقهم۔ والكرامات للاولياء حق أي الخوارق التي تصدر عن الأولياء تسمى كرامات لان الله تعالى يريد بصدورها عنهم اكرامهم واعزازهم.والولي في اللغة قريب فاذا كان العبد قريباً من حضرة الله تعالى بسبب كثرة طاعته وكثرة اخلاصه كان الرب تعالى قريباً منه برحمته وفضله واحسانه»۔[70]

آیات یعنی معجزات انبیاء علیہم السلام سے مخصوص ہیں، مثلاً مُردوں کو زندہ کرنا انگلیوں سے پانی جاری کرنا، آگ کا بے اثر ہونا۔اسی طرح کے دوسرے خارق عادت اعمال جو انبیاء کے ہاتھوں انجام پاتے ہیں "آیات" کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں "آیات" اس لیے ظاہر کرتا ہے کہ اس سے ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق ہو۔ کرامات اولیاء سے مخصوص ہیں۔ یعنی وہ تمام خارق عادت اعمال جو اولیاء کے ذریعے انجام پاتے ہیں انہیں کرامات کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذریعہ یہ اعمال ان کے اعزاز و اکرام کے لیے صادر کرتا ہے۔ ولی کے لغوی معنی قریب کے ہیں اور اگر

کوئی بندہ اپنی کثرت اطاعت، عبادت اور خلوص سے بارگاہ ایزدی کا قرب حاصل کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا احسان، فضل اور کرم اس کے شامل حال ہوتا ہے۔

دنیا کے تمام ادیان میں معجزہ ایک مشترک تصور ہے۔ مقلدین لاؤتزے (تاؤیست)، زردشتی، بدھ، ہندو اور مسلمان سب ہی اس شخص کو معجزنما مانتے ہیں جس کو معجزہ کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے دی ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کے بارے میں عیسائیوں کا خیال ہے:

"توریت کو اگر پارہ پارہ بھی کر دیا جائے تو معجزوں کو اُس سے جدا کرنا ممکن نہیں۔ اور یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان اعمال پر مشتمل ہے، جن کو انہوں نے اپنے عہد نبوت میں انجام دیا تھا۔ تمام پیغمبروں کو معجزہ کے ساتھ بھیجا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

«مامن الانبياء نبي إلاأعطى من الآيات ما مثله اومن او أمن عليه البشر»[٧٣]

ہر نبی کو "آیات" میں سے اس عہد کے مطابق یا عوام کے عقائد سے ہم آہنگ معجزہ دیا گیا ہے۔

محض معجزے دکھانا نبوّت اور پیغمبری کا مدعا ہرگز نہیں، ہر پیمبر کا سب سے عظیم و واقعی معجزہ تو اس کی شخصیت، بے لوث کردار اور تعلیمات ہیں۔ اس کے فرائض میں محض معجزے دکھا کر لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنا نہیں ان کا منصب لوگوں کو توحید و عمل کی دعوت دینا ہے۔ پیغمبر ہمیشہ مصلح ہوتا ہے، وہ اپنے خلوص محبت اور اخلاق و رفتار سے لوگوں کا دل جیت لیتا ہے۔ ہر پیغمبر کا بنیادی کام لوگوں کی توجہ خالق کل کی طرف مبذول کرانا اور اس کی عبادت پر راغب کرنا ہے۔

«وما أمروا إلّا ليعبدوا الله مخلصين له الدين[٧٤]»

اور انھیں تو بس یہ حکم دیا گیا تھا کہ نرا کھرا اسی کا اعتقاد رکھ کر باطل سے کترا کے خدا کی عبادت کریں۔

پیغمبروں کا مبعوث ہونا کوئی محدود عمل نہ تھا، بلکہ ہر قوم و ملت کے لیے کوئی نہ کوئی پیغمبر ضرور بھیجا گیا۔

"ان من امۃ خلا فیھا نذیر"[۷۵]

اور کوئی امت (دنیا میں) ایسی نہیں گذری کہ اس کے پاس (ہمارا) ڈرانے والا (پیغمبر) نہ آیا ہو۔

«لکل قوم هاد»[۷۶]

ہر قوم کے لیئے ایک ہدایت کرنے والا ہے۔

«ولقد بعثنا فی کل أمة رسولاً ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت»[۷۷]

اور ہم نے تو ہر امت میں ایک (نہ ایک) رسول ضرور بھیجا (کہ وہ لوگوں سے کہے) کہ خدا کی عبادت کرو اور بتوں (کی عبادت) سے بچے رہو۔

حضرت نوح، ہود، صالح، شعیب، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو ان کی قوموں کے لیے اسی مقصد کے تحت بھیجا گیا تھا۔[۷۸] حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے بھیجے گئے تھے۔[۷۹]

«ألا تعبدوا إلا الله۔ انني لكم منه نذير وبشير»[۸۰]

خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ میں تو اس کی طرف سے تمہیں (عذاب سے) ڈرانیوالا اور (بہشت کی) خوشخبری دینے والا رسول ہوں۔

وحدانیت کی تبلیغ کے بعد رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرائض حسب ذیل ہیں:

«يتلوا عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتب والحكمة»[۸۱]

(خدا نے انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو) خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا اور ان کی (طبیعت) کو پاکیزہ کرتا ہے اور انہیں کتاب (خدا) اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے۔

۱۔ پیغمبر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی باتوں سے آشنا کرتا ہے۔

۲۔ وہ لوگوں کی اصلاح کر کے ان کے دلوں کو پاک و پاکیزہ کرتا ہے۔

۳۔ کتاب خدا کی تعلیم دیتا اور اس کے احکام کی نشاندہی کرتا ہے۔
۴۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اٹھنے والے قدم کو بہتر سے بہتر بنانے کی غرض سے وہ لوگوں کو عقل وحکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

اگر پیغمبروں کی مکمل تاریخ کو غور و فکر کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ محسوس ہوگا کہ پیغمبری کے دوران معجز نما قدرت وصلاحیت رکھنے کے باوجود تبلیغ کو ان سب نے اپنا اخلاقی منصب سمجھا۔ اخلاق کا سب سے اعلیٰ نمونہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

«انک لعلیٰ خلق عظیم[۸۲]»

بے شک تمہارے اخلاق بڑے (اعلیٰ درجے کے) ہیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذات خود اپنے فرائض کی نشاندھی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

«بعثت لأتمم مکارم الأخلاق[۸۳]».

میں حسن اخلاق کی حدوں کو پورا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں معجزہ کی صلاحیت بھی نہ ہوتی تو نیک وصالح افراد محض ان کی شخصیت کی بنا پر انھیں قبول کر لیتے۔ ابن رواحہ کے بقول:

"لو لم تکن فیہ آیات بینۃ۔ لکان منظرہ ینبیک بالخبر[۸۴]"

اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں معجزہ کی صلاحیت نہ بھی ہوتی تو ان کی شخصیت ہی نبوت کی دلیل کافی ہوتی۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کے بارے میں غزالی نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے:

«لولم تکن فیہ آیات بینۃ۔ لکان منظرہ ینبیک بالخبر»

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کردار اور ان کی شخصیت و رفتار ہی ان کے

سچے ہونے کی دلیل ہے۔

تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ہارون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی معجزہ کی فرمائش نہیں کی۔ اسی طرح حضرت خدیجہ علیہا السلام یا حضرت ابوبکر نے محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کردار و شخصیت سے متأثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ ہرقل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اپنے ایلچی ابوسفیان جیسے مخالف کی زبانی سنتے ہی کہا:

«ان یک ما تقول فیه حقاً فانه نبی[۸۶]»

جو کچھ تم نے بیان کیا ہے اگر وہ سچ ہے تو یقیناً وہ نبی ہے۔

مذکورہ حقائق کے بعد یہ سوال بھی حل کرتے چلیں کہ معجزے کا اثر کیا ہوتا ہے؟ قرآن کریم کی روشنی میں معجزہ کا پہلا اثر یہ ہے کہ خود پیغمبر کی عزیمت کو مستحکم کرتا ہے۔ جیسے عزیر[۸۷] کے بارے میں قرآن نے ذکر کیا ہے یا حضرت ابراہیم[۸۸] علیہ السلام کا واقعہ اسی فرعون کی ملاقات سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ بشارت ملی "لو جاؤ، تم دونوں اور تمہارے پیرو غالب رہیں گے[۸۹]"۔ اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے معراج[۹۰] سے نوازا۔ ظاہر ہے کہ تمام معجزات مخالفین کو دلیل صداقت دکھانے کے ساتھ ساتھ خود انبیاء کو عزیمت میں تقویت کا فائدہ بھی دیتے رہے۔

معجزہ کا دوسرا اہم اثر یہ ہے کہ معتقدین نبوت کے عقیدہ کو مزید استحکام بخشتا ہے۔ عام حالات میں جب دشمن کا سامنا بطور تحدی نہیں ہوتا تو پیغمبر کا معجزہ پیغمبری کو ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ جس طرح سے اللہ عز اسمہ نے پہاڑوں اور (تسبیح خدا کرتے والے) پرندوں کو حضرت داؤد[۹۱] علیہ السلام کا تابع بنایا، طوفانی ہواؤں اور راجنہ و شیاطین کو حضرت سلیمان[۹۲] علیہ السلام کا تابع بنایا، حضرت موسیٰ[۹۳] علیہ السلام کی دعا سے بنی اسرائیل پر ابر سایہ فگن ہوا اور ان کے عصا سے پہاڑوں[۹۴] میں بارہ چشمے پھوٹے، مادر زاد اندھے اور کوڑھی کے مریضوں کو شفا ملنا

اور مردوں کا اللہ کے حکم سے زندہ ہونا وغیرہ وہ معجزے ہیں جو حضرت عیسیٰ[95] علیہ السلام کے ذریعے انجام پائے، یہی حال جنگ بدر میں فرشتوں[96] کے ذریعہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مدد کا ہے۔ ان کے علاوہ ایسے بے شمار معجزات ہیں جو[97] پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ انجام پائے۔ اس طرح کے معجزے عام طور پر معتقدین کے عقیدے میں استحکام پیدا کرکے اس کو ارتقا کی اعلیٰ ترین منزل پر پہنچاتے ہیں۔ قرآن کریم بذات خود اس عمل کی وضاحت کرتا ہے:

«وما جعله الله إلّا بشرىٰ ولتطمئن به قلوبكم[98]»

اور (یہ امداد غیبی) خدا نے صرف تمہارے خوشی خاطر کے لیے کی تھی اور تاکہ تمہارے دل مطمئن ہوجائیں۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے مشہور ومعروف صحابی عبداللہ بن مسعود نے بھی اس قسم کے معجزوں کے اثرات کی طرف اشارہ کیا ہے:

«وعن عبدالله ابن مسعود قال: كنا نعد الآيات بركة وانتم تعدونها تخويفاً — كنا مع رسول الله صلّى الله عليه وسلم فى سفر فقلّ الماء فقال اطلبوا فضلة من ماء فجاءوا بإناء فيه ماء قليل فأدخل يده فى الاناء ثم قال: حيّ على الطهور المبارك والبركة من الله ولقد رأيت الماء ينبع من بين اصابع رسول الله صلّى الله عليه وسلم ولقد كنا نسمع تسبيح الطعام وهو يؤكل — رواه البخاري[99]».

یعنی — ہم لوگ معجزوں کو باعث برکت مانتے ہیں اور تم لوگ ڈرانے کا حربہ۔ ایک سفر کے دوران ہم سب رسول اللہ صلی علیہ وآلہ وسلّم کے ہمراہ تھے، پانی کی قلت تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے پانی کا برتن طلب کیا تو اس میں پانی بہت کم تھا۔ حضرتؐ نے برتن میں ہاتھ ڈالا اور ہم سب کو آواز دیکر کہا: اگر خداوند کریم کی عنایت دیکھنا ہے تو آؤ۔ ہم نزدیک گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگلیوں کے درمیان سے پانی چشمے کے مانند ابل رہا ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے کھانے کو بھی اللہ عز اسمہ کی حمد وستائش کرتے ہوئے سنا۔ (بخاری نے اس

روایت کو نقل کیا ہے۔)

معجزہ کا تیسرا اثر یہ ہے کہ وہ منکرین کو حقیقت تسلیم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر مارا تو اللہ کے حکم سے وہ اژدھا بن گیا، خود جادوگروں کا بیان ہے کہ تمام جادوگروں نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے کہا:

«آمنا برب هرون وموسیٰ»

ہم ہارون وموسیٰ (علیہما السلام) کے خدا کو مان گئے۔

اس پر فرعون نے جادوگروں کو ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پیر کاٹنے اور انھیں کھجوروں کے درختوں پر لٹکا کر پھانسی دینے کی جو دھمکی دی تھی، اس کے جواب میں جادوگروں نے کہا:

«لن نؤثرک علی ما جاءنا من البیّنات والذي فطرنا فاقض ما أنت قاض إنما تقضي هذه الحیوة الدنیا۔ إنّا آمنا بربنا لیغفرلنا خطایانا»[۱۰]

جادوگر بولے کہ ایسے واضح و روشن معجزات جو ہمارے سامنے آئے ان پر اور جس (خدا) نے ہم کو پیدا کیا اس پر تو ہم تم کو کسی طرح ترجیح نہیں دے سکتے۔ جو تجھے کرنا ہو کر گزر، تو بس دنیا کی (اسی ذراسی) زندگی پر حکومت کر سکتا ہے۔ (اور کہا) ہم تو اپنے پروردگار پر اس لیے ایمان لائے ہیں تاکہ ہمارے واسطے ہمارے سارے گناہ معاف کر دے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے معجزوں نے ان کے دلوں پر اثر کیا، بہت سے لوگوں نے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔ یہ بھی ہوا کہ قبیلۂ قریش کے بہت سے معزز افراد نے اسلام محض اس لیے قبول کیا کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تھا کہ شکست خوردہ رومی کیانی حکومت پر فتح پائیں گے۔[۱۱]

معجزہ کا چوتھا اثر یہ ہے کہ وہ منکرین کو راہ راست پر لانے کا بہترین ذریعہ

ہے ۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب کبھی کسی پیغمبر نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تو صرف کچھ نیک سیرت افراد نے اسے قبول کیا اور پیغمبروں کے عظیم کردار کے باوجود۔

۱۔ اکثر افراد نے پیغمبروں کی مخالفت و تردید کی۔[۱۰۳]

۲۔ ان کا پیغمبروں کو نہ ماننا انکار توحید کے مرادف تھا۔[۱۰۴]

۳۔ خدا کے مطیع و فرمانبردار بندے کی طرح تمام پیغمبروں نے دعوت حق کا کام استقامت اور صبر و استقلال کے ساتھ انجام دیا۔[۱۰۵]

۴۔ آخر کار میدان یوں خالی ہوا کہ کشتی نوحؑ، حضرت صالحؑ کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عصا کے ذریعہ وہ معجزے رونما ہوئے کہ منکرین اس طرح نیست و نابود ہوئے کہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک سبق بن گئے۔[۱۰۶]

اسی نکتے کو قرآن نے یوں واضح کیا ہے :

«وما نرسل بالآیات إلاّ تخویفاً»

ــ اور ہم تو معجزے صرف ڈرانے کی غرض سے بھیجا کرتے ہیں ۔

مستشرقین اور بہت سے عقلیت پسند مسلمانوں نے مذکورہ آیت کے پہلے حصّے سے یہ استنباط کیا ہے کہ معجزوں کا بھیجا جانا روک لیا گیا تھا اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معجزہ نہیں دیا گیا ۔

«وما منعنا أن نرسل بالآیات إلاّ أن کذب بها الأولون.إلخ.»

اور ہمیں معجزات بھیجنے سے بجز اس کے اور کوئی وجہ مانع نہیں ہوئی کہ اگلوں نے انھیں جھٹلا دیا ۔

حقیقت اس آیت میں معجزے کے بارے میں منکرین کے رویے کا بیان ہے :

۱۔ گذشتہ لوگوں نے معجزہ سے کوئی سبق نہیں لیا ۔

۲۔ یہ بات ممکن تھی کہ خداوند عالم مزید آیات نازل نہ کرتا ۔

۳۔ ثمود کو خداوند عالم نے اونٹنی دی جو ایک بیّن آیت ہے ۔

۴۔ لیکن اکثر افراد نے ناانصافی کا ثبوت دیا ۔

۵۔ آخر کار نصرتِ الہٰی حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ماننے والوں کے کے شامل حال ہوئی۔

۶۔ اس قسم کے معجزوں کی غرض و غایت منکرین کی تنبیہ ہے۔

دوسرے پیغمبروں کے سلسلے میں یہ کلیہ (معجزوں کی غرض و غایت منکرین کی تنبیہ ہے) سچا نظر آتا ہے، لیکن منجی بشر اور رحمۃ للعالمین[۱۰۸] جو نہ صرف ہمیشہ اپنے مخالفین کو معاف بلکہ حقیقت کی طرف راغب کیا کرتے تھے، انھیں ایسے معجزے نہیں دئے گئے جن کی وجہ سے روئے زمین پر منکرین مکمل طور پر تباہ و برباد ہو جاتے۔

مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن ہے جس کی لاجوابی کا سب کو اقرار تھا اور ہے۔

(۱)۔ جس طرح سے عیسائیت[۱۰۹] میں معجزہ پیغمبر کا جزو لاینفک محسوب ہوتا ہے، اس طرح سے اسلام[۱۱۰] میں نہیں۔ ارشاد رب العزت ہے:

«وما كان لرسول أن يأتي بآية إلّا بإذن الله»[۱۱۱]

اور کسی پیغمبر کی یہ مجال نہ تھی کہ خدا کے اختیار دیئے بغیر کوئی معجزہ دکھا سکے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے معجزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے دوبار اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ کوئی معجزہ بغیر[۱۱۲] خدا کی اجازت کے نہیں دکھا سکتے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معجزہ کو خدا کی برکت مانتے تھے (البرکۃ من اللہ)۔ فخر الدین رازی کا خیال ہے:

(۲)۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے لوث شخصیت بذات خود ایک معجزہ ہے۔ جس کی گواہی[۱۱۳] قرآن مجید دیتا ہے، لہٰذا تنہا معجزہ ہی پیغمبری کا ثبوت نہیں، عقیدہ کا بنیادی معیار و ثبوت اصل دعوای نبوت میں بڑا ثبوت ہے۔

(۳)۔ معجزہ دکھانے کی خواہش کسی پیغمبر کو نہ تھی۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ وہ کس و ناکس کے کہنے پر معجزہ دکھانے کے پابند نہیں ہیں[۱۱۴]۔

۴۔ لفظ آیات، عقلی اور قابل قبول معجزوں پر مشتمل ہے[۱۱۸]۔

۵۔ معجزے کے بارے میں قرآنی توضیحات کے مطابق، نبی خدا یا خدا کا بیٹا نہیں بن جاتا۔ اور نہ اس کے متعلق جاہلانہ انداز سے یہ سوچا جا سکتا ہے کہ وہ لایزال،

بلند و بالا ہوتا ہے۔ معجزہ مجبور کرنے والا عمل نہیں ہے کہ دیکھنے والوں کو مفلوج الذہن کر دے۔ مگر بقول ابن رشد، وہ اس بات کا باعث ضرور ہوتا ہے کہ انسان کو حقیقت تسلیم[۱۱۹] کرنے پر آمادہ کرے۔

۶۔ قرآن کریم بذاتہ ایک[۱۲۰] عظیم عقلی و علمی معجزہ ہے، جس کی تائید موافق و مخالف دونوں گروہوں نے کی ہے[۱۲۱]۔

اس طرح معجزے کے بارے میں جو معیاری تصور اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس کی مثال دنیا کے کسی دین و مذہب میں نہیں ملتی۔

اشارے

1. *Encyclopaedia of Religion and Ethics*, art. "Miracle".
2. *Dictionary of Bible*, 1914, art. "Miracle".
3. (a) *Encyclopaedia Britannica*, Chicago, 1960, V. 15, p. 585,
   (b) *Collier's Encyclopaedia*, New York, 1958, V. 14, p. 4.
   (c) *Chamber's Encyclopaedia* (New Revised Edition) Pergamon Press, London, 1967, Vol. IX, p. 434.
4. *Collier's Enyclopaedia*, V. 14, P. 4.
5. *Chamber's Encyclopaedia*, V. IX, P. 434.
6. *The Columbia Encyclopaedia*. p. 1180.
7. *Encyclopaedia Britannica*, V. 15, p. 535.
8. *Collier's Encyclopaedia*, Vol. 14, p. 5.
9. *Encyclopaedia of Religion and Religion* by E.R Pike, New york, 1959.
10. *World book Encyclopaedia*.

۱۱۔ کتاب المواقف، جلد ۸، مطبوعہ مصر ۱۹۰۷ء، ص۲۲۲

۱۲؎ مفردات القرآن، طبع مصر۔ ص۳۲۵

۱۳؎ قرآن ۵/آیت ۳۱

۱۴؎ قرآن ۹/آیت ۳۱

۱۵ قرآن ۴۲/آیت ۳۱

16. Steingass: *Persian English Dictionary,* London.
17. *A commentary on the creed of Islam* by Taftazani, New York, 1950. p. 129. CF. also *Shorter Ency of Islam,* Art. "Mudjiza".
18. *Pillars of the creed of Sunnites,* London, p. 16.
19. *Shorter Encyclopaedia of Islam.*

۲۰ کتاب المواقف، جلد ۸، ص ۲۳۲، طبع مصر ۱۹۰۷ء

۲۱ 21 Shorter Encyclopaedia of Islam Art, "Madjiza"

۲۲ قرآن ۴۵/آیت ۱-۲

۲۳ قرآن ۱۷/آیت ۱

۲۴ قرآن ۳/آیت ۶۰

۲۵ قرآن ۸/آیت ۱۷

۲۶ قرآن ۳۰/آیت ۲

۲۷ قرآن ۹/آیت ۴۰

۲۸ قرآن ۲۶/آیت ۳

۲۹ قرآن ۴۸/آیت ۲۷

۳۰ قرآن ۳/آیت ۱۲۳-۱۲۵

۳۱ قرآن ۱۷/آیت ۸۸، ۱۱/آیت ۱۳، ۱۰/آیت ۳۸، ۲/آیت ۲۳

32. Cf. *Koran, A new translation* by N.J. Dawood : "It is my belief that the Koran is not only one of the greatest book of prophetic literature but also a literary masterpiece of surpassing excellence" (intro-11).

۳۳ قرآن ۲/آیت ۴۱، ۵/آیت ۴۴، ۳/آیت ۱۶۳

۳۴ قرآن ۶/آیت ۱۳۱

۳۵ قرآن ۲۱/آیت ۳۲، ۱۰/آیت ۶۷

۳۶ قرآن ۷/آیت ۱۰۶، ۲/آیت ۱۴۵، ۲/آیت ۱۱۸

۳۷ قرآن ۲۹/آیت ۱۵-۳۴

37. Cf. *Dictionary of Bible,* art, "Moses". "Moses was given two signs".

38. Cf. *Dictionary af Bible*, art. "miracles".

۳۸ قرآن ۳/آیت ۴۸

۳۹ مشکوٰۃ، باب المعجزات

40. *Mark* 16:29. Cf. *Dictoinary of Bible*, Edinburg, 1914, p. 853, mentioning that "the fourth gospel frequently describes the miracles of Jesus as signs".
41. *Kitab-i-Muqaddas*, printed by Pakistan Bible Society, Lahore, 1959, (Mark, 16:20).
42. *Encyclopaedia of Relegion and Ethics*, art. "Miracle".
43. Ibid.

۴۳ ایضاً

44. *Encyclopaedia of Religion and Religions* by E.R. Pike, art. 'Bible'.

۴۵ مزید توضیح کے لئے دیکھئے، "سیرت النبی" تالیف سید سلیمان ندوی، جلد ۳ ص ۲۱۳

۴۶ احیاء علوم الدین طبع مصر ۱۹۳۹ء، جلد ۲، ص ۲۸۵

۴۷ ایضاً

۴۸ کتاب "التمہید"، طبع بیروت ۱۹۵۷ء، ص ۱۳۲

۴۹ کتاب "العمدۃ" ص ۱۵ ۔ اسی طرح ابن حزم نے "کتاب الفصل فی الملل والاھواء والنحل" طبع مصر جلد ۵، صفحہ ۲ میں معجزے کو آیات کے بدلے استعمال کیا ہے۔

۵۰ قرآن ۲/آیت ۵۲ ۔ تفسیر بیضاوی ۳/آیت ۴۰ ملاحظہ فرمائیں۔

۵۱ قرآن ۲۸/آیت ۳۲

۵۲ قرآن ۵/آیت ۱۱۰

۵۳ قرآن ۴۸/آیت ۲۳، ۳۵/آیت ۴۳

54. *Encyclopaedia of Islam*. art. "Karama".

۵۴ اسی طرح ملاحظہ ہو۔ مثنوی مولانا روم میں لفظ کرامات کو بڑے اچھے انداز میں سمجھایا گیا ہے۔

۵۵ امام غزالی کا "فلسفۂ مذہب و اخلاق" مؤلفہ ڈاکٹر سید حسین قادری طبع دہلی ۱۹۶۱ء، ص ۱۳۱

۵۶ "مانی الاسلام" مؤلفہ پروفیسر اصغر علی روحی، جلد ۱، ص ۲۳۶۔ "سیرت النبی" جلد ۳، ص ۵۹

۵۷ ایضاً

۵۸ "کتاب الاشارات والتنبیہات" مؤلفہ ابن سینا، طبع لیڈن ۱۸۹۲ء، ص ۲۰۷

۵۹ ایضاً ص ۲۰۸

۶۰ ایضاً ص ۲۰۹

۶۱ ایضاً ص ۲۱۹

۶۲ ایضاً ص۲۲

۶۳ " لباب الاشارات" مؤلفہ فخر الدین رازی، طبع مصر۔

۶۴ "شرح اشارات" مؤلفہ خواجہ نصیر الدین طوسی اور فخر الدین رازی، طبع مصر۔

65. ***Shorter Encyclopaedia of Islam*, art. "Karama".** ۶۵

۶۶ "کتاب التمہید" مؤلفہ باقلانی، طبع بیروت ۱۹۵۷ء، ص۱۳۲۔ اسی طرح ملاحظہ فرمائیں "اعجاز القرآن" مرتبہ سید احمد صقر، طبع مصر۔

۶۷ "الانتقاد الرجیح" مؤلفہ صدیق حسین خان، طبع لکھنؤ، ص۴۹

۶۸ "کتاب الفصل فی الملل والاہواء والنحل" مؤلفہ ابن حزم، طبع مصر، جلد (۵)، ص۲

۶۹ "شرح الفقہ الاکبر" مؤلفہ ابوالمنتہی، طبع حیدر آباد دکن ۱۳۲۱ھ، ص۳۰۔

۷۰ ایضاً۔ دیکھئے تفسیر تفتازانی، طبع نیویارک ۱۹۵۰ء، ص۱۲۹، ۱۳۷ - ۱۳۸

71. ***Encyclopaedia of Religion and Ethics*, art. "Miracle".**

72. **James Hastinga, *Dictionary of Bible*, Edinburgh, 1914, art. "Miracle".**

۷۳ "کتاب جامع الصحیح" طبع لیڈن ۱۹۰۸ء، جلد (۴)، ص۴۱۹

۷۴ قرآن ۹۸/آیت ۵

۷۵ قرآن ۳۵/آیت ۲۴

۷۶ قرآن ۱۳/آیت ۷

۷۷ قرآن ۱۶/آیت ۳۶

۷۸ قرآن ۱۱/آیت ۲۵، ۱۱/آیت ۵۰، ۱۱/آیت ۶۱، ۱۱/آیت ۸۴

۷۹ قرآن ۳۴/آیت ۲۸

۸۰ قرآن ۱۱/آیت ۲

۸۱ قرآن ۳/آیت ۱۶۴

۸۲ قرآن ۶۸/آیت ۴

۸۳ مشکوٰۃ، طبع دہلی ۱۳۵۰ھ، ص۲۲۳

۸۴ "جواہر البحار" مؤلفہ یوسف اسمٰعیل النبہانی جلد (۱)، ص۵۵

۸۵۔ احیاء علوم الدین، جلد ۲، ص ۳۴۴

۸۶۔ "جواہر البخاری" مؤلفہ قصطلانی، طبع مصر ۱۹۴۰ء، صفحہ ۴

۸۷۔ قرآن ۲/آیت ۲۵۹

۸۸۔ قرآن ۲/آیت ۲۶۰

۸۹۔ قرآن ۲۸/آیت ۳۰-۳۴

۹۰۔ قرآن ۱۷/آیت ۱

۹۱۔ قرآن ۲۱/آیت ۶۹

۹۲۔ قرآن ۲۱/آیت ۸۱-۸۲

۹۳۔ قرآن ۲/آیت ۵۷

۹۴۔ قرآن ۲/آیت ۶۰

۹۵۔ قرآن ۳/آیت ۴۹

۹۶۔ قرآن ۳/آیت ۱۲۳-۱۲۵

۹۷۔ "مشکوٰۃ" کتاب المعجزات

۹۸۔ قرآن ۸/آیت ۱۰

۹۹۔ "مشکوٰۃ" کتاب المعجزات

۱۰۰۔ قرآن ۲۰/آیت ۷۰

۱۰۱۔ قرآن ۲۰/آیت ۷۲-۷۳

۱۰۲۔ "جامع ترمذی" طبع دہلی، جلد ۲، ص ۱۵۱

۱۰۳۔ قرآن ۷/آیت ۶۴، ۷/آیت ۷۲، ۶/آیت ۳۳

۱۰۴۔ قرآن ۶/آیت ۳۳

۱۰۵۔ قرآن ۶/آیت ۳۴

۱۰۶۔ قرآن ۳/آیت ۱۳۷

۱۰۷۔ قرآن ۱۷/آیت ۵۹

۱۰۸ قرآن ۲۱/آیت ۱۰۷

۱۰۹ "Religion of Islam" مؤلفہ محمد علی طبع لاہور ۱۹۳۶ء ص ۲۴۱

۱۱۰ "مکتوبات" شیخ احمد سرہندی۔ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی ملاحظہ کریں۔ "معجزہ پیغمبری کا ثبوت نہیں ثمر دیکھ)
ہے۔" (مجلۃ الاسلام - دیوبند ۱۳۵۹ء ص ۳۱)

۱۱۱ قرآن ۲۸/آیت ۷۸ ۱۱۲ قرآن ۳/آیت ۴۹

۱۱۳ "کتاب الاربعین" حیدر آباد دکن ۱۳۵۳ء ، ص ۳۱۶

۱۱۴ قرآن ۱۰/آیت ۱۶ ، ابن مسکویہ پیغمبر اور غیر پیغمبر کے درمیان فرق ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے

«اما النبي المرسل فانه يتميز عن الناس بخصال كثيرة أحدها ان للمرسل ما لا يجتمع إلّا فيه و يتميز بها عن غيره ولا تكون مجتمعة في سواه»

بھیجا ہوا پیغمبر بہت سی خصوصیات کی بنا پر دوسرے انسانوں سے ممتاز ہوتا ہے - ایک خصوصیت یہ ہے کہ تمام نیک صفات پیغمبر کے علاوہ کسی دوسرے میں جمع نہیں ہوتیں، اور وہ انہیں خصوصیات کے نتیجہ میں دوسرے انسانوں سے بلند ہوتا ہے -

۱۱۵ غزالی جس نے درج ذیل عقیدہ پر زور دیا ہے :

« فمن ذلک الطريق فاطلب اليقين بالنبوة لا من قلب العصاء ثعباناً وشق القمر »

پیغمبر کی پیغمبری کو ماننے کے لیے اس کا کردار کافی ہے ، عصا اژدھا میں بدل جائے اور چاند کے دو ٹکڑے ہو جائیں تو ماننے میں کیا لطف ہے -

۱۱۶ قرآن ۱۷/آیت ۹۰ - ۹۳ ، ۱۵/آیت ۷ - ۱۵ ، دیکھئے " سیرۃ النبویہ" مؤلفہ ابن ہشام طبع مصر ۱۹۳۶ء ، جلد ۲، ص ۳۱۶

۱۱۷ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دونوں قسموں پر مشتمل معجزات کے اعداد و شمار کے لئے دیکھئے "کتاب الاربعین" مؤلفہ رازی، ص ۳۰۹ - ۳۱۶

۱۱۸ قرآن ۲۱/آیت ۲۶

118. Cf. *Ency. of Religion and religions* by E.R. Pike, art. "VISHNU".

۱۱۹ء ابن رشد ، وہ عظیم مسلم فلسفی جس نے کہا :

«ينبغي ان تفهم الأمر في دلالة المعجز على الأنبياء.أعني ان المعجز في العلم والعمل هو الدلالة القطعية على صفة النبوة.واما المعجز في غير ذلک من الأفعال فشاهد ومقو.» (کتاب الکشف طبع مصر ۱۳۱۹ صـ۷۹)

معجزہ پیغمبری کا ثبوت ضرور ہے، لیکن اگر علم و عمل پر مبنی ہو ۔ یعنی جو معجزے علم و عمل کو فروغ دینے کے لئے انجام پاتے ہیں وہ پیغمبری کا ثبوت ہیں ۔ باقی دوسرے اس کی سچائی کی نشاندہی کرتے ہیں ۔

۱۲۰ء غزالی :

«ثم لا يتمارى في تواتر القرآن وهي المعجزة الكبرىٰ الباقية بين الخلق وليس لنبي معجزة باقية سواه.»

قرآن مجید کے تواتر میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ، اس لیے کہ سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا ہے۔ پیغمبر اسلام ص کا یہ وہ عظیم معجزہ ہے جو اب تک ہمارے سامنے باقی ہے ، اس کے سوا کسی دوسرے پیغمبر کا کوئی معجزہ دکھائی نہیں دیتا ۔

(احیاء علوم الدین ، طبع مصر ۱۹۳۹ء ، جلد ۲، ص۳۸۸ ۔ دیکھئے نفسی کی کتاب "العمدۃ" ص۱۵)

سید احمد صفر :

«ايده بمعجزات حسّية كمعجزات من سبقه من المرسلين وخصه بمعجزة عقلية خالدة وهي إنزال القرآن الكريم الذي لو اجتمعت الانس والجن على أن يأتوا بمثله لم يستطيعوا.»

خداوند کریم نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان معجزات کے علاوہ جو گذشتہ پیغمبروں کو دیئے تھے ، ایک بڑے عقلی معجزے سے بھی نوازا ، اور وہ ہے قرآن کریم جس کا جواب پیش کرنے کے لیے اگر دنیا کے تمام انس وجن بھی جمع ہو جائیں تو اس کا جواب نہیں تیار کر سکتے ۔

دیکھئے "مقدمہ اعجاز القرآن" مؤلفہ باقلانی ۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی

"عقلی معجزوں کی عظمت دوسرے معجزوں سے کہیں زیادہ ہے ۔"

"حجۃ الاسلام ، ۱۳۵۹ھ ، ص۳۱"

۱۲۱ء "Religion of Islam" مؤلفہ محمد علی ، طبع لاہور ۱۹۵۰ء ، ص۲۴۵

از :۔ فاضل لکھنوی

خواتین کی مردوں پر برتری

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۰
ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض ۰
للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن ۰
وسئلوا اللہ من فضلہ ۰
ان اللہ بکل شیئ علیما

(النساء ۔ آیت ۳۲)

اور اللہ نے جو تم میں ایک کو دوسرے پر برتری
عطا کی ہے اس کی ہوس نہ کرو۔
مردوں کو اپنے کیے کا حصہ ہے اور عورتوں کو اپنے کیے کا حصہ ہے
اور اللہ سے اس کے فضل و کرم کی دعا کرو۔
بے شک اللہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

پورا کرۂ ارض سمٹ کر ایک شہر اور شہر ایک گھر کی صورت اختیار کر چکے ہیں ۔
حمل و نقل، آمد و رفت، رسل و رسائل خبر اور اطلاعات نے سب کو سب سے قریب کر دیا۔
افریقہ میں طوفان آئے تو ایشیا میں ہلچل مچ جاتی ہے، ایشیا میں آئٹم بم کا دھماکہ ہو تو یورپ
میں ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ فرصت طلب اور بہانہ جو ڈاکو ان حادثات سے فائدہ اٹھاتے اور
اپنی برتری جتانے کے لیے کمزور، کم علم، کم سرمایہ اور کم آبادی والوں کو اپنا ممنونِ احسان

شکر گذار، دوست پھر غلام بنا لیتے ہیں ۔ آزادی ۔ ان کا نعرہ ۔ حقوق انسانی ۔ ان کا منشور ۔ غریب عوام ۔ ان کا راج ۔ مساوات ان کا وردِ وظیفہ ہے ۔

کبھی آپ نے سوچا ہے ؟ جس گھر میں آنکھ کھولی، جن گودیوں میں آپ پلی بڑھیں۔ جن ماؤں نے دکھ جھیلے، جن باپوں نے پاپڑ بیلے ۔ آپ ان کے سلسلے میں آسودگی، خوشی اور مسکراتی زندگی کی رنگینیاں محسوس کرتی ہیں یا نہیں ؟

جی ہاں !

دنیا میں ایسے معاشرے بھی ہیں جہاں بچے اسپتال میں پیدا ہوتے ہیں، نرسری میں تعلیم پاتے ہیں، ہوسٹلوں میں رہتے ہیں، پارکوں یا کلبوں میں نکاح کرتے ہیں اور ہوٹلوں میں مرجاتے ہیں ۔ انھوں نے نہ باپ کو پہچانا نہ ماں کی صورت دیکھی، نہ بہن بھائی سے روابط کا تصور ان کے ذہن میں آیا ۔ ضبطِ تولید کی دوائیں کھانے والے، نس بندی کرانے والے، بچوں کو پوڈر کا دودھ پلانے والے، اولاد کو گود میں نہ لینے والے گھرانے بھی ہیں ۔

یقین کیجئے ۔ ان معاشروں، ان گھروں اور اگر "خاندان" کہا جا سکے ۔ تو ان خاندانوں میں، ذہنی امراض ۔ اعصابی تکلیفیں، نفسیاتی بیماریاں اتنی ہیں، جن سے وہاں کے طرح طرح کے اسپتال بھرے ہوئے ہیں، اور حکومتیں عاجز ہیں اور یہ لوگ خود بھی ۔ ہپّی نشہ باز ۔ دنیا فراموش ۔ بن کر جوانی میں بن باس ہو جاتے ہیں اور بڑھاپے میں ۔ معذور افراد کی دیکھ بھال کرنے والے خیرات خانوں میں زندگی کے دن کاٹتے ہیں ۔

کیا آپ اجازت دیں گی ؟ اگر تہذیب نامی کوئی چیز ہے، اگر انسان تمدن کا فرد ہے، اگر آدمیت احترامِ آدمی کا نام ہے، تو ہر عقل مند، ان کو جانور ۔ بلکہ ان سے بدتر کہیے، کتیا، کتے، آوارہ کتے، جسے کاٹ لیں دیوانہ بنا دیتے ہیں ۔ وہ جدھر سے گذر جائیں بدبو پھیل جائے ۔ متمدن دنیا کے ننگے جنگلی، ترقی یافتہ شہروں کے کثیف انسان ۔ آئے دن ان کی داستانیں چھپتی، ان کی پیدائش، ان کی شادی، ان کے رومانس، ان کے مقابلہ حسن، ان کی طلاق، ان کی دوسری شادی . . . . بین الاقوامی اداروں کی رپورٹوں اور متعدد محکموں کے گوشواروں کے ذریعے دنیا میں پڑھے جاتے ہیں ۔ پھر آپ جانتی ہیں کہ ان کی موت کیسے ہوتی ہے ؟

یہ معاشرے دو طرح کے ہیں ۔ سرمایہ داری ۔ اشتراکیت دونوں میں ایٹم بموں کے گٹھے
سانوں کی پیٹھ پر ہیں، جیسے جنگل کے لکڑہارے، دونوں کو نشہ پلا کے مارا جارہا ہے اور دونوں کو عظیم
وم عظیم قوت کا دلفریب ترانہ گانے مجبور کردیا گیا ہے ۔ ایک معاشرے میں انسانیت گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہی
ہے اور دوسرے معاشرے میں آدمیت کے گلے میں سولی کا پھندا ہے ۔ ایک چیختے چیختے پاگل ہوگیا ہے ۔ دوسرا
ار پر لٹکے لٹکے مرگیا ہے ۔ مشرق و مغرب کے گھروں کا جائزہ تو لیجئے ۔ جرائم کی الگ رپورٹیں تو پڑھیے، پولیس
ور ڈاکٹروں کے مہیا کردہ اعداد و شمار، انبار در انبار ہیں ۔ معیار تعلیم پست تعلیم عام ہے ۔ پچاس فیصد ذہنی بیمار ۔
مگر صنعت و سائنس میں آگے ہیں ۔ خدا کے لیے اس ڈگر پر چلیں کہ معیار تعلیم بھی بلند ہو ۔ ذہنی تندرستی بھی عام ہو،
ذہن آزاد ہیں اور صنعت و سائنس میں بھی بڑے بن سکیں ۔ صاف و شفاف پانی پئیں ۔ عمدہ اور اچھا سودا کریں ۔
کیا ہوا کہ ۔ وہ سائنس میں آگے ہیں اور برہنہ ہیں ۔ ہم بھی ننگے ہوجاتے ہیں غور نہیں کیا ۔ وہ سائنس کے لئے
ہزاروں جتن کرتے ہیں، اپنے ذہین ترین افراد تلاش کرتے ہیں، دوسری قوموں کے ذہین ترین افراد کو غلام بناتے ہیں ۔
نہیں کمروں میں بند کرتے ہیں، ان سے دس دس گھنٹے، پندرہ پندرہ گھنٹے کام لیتے ہیں ۔ ذرا ان کے گھروں میں جھانک
کر تو دیکھیے ۔ وہ غریب نہ سینما دیکھ سکتے ہیں، نہ رقص کا وقت نکال سکتے ہیں، نہ کلبوں میں راتیں بسر کرنے کی مہلت
رکھتے ہیں ۔ وہ مشین بننے کے بعد مشین بناتے ہیں ۔ دس دس سال بیس بیس سال ایک ذرہ کو دیکھنے اور
یک جرثومے کو پالتے ہیں جب جاکر ایک زہریلا جوہر اور ایک طاقت ور دھماکہ کرنے کے قابل ہوتے ہیں ۔

تمام قوموں کی دولت ان کی جیب میں، بے شمار قوموں کی افرادی قوت ان کے زیر فرمان ہے ۔ آپ اپنے
خرچ میں کفایت شعاری برتیں، آپ ان کی عیاشی سے دور رہیں ۔ آپ اپنی نسل بڑھائیں ۔ آپ اپنی
ولاد سے افرادی قوت حاصل کریں ۔ کوا، آخر ہنس کی چال کیوں چلے ۔

آپ اس بھیڑ بھاڑ میں گم نہ ہوں، آپ اس میلے میں نہ جائیں ۔ نہ منزل سے دور ہوں گی ۔
نہ گرہ کٹے گی ۔ یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے لوگ مداری ہیں، وقت بھی ضایع کرتے ہیں اور پیسے
بھی وصول کرتے ہیں ۔ ان کا مقصد اپنا کام نکالنا ہے ۔ شراب ان کی پئیں دوسرے، فلم ان کی خریدیں
دوسرے، پیانو ان کا بجائیں آپ، چونکہ مزا آتا ہے اس لیے گھر لٹا دیتے ہیں ۔ گھر پھونک تماشا دیکھنے
والے ۔ اپنے بچوں، اپنی بچیوں بلکہ اپنے وجود، اپنی قوم اور اپنی تاریخ کے صفحہ ہستی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں ۔

علامہ اقبال نے ان گھرانوں، ان معاشروں کے دانا اور بینا مرد و زن سے کہا ہے :

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرے کا کمال مردِ بیکار و زنِ تہی آغوش

ایک مثالی گھر۔
مثالی معاشرہ
اس ناچتے تھرکتے، گرتے پڑتے، گولیاں چلاتے، زندگیاں لوٹتے، غلام بناتے، رگڑتے دباتے، جانوروں کی طرح منہ زوریاں کرتے معاشروں کے مقابلے میں۔ ایک معاشرہ، ایک نظام، ایک فلسفہ، ایک عملی دنیا اور بھی ہے۔

تربیت۔ اخلاق۔ عقیدے۔ اور توحید پر مبنی معاشرہ قرآن اور اسوۂ رسولؐ کے محور پر بڑھتے ہوئے دائروں کی شکل میں چاروں سمتوں اور شش جہات میں پھیلنے والا نظام جس کے تمام خطوط ایک مرکز سے گذرتے ہیں جس نے ایک کامیاب زندگی، روشن تاریخ اور تابندہ قوم جنم لیتی ہے۔ جس کی نقیب فاطمہؑ۔ اور جس کی قائد زینبؑ ہیں۔

ہمیں ایک ایسا گھر، ایک ایسا معاشرہ، ایک ایسا خاندان ایک ایسی قوم بنانا ہے، جو نئے سے نئے انکشافات سے دنیا کو فیض یاب کرے، مگر یادِ آخرت کے ساتھ۔ جو الگ الگ افراد ہوں تو رنگا رنگ پھول، جمع ہو جائیں تو گلستان، چمن ہو جائیں تو بہار۔ ایسے افراد جو اخلاق، علم، عمل، تقویٰ، محنت اور ذہانت کا بہترین نمونہ ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے والے اپنے پَر آپ اُڑنے والے، اپنے افق پر چمکنے والے، نہ مشرقی نہ مغربی۔ محمدی۔ علوی۔ فاطمی۔ زینبی۔ جعفری۔ یاد رکھیے، آپ کے دبستانِ ہدایت نے ہر قسم کے علم کو فروغ دینے کی سعی کی اور آپ سے اس راہ میں محنت کرنے کی خواہش کی ہم نہ سنیں، آپ بات نہ مانیں تو گناہ ہمارا ہے۔ گمراہی اور ہدایت کے راستے دکھا دیے گئے۔ کتاب آچکی۔ پڑھانے والے بنیادی سبق دے کر، مثالی عمل دکھا کر دوسرے عالم چھوڑ کر حجت تمام کر چکے۔ آیئے، سوچیے اور دیکھیے۔ تو پہلے اپنا گھر۔

اسلام نے گھر کو بہت اہمیت دی ہے۔ برکت اور ہدایت کا گھر ہی اصل گھر ہے۔

گھر ایسا ہو کہ جب کوئی آئے تو محبت کی خوشبو پائے، انس و ہمدردی کی فضا محسوس کرے، مسکراتے چہرے، شرمیلی آنکھیں، باحیا سراپا، باعفت دامن، بااخلاق سلوک، بھاری بھرکم میل جول، باعقیدہ بات چیت، باسلیقہ اٹھنا بیٹھنا ہو۔ جو آئے وہ کچھ سیکھ کر جائے جو نہ آتا ہو وہ بتا کر جائے۔ ایسے گھر کی تعمیر آرکیٹکٹ نہیں۔ ماں باپ کرتے ہیں بشرطیکہ وہ ذہنی طور پر سکون آشنا اور نفسیاتی طور پر متقی و خدا شناس و عاشق رسولؐ و آلِ رسولؐ ہوں۔

مثالی گھر۔ دنیا بھر کے گھروں میں عمدہ گھر وہ ہے جس کی شمع فروزاں، اور صبح خنداں، پاکیزہ نفس ماں ہو۔ گھر سے ماں اور باپ، پھر ان کے سائے میں ہنسنے بسنے والے بچے ہیں۔ ہماری دنیا میں گھر کے یہی معنی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے:

بہت رنگ بدلے سپہرِ بریں نے خدایا یہ دنیا جہاں تھی وہیں ہے

تفاوت نہ دیکھا زن و شو میں میں نے — وہ خلوت نشیں ہے، یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردے میں اولاد آدم — کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

زن و شو کی خلوتوں سے، جلوتیں پیدا ہوتی ہیں، ہونہار بچے اور خوبصورت پھول تا ریخ سازنا اولاد۔

خطبۂ نکاح میں حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد ایک آیت اور دو حدیثیں پڑھی جاتی ہیں پھر نکاح کے دو بول ادا ہوتے ہیں:

○ اور بے شوہر عورتوں اور اپنے صالح غلاموں اور کنیزوں کا بھی نکاح کر دیا کرو۔ اگر یہ لوگ محتاج ہو گئے تو اللہ اپنے فضل و کرم سے انھیں مال دار بنا دے اور اللہ تو بڑی وسعتوں اور بڑے علم والا ہے (النور۔ آیت ۳۲)

□ نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے روگرداں وہ مجھ سے نہیں □ نکاح کرو، نسل بڑھاؤ۔ میں قیامت کے دن دوسری امتوں کے سامنے (اپنی کثرت امت) پر فخر کروں گا خواہ ساقط شدہ فرد کیوں نہ ہو۔

مرد، نیک، سمجھ دار اور صالح ہو۔ عورت باعفت، اور مومنہ ہو۔ مقصد صالح اولاد پیدا کرنا ہو۔ روزی میں وسعت خدا دینے والا ہے اور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تمھاری اولاد کو سرمایۂ افتخار بنا سکیں۔

ہوس رانی اور عیش و عشرت جب نکاح جیسے پاک عمل میں ملحوظ نہیں تو پھر کہاں اس کا جواز رہ جاتا ہے جب قابل فخر اولاد مقصود و مدعا ہو تو ماں باپ کے فرائض بڑھ جائیں گے۔

تربیت: اللہ کی پسندیدہ اور رسولؐ و آلؑ کی گردیدہ اولاد کی تربیت عبادت ہے۔ باپ کی چشم نمائی اور ماں کی ادب آموزی ننھی سی جان میں روح پاک بیدار کرے گی۔ بچہ بولا تو "اللہ، اللہ" زبان چلی تو اللہ ایک پنجتن پاک۔ اور بڑا ہوا تو کلمہ۔ اصول دین۔ فروع دین۔ مجلس ہوئی تو انیس اور دبیر کی رباعیاں۔ روانی آئی تو اساتذۂ ادب کے سلام اور مرثیے۔ قوت گویائی بڑھی تو سیرت پاک پر تقریر۔ فضائل علیؑ پر بیان اور کربلا پر اظہار خیالات کی راہیں کھائی جانے لگیں۔ یہ سب بنیادی طور پر ماں پھر باپ اور بڑے بھائی بہن کا کام اور تربیت کا بہترین طریقہ ہے۔

بچے اور بچیوں کی صلاح و فلاح، ان کی اخلاقی و فکری تربیت سینٹ جوزف اور کنڈر گارڈن میں نہیں ہو سکتی وہ عیسائی چرچوں کے ادارے ہیں، وہ مذہبی اوقاف سے چلنے والی درسگاہیں ہیں۔ وہاں کے تربیتی اصول آوانہ ذہن اسلام سے مختلف آداب سے آشنا کرنے کی مہم پر مبنی ہوتے ہیں۔ ننھے منے بچوں کو ایسے اداروں میں بھیجنے کے دو مقصد ہیں (۱) بچے خالی نہ پھریں (۲) ماں کے پاس وقت نہیں ہے۔

بچے خالی نہ پھریں، اس لیے اسکول میں داخل کرنا۔ اگر اس خیال سے ہے کہ وہاں پڑھیں گے، تو غلط ہے، بچے وہاں غلط طور طریقے سیکھتے ہیں، بچے وہاں خالی پھرتے ہیں، بچے وہاں ناجنس صحبت میں رہتے ہیں۔ وہاں زیادہ سے زیادہ فیس اور کم سے کم کام ہوتا ہے۔ بچہ گلی میں نہ پھرا نرسری میں اسکول نامی گراونڈ میں پھرا اور بچے دل جا کر

لیجئے کہ ماں اور خالہ، بہن اور بھائی کیا کرتے رہے۔ تین تین، چار چار سال کے بچوں کو اپنی بلا ٹالنے کے لیے گھر سے نکالنا اور اس معصوم کے لیے وقت نہ نکالنا خطرناک جرم ہے۔ بچہ اس عمر میں ماں سے دور رہنے کا سبق سیکھ لیتا ہے۔ وہ آوارگی، مٹھاس اور ذہنی قربت فراموش کر دیتا ہے۔ وہ ماں کے بغیر خالی پھرتا ہے اور ماں کے پاس وقت نہ ہونے کی سزا بھگتتا ہے۔ اس عمر میں بچے کو اپنے سائے میں رکھیے، یہ کچی کونپل جدھر موڑیے مڑ جائے گی۔ اسے گھر سے غیروں کے ساتھ رہنے کی عادت نہ ڈالیے جب اس کی حس بیدار ہو گی تو "اماں کے پاس وقت نہ ہونے" کی وجہ وہ باہر ہی گھومے گا، پارک، بس اسٹاپ۔۔۔

لڑکیوں کی تربیت : لڑکیاں اس سلسلے میں زیادہ توجہ طلب ہوتی ہیں۔ آپ کو برا لگے گا مگر رہنمائے بشریت امام جعفر صادقؑ جیسے علم پرور امام نے فرمایا ہے:

"ان لڑکیوں کو حبِ امیر المؤمنینؑ میں پختہ کرو اور اپنی مفروضہ "نادانی" پر رہنے دو" (الوسائل ج ۱۴ ص ۱۲۷)

علیؑ کی محبت کے معنی ہیں، حضرت امیرؑ کی ذات و تعلیمات سے آشنا کرو۔ سیدۂ عالمیہؑ کا بچپنا فراموش مت کرو، اس کم سن بی بی نے اپنی دولت مند ماں کی گود میں پلنے اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ جیسے عظیم باپ کی محبت میں بڑھنے کے باوجود، دین کی راہ میں کس قدر استقلال، ہمت اور مجاہدے سے کام لیا۔ دین و مقصدِ دین پر بچیوں کو پالو اور حضرت زینبؑ کی طرح راہ خدا میں جہاد کی تربیت دو، بچی کو یوں پردے میں رکھو کہ ہوش سنبھالنے کے بعد اسے بے پردہ صورتوں سے خوف و نفرت ہو جائے۔ ہم سب کی پیشوا حضرت فاطمۂ زہراؑ نے فرمایا ہے۔ "حجاب، عورتوں کا سب سے اچھا زیور ہے"۔ اگر عورت مرد کے برابر ہے۔ تو اس بچی کو ایسا دین و اخلاق، سوجھ بوجھ، علم و ہنر سکھاؤ کہ واقعاً وہ مردوں کے لیے باعث رشک بنے۔

بچیوں کا رنگارنگ کپڑے پہننا، بچوں کے ساتھ اسکول کے میلوں میں جانا، ان کا تھرکنا، مل کر بے معنی نظمیں پڑھنا، پھر راستے میں چھیڑ چھاڑ، بس اسٹاپ پر بڑی لڑکیوں سے بڑے لڑکوں کی شرارت اور شریر لڑکیوں کا عجیب عجیب باتیں کرنا ایسا ایسی ثقافت، ایسی تہذیب اور ایسے معاشرے سے قریب کرتے ہیں بہرحال مدد دیتی ہیں، جس سے اسلامی گھر کو پاک ہونا چاہیے یہ بچی کل ویسی ماں کیسے بنے گی جس کے احترام کا حکم خدا اور رسولؐ نے دیا ہے۔

اسکول کیوں بھیجا؟ کہ وقت نہیں تھا اور گھر میں دیکھ بھال نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے، عذر معقول ہو۔ مگر کہیں ماں باپ سنیما تو نہیں جاتے؟ اس کے لیے وہ وقت بچا کر رکھتے یا نہیں؟ دونوں بازار کے چکر لگاتے ہیں؟ بچہ یا بچی باہر سڑکوں گلیوں اور میدانوں کے تماشے دیکھ کر پلٹتی ہے تو خالی کمرے میں ریڈیو کے گانے اور ٹیلی ویژن کے بے معنی کارٹون۔۔۔۔ تو اس کا استقبال نہیں کرتے؟ نہیں، بچی کو اسکول اس لیے بھیجا تھا کہ گھر خالی رہے اور اب ریڈیو ٹیلی ویژن اس لیے کہ بچے بچیاں اس میں لگی رہیں اور گھر میں شور نہ ہو۔

نتیجہ کیا نکلا؟ ماں نے اولاد کو گھر سے باہر رہنے، گھر کے اندر یقیناً بری عورتوں اور برے مردوں کی عملی حالت اتنی مرتبہ دکھائی کہ اس کے ذہن میں نقش بن گئی۔ وہ غیر ارادی طور پر مٹکنے لگی جیسے جسم فروش ناچتی ہے۔ وہ اس طرح تیور بدلنے لگی جیسے لنلاق کے ڈاکو حملہ کرتے ہیں، اس کی صوت و صدا اس کی رگ رگ، اس کی بوٹی بوٹی ایسے حرکات و سکنات سے مانوس ہو گئی جیسے......

اب وہ لڑکوں کی سیٹیوں سے اگر خوش نہیں ہوتی تو غصہ بھی نہیں کرتی، وہ اگر باہر نکلنے کی خواہش کرتی اور تنو کیس میں ایک جوان کے جسم پر بلاؤز دیکھتی ہے تو نظر ہٹاتی بھی نہیں وہ دیواروں پر آگ لگتی تو پ بندوق کے سامنے دو لڑکے اور لڑکیوں کو گلے ملتے دیکھتی ہے وسینما کا جیسا مزہ لیتی ہے۔ اب اسے گھر کی چار دیواری اچھی نہیں لگتی۔ پردہ تو بڑے چھوڑ ہی چکے.... بتلائیے ایسے لڑکے جیسے باپ اور ایسی لڑکیاں دوست داران اہل بیت اور کنیزان فاطمہؑ و زینبؑ بن سکیں گی؟؟

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے　　　روشن ہے نگہ، آئینۂ دل ہے مکدر

بڑھ جاتا ہے جب ذوقِ نظر اپنی حدوں سے　　　ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

طالبات: بچیاں، اسکول سے کالج اور کالج سے یونیورسٹی میں پہنچتی ہیں تو گھر کی غفلت سے زیادہ لڑکا بن جاتی ہیں۔ بے باک، دلیر، آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات کرنے والی۔ دریدہ دامن.... یہ لڑکیاں عائلی زندگی اور گھریلو معاشرت سے بڑی حد تک بدل جاتی ہیں شوہر اور اولاد سے ان کا طرزِ بود و ماند دوستانہ یا افسرانہ یا قانونی قسم کا ہوتا ہے۔ اس لیے مستقبل کی پیش بندی کے طور پر ماں سوچ سکتی ہے کہ اس لڑکی کی اٹھان کیسی رکھی جائے۔ نسوانی حس، معاشرتی رجحان اور فکری۔ دینی و اخلاقی مزاج کو نگاہوں میں رکھیں۔ ایسی لڑکیوں کی تربیت میں ذرا سی غفلت زندگی کو وبال بنا دیتی ہے۔

اعلیٰ ذہنی و فکری تربیت کے لیے مجتہد کا مجموعہ مسائل "توضیح المسائل"۔ سورۂ نور کی تفسیر اور سیرت ام المومنین خدیجہ و فاطمہ زہراؑ.... پڑھنے پڑھانے پر خاص توجہ دیں۔ نماز کی پابندی اور امر بمعروف و نہی عن المنکر پر نظر رکھیں۔

مجلس و ماتم: کچھ گھروں میں مجلس و ماتم، میلاد و وعظ عام طور سے ہوا کرتے ہیں، کچھ گھروں میں کبھی کبھی۔ کچھ لوگوں کے یہاں شرکت کی رسم ہے گھر میں یہ انتظام نہیں ہوتا مگر.... کی کہانی۔ لکڑہارے کی کہانی۔ کی رسم نئی نئی چل نکلی ہے ہم جانتے ہیں کہ کہانی کے نام جو کچھ پڑھا جاتا ہے اسے اہل دانش خواتین بھی نہیں سنتیں۔ نہ سننا چاہیے۔

محرم، صفر، ربیع الاول، شعبان، رمضان پانچ مہینے بہت اہمیت رکھتے ہیں تربیت اور تقویٰ، دینی تعلیم اور فکری نشوونما کا اچھا ماحول قائم ہوتا ہے مجلس و ماتم میں پرخلوص شرکت، بہ اہتمام حصہ لینے کی سعی اور تقریر و تحریر، مرثیہ و ماتم توجہ سے سننا اور پڑھنا چاہیے۔ لڑکیاں دو ماہ تک شہادت امامؑ و تاریخ کربلا پر غور کریں تو بڑے اچھے نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کربلا ہماری طرح کی رہنما ہے۔

ربیع الاول، حضرت خاتم الانبیاءؐ سے خصوصی نسبت رکھنے والا مہینہ ہے، اس میں میلاد و جشن رسمی طور پر نہیں،

عقلی انداز میں منعقد ہوں، سیرت، اسلام، تعلیمات و تاریخ کا مطالعہ، رسائل و مجلات کا مطالعہ کیا جائے۔

شعبان، حضرت ولی عصر امام آخر الزمان عجل اللہ فرجہ کے جشن ولادت کا مہینہ ہے، اس مہینے میں اپنے امام کی معرفت اور بہ حیثیت مسلمان کے اپنے فرائض سے باخبری اور تجدید عہد کرنے کی طرف توجہ دینا دلانا چاہیے۔

ماہ رمضان خواتین اور لڑکیوں کی گھریلو مصروفیتوں میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ رنگا رنگ پکوان افطاری کا اہتمام سحری کے لیے اٹھنا، قرآن پڑھنا اور سننا! اس موقع پر اگر خاندان کی بڑی بوڑھیاں اور پڑھی لکھی بی بیاں ذرا سی توجہ دیں تو بچوں کے نفسیات کی جلا، تقوے کی جانب بڑھنے، تو بہ کرنے، دل کو قابو میں رکھنے، غریبوں کی خبر گیری اور بے شمار پہلوؤں کی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ فکری تربیت کا یہ بہترین مہینہ ہے۔

محرم اور رمضان کو اچھے گھر، پاک ضمیر گھر والے پہچانے جاتے ہیں۔ تعلیم یافتہ خوش حال گھروں کو ان دنوں اپنے فرائض پر توجہ دلانا "ماں" کا فریضہ ہے اور ایسے ہی گھروں کی قرآن میں تعریف کی گئی:

"ایسے گھروں میں ذکر خدا کی گونج رہتی ہے۔"

اگر خواتین ان مواقع پر مردوں کو راہ اسلام پر لانے اور طریقۂ رسولؐ و آلِ رسولؐ پر فرمانِ خدا کی تعمیل کرنے پر زور دیں تو انھیں دوہرا شرف و اعزاز ملے گا۔ مردوں کو اپنی نیکی کا صلہ اور خواتین کو اپنی دو نیکیوں کے دو صلے۔

○

اسلامی اصول و ضوابط کی روشنی میں

عورت، قابل عزت و حرمت ہے۔

عورت، بے حق و مسلوب الاختیار نہیں ہے۔

عورت، باعتبار بیٹی کے پیاری، با احترام اور رحمت ہے۔

عورت، باعتبار بیوی کے زندگی کی بہترین یا بدترین رفیق ہے۔ مرد بھی بیوی کے لیے کبھی رحمت اور کبھی زحمت ہوتا ہے۔

عورت، باعتبار ماں کے اولاد سے برتر ہے۔

عورت، باعتبار تقویٰ مرد سے بلند ہے تو خدا کے یہاں اسے برتری حاصل ہے۔

عورت، باعتبار عمل خیر و اطاعت خدا، باعمل مرد کے برابر ہے اور بندگی خدا میں زیادہ آگے جانے والی خدا کے حضور مرد سے برتر انعام حاصل کرے گی۔

عورت، باعتبار تربیت چونکہ زیادہ مؤثر حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اگر وہ اچھی تربیت کا مظاہرہ کرتی ہے تو معاشرے اور تاریخ میں اپنی برتری کی دستاویز مہیا کرتی ہے۔

○

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت　　ہے حضرت انسان کے لیے اس کا ثمر موت

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن　　کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن　　ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

●●

جناب منتظر عباس نقوی
(پاکستان)

اخلاقیات کے مابعدالطبیعاتی مسلمات

دنیا کے بیشتر علوم کی اساس کسی نہ کسی ایسے مابعدالطبیعاتی مسلّمہ یا مفروضہ پر ہوتی ہے، جس کا وجود کسی ثبوت کا مقتضی نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ وہ مسلّمہ خود اپنی بنیاد پر قائم ہونے والے تمام نتائج کا ثبوت ہوتا ہے۔ اخلاقیات کے لیے بھی کسی ایسے مسلّمہ کا وجود تسلیم کر لینا ناگزیر ہے۔ البتہ یہ سوال کسی حد تک متنازع فیہ ہوسکتا ہے کہ کیا یہ مسلّمہ یا مسلّمات طبیعاتی ہونے چاہییں یا مابعدالطبیعاتی؟ بیشتر اخلاقی نظام "کسی نہ کسی مابعدالطبیعاتی ہونے چاہئیں۔" اصول کو ایک مسلّمہ کی حیثیت میں قبول کرنے کے حق میں ہیں، خاص طور پر خیر کا تعلق ارادہ کی آزادی یا اختیار کا تصور ایسے اصول ہیں جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے مابعدالطبیعاتی ہیں اور ان اصولوں کے بغیر ظاہر ہے کہ اخلاقیات کی عمارت کھڑی نہیں ہوسکتی۔

بعض اخلاقی نظام بظاہر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مابعدالطبیعات کے سہارے کے بغیر بھی اخلاقی نظام پیش کر سکتے ہیں ایسے اخلاقی نظام دو طرح کے ہیں ایک تو وہ جو اخلاقیات کی بنیاد انسانی نفسیات کے کسی خاص پہلو (مثلاً لذت یا مسرت) یا پھر فطرت کے کسی قانون (مثلاً ارتقاء) کو اخلاقی عمل کی اساس قرار دیتے ہیں اور دوسرے

وہ نظام ہیں جن میں فرد کے انفرادی جذبات اور خواہشات ہی اس کے کسی عمل کا جواز ہوتی ہیں۔ لیکن کیا ایسے کسی نظام کا یہ دعویٰ درست ہے کہ وہ مابعد الطبیعات سے ماورا ہے؟ اور اگر اس کا یہ دعویٰ درست ہے، تو کیا ایسے نظام کو اخلاقیات کا نظام کہا جا سکتا ہے؟ غالباً ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہوگا۔ وہ اس لئے کہ پہلے مکتبِ فکر کے نقطۂ نظر کو تسلیم کرنے کی صرف دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو یہ سمجھا جائے کہ نفسیات یا فطرت کا کوئی اصول انسان کے عمل کا لازمی محرک ہوتا ہے۔ اس صورت میں تمام انسانی افعال اس اصول کے تابع ہو جاتے ہیں۔ فرد کا ارادہ، اختیار اور آزادی بالکل ختم ہو جاتی ہے، اس طرح انسانی اعمال ارادی اور اختیاری ہونے کے بجائے میکانکی ہو جاتے ہیں اور ظاہر ہے کہ میکانکی افعال پر اخلاقیات کا اطلاق نہیں ہوتا۔ کیونکہ اخلاقیات کے لیے اختیار کا ہونا ضروری ہے۔ اس مکتبِ فکر کے نقطۂ نظر کی دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ کسی فطری یا نفسیاتی اصول کو انسان کا نصب العین قرار دے کر یہ کہا جائے کہ ان کے لیے اخلاقی طور پر ضروری ہے کہ وہ اس نصب العین کے حصول کی کوشش کرے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوگا کہ کسی خاص اصول کو نصب العین قرار دینے کی کیا وجہ ہے؟ مثلاً حصول لذت ہی کیوں نصب العین ہو حصول اہم کو کیوں نہ نصب العین قرار دیا جائے؟ چنانچہ اس سوال کے جواب میں ضروری ہو جائے گا کہ اس اصول کے جواز کے لئے کسی اور اصول کا سہارا لیا جائے اور اس طرح بات پھر مابعد الطبیعات تک پہنچ جائے گی۔

غیر مابعد الطبیعاتی اخلاقیات کی دوسری صورت کا یہ دعویٰ کہ فرد کے انفرادی جذبات و محسوسات ہی کو اخلاقیات کی اساس قرار دینا چاہیے، اپنی جگہ پر غیر مکمل ہے کیونکہ اولاً فرد کی اخلاقیات انفرادی اور موضوعی ہونے کی وجہ سے کوئی نظام نہیں بن سکتی۔ ثانیاً انفراد کی جذبات کو اخلاقیات کی اساس قرار دینے کے لیے ہمیں لازمی طور پر مابعد الطبیعات کا سہارا لینا پڑے گا۔ کیونکہ انفرادی جذبات کو قابل عمل قرار دینے سے پہلے ہمیں یہ ماننا ہوگا کہ فرد کے جذباتی فیصلے اجتماعی عقلی فیصلوں پر فوقیت رکھتے ہیں اور فوقیت کا یہ مفروضہ ظاہر ہے کہ ایک مابعد الطبیعاتی مفروضہ ہے۔

الغرض اخلاقیات کی کوئی بھی صورت ہو، خواہ نفسیات یا فطرت جیسے طبعی محرکات پر مبنی ہو یا فرد کے ذاتی جذبہ پر استوار ہو مابعد الطبیعات سے قطعاً غیر متعلق ہونے کی دعوی دار نہیں ہو سکتی۔ اخلاقیات کے لئے مابعد الطبیعاتی مسلمات کا وجود ناگزیر ہے ورنہ اخلاقیات کا اپنا وجود باقی نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر اخلاقی نظاموں کی بنیاد مابعد الطبیعاتی مسلمات ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ مختلف اخلاقی نظاموں میں ان مسلمات کی نوعیت جداگانہ ہے۔ اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ علی ابن ابیطالب علیہ السلام کا اخلاقی نظام کن مابعد الطبیعاتی بنیادوں پر استوار ہوا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا مسلّمہ وجود خدا ہے اخلاقیات کی ضرورت عالمگیریت اور معروضیت کی توجیہ کے لیے خدا کا اقرار اسے تمام اقدار خیر کا خالق ہونے اور اس کی عادلانہ حیثیت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں وجود خدا کے اعتراف کی اہمیت پر بحث کرنے سے پہلے حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے عقیدۂ خدا کی توضیح ضروری ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کا تصوّر خدا مذہبی تصورات خدا میں غیر معمولی طور پر منفرد ہے۔ اسلام سے پہلے جن مذاہب نے دنیا کے سامنے خدا کا تصوّر پیش کیا ان میں سے بیشتر تصورات انسانی عادات و اطوار سے اخذ کئے گئے تھے۔ عیسائیت اور اس سے پہلے یہودیت کا خدا ایک شخصی وجود کی حیثیت رکھتا ہے جو انسانی صفات کے نقطۂ کمال پر فائز ہے، یہ خدا ایک مذہبی آدمی کے لئے تو قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن فلسفیانہ نقطۂ نظر سے یقیناً نامکمل اور ناقص سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ فلسفہ اور مذہب شروع سے ہی دو مختلف اداروں میں تقسیم ہو گئے کیونکہ ان کے درمیان تصوّر خدا کا اساسی فرق تھا جس کی وجہ سے دونوں میں اشتراک مشکل تھا۔ مذہبی تصوّر خدا کو فلسفیانہ لہجہ میں سمجھانے کی پہلی کوشش اسلام نے کی اور اس کوشش کی واضح ترین صورت حضرت علی علیہ السلام کے افکار میں ملتی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک "دین کی ابتداء و اساس خدا کی معرفت ہے، کمال معرفت اس کی تصدیق ہے، کمالِ تصدیق توحید ہے، کمال توحید تنزیہہ و اخلاق ہے، اور کمال تنزیہہ و اخلاق یہ ہے کہ اس سے صفتوں کی نفی کی جائے۔" یہ جملے اخلاقیات اور اس کے

مابعد الطبیعاتی اساس کی توضیح کرتے ہیں۔

دین وہ عملی نظام ہے جسے مذہب شریعت کا اور فلسفہ اخلاقی نظام کا نام دیتا ہے علیؑ ابن ابیطالبؑ کے نزدیک اس اخلاقی نظام کی اساس خدا کی معرفت ہے یعنی تصوّر خدا کے بغیر کسی اخلاقی ضابطہ کا وجود ممکن نہیں۔ ملک، قوم، معاشرہ یا فرد کی اساس پر بھی اخلاقی نظام تشکیل دیے گئے ہیں، لیکن ان تمام نظاموں کو عالمگیر حیثیت نہیں دی جا سکتی، کیونکہ ان سب کی بنیاد ایک مخصوص جماعت ہے اور ایک مخصوص جماعت کو نصب العین قرار دیکر جو عمل بھی کیا جائے گا وہ لازمی طور پر دوسری جماعتوں یا دوسرے افراد کی نفی کرے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ اخلاقیات کی اساس کوئی ایسی عالمگیر چیز ہو جو تمام افعال کے لیے قدر مشترک کا کام دے سکے۔ حضرت علیؑ کے نزدیک یہ عالمگیر اساس خدا کی ذات ہے۔ اس نظریہ کا یہ فائدہ بھی واضح ہے کہ اگر ہم کانٹ کی طرح کسی قانون کو عالمگیر قرار دے کر اسے واجب العمل سمجھ لیں تو یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ کوئی قانون کن وجوہات کی بنا پر عالمگیر بن گیا اور آخر اسے کیوں واجب العمل سمجھا جائے؟ جب کہ اخلاقیات کی بنیاد خدا کو قرار دینے سے یہ دونوں سوال پیدا نہیں ہوتے کیونکہ کسی عمل یا اصول کو خدا کی طرف منسوب کرنے سے وہ اصول خود بخود عالمگیر بھی بن جاتا ہے اور واجب الاطاعت بھی۔ چنانچہ ایک درست اخلاقی نظام کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کے تصوّر کو ایک مسلّمہ کی حیثیت سے قبول کرے۔ ورنہ کسی اور بنیاد پر قائم ہونے والا نظام نہ تو معروضی ہوگا نہ قطعی اور نہ عالمگیر۔

اب چونکہ کسی اخلاقی نظام کے لیے خدا کا تصور ضروری ہے اس لیے اخلاقیات کو ضابطۂ حیات بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تصور خدا کی تصدیق کی جائے تصدیق علم کا وہ بلند ترمرتبہ ہے جہاں علم صرف معلوم ہی نہیں رہتا بلکہ مؤثر بھی بن جاتا ہے یعنی اخلاقیات کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں کہ ایک خدا ہے بلکہ اس خدا کو کائنات کی علت، کائنات کا آغاز و ابتداء اور مقصود و منتہا ماننا بھی ضروری ہے۔ خدا کو ہر جگہ موجود اور ہر شے سے باخبر ماننا تصدیق کی بنیادی شرط ہے اور اس شرط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی افعال کے لیے تحریک بھی ملتی ہے رہنمائی بھی اور نگرانی کا احساس بھی۔ اخلاقیات کا یہ سوال کافی اہم ہے کہ اخلاقی احکام کے نافذ کرنے کا اختیار کس کے پاس ہونا چاہیے؟ خدا کی تصدیق کا اصول اس مسئلہ کو اس طرح حل کرتا ہے

کہ اگر خدا کی تصدیق درست طریقہ پر کر لی جائے تو کسی بیرونی قوت کی ضرورت نہیں ہوگی جو اخلاقی احکام پر عمل کرائے، یہ احساس اپنی جگہ پر خود ایک زبردست قوت ہے کہ نصب العین کے حصول کی کوشش کے سلسلہ میں قدم قدم پر میری نگرانی ہو رہی ہے اور ایک بالاتر مافوق الفطرت ہستی میرے مثبت اقدامات میں میری معاون اور منفی افعال میں مزاحم ہے۔ تصدیق کا یہی وہ اصول ہے جس کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہا تھا کہ "خدا کے احکام اس طرح پورے کرو گویا تم اس کے سامنے ہو۔ اگر یہ مقام حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو یہ سمجھ لو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے اور اس کے بعد اپنے فرائض ادا کرو[۲]۔"

تصدیق کا یہ اصول اخلاقیات کو محض ایک معاشرتی رویہ کی سطح سے بلند کر کے انسان کی انفرادی، ذاتی اور قطعاً شخصی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے وہ اخلاقی ضوابط جو اپنے نفاذ کے لیے سیاسی اقتدار، ریاست یا معاشرہ کے سہارے کو ضروری سمجھتے ہیں ان کا دائرۂ اختیار انسانی زندگی کا ایک مخصوص حصہ ہوتا ہے۔ جبکہ خدا کے ہمہ وقت اور ہمہ جا موجود تصوّر کے تحت ہونے والا اخلاقی عمل کسی مخصوص وقت یا جگہ کا پابند نہیں ہے۔ انسان کائنات کے ہر گوشے میں اور زندگی کے ہر لمحے میں اخلاقی احکام و قوانین کا پابند ہے چنانچہ اخلاقی اصولوں کو نفاذ کے اعتبار سے عالمگیر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ تصورِ خدا کے ساتھ ساتھ اس کی مکمل تصدیق بھی کی جائے۔

لیکن معرفتِ خدا اور تصدیقِ خدا کی اصطلاحیں یہ نہیں بتاتیں کہ خدا کے تصوّر کی کون سی صورت ممکن ہے اس سوال کا جواب توحیدِ خدا ہے اخلاقیات کے لیے جس خدا کی ضرورت ہے اس کے لیے وحدت لازمی ہے، اس لیے کہ کائنات کو کسی ایک اصول کے تحت لانے کے واسطے اور انسانی افعال کا مقصود واحد قرار دینے کی خاطر انھیں کسی واحد اور بسیط تصوّر کے تابع کرنا ضروری ہے ایک سے زیادہ خدا کا تصوّر نہ تو منطقی طور پر قابلِ قبول ہے، نہ اخلاقی نقطۂ نظر سے۔ کیونکہ ایک سے زیادہ خداؤں کے تصوّر کا مطلب یہ ہوگا کہ ان خداؤں کی نسبت سے انسان کے نصب العین بھی ایک سے زیادہ ہیں اور نصب العینوں کی کثرت سوائے انتشار و تخریب اور بے عملی کے اور کچھ نہیں۔ علی ابن ابیطالبؑ کی اخلاقیات میں مقصد یا نصب العین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اگر یہ نصب العین ایک سے زیادہ ہوں تو عمل کے کئی محور اور کئی مرکز ماننے پڑیں گے جو یقیناً ایک منطقی غلطی

ہوگی۔اس لئے خدا کے لیے وحدت کا یقین ناگزیر ہے۔

لیکن یہ وحدت ہندسی اکائی کی سی وحدت نہیں ہے اس سلسلہ میں حضرت علیؑ کا ارشاد یہ ہے کہ "یہ قول کہ خدا ایک ہے چار معنوں کا حامل ہو سکتا ہے۔ان میں سے دو معنی خدا کے لیے درست نہیں ہیں اور دو معنی درست و صحیح ہیں وہ معنی جو خدا کے لیے درست نہیں ہیں (وہ یہ ہیں) کہ کہنے والا گویا ایک کہے اور اس کا مقصد یہ ہو کہ وہ اعداد میں سے ایک ہے۔یہ خدا کے لیے جائز نہیں ہے۔اس لیے کہ جس کا ثانی نہ ہو وہ اعداد میں سے نہیں ہو سکتا۔کیا نہیں دیکھتے ہو کہ جس نے یہ کہا کہ خدا تین میں کا تیسرا ہے وہ کافر ہے۔اسی طرح سے اگر کوئی خدا کو ان معنوں میں ایک کہے جیسے یہ کہتے ہیں کہ وہ شخص آدمیوں میں سے ایک ہے۔مطلب یہ ہے کہ ایک نوع ہے جنس میں سے ان معنوں میں بھی خدا کو ایک کہنا درست نہیں کیونکہ اس سے تشبیہ لازم آئے گی اور ہمارا پروردگار اس سے پاک ہے۔یہ دو معنی تو ایسے ہیں جو خدا کے لیے درست نہیں لیکن وہ دو معنی جن کی بنا پر خدا کو واحد کہنا صحیح ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایسا یکتا ہے کہ اشیا میں اس کے مشابہ کچھ نہیں۔ دوسرے معنی جو اس کے لیے درست ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ "احدی المعنی" ہے یعنی وجود میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔اور نہ عقل اور وہم اس کا ادراک کر سکتے ہیں۔ہمارا رب ایسا ہی ہے جو خیال و قیاس و گمان و وہم سے برتر ہے اور اس کے وجود کو اس کی ذات سے الگ نہیں کیا جا سکتا"[12]

خدا کی وحدت کے اس تصور میں یہ پہلو بھی شامل ہے کہ خدا ایک بسیط وحدت ہے۔ یعنی اسے اجزاء میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بہت سی صفات یا صفات و ذات کا مجموعہ نہیں (جیسا کہ بعض مفکرین سمجھتے رہے ہیں) بلکہ خدا محض ایک وحدت ہے۔" جو اس کے لیے اجزاء کا قائل ہوا وہ اس سے بے خبر رہا۔"[13]

وہ وحدت جو نہ تو ہندسی ہو نہ نوعی اور نہ قابل تقسیم ہو وہ انتہائی تجریدی اور تنزیہی وحدت ہوگی۔اسی لیے خدا کے تصورِ وحدت کا کمال تنزیہہ و اخلاص کو قرار دیا گیا۔جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو "جسم و صورت تمثیل و تشبیہ، مکان و زمان، حرکت و سکون، اور عجز و جہل سے منزہ مانا جائے۔"[14] "وہ چھپی ہوئی چیزوں کی گہرائیوں میں اترا ہوا ہے اس کے ظاہر و ہویدا

ہونے کی نشانیاں اس کے وجود کا پتہ دیتی ہیں۔ گو دیکھنے والے کی آنکھ سے وہ نظر نہیں آسکتا۔ پھر بھی نہ دیکھنے والے کی آنکھ اس کی حقیقت کا انکار نہیں کر سکتی اور جس نے اس کا اقرار کیا اس کا دل اس کی حقیقت کو نہیں پا سکتا۔ وہ اتنا بلند و برتر ہے کہ کوئی چیز اس سے بلند نہیں ہو سکتی اتنا قریب ہے کہ کوئی شے اس سے قریب تر نہیں ہو سکتی۔ اس پر زمانہ کے مختلف دور نہیں گذرتے کہ اس کے حالات میں تغیر و تبدل پیدا ہو وہ کسی جگہ میں نہیں ہے کہ اس کے لیے نقل و حرکت صحیح ہو سکے۔ وہ ہر اوّل سے پہلے اول اور ہر آخر کے بعد آخر ہے۔ اس کی اولیت کے سبب واجب ہے کہ اس سے پہلے کوئی نہ ہو اور اس کے آخر ہونے کی وجہ سے ضروری ہے کہ اس کے بعد کوئی نہ ہو۔ "اس نے بغیر سوچ بچار میں پڑے مخلوق کو پیدا کیا اس لیے کہ غور و فکر اس کے لیے مناسب ہوا کرتی ہے جو اعضا رکھتا ہو اور وہ دل و دماغ کی ضرورت سے بری ہے۔

زمان و مکان، مشابہت و تمثیل وغیرہ سے ماورا ہونا تصور خدا کو انتہائی تجریدی بنا دیتا ہے یہ خدا عام مذاہب کے خداؤں کی طرح کلیتاً شخص خدا نہیں ہے جو ایک انتہائی طاقتور اور مقتدر حکمراں سے مشابہت رکھتا ہو بلکہ یہ فلسفہ کے اس اصول اول سے قریب تر ہے جس کے وجود کا احساس تو ہو جاتا ہے لیکن جس کے پورے تصور کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ انسانی فکر بنیادی طور پر مادی ہوتی ہے اور مسلسل کوشش سے درجہ بدرجہ تجدید اور تنزیہ کی طرف بڑھتی جاتی ہے، لیکن تجرید محض عقل انسانی کے بس کی بات نہیں۔ ہم کسی مجرد ترین چیز کے وجود کا تصور تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی مکمل ماہیت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلسفہ کی تمام تر کوشش یہ ہے کہ وہ حقیقت مطلقہ کو ہر قسم کی تشبیہ و تمثیل سے ماورا ہو کر سمجھے لیکن بد قسمتی سے فلسفہ کے پاس نہ تو وہ تصورات ہیں جن کی اساس مادہ نہ ہو اور نہ وہ زبان ہے جو بغیر کسی تشبیہ اور آمیزش کے کوئی بات کہہ سکے اس لئے علیؑ کا خدا ایسا نہیں ہے جو عقل و فہم میں آسکے۔ حضرت علی ابن ابیطالبؑ کے نزدیک "عقل و وجدان اس کے وجود کا پتہ تو دیتے ہیں لیکن اس کی حقیقت یا کنہ ذات سے آگاہ نہیں کر سکتے۔" اس نے عقلوں کو اپنی صفتوں کی حد و نہایت پر مطلع نہیں کیا اور ضروری مقدار میں معرفت حاصل کرنے کے لیے ان کے آگے پردے بھی

حائل نہیں کیے۔ وہ ذات ایسی ہے کہ جس کے وجود کے نشانات اس طرح اس کی شہادت دیتے ہیں کہ (زبان سے) انکار کرنے والے کا دل بھی اقرار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اللہ ان گوں کی باتوں سے بہت بلند و برتر ہے جو مخلوقات سے اس کی تشبیہ دیتے ہیں اور اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں[۱۰]۔ "نہ بلند پرواز ہمتیں اسے پا سکتی ہیں نہ عقل و فہم کی گہرائیاں اس تک پہنچ سکتی ہیں[۱۱]۔" خدا کا حقیقی تصور یہی ہے کہ اسے ہر طرح سے منزہ اور مجرد مانا جائے اور ساتھ ساتھ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان کی عقل یا وجدان دونوں خدا شناسی تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی پوری شناخت اور اس کی نوعیت و حقیقت وجود کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ خدا کے متعلق بہترین تصور ان لوگوں کا تصور ہے۔ "جو شکل و صورت کے ساتھ اپنے رب کا تصور نہیں کرتے نہ اس پر مخلوق کی صفات طاری کرتے ہیں نہ اسے محل و مکان میں گھرا سمجھتے ہیں نہ اشباہ و نظائر سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں[۱۲]۔"

تنزیہہ و اخلاص اس وقت نقطۂ کمال پر پہنچ جاتا ہے جب خدا کی ذات سے ہر قسم کے صفات کی نفی کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کا استدلال یہ ہے کہ "ہر صفت شاہد ہے کہ وہ اپنے موصوف کی غیر ہے اور ہر موصوف شاہد ہے کہ وہ صفت کے علاوہ کوئی چیز ہے۔ لہٰذا جس نے ذات الٰہی کے علاوہ صفات تسلیم کیں اس نے ذات کا ایک دوسرا ساتھی مان لیا۔ اور جس نے اس کی ذات کا کوئی اور ساتھی مان لیا اس نے دوئی پیدا کی جس نے دوئی پیدا کی، اس نے اس کے لیے جز بنا ڈالا اور جو اس کے لیے اجزاء کا قائل ہوا وہ اس سے بے خبر رہا اور جو اس سے بے خبر رہا اس نے اسے قابل اشارہ سمجھ لیا اس نے اس کی حد بندی کر دی اور جو اسے محدود سمجھا وہ اسے دوسری چیزوں ہی کی قطار میں لے آیا۔ جس نے یہ کہا کہ وہ کسی چیز میں ہے اس نے اسے کسی شے کے ضمن میں فرض کر لیا۔ اور جس نے کہا وہ کسی چیز پر ہے اس نے اور جگہیں اس سے خالی سمجھ لیں[۱۳]۔"

صفات کی نفی کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کا وجود اور عدم وجود برابر ہے کیونکہ ہم اشیا یا وجود کا ادراک صرف ان کی صفات کی وساطت سے کرتے ہیں اگر کسی شے کو ہر قسم کی صفت سے عاری قرار دے دیا جائے تو اس شے کا کوئی تصور ممکن نہیں رہتا اور نہ

اس کا وجود قابل فہم ہوگا۔ درحقیقت خدا سے صفات کی نفی کا یہ مطلب ہے کہ صفاتِ الٰہی اور ذاتِ الٰہی دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ صفات عین ذات اور ذات عینِ صفات ہے۔ "وہ ہے، ہوا نہیں، موجود ہے مگر عدم سے وجود میں نہیں آیا، وہ ہر شے کے ساتھ ہے لیکن جسمانی اتصال کی طرح نہیں، وہ ہر چیز سے دور ہے، لیکن جسمانی دوری کی طرح نہیں، وہ فاعل ہے لیکن حرکات و آلات کا محتاج نہیں۔ وہ اس وقت بھی دیکھنے والا تھا جب کہ مخلوقات میں کوئی چیز دکھائی دینے والی نہ تھی۔ وہ یگانہ ہے اس لیے کہ اس کا کوئی ساتھی ہی نہیں ہے کہ جس سے وہ مانوس ہو اور کھو کر پریشان ہو جائے"[14]

جب ذات و صفات ایک ہی ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صفات پر ان تمام اصولوں کا اطلاق ہوگا جن کا اطلاق ذات پر ہے مندرجۂ بالا گفتگو سے یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ ذاتِ خدا ابدی و ازلی غیر محدود واحد اور عقل و وجدان سے ماورا ہے۔ چنانچہ خدا کی صفات بھی یہ تمام خواص رکھتی ہیں، "اس کی ایک صفت سے دوسری صفت کو تقدیم نہیں کہ وہ آخر ہونے سے پہلے اول ہو اور ظاہر ہونے سے پہلے باطن ہو"[15] "اس پر زمانہ کے مختلف دور نہیں گذرتے کہ اس کے حالات میں تغیر و تبدل پیدا ہو۔"[16] "اس کی کسی صفت سے وہم و گمان باخبر نہیں ہو سکتے۔ نہ اس کی کسی کیفیت پر دلوں کا عقیدہ جم سکتا ہے"[17] "اس نے عقلوں کو اپنی صفتوں کی حد و نہایت پر مطلع نہیں کیا"۔[18]

صفات کی نفی کا یہ مطلب ہے کہ ذات اور صفات کو ایک نہ کیا جائے بلکہ صفات کو عینِ ذات قرار دیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ خدا کی صفات کو غیر متغیر غیر حادث، لامحدود، ابدی و ازلی بھی مانا جائے۔ یہاں دو اہم سوال اٹھتے ہیں ایک تو یہ کہ خدا کی بعض صفات مثلاً تخلیقِ زمان و مکان میں نمایاں ہوتی ہیں پھر یہ کیسے تسلیم کیا جائے کہ خدا ہمیشہ سے خالق تھا؟ ۔ اس کا جواب امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان الفاظ میں دیا ہے کہ "ہمارا خدائے بزرگ و برتر ہمیشہ سے عینِ علم رہا۔ حالانکہ علم ابھی کتمِ عدم میں تھا اور عین سمع و بصر رہا۔ حالانکہ نہ کسی آواز کی گونج بلند ہوئی تھی اور نہ کوئی دکھائی دینے والی چیز موجود تھی۔ اور عینِ قدرت رہا حالانکہ قدرت کے اثرات کو قبول کرنے والی کوئی شے نہ تھی۔ پھر جب

اس نے ان چیزوں کو پیدا کیا اور معلوم کا وجود ہوا تو اس کا علم معلومات پر پوری طرح منطبق ہو۔ خواہ وہ سنی جانے والی صدائیں ہوں یا دیکھی جانے والی چیزیں اور مقدور کے تعلق سے اس کی قدرت نمایاں ہوئی۔[19]

دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے افعال (خاص طور پر تخلیق سے) موجودات میں جو تغیر ہوتا ہے یا کائنات کی تخلیق کی صورت میں جو تغیر ہوا وہ خدا میں تغیر کی نشاندہی کرتا ہے؟ لیکن یہ سوال ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں۔ خدا ابدی طور پر اس بات سے واقف ہے کہ فلاں تغیر فلاں وقت ہوگا، اس لیے تغیر کا وجود میں آنا علم خدا میں تغیر کا سبب نہیں بنتا۔ خدا کا یہ علم ابدی ہے کہ کائنات معرض وجود میں آئے گی۔ اب کائنات کے وجود میں آنے کا یہ مطلب نہیں کہ خدا کے علم میں اضافہ ہوگیا۔ درحقیقت صورت یہ ہے کہ خدا کے ازلی اور ابدی علم میں ایک ازلی اور ابدی منصوبہ یا نظام موجود ہے اس نظام کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ انتہا البتہ اس کے مختلف اجزا یا عناصر پیدا ہوتے اور ختم ہوتے رہتے ہیں۔ ہر لمحہ تغیر اور انقلاب پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ تغیرات اس ابدی نظام کا جز ضرور ہے لیکن ان کا اطلاق خدا کے علم یا خدا کی ذات میں تغیر پر نہیں ہوتا۔

ابھی تک صرف اس امر کا جائزہ لیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ ابن ابیطالب کے نزدیک اخلاقیات کے لیے خدا کا تصوّر ایک ناگزیر مابعدالطبیعاتی مسلمہ ہے اور اس مسلمہ کے بغیر کوئی معروضی اور عالمگیر اخلاقیات ٹھوس بنیادوں پر قائم نہیں ہوسکتی لیکن صرف یہ تسلیم کر لینا کہ ایک ازلی و ابدی، برتر و اعلیٰ اور قادر ہستی کا وجود ہے، اخلاقیات کے لیے کافی نہیں کیونکہ اخلاقیات کے لیے صرف اخلاقی عمل کی بنیاد تلاش کر لینا ہی کافی نہیں ہوسکتا بلکہ اسے یہ بھی دیکھنا ہے کہ کسی عمل کے محرکات کیا ہونے چاہئیں؟ نیز کسی عمل کا مقصود کیا ہوگا؟ ان سوالوں کے جواب کے لیے ہمیں کچھ اور مسلمات کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ جن میں اس امر کی توضیح ہو کہ خدا نے کائنات کی تخلیق کسی اصول کے تحت کی۔

اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام اصولِ عدل کو افعال خدا کی اساس قرار دیتے

ہیں، خدا عینِ عدل ہے اور اس کا ہر فعل عدل کے مطابق ہوتا ہے۔" اس نے روزیاں مقرر کر رکھی ہیں (کسی کے لیے) انھیں زیادہ کیا ہے اور (کسی کے لیے) کم اور اس کی تقسیم میں کہیں تنگی رکھی ہے اور کہیں فراخی اور یہ بالکل عدل کے مطابق تھا۔"[۲۰]
اس طرح خدا کا عمل ایک بے روا روی اور بے اصول مرضی کا تابع نہیں بلکہ عدل کا عین ذات الٰہی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ یہ خدا کی فطرت میں داخل (سنتِ الٰہی) ہے کہ وہ اصول عدل کے مطابق عمل کرے گا۔ "وہ اپنے وعدہ میں سچا اور بندوں پر ظلم کرنے سے بالاتر ہے وہ مخلوق کے بارے میں عدل سے چلتا ہے اور اپنے حکم میں انصاف برتتا ہے۔"[۲۱]

سوال یہ ہے کہ عدل کیا ہے؟ حضرت علیؑ اس لفظ کی جامع تعریف بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عدل وہ صفت ہے "جو تمام امور کو ان کے موقع و محل پر رکھتی ہے۔"[۲۲] وہ فعل جو اپنے محل اور مقام پر نہ ہو ظلم کہلاتا ہے اور خدا ظالم نہیں ہے۔ اس کا ہر فعل اس مقام پر ہوتا ہے جہاں اسے ہونا چاہیے اس طرح ہم خدا کے کسی فعل کو بے محل، بے موقع یا غلط نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ خود حضرتؑ ہی عدل کے صحیح تصوّر کی ایک تشریح یوں کرتے ہیں کہ۔" عدل یہ ہے کہ خدا پر الزامات نہ لگاؤ۔"[۲۳] کیونکہ الزامات کا امکان اس وقت ہوتا ہے جب یہ فرض کرلیا جائے کہ خدا کا کوئی فعل غیر مناسب یا غلط بھی ہوسکتا ہے۔"

عدل کے اس تصور کا اخلاقیات سے گہرا تعلق ہے اس مسلمہ کو تسلیم کرنے کا پہلا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم کائنات اور اس کی موجودات کو بامقصد تصور کریں کیونکہ خدا کا کوئی فعل بلا وجہ بے موقع یا نامناسب نہیں ہے اور کائنات خدا کی تخلیق ہے اس لیے یہ بے مقصد نہیں ہوسکتی۔ حضرت علیؑ کائنات کی اس مقصدیت پر بہت زیادہ اصرار کرتے ہیں۔ " اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمہیں بیکار پیدا نہیں کیا اور نہ اس نے تمہیں بے قید و بند جہالت و گمراہی میں کھلا چھوڑ دیا ہے۔"[۲۴] اس نے جو چیزیں پیدا کیں ان کا ایک اندازہ رکھا مضبوط و مستحکم اور ان کا انتظام کیا عمدہ و پاکیزہ اور

انھیں ان کی سمت پر اس طرح لگایا کہ نہ وہ اپنی آخری منزل کی حدوں سے آگے بڑھیں اور نہ منزل منتہا تک پہنچنے میں کوتاہی کی۔[۲۵] اس آخری اقتباس سے یہ نتائج نکلتے ہیں کہ اولاً کائنات کی ہر شے بامقصد ہے، ثانیاً ہر شے کی امکانی حدود متعین ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ انفرادی نصب العین بھی رکھتی ہیں۔

تصورِ عدل کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ خیر و شر عقلی قرار پائیں گی، یعنی عقل صحیح اس بات کی قوت و قدرت رکھتی ہے کہ وہ خیر اور شر کا ادراک کر سکے کیونکہ ہر وہ شے جو مقصد و منشا رکھتی ہو اور محل و موقع کی مناسبت سے معرض وجود میں آئے اس کے مقام اور حیثیت کا تعین عقل کر سکے گی۔ دوسرے الفاظ میں تصورِ عدل کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات بامقصد ہے اور کائنات کے بامقصد ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی توجیہ ہو سکتی ہے اور جس چیز کی توجیہ ہو سکے وہ عقلی ہوگی۔ "اس نے عقلوں کو اپنی صفتوں کی حد و نہایت پر مطلع نہیں کیا اور ضروری مقدار میں معرفت حاصل کرنے کے لیے ان کے آگے پردے بھی حائل نہیں کیے"۔[۲۶] یہاں خیال رہے کہ عقل، خیر و شر کی خالق نہیں ہے بلکہ وہ محض علمِ خیر کا ایک ذریعہ ہے۔ یعنی اخلاقی احکام کسی ان دیکھی قوت کے بنائے ہوئے خواہ مخواہ کے قوانین نہیں بلکہ اگر عقل صحیح چاہے تو وہ اخلاقی احکام کی علت سمجھ سکتی ہے۔ اس نقطۂ نظر کے تحت حضرت امیر المومنینؑ شریعت کو عینِ عدل قرار دیتے ہیں "ان کا (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کلام حق و باطل کا فیصلہ کرنے والا اور حکم عین عدل ہے"۔[۲۷] یعنی پیغمبر کے احکام کی توجیہ عقل صحیح کر سکتی ہے۔

تصورِ عدل کا تیسرا اہم نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کی کوئی شے اپنی اصل کے اعتبار سے شر نہیں اور نہ شر کوئی معروضی وجود رکھتا ہے بلکہ وہ محض حقیقت کا سلبی پہلو ہے۔ کیونکہ کائنات خدا کی تخلیق ہے، خدا کی تخلیق بامقصد ہے اور خدا کے مقصد کے مطابق ہونا ہی خیر ہے۔ اس لیے کائنات کی تمام موجودات کی اصل خیر ہے اور چونکہ ہر وجود خیر ہے اس لیے شر وجود نہیں رکھتا۔ اسکی موجودگی معروضی نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ خیر کی طرح ازلی و ابدی حقیقت ہو سکتا ہے بلکہ اس کی نوعیت محض سلبی اور اس کا

وجود اضافی۔ ہر وہ چیز جو خدا کے بنائے ہوئے نظام خیر کی تابع ہے اس میں تو شر کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کائنات پر کسی با اختیار مخلوق (یعنی انسان) کے جزوی یا کلی اختیار کو تسلیم کر لیا جائے تو شر کا تعلق صرف اس مخلوق کے اختیار کی حد تک ہوگا۔ یعنی ہر شے بنیادی طور پر خیر ہے شر کا تعلق محض افعال کے ساتھ ہے اور افعال بھی وہ جو کسی اختیار کے تحت کیے جائیں۔ الٰہی جبر کے تابع نہ ہوں۔

اس مقام پر تصور عدل کا چوتھا نتیجہ سامنے آتا ہے جو اخلاقیات کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے یعنی انسان کو اخلاقی نقطۂ نظر سے صرف ان افعال کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے جو اس کے اختیار میں ہوں۔ اگر انسان کو مجبور محض مان لیا جائے تو اس پر کسی قانون کی پابندی کی کوشش واجب نہیں رہتی۔ کیوں کہ اس کے تمام اعمال پہلے ہی کسی خارجی قانون کے تابع ہیں۔ البتہ اگر وہ جزوی یا کلّی طور پر آزاد و مختار ہے تو اس کے آزادانہ افعال کا احتساب ہو سکتا ہے اور اس کے کردار کو درست اور نادرست کے پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے۔ اب یا تو انسان کو مکمل طور پر مجبور سمجھا جائے یا پھر جزوی یا مکمل طور پر مختار مان لیں۔ اگر وہ مجبور محض ہے تو اس کا ہر فعل خیر ہے کیونکہ اس کا ہر فعل خدا کی رضا اور منشا کے مطابق ہے اور خدا کی رضا و منشا خیر ہے۔ البتہ اگر وہ آزاد ہے تو اسے نصب العین کے حصول کے لیے ضابطۂ اخلاق کا پابند ہونا پڑے گا۔ اس سلسلے میں حضرت علی علیہ السلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو نہ تو مجبور محض مانو، نہ مختار محض۔ بلکہ اس کا وجود جبر و اختیار کے بین بین ہے۔ خدا قادر مطلق کی حیثیت سے کائنات پر اختیار کلی رکھتا ہے لیکن جزوی افعال میں اس نے فرد کو آزاد بنایا ہے، یہ آزادی سب سے پہلے ارادے اور انتخاب کی آزادی کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ انسان "قوائے ذہنی کو حرکت دینے والا فکری حرکات سے تصرف کرنے والا اعضاء و جوارح سے خدمت لینے والا اور ہاتھ پیروں کو چلانے والا ہے اور ایسی شناخت کا مالک ہے جس سے حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے"[۲۱] اخلاقیات کے لیے حق و باطل میں تمیز اور بعد ازاں اس تمیز کے تحت تصرف وہ صلاحیتیں ہیں جن کا وجود اخلاقیات کے لیے کافی ہے۔ ہاں، یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے نزدیک ہر شے کی حد و نہایت متعین ہے اور اس

تعین کے مقام سے جبر شروع ہو جاتا ہے یعنی فرد کو ایک مخصوص حد تک آزادی حاصل ہے یہ آزادی بالفعل نہیں بالقوۃ ہے۔ یعنی اگر چاہے تو انسان اس آزادی سے کام لے سکتا ہے۔ لیکن یہ آزادی انسان کی امکان قوت عمل کی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ علی ابن ابیطالب علیہ السلام قضاوقدر کے عمومی تصور کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک قضاوقدر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان کا ہر فعل پہلے سے متعین ہے اور وہ کوئی بات بھی لوح محفوظ پر درج حرکات سے انحراف کرتے ہوئے نہیں کرسکتا۔ بلکہ انسانی معاملات میں قضا و قدر کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ خدا نے انسانی امکانات کو متعین کردیا ہے۔ یعنی وہ زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم کیا کرسکتا ہے۔ ان دو انتہاؤں کے درمیان آنے والا افعال کے سلسلہ میں قضاوقدر کی حیثیت ایک حکم کی سی ہو جاتی ہے۔ جس پر عمل ہونا چاہیے لیکن یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ وہ ان احکام پر عمل کرے یا نہ کرے۔ اس سلسلہ میں حضرت کے کلمات یہ ہیں " شاید تم نے حتمی و لازمی قضا و قدر سمجھ لیا ہے (کہ جس کے انجام دینے پر ہم مجبور ہیں)؟ اگر ایسا ہوتا تو پھر نہ ثواب کا کوئی سوال پیدا ہوتا نہ عذاب کا، نہ وعدے کے کچھ معنی رہتے نہ وعید کے۔ خداوند عالم نے تو بندوں کو مختار بنا کر مامور کیا ہے اور (عذاب سے) ڈراتے ہوئے نہی کی ہے اس نے سہل و آسان (فرائض) تکلیف دی ہے۔ اور دشواریوں سے بچائے رکھا ہے وہ تھوڑے کیے پر زیادہ اجر دیتا ہے۔ اس کی نافرمانی اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ دب گیا ہے اور نہ اسکی اطاعت اس لیے کی جاتی ہے کہ اس نے مجبور کر رکھا ہے"[29]۔ دوسرے الفاظ میں قضا و قدر خدا کی مرضی ہے اس میں وہ مرضی بھی شامل ہے جس کی تکمیل خود اس کی قدرت کے تابع ہے اور وہ مرضی بھی جسے اس نے انسان کے اختیار کے تابع کر رکھا ہے۔ قضا و قدر کے دو پہلو ہیں ایک تو وہ جو لازمی اور حتمی طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے اور ایک وہ جسے ہونا چاہیے۔ اخلاقیات کا تعلق صرف اس دوسرے پہلو سے ہے۔

عدل کے نتائج میں رہنمائی اور رہبری کا تصور شامل کرنا بھی ضروری ہوگا۔ کیونکہ اگر خدا عین عدل ہے اور اس نے ہر شے کسی مقصد کے لیے تخلیق کی ہے تو خدا پر واجب ہوگا

کہ وہ اپنی مخلوقات کو ان کے نصب العین سے آگاہ کرے ۔ اپنے مقصد سے آگاہ ہوئے بغیر نصب العین کے حصول میں کسی کوتاہی پر کسی بھی وجود کو مجرم نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ چنانچہ عدل کا تقاضہ ہے کہ کہ مخلوق کی رہنمائی اور رہبری ہوتا کہ وہ اپنے مقصود سے آگاہ ہوسکے ۔ اس سلسلہ میں جہاں تک ان خلائق کا تعلق ہے، جن کی زندگی یا وجود تمام تر میکانکی ضابطوں کا پابند ہے وہاں ان کے لیے اپنے مقصود سے شعوری طور پر آگاہ ہونا ضروری نہیں کیونکہ انکی ساخت یا وجود ہی اس قسم کا ہوگا کہ وہ خود بخود اپنے مقصود کے حصول کے لیے کوشاں رہیں ۔ البتہ انسان کے معاملہ میں چونکہ اختیار اور آزادی کو ایک مسلمہ کی حیثیت سے قبول کر لیا گیا ہے اس لیے ضروری ہے کہ انسان شعوری طور پر اپنے نصب العین سے باخبر ہو ، اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے اس کی رہنمائی ہوتی رہے چنانچہ حضرت علی ابن ابیطالبؑ اس الٰہی رہبری کے بارے میں فرماتے ہیں ، " خدا نے تمھیں بے قید و بند گمراہی میں کھلا نہیں چھوڑا ۔ اس نے تمھارے کرنے اور نہ کرنے کے اچھے برے کام تجویز کر دیے اور سکھا دیے ہیں[۳۰] "

اب سوال یہ ہے کہ اس رہنمائی کی نوعیت کیا ہے ؟ اصولاً رہنمائی دو طرح ہوسکتی ہے ؛ ایک یوں کہ انسان کی ذات کے اندر ایسے اشارے موجود ہوں جو اسے منزل کی طرف لے جائیں ۔ اور دوسری یوں کہ خارج سے نافذ کیے جانے والے قوانین یا اشارے اسے منزل کا پتہ بتائیں

تقاضۂ عدل کے تحت پہلی صورت لازمی ہے اگر انسان کی تخلیق با مقصد ہے تو انسان کے اندر اپنے اصل کے اعتبار سے وہ تمام عناصر موجود ہونے چاہئیں جو اسے مقصد تک پہنچا سکیں ۔ انسان سے کسی ایسے فعل کی توقع کرنا خلاف عدل ہوگا جو انسان کی صلاحیت اور طاقت سے باہر ہو ۔ علاوہ ازیں انسان میں موجود تمام صلاحیتیں ایسی ہونی چاہئیں کہ وہ مقصد سے کسی نہ کسی طرح وابستہ ہوں ایک ایسی اخلاقیات جو خود انسان کے قوائے داخلی سے نہ ابھریں اور نہ انسان کی صلاحیتیں اس کی تکمیل کرسکیں کبھی بھی عادلانہ اخلاقیات نہیں ہوسکتی اس طرح ہم حضرت علی علیہ السلام کی اخلاقیات کے متعلق دو اہم نتائج تک پہنچتے ہیں ۔ ایک یہ کہ اخلاقی معیار خود انسان کی فطرت میں موجود ہوتا ہے اور دوسرے یہ کہ انسانی وجود کا کوئی بھی پہلو (مثلاً عقل ۔ جذبہ ...) اپنی اصل کے اعتبار سے شر نہیں

اور نہ ان میں سے کسی پہلو کو یکسر کچل دینا خیر کہلا سکتا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں "اے اللہ کے بندو! یقین رکھو کہ خود تمہارا ضمیر تمہارا نگہبان اور تمہارے اعضا و جوارح تمہارے نگران ہیں"[۲۱]

یہ درست ہے کہ خیر انسان کی فطرت ہے اور اس کے عناصر ایسے ہیں جو اسے خیر کے حصول میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن انسان میں موجود اختیار اور آزادی اس سے غلط فیصلے بھی کرا سکتی ہے اور حقیقت سے آگاہی کے بارے میں دھوکہ بھی دے سکتی ہے اس لیے صرف داخلی معیار اخلاق پر ہی اکتفا نہیں کی گئی۔ بلکہ انسان کی رہنمائی کے لئے ایسی شخصیتیں خلق کی گئیں جو حقیقتِ مطلقہ کا براہ راست مشاہدہ کرتی ہیں اور جنھیں خالق کی طرف سے حق اور خیر سے براہ راست آگاہ کیا جاتا ہے۔ ان کے علم کا ذریعہ عقل یا وجدان کے بجائے وحی الٰہی ہوتی ہے۔ وحی، عقل سے زیادہ یقینی اور عالمگیر ہے اور وجدان سے زیادہ وارداتی۔ اس ذریعۂ علم میں علم محض آگاہی نہیں ہوتا۔ بلکہ تجربہ بن جاتا ہے۔ صاحبانِ وحی یقین کے نقطۂ کمال پر فائز ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے علم کے کسی پہلو پر شک و شبہ نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ان کے احکام عقلی اور عدل پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لیے انبیا کا فراہم کردہ معیارِ اخلاق واجب العمل قرار پاتا ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، "اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے رسولوں کو وحی کے امتیازات کے ساتھ بھیجا اور انھیں مخلوق پر اپنی حجت ٹھہرایا تاکہ وہ عذر نہ کرسکیں کہ ان پر حجت تمام نہیں ہوئی"[۲۲] لیکن ان صاحبان وحی کی پیروی کا یہ مطلب نہیں کہ اخلاقیات محض خارجی قوانین کا نام ہے۔ انبیا کے احکام فطرتِ انسانی ہی کی نشاندہی پر مشتمل ہوتے ہیں "اللہ نے ان میں اپنے رسول مبعوث کیے اور لگاتار انبیا بھیجے تاکہ ان سے فطرت کے عہد و پیمان پورے کرائیں۔ اس کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں۔ پیغام ربانی پہنچا کر حجت تمام کریں۔ عقل کے دفینوں کو ابھاریں اور انھیں قدرت کی نشانیاں دکھائیں"[۲۳] "یعنی معیار اخلاق، فطرت اور عقل انسانی ہی پر مبنی ہوتا ہے انبیاء کا کام صرف یہ ہے کہ فطرت کا راستہ واضح اور عقل کی رہنمائی کریں۔ ورنہ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے

وہ فرد کی اپنی ذات ہی سے ابھرتے ہیں اور اخلاقی احکام فرد خود اپنے اوپر عائد کرتا ہے
"یاد رکھو کہ جسے اپنے نفس کے لیے یہ توفیق نہ ہو کہ وہ خود اپنے کو وعظ و پند کرے اور برائیوں
پر متنبہ کر دے تو پھر کسی اور کی بھی پند و توضیح اس پر اثر نہیں کر سکتی۔"[۳۴]

حضرت علی علیہ السلام کی اخلاقیات کے مابعد الطبیعاتی مسلمات کے عنوان کے تحت
ہم اب تک جو باتیں عرض کر چکے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ اخلاقیات کے لیے کچھ مابعد الطبیعاتی
مسلمات کا تسلیم کرنا ناگزیر ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ تو اخلاقیات کی توجیہ ہو سکتی ہے
نہ اسے معروضی حیثیت مل سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا مسلمہ خدا کا وجود ہے۔
جس کے بغیر اخلاقیات حتمی و قطعی اور معروضی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے خدا کا تصوّر اور
اس تصور کی تصدیق اخلاقیات کے لیے ناگزیر ہے۔ اس طرح اخلاقیات بیک وقت اجتماعی،
انفرادی اور شخصی ہو جاتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام جس تصوّرِ خدا کی تصدیق چاہتے
ہیں اس کے ماتحت خدا ایک وحدت ہے لیکن یہ وحدت ہندسی اکائی نہیں ہے
اور نہ ہی نوعی یا عرضی وحدت۔ وہ واحد ہے، صرف ان معنوں میں کہ ناقابلِ تقسیم
ہے اور بے مثال ہے۔ چنانچہ خدا کا ادراک تمثیل و تشبیہ سے نہیں ہو سکتا۔ وہ زمان
و مکان شکل و صورت اور سمت و جہت سے پاک ہے عقل اس کا کلی احاطہ نہیں کر سکتی
البتہ اس کے وجود کو محسوس کر سکتی ہے۔ خدا کے ساتھ کسی صفت کو اس طرح وابستہ
نہیں کیا جا سکتا کہ خدا اور اس کی صفات دو الگ چیزیں ہیں۔ ذاتِ الٰہی اور
صفاتِ الٰہی ایک ہی چیز ہیں، اس کی صفات جو عینِ ذات ہیں ابدی ازلی غیر محدود
اور عقل و وجدان سے ماورا ہیں۔ البتہ عقل صفات کی جزوی آگاہی سے اس کے وجود
سے آگاہ ہو سکتی ہے۔ خدا کی ذات و صفات غیر تغیر پذیر ہیں۔ خدا علمِ جزئیات
رکھتا ہے لیکن یہ علمِ جزئیات اس کے علم میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کرتا۔

اخلاقیات کے لیے خدا کے اس منزہ و خالص نظریۂ وحدت کے ساتھ ساتھ
یہ بھی ضروری ہے کہ اسے عادل سمجھا جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی فعل بغیر
مقصد کے نہیں ہوتا اور نہ بے محل و موقع ہوتا ہے۔ نظریۂ عدل کو تسلیم کرنے سے ماننا

پڑتا ہے کہ اولاً کائنات کی تخلیق بامقصد ہے۔ ثانیاً خیر و شر عقلی ہیں۔ ثالثاً کائنات کی کوئی شے اپنے اصل کے اعتبار سے شر نہیں ہے۔ رابعاً انسان پر اخلاقی احکامات کی پابندی صرف بااختیار افعال حد تک عائد ہوتی ہے۔ خامساً انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ لیتے نصب العین سے شعوری طور پر باخبر ہو۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اولاً اخلاقی معیار کو انسان کی فطرت کا جزو بنایا گیا ہے اور اخلاقیات بنیادی طور پر انسان کی ذات سے ابھرتی ہے۔ البتہ شعوری نشاندہی کے لیے خدا سلسلہ وحی کے ذریعہ افراد کی رہنمائی کرتا ہے۔ وحی کا مقصد قوانین کا خارج سے نافذ کرنا نہیں ہے بلکہ وحی صرف فطرت کی نشاندہی اور عقل کی رہنمائی کرنی۔

اشارات

۱۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۱ صفحہ ۶۱
۲۔ بحوالہ مشکاۃ۔ دی ہسٹری آف مسلم فلاسفی۔ تدوین میاں محمد شریف۔
۳۔ ابوجعفر محمد ابن بابویہ قمی متوفی ۳۸۱ھ۔ کتاب التوحید۔ باب ثالث
۴۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۱ صفحہ ۶۱
۵۔ مفتی جعفر حسین، حواشی نہج البلاغہ جلد ۱۔ صفحہ ۷۱۔
۶۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۴۹ صفحہ ۱۸۶
۷۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۹ صفحہ ۲۰۵
۸۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۹۹ صفحہ ۲۹۰
۹۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۱۰۶ صفحہ ۳۲۰
۱۰۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۴۹ صفحہ ۱۸۷
۱۱۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۱ صفحہ ۶۰
۱۲۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۱ صفحہ ۶۴
۱۳۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۱ صفحہ ۶۱
۱۴۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۱ صفحہ ۶۱
۱۵۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۶۳ صفحہ ۲۰۱
۱۶۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۹ صفحہ ۲۵۰
۱۷۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۳ صفحہ ۲۲۵
۱۸۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۴۹ صفحہ ۱۸۷
۱۹۔ شیخ صدوق: التوحید
۲۰۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۹ صفحہ ۲۶۶
۲۱۔ نہج البلاغہ جلد ۲ خطبہ ۱۸۳ صفحہ ۱۶۳
۲۲۔ نہج البلاغہ جلد ۳ قول ۳۶ ۱ صفحہ ۳۱۹
۲۳۔ نہج البلاغہ جلد ۳ قول ۴۷۰ صفحہ ۳۴۹
۲۴۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۳ صفحہ ۲۳۷
۲۵۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۹ صفحہ ۳۵۴
۲۶۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۴۹ صفحہ ۲۸۷
۲۷۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۹۲ صفحہ ۲۸۰
۲۸۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۱ صفحہ ۶۵
۲۹۔ نہج البلاغہ جلد ۳ قول ۷۸ صفحہ ۱۹۵
۳۰۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۴ صفحہ ۲۳۷
۳۱۔ نہج البلاغہ جلد ۲ خطبہ ۱۵۵ صفحہ ۸۷
۳۲۔ نہج البلاغہ جلد ۲ خطبہ ۱۴۳ صفحہ ۵۲
۳۳۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۱ صفحہ ۶۶
۳۴۔ نہج البلاغہ جلد ۱ خطبہ ۸۸ صفحہ ۲۴۹

اصول فقہ

شریعت کے مصادر

جناب ڈاکٹر ابراہیم سلقینی
(دمشق، شام)

ترجمہ: جناب خادم حسین ایم۔ اے علیگ

ماخذ یا مصدر، وہ شئی کہلاتی ہے جس کی طرف جزئی مسائل حاصل کرنے کے لیے رجوع کیا جائے، اسلام میں شرعی احکام اور فقہی فروع تک رسائی کے لیے کوئی نہ کوئی ماخذ ہونا چاہیے سب سے پہلے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی شریعت کا نشو و نما کسی خاص زمان و مکان میں علاقائی اور سماجی حالات کے زیر اثر نہیں ہوا جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ نفسیاتی اثر قبول کیا ہوگا۔ "شریعت اسلام اس وجہ سے کسی خاص شخص کے ذاتی مفادات کے تحفظ سے ماورا ہے۔ اس کے اندر کسی قسم کا ایسا ٹکراؤ فردی اور سماجی مفادات کے درمیان نہیں ہے جس کے نتیجہ میں اس کا دائرہ محض ایک گروہ کے دوسرے گروہ پر حکمراں ہونے تک ہی محدود رہے۔

اسلامی شریعت ایک آسمانی شریعت ہے جس کی بنیاد انسانی فطرت کے مطابق وضع ہوئی ہے اور ہم تک اس خدا نے بھیجی ہے جس نے خود انسانی فطرت کا خمیر تیار کیا ہے۔

"فاقم وجہك للدين حنيفاً فطرة الله التي فطر الناس عليها" (الروم آیت ۳۰)

پس اے نبیؐ، خلوص نیت کے ساتھ دین کی طرف اپنا رخ کیے رہو، خدا کی بنائی ہوئی سرشت جس پر اس نے آدمیوں کو پیدا کیا، یہی ہے۔

خداوند کریم نے جو کچھ نازل کیا ہے اس کی اصلی غرض و غایت محض یہی رہی ہے کہ انسانوں

کو نفسانی خواہشات، بے جا اختلافات، خود غرضی اور ذاتی مفاد پرستی سے چھٹکارا دلائے۔
اس طرح سے معاشرتی مفادات، انفرادی خواہشات اور خود غرضی کے خطرے سے محفوظ رہتے ہیں، لوگ اپنی نفسانی خواہشات اور دوسروں کے تسلط سے نجات پاتے ہیں۔
اسلام کی رو سے قانون وضع کرنے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔

"ان الحکم الا للّٰہ" (الانعام / آیت ۵۷)

اختیار صرف خدا ہی کو ہے۔

یہ آسمانی مصدر و ماخذ "قرآن کریم" ہے جو دوسرے ماخذ کا سرچشمہ اور منشأ خدا کا نہیں بلکہ حکم خدا کی وضاحت و نشاندہی کرنے والا ہے اور مسلمان حکم خدا کے سوا کسی دوسری چیز پر ایمان نہیں رکھ سکتا۔

قائد، ولی امر اور امت مسلمہ کے پیشواؤں میں سے کسی ایک کو بھی قانون وضع کرنے کا حق اس وقت تک نہیں جب تک کہ وہ جامع الشرائط مجتہد نہ ہو، اس لئے کہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو کتاب خدا اور سنت رسولؐ کے بارے میں دوسروں سے زیادہ معلومات رکھتا اور اسلام کے تمام ضابطوں اور امت مسلمہ کے مفادات کے تحفظ کی خاطر قانون وضع کرنے کے مقاصد کو مزید گہرائی کے ساتھ سمجھتا ہے، لہٰذا جو احکام مجتہدین بیان کرتے ہیں اس میں ان کے ذاتی مفاد یا نفسانی خواہشات کا دخل نہیں ہوتا۔ ان کے قانونی نکات و فتاویٰ شریعت کے لب لباب سے حاصل ہوتے ہیں۔ درحقیقت وہ حکم مجتہد کا ذاتی حکم نہیں ہوتا بلکہ خدا کے حکم کی نشاندہی کرتا ہے۔

اس کے علاوہ خداوند کریم نے پیغمبر اکرم صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم کو عصمت کے باوجود مشورہ کا حکم دیا جبکہ ان کی شخصیت غلطی سے دور اور مشورہ سے بے نیاز تھی۔ دراصل یہ حکم ایک قاعدہ و قانون کی تشکیل کے لیے دیا گیا، اور وہ ہے حکومت کے قیام کے لیے مشورہ کی اہمیت۔

"وامرھم شوریٰ بینھم" (شوریٰ / آیت ۳۸)

اور ان کا معاملہ باہمی مشورہ سے (طے) ہوتا ہے۔

"وشاورھم فی الامر" (آل عمران/آیت ۱۵۹)

اور ان سے معاملات میں مشورہ کر لیا کرو۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ نے انسانوں کو بے معنی و بے مقصد پیدا نہیں کیا اور نہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے کہ جو چاہیں کریں۔ اس نے ہر عمل کے لیے خاص حکم دیا اور ان احکام کے لیے مآخذ تاکہ ان مآخذ سے متعلقہ حکم معلوم کریں۔ ان مآخذ میں سے کچھ تمام علماء کی نظر میں حجت ہیں جن کو اصل کہتے ہیں اور کچھ کے بارے میں اختلاف ہے جو فرعی مآخذ کے نام سے موسوم ہیں۔ ضرور ان سب مآخذ کا تعلق آخر کار نص کتاب و سنت سے جاملتا ہے، ان دو مآخذ کے علاوہ جتنے ثانوی ماخذ ہوں، انھیں ان دونوں سے ماخوذ یا ان پر مبنی ہونا چاہیے۔

امام شافعی فرماتے ہیں: "احکام کو صرف نص یا اس پر مبنی مآخذ سے حاصل کرنا چاہیے"۔ اور جب قرآن مجید تمام مآخذ کا سرچشمہ ہے، تو وہی پہلا ماخذ قرار پایا، ہر حکم پہلے قرآن مجید کے ذریعہ معلوم کیا جائے گا۔ اگر کتاب میں حکم تک رسائی نہ ہو تو سنت کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اگر اس میں نہ ملے تو اجماع کی طرف اور اگر اجماع سے بھی کام نہ چلے تو قیاس مآخذ قرار پانا چاہیے (یہ بات واضح رہے کہ قیاس چونکہ دو جزئیات کے تشابہ سے تشکیل پاتا ہے منطقی اصطلاح کی رو سے اسے تمثیل کہتے ہیں) لہٰذا اہل سنت حضرات کے مذاہب اربعہ کے لحاظ سے) قیاس آخری دلیل ہے۔ خلاصہ یہ ہے اصول فقہ چار ہیں جنھیں ادلہ اربعہ کہا جاتا ہے (۱) کتاب (۲) سنت (۳) اجماع (۴) قیاس۔ ان چاروں مآخذ کی دلیل قول خداوند تعالیٰ ہے۔

"یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیئ فردوہ الی اللہ والی الرسول" (نساء/آیت ۵۹)

اے ایمان لانے والو اللہ کی اطاعت کرو اور اس کے رسولؐ اور والیان امر کی اطاعت کرو جو تم ہی میں سے ہیں، پھر اگر کسی معاملے میں تم میں آپس میں جھگڑا ہو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔

حدیث میں بھی ان چاروں اصولوں سے متعلق ایک روایت سے سند لی جاتی ہے: معاذ بن جبلؓ کا واقعہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ان کو قاضی یمن کی حیثیت سے

روانہ کر رہے تھے تو ان سے پوچھا: قضاوت کیسے کروگے؟ انھوں نے کہا: کتاب خدا سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر کتاب خدا میں تمھیں حکم نہ ملا؟ کہا: سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر سنت میں بھی وہ حکم نہ ملا؟ انھوں نے جواب دیا: غلطی سے بچ کر رائے کا صحیح استعمال کروں گا۔ یعنی اجتہاد و جستجو میں کوتاہی نہ کروں گا۔

معاذ کہتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر فرمایا: شکر ہے اس خدا کا کہ جس کا پیغامبر اس کی اور اس کے رسولؐ کی مرضی کے موافق نکلا

اسی طرح حضرت عمر نے جو خط ابو موسیٰ اشعری کو روانہ کیا اس میں لکھا تھا، جو حکم کتاب و سنت میں نہ ہو اس کے لیے اپنے فہم و ادراک سے کام لو، اشباہ و امثال کو پہچان کر دونوں کے درمیان قیاس کرو۔

اصل مآخذ کے علاوہ کچھ اختلافی و فروعی اصول و ادلہ بھی ہیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ مشہور (۱) استحسان (۲) مصالح مرسلہ (۳) عرف (۴) مذہب اصحاب و شرع اور (۵) ذرائع کا مسدود ہونا ہیں۔

مذکورہ دلیلوں سے موافقت یا عدم موافقت کے سلسلے میں فی الحال ہم بحث نہیں کرنا چاہتے۔ ہم صرف ان مسائل کو پیش کریں گے جن کا دونوں طرح کی دلیلوں سے قریبی تعلق ہے۔ اس اعتبار سے ۱۔ تمام دلائل، عقلی و نقلی دو حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔

نقلی دلائل میں مجتہد کا کوئی دخل نہیں وہ کتاب و سنت سے ثابت ہوتے ہیں۔

اسی طرح عرف و شرع، اجماع اور مذہب صحابی کا شمار ثابت امور میں ہوتا ہے اور ان میں بھی مجتہد کا دخل نہیں۔

لیکن عقلی دلائل، (قیاس، مصالح مرسلہ اور استحسان) میں مجتہد کا دخل ہوتا ہے، مذکورہ تقسیم استدلال کی تقسیم نہیں، دلائل کی تقسیم ہے۔ یہ ضرور ہے کہ استدلال و دلیل دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس لیے نقلی دلائل سے استدلال کو بھی عقلی بنیادوں پر استوار ہونا چاہیے۔ اور عقلی استدلال سے نقلی دلائل کو بر بنیاد رکھے بغیر بے فائدہ ہے، اس لیے کہ عقل محض کو احکام کی تشریع میں براہ راست

کوئی دخل نہیں (البتہ شیعہ اجتہاد کی رو سے قیاس اور دوسرے فرعی دلائل غیر معتبر دلائل کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں، صرف مستقل عقل بھی غیر معتبر محض نہیں ہے۔ تفصیل کے لیے مصادر ملاحظہ کیجئے۔)

۲۔ شرعی دلائل عقل سلیم کے منافی نہیں:

عقل کا صحیح دلائل کے معارض ہونا ہرگز ممکن نہیں، لیکن دلیل کی عدم صحت، عدم فہم یا عقل کے بیمار اور ذاتی اغراض میں ملوث ہونے کے نتیجہ میں ہمیشہ عقل اور دلیل کے درمیان اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

خداوند کریم نے شرعی دلائل پیغمبروں پر اس لیے نازل کیے کہ انسانی عقل اس کا ادراک کر سکے، اگر یہ دلائل عقل انسانی کے دائرے سے باہر ہوتے تو شرعی ذمہ داریاں ایسی ہوتیں جن کو پورا کرنا ممکن نہ ہوتا۔ کیونکہ جو چیز عقل کی تصدیق و تصوّر سے خارج ہو اس پر عمل غیر ممکن ہوتا ہے اور جب شریعت و قانون قابل عمل نہ ہوتا تو دعوت اسلام، شریعت کی تدوین اور آسمانی کتب کا نزول اور پیغمبروں کا مبعوث ہونا بے مقصد رہ جاتا، اللہ عزوجل بے معنی و بے کار کام نہیں کرتا وہ اس سے پاک و پاکیزہ ہے۔

اس لحاظ سے تکلیف شرعی عقل پر عائد ہوتی ہے، اگر عقل نہ ہو تو تکلیف شرعی نہیں ہوتی اور یہ بات مسلّم ہے کہ دلیل کو عقل کے ہم آہنگ ہونا چاہیے، ورنہ جب کبھی دلیل، عقل کے تقاضوں کو پورا نہ کرے گی، اس وقت صاحب عقل کی تکلیف شرعی کا پابند ہونا ایک دیوانے یا فاقد شعور بچے کی پابندی سے زیادہ ضروری ہوگا۔ اس لیے کہ یہ لوگ تو عقل نہیں رکھتے جو اس کی تصدیق یا تکذیب کریں، لیکن ایک صاحب عقل کا غیر قابل تصدیق چیز کو قبول کر لینا، اس اعتبار سے کہ عقل کے منافی ہے، اس کی تکلیف شرعی ایک دیوانے کی تکلیف شرعی سے زیادہ سنگین و دشوار ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے عقلاً پر بھی تکلیف شرعی ساقط ہونا چاہیے۔ (صغریٰ میں اختلاف)

۳۔ احکام کے مآخذ دو قسم کے ہیں : اصل اور مستقل جیسے کتاب و سنت اور غیر مستقل جیسے قیاس و استحسان ۔ کتاب و سنت کے مستقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں سے حکم ثابت کرنے کے لیے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں رہتی ۔
لیکن قیاس (وغیرہ) بذاتہ دلیل اصولی نہیں ، کیونکہ خود اسے (اصل) ثابت کرنے کے لئے کتاب و سنت و اجماع جیسے مآخذ پر بنیاد رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ اسی طرح خود اس حکم کی علت (وجہ سبب) کی شناخت بھی ضروری ہے جس کی بنیاد پر "اصل" میں حکم دیا گیا ہے ۔ اس کے بغیر قیاس سے کسی حکم کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔
لہذا حقیقی معنوں میں قیاس فرعی مسئلہ میں کسی حکم کو ثابت نہیں کرتا بلکہ فرعی مسئلہ سے متعلق نص و اجماع میں موجود حکم کے شمول (و عموم) کو ظاہر کرتا ہے ۔ اس لحاظ سے علمائے کرام نے کہا : "قیاس مُثبِتِ حکم نہیں ، مُظہِر ہے" (ثابت کرنے والا نہیں ، ظاہر کرنے والا ہے)

پہلا سرچشمۂ احکام کتاب

یہ بحث ذیل کے نکات پر مشتمل ہے :
۱۔ کتاب کی تعریف لغت و اصطلاح میں اور تعریف قرآن ۔
۲۔ نزول قرآن ۔
۳۔ حفظ و جمع قرآن ۔
۴۔ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب ۔
۵۔ قرآن کے خصوصیات ۔
۶۔ قرآن کی حجیت و اعجاز ۔
۷۔ قرآن کے اعجازی پہلو ۔
۸۔ قرآنی احکام کی قسمیں ۔
۹۔ احکام کے سلسلے میں قرآن کی نشاندہی ۔

① پہلے ماخذ احکام، کتاب اللہ کی شناخت۔

پورے موضوع اور مسائل کو دیکھا جائے تو اصول فقہ و ماخذ قانون اسلام میں دراصل ایک ہی ماخذ نظر آتا ہے اور وہ قرآن مجید و ارشاد باری ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قول و فعل بھی قول و اشارہ خداوندی ہے۔ اجماع بھی قرآن و سنت کی بنیاد پر مستند ہے لہٰذا حکم کا اختیار صرف خدا ہی کو حاصل ہے۔

اس لحاظ سے کتاب (قرآن) دائرۂ دین کا مرکز، شریعت کا محور اور اہم ترین اساسی مأخذ ہے جس کی کوئی تعریف و حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

لغوی اعتبار سے کَتَبَ (فعل ماضی) کا مصدر کتاب اور اس کا اسم مفعول مکتوب ہے۔ شرعی اصطلاح میں "قرآن کریم" کہتے ہیں۔

قرآن، کا مادہ "قرء" اور قرآن مصدر ہے۔ جس کے معنی ہیں — "پڑھنا"۔

"فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ" (القیامۃ / آیت ۱۸)

پھر جب ہم اسے پڑھا دیں تو تم اسے پڑھتے رہنا۔

قرآن — سے مراد اس خدائے عزّوجل کا کلام ہے جو بندوں کی زبان پر جاری و ساری ہے۔ کلام اللہ سے مراد وہ کلام ہے جو باری تعالیٰ نے جبرئیلؑ کے ذریعہ پیغمبر اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل کیا، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے حجت اور انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ مسلمان اس کی تلاوت کو عبادت سمجھتے ہیں۔

قرآن جسے مصحف بھی کہتے ہیں — سورۂ حمد سے شروع اور سورۃ الناس پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں کل سورتیں ۱۱۴ اور کل آیتیں ۶۲۴۲ ہیں۔ یہ پورا کلام بالتواتر ثابت اور لفظی و معنوی اعجاز سے آراستہ اور ہر طرح کے تغیّر و تبدل سے محفوظ ہے۔ ارشاد باری ہے:

"انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون" (الحجر / آیت ۹)

قرآن ہم نے نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

مزید تحقیقات کے لیے امام شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول" (صفحہ ۲۹ - ۳۲) طبع اوّل۔ اور "الاحکام فی اصول الاحکام" مؤلفہ علامہ الآمدی (جلد ۱، ص ۲۲۸ - ۲۴۰) مطبوعہ، معارف پریس

سنہ ۱۳۳۲ ھ ق ، ملاحظہ کیجئے ۔

② نزول قرآن پہلی اور آخری آیت

قرآن مجید رفتہ رفتہ نازل ہوا ، ایک آیت یا چند آیتیں یا ایک سورۃ تقاضائے وقت کے مطابق نازل ہوا کرتا تھا ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥ اقرأ باسم ربك الذی خلق . . . .

یعنی سورۃ العلق ، رمضان کی سترہ تاریخ کو اور آخری آیات آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی وفات سے نو دن پہلے نازل ہوئیں ۔

[الف] "واتقوا یومًا ترجعون فیہ الی اللہ ثم توفی کل نفس ما کسبت وھم لا یظلمون" ۔ (البقرہ / آیت ۲۸۱)

اور اس دن سے ڈرو جس دن خدا کے حضور میں حاضر کئے جاؤ گے پھر ہر نفس کو جو کچھ اس نے کیا ہے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا ، اور ان پر ظلم نہ کیا جائے گا ۔

لیکن حسب ذیل آیت ،

"الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا" (المائدہ / آیت ۳)

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور دین اسلام کو تمہارے لیے پسند کر لیا ۔

کا شمار آخری نازل شدہ آیتوں میں نہیں بلکہ ان آیات میں ہوتا ہے جو تشریع و قانون گذاری کے لحاظ سے آخری ہیں ۔

قرآن مجید کے آغازِ نزول سے آخرِ نزول تک بائیس سال ، دو مہینے بائیس دن ہوتے ہیں ۔

③ حفظ و جمع قرآن

ہمارے پاس جو قرآن ہے ، اور جس قرآن کو احکام شریعت کا سرچشمہ مانا جاتا ہے

وہ ہر طرح سے قابل وثوق و اعتماد بھی مانا گیا ہے۔ وہ دوسری آسمانی کتابوں کی طرح کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوا، وقت نزول آیات حضرت سرور کائنات ؐ وہ آیت یا آیتیں دوسروں کو سناتے اور لکھواتے تھے، مسلمان اکابر انھیں حرز جان بناتے تھے۔ وہی آیتیں یکجا ہوئیں تو قرآن نام ہوا۔ حضرت عثمان کے زمانے میں قرآن کی متعدد نقلیں ایک اصل کے مطابق تیار کرا کے کئی مرکزی شہروں میں بھیجی گئیں جس کی نقل در نقل اشاعت ہوتی چلی آئی رہی ہے۔

قرآن مجید کو یکجا جمع کرنے کا اہتمام حضرت ابوبکر کے زمانے میں کیا گیا، باوثوق راویوں کا کہنا ہے کہ حضرت عمر وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جنگ یمامہ میں ستر حافظین قرآن کی شہادت کے بعد سب سے پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ وہ حضرت ابوبکر کے پاس گئے اور ان سے کہا، میرا خیال ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم دے دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ حافظوں کی عدم موجودگی کے نتیجہ میں قرآن مجید کے کچھ حصے نہ مل سکیں۔

حضرت ابوبکر نے کہا، میں اس کام کو کیسے انجام دوں جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انجام نہ دیا ہو۔ حضرت عمر نے کہا، یہ ایک نہایت عمدہ کام ہوگا اور اس سلسلے میں لگاتار رجوع کرتے رہے یہاں تک کہ اللہ عز اسمہ نے جس طرح حضرت عمر کو فراخدلی عنایت کی تھی اسی طرح حضرت ابوبکر کے دل میں بھی یہ بات ڈال دی۔ دونوں نے زید بن ثابت سے ملاقات کی اور ان سے کہا، آپ نہایت سنجیدہ نوجوان ہیں ہم آپ کو قرآن کے سلسلے میں جعلساز نہیں ٹھہرانا چاہتے، آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں وحی لکھا کرتے تھے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ قرآن جمع کرنے کا کام کریں۔ زید بن ثابت نے کہا، آپ حضرات ایسے کام کرنے کا مجھے حکم کیوں دے رہے ہیں جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انجام نہیں دیا۔

ان دونوں نے کہا یہ بہت عمدہ کام ہے۔ غرض یہ کہ بار بار ان سے رابطہ قائم کیا، یہاں تک کہ جس طرح سے حضرت ابوبکر و عمر کے دل میں خدا عز اسمہ نے یہ بات ڈالی تھی اسی طرح زید بن ثابت کے دل میں بھی اس کے لیے جگہ بنا دی۔ ایک ملاقات کے دوران زید بن ثابت نے یہ کہہ کر: "خدا کی قسم اگر مجھ سے کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری

بلکہ منتقل کرنے کے لیے کہا جاتا تو وہ کام اس کام سے میرے لئے آسان تر ہوتا؛ قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری قبول کر لی اور لوگوں کے سینوں اور سفینو ، تپوں اور متعدد چیزوں سے آیتوں کو نقل کرنا شروع کر دیا۔ وہ فقط آیات کو سنکر قلمبند یا قبول نہیں کر لیا کرتے تھے۔ بلکہ دو آدمیوں کی گواہی لیتے تھے کہ ہاں اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی سنا اور انھیں کے سامنے لکھا ہے۔ یہ نسخہ پہلے خلیفہ کے وقت محفوظ رہا، پھر خلیفۂ دوم کے پاس اور ان کے بعد ان کی بیٹی حفصہ پھر حضرت عائشہ کی حفاظت میں رہا۔

عثمان کے زمانۂ خلافت میں حذیفۃ الیمان (جو آذربایجان کے صوبۂ ارمینیا میں مصروف جنگ تھے) کو لوگوں کے اختلاف لب ولہجہ کا احساس ہوا۔ وہ فوراً حضرت عثمان کے پاس گئے اور کہا: یہود و نصاریٰ کی طرح قرآن کے سلسلے میں مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہونے سے پہلے کوئی تدبیر کرنا چاہیے۔ حضرت عثمان نے حفصہ بنت عمر کے پاس ایک شخص کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ قرآن بھیج دیں تاکہ اس کے چند نسخے تیار کیے جا سکیں۔

زید بن ثابت، سعید بن العاص، عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام اور عبداللہ بن زبیر کو اصل نسخے سے نقل کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ چھ نسخے تیار کر کے بڑے بڑے شہروں میں بھیجے گئے پھر حضرت عثمان کے حکم سے باقی تمام نسخے نذر آتش کر دیے گئے۔

④ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب۔

جس طرح قرآن مجید میں سورتوں کی ترتیب اور ان کے نام توقیفی ہیں، اسی طرح اللہ عزّ شانہ کے حکم سے آیتوں کی ترتیب بھی توقیفی ہے۔

جب کبھی کوئی آیت یا آیتوں کا نزول ہوتا جبریل علیہ السلام پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کرتے کہ اس آیت کو فلاں سورہ کے فلاں حصے میں قرار دیں۔

⑤ **قرآن کی خصوصیات:** قرآن مجید کے بے شمار امتیازات و خصوصیات میں چند خصوصیات یہ ہیں:

[الف] اس کے الفاظ عربی زبان میں ہیں، اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے پیغمبر اکرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کے سینہ پر نازل کیا۔ اسی خصوصیت کی بنا پر تورات وانجیل اور دیگر آسمانی کتب پر اسے فوقیت حاصل ہے۔ لہذا عربی زبان میں کسی سورہ یا آیت کی تفسیر اگرچہ قرآن کے الفاظ و کلمات کے مرادف ہی کیوں نہ ہو قرآن محسوب نہ ہوگی اور اسے دلیل میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ترجمہ خواہ کتنا ہی اچھا اور قرآن کے مطابق کیوں نہ ہو اسے قرآن نہیں کہا جائے گا نہ اس کو قرآنی سورتوں اور آیات کی جگہ نماز میں پڑھ سکتے ہیں۔

[ب] قرآن کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے الفاظ و معانی اللہ جل جلالہ کی جانب سے نازل ہوئے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فریضہ لوگوں کو ہدایت کرنے اور ان کی ضروریات کے مطابق ضروری باتیں پہچانا اور سمجھانا ہے۔ اسی بنیاد پر حدیث و قرآن جدا ہوتے ہیں۔ حدیث خواہ قدسی ہو یا نبوی اس کے معانی خداوند متعال اور الفاظ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں (ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ) نفسانی خواہشوں کی بنا پر نہیں کہتے بلکہ وہی بیان کرتے ہیں جو وحی کے ذریعے ان پر نازل ہوا ہو۔

[ج]:۔ قرآن مجید کی خصوصیت یہ ہے کہ متواتر طریقے سے ہم پر نقل ہوا ہے۔ ایک گروہ نے دوسرے گروہ کے لیے نقل کیا ہے۔ لہذا یہ تصور باطل و محال ہے کہ اس میں جھوٹی باتیں گڑھنے کے لئے سب نے مل کر سازش کی ہوگی، کتابت اور حفظ، دونوں اعتبار سے جس طرح اور جب سے نازل ہوا ہے، آج تک اس میں تغیر و تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اس لیے کہ وحی نازل ہوتی تھی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تلاوت کرتے اور کاتبین وحی لکھتے اور حفظ کرنے والے حفظ کیا کرتے تھے، پھر یہ کہ سینہ بہ سینہ اور سفینہ بہ سفینہ نسلاً بعد نسلٍ بغیر کسی تبدیلی و تغیر کے وہ سب ہم تک پہنچا اور سب کے پاس موجود ہے۔

"انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" (الحجر/آیت ۹)

قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں

لہذا قرآن مجید بہترین و کامل ترین سند ہے۔

⑥ قرآن کی حجیت و اعجاز

قرآن حجت اور اس کی پیروی واجب ہے، اس لیے کہ اللہ جل جلالہ کی جانب سے اس کا نزول ہوا اور بغیر کسی تغیر و تبدیلی کے ہم تک پہنچا ہے۔ قرآن سے سرتابی اختیار نہیں کی جاسکتی کیونکہ ۔

"لا یأتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید ۔" (فصلت / آیت ۴۲)

باطل نہ سامنے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے یہ حکمت والے اور حمد کے مالک اللہ کی طرف سے نازل شدہ (کتاب) ہے۔

قرآن ایک ایسے دستور العمل کے مانند ہے جو ہمیشہ صحیح راستے کی ہدایت کرتا ہے ۔

اللہ عزّوجل کی جانب سے قرآن نازل ہونے کی دلیل اس کا اعجاز ہے۔ اور اعجاز یعنی دوسرے کے لیے عجز ثابت کرنا۔ لیکن اعجاز سے مراد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت و رسالت کے دعوے کو سچ منوانا ہے۔ اعجاز مندرجۂ ذیل چیزوں کے بغیر عملی جامہ اختیار نہیں کرسکتا ۔

۱۔ تحدّی (چیلنج)

۲۔ ان تقاضوں کی موجودگی جو مدّعی کو میدان عمل میں آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

۳۔ میدان عمل میں وارد ہونے کے لیے رکاوٹوں کی عدم موجودگی ۔

قرآن مجید میں متعدد جگہ چیلنج کیا گیا ہے، خصوصاً ان لوگوں کو جنھوں نے قرآن سے معارضہ کرنا چاہا، تقاضا موجود تھا، مانع موجود نہ تھا لہٰذا معجزہ دکھانا برمحل تھا۔

لیکن چیلنج کیوں کیا گیا؟ کج بحث، قرآن پر اعتراض کرتے تھے انھیں سمجھایا گیا مگر وہ نہ مانے، آخر کار انھیں دعوت دی گئی کہ ۔

"قل لئن اجتمعت الانس والجن علیٰ ان یأتوا بمثل ھٰذا القرآن لا یأتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیراً" (الاسراء/آیت ۸۸)

تم یہ کہہ دو کہ اگر سب آدمی اور کل جن اس بات کے لیے جمع ہو جائیں کہ اس

قرآن (مجید) کے مانند بنالائیں تو اس کے مانند نہ لاسکیں کے گو ان میں ایک دوسرے کا پشت پناہ بھی ہو۔

ارشاد ہوا:

"ام یقولون افتراہ قل فأتوا بعشر سور مثلہ مفتریات وادعوا من استطعتم من دون اللہ ان کنتم صادقین۔"

(ہود / آیت ۱۳)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ (پیغمبرؐ) نے اسے گڑھ لیا ہے۔ تم یہ کہہ دو کہ ایسی ہی بنی ہوئی دس سورتیں تم بھی لے آؤ اور اگر تم سچے ہو تو اللہ کے سوا تم جن کو بلا سکتے ہو بلا لو۔

اللہ عزاسمہ نے فرمایا:

"وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فأتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداء کم من دون اللہ ان کنتم صادقین ○ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ أعدت للکافرین۔" (بقرہ / آیت ۲۳-۲۴)

اور جو کچھ ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا اگر اس میں تمھیں کچھ شک ہو تو ویسی ہی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اگر تم سچے ہو تو خدا کے سوا، اپنے سب گواہوں کو بلا لو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کرو اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے بھی ڈرتے رہو جس کا ایندھن آدمی ہیں اور پتھر (جو) خاص کر کافروں ہی کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اعتراض کے لیے تقاضوں کا ہونا: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رسالت الٰہی کا دعویٰ کیا۔ اپنے زمانے کے لوگوں کے سامنے اپنا دین پیش کیا، بتوں کی پوجا کو جہل و نادانی بتایا اور اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے قرآن سے استدلال کیا۔ مشرک عربوں نے قرآن کو قبول نہ کیا، اس پر اعتراض کیے تو انھیں اس کا مثل لانے کا چیلنج دیا گیا۔ آیا جدید

دین کو باطل اور اپنے دین کی حفاظت کے سلسلے میں قرآن مجید کی اس تجویز سے بہتر اور کوئی تجویز سوچی جاسکتی ہے؟

اب رہا یہ امر کہ اعتراض کو روکنے والے اسباب کیوں موجود نہ تھے؟ بات یہ ہے کہ قرآن مجید عربی زبان میں تھا، عبارتوں کی تنظیم عربی زبان کے مزاج کے مطابق تھی۔ جن سے خطاب تھا وہ فصاحت و بلاغت کے مالک ہونے کے مدعی تھے وہ تو کہتے تھے:

"خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص مجھ سے زیادہ عربی اشعار کے بارے میں نہیں جانتا، میں رجز سب سے اچھی جانتا ہوں، خدا کی قسم ان میں سے کسی کا قرآن سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، خدا کی قسم اس کی حلاوت وطراوت بے مثال، چڑھاؤ نتیجہ خیز، آثار فیوض سے لبریز، بلندی اس کا مزاج، ہر چیز سے بلند و بالا کسی چیز کو اس پر برتری نہیں اور اس کی ہر بات قاطع ہے۔"

۷ قرآن مجید کے اعجازی پہلو:

اعجاز قرآن کا تعلق کسی خاص جہت سے نہیں بلکہ ہر لحاظ سے وہ معجزہ ہے خواہ لفظی ہو یا معنوی حیثیت، قرآن مجید کی انھیں خصوصیات نے اعتراض کرنے والوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا اور سب اس بات پر متفق ہو گئے کہ انسانی عقل قرآن کے اعجازی پہلو کو پورے طور پر جاننے سے قاصر ہے۔ جس حد تک قرآن کے سلسلے میں غور و فکر کیا جائے علمی تحقیق و مباحث کے ذریعے اسرار و رموز کائنات کے جتنے پردے اٹھائے جائیں اعجاز قرآن کے اتنے ہی پہلو آشکار ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہر بار نئی دلیل سامنے آتی ہے کہ قرآن اللہ عزاسمہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ لھٰذا قرآن صرف عربوں کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے معجزہ ہے اس اعجاز کے واضح ترین پہلو حسب ذیل ہیں:۔

[الف] الفاظ، معانی اور احکام کے درمیان ہم آہنگی۔

قرآن مجید چھ ہزار آیتوں سے زیادہ پر مشتمل ہے، جو بیس سال کے عرصے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی ہیں۔ قرآن نے اپنے مقصود کو مختلف طریقوں اور

عبارتوں میں کیا ہے۔ اس کے مقاصد و موضوعات ہیں ۱۔ عقائد ۔ اخلاق ۔ احکام اور قانون وضع کرنے کے طریقوں پر بحث، عالمی اور معاشرتی نظام کا بیان ہونے کے باوجود اس کی عبارتوں میں کوئی کمی اور ناہمواری نظر نہیں آتی۔ فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے کوئی عبارت قرآن کی عبارت سے زیادہ خوبصورت نہیں ملتی۔ جو لفظ جہاں ہے وہاں دوسرا لفظ لانا ناممکن ہے۔ ہر عبارت معنیٰ آفریں ہے۔ ایک بیان دوسرے بیان کے خلاف نہیں۔ اور اگر یہ کتاب اللہ کے بجائے کسی ایک یا چند لوگوں کے ذریعے گڑھا گیا ہوتا تو یقیناً عبارتوں میں اختلاف و تضاد نظر آتا، اس لیے کہ انسانی عقل لاکھ ارتقا کی منزلیں طے کرلے پھر بھی چھ ہزار آیتوں کو اس طرح سے ترتیب نہیں دے سکتی کہ بلاغت کے لحاظ سے یکساں اور معنی کے اعتبار سے اختلاف کا شائبہ بھی نہ پایا جائے، انھیں خصوصیات کی بنا پر اللہ عز اسمہ درج ذیل آیت میں فرماتا ہے۔

"افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیراً" (النساء/آیت ۸۲)

تو کیا یہ لوگ قرآن میں بھی غور نہیں کرتے اور (یہ خیال نہیں کرتے کہ) اگر خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے (آیا) ہوتا تو ضرور اسمیں بڑا اختلاف پاتے۔

[ب]۔ قرآنی الفاظ و عبارات کی بلاغت و فصاحت۔

قرآن مجید میں فصاحت و بلاغت کا معیار وہ ہے کہ عربی ادب میں اس کی مثال نہیں ملتی، جو لوگ عربی زبان سے آشنا، صاحب ذوق و ملکۂ تحقیق و تنقید کے مالک ہیں، انھوں نے عربی اشعار اور نثر کے بہترین شہ پاروں کا موازنہ کرنے کے بعد کہا ہے، قرآن کا کوئی جواب نہیں۔ قرآن کے الفاظ رواں اور اسلوب پرکشش ہے، انداز کہیں شعلہ کہیں شبنم ہونے کے باوجود ترکیب کی روانی اور اسلوب کی دل ربائی میں وہ حیرت انگیز ہم آہنگی ہے۔ جو انتہائی موزوں و مقفّی عبارتوں میں بھی دکھائی نہیں دیتی، قرآن کا اپنا ایک خاص اسلوب ہے، اس میں ماقبل یا مابعد کا کوئی لفظ

نامانوس نہیں، عبارتوں کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے تو نہایت اعلیٰ درجے کی بلاغت ملتی ہے، یہ تمام باتیں اس شخص پر روشن ہیں جو صاحب ذوق اور عربی فصاحت و بلاغت کے اصول سے واقف ہے۔ صحیح مسلم میں روایت ہے: ابوذرؓ کے بھائی انس نے ابوذر سے کہا:

میں نے مکہ میں ایک شخص کو دیکھا جو تمہارے دین پر تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اللہ نے اسے بھیجا ہے، میں نے کہا لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ اس نے کہا، لوگ کہتے ہیں: وہ (پادری) گوشہ نشین اور جادوگر شاعر ہے انس کا شمار بھی شاعروں میں ہوتا تھا لیکن اس نے کہا: میں نے پادریوں کا کلام سنا ہے، اس کا کلام ان کے کلام سے مختلف ہے، میں نے اس کے کلام کا شاعروں کے کلام سے موازنہ بھی کیا لیکن آج تک کسی شاعر کی زبان کا یہ انداز نہ دیکھا، خدا کی قسم وہ سچا اور باقی سب جھوٹے ہیں۔

[ج]۔ گذشتہ صدیوں کے حالات سے متعلق قرآن کا بیان۔

قرآن نے گذشتہ صدیوں کے حالات کی بھی اطلاع دی ہے۔ عاد و ثمود، نوحؑ و ابراہیمؑ، قوم لوط، موسیٰؑ اور ان کی قوم، فرعون اور اس کی قوم، حضرت مریمؑ کا حاملہ ہونا اور بہت سے انبیا و رسل کے بارے میں تذکرے ہیں۔ یہ سب باتیں معقول پیرائے اور حقیقت کے مطابق ہیں۔ یہ تمام واقعات ایک ایسے انسان کی زبان پر جاری ہوئے جو امّی تھا، کسی اسکول یا مدرسہ کا فارغ التحصیل نہ تھا اور نہ علمی ماحول میں رہنے والا تھا، جو یہ کہا جا سکے کہ مطالعۂ کتب کے ذریعے متعلقہ واقعات کا علم حاصل کیا ہوگا۔ یہ ایک واضح ثبوت ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

"وماكنت تتلوا من قبله من كتاب ولا تخطه بيمينك اذاً لارتاب المبطلون۔" (عنکبوت/آیت ۴۸)

اور اے رسولؐ قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے

ہاتھ سے تم لکھا کرتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھوٹے ضرور (تمہاری نبوت میں) شک کرتے۔

منکرین قرآن جب حیرت زدہ ہوئے اور کوئی راہ فرار نہ ملی تو انھوں نے افتراپردازیوں کی ٹھان لی۔ انھوں نے کہا "پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کوئی شخص یہ سب کچھ پڑھاتا ہے۔ اس شخص کی تلاش شروع ہوئی لیکن ایک کے سوا مکے بھر میں کسی کو پڑھا لکھا نہ پا سکے، پھر وہ شخص ایسا کہ اسے نہ تو عربی پر عبور تھا اور نہ گذشتہ افراد کے علم سے آگاہی۔ اسی بنا پر اللہ عز اسمہ ارشاد فرماتا ہے۔

"ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمه بشر لسان الذی یلحدون الیه اعجمی وھذا لسان عربی مبین" (نحل/آیت ۱۰۳)

اور (اے رسول) تحقیقاً ہم جانتے ہیں کہ یہ کفار (آپ کی نسبت) کہا کرتے ہیں کہ ان کو (آپ کو) کوئی آدمی قرآن سکھا دیا کرتا ہے (حالانکہ بالکل غلط ہے کیونکہ) جس شخص کی طرف یہ لوگ نسبت دیتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے۔ اس اعجازی جہت کی رہنمائی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

"تلك من انباء الغیب نوحیھا الیك ما کنت تعلمھا انت ولا قومك من قبل ھذا" (ہود/ آیت ۴۹)

(اے رسولؐ) یہ غیب کی چند خبریں ہیں جن کو ہم تمہاری طرف وحی کے ذریعے پہنچاتے ہیں (جو) اس کے قبل نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم (ہی جانتی تھی)

[د] ۔ قرآن کی پیشین گوئی:۔

مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث کے بارے میں قرآن نے جو کچھ بیان کیا ویسا ہی ہوا ہے۔ مثال کے طور پر رومیوں کے بعد ایرانیوں کے فرار ہونے کے سلسلے میں یوں ارشاد ہوا ہے:

"الٓمٓ غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم
سیغلبون فی بضع سنین" (روم/آیت ۱-۴)

الٓمٓ ، (یہاں سے) بہت قریب کے ملک میں رومی (نصاریٰ اہلِ فارس آتش پرستوں سے) ہار گئے مگر یہ لوگ عنقریب ہی اپنے ہار جانے کے بعد چند سالوں میں پھر (اہل فارس پر) غالب آجائیں گے۔

اور جنگ بدر میں کامیابی کے بارے میں اللہ عزشانہ نے فرمایا ہے :

"واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم وتودون ان
غیر ذات الشوکۃ تکون لکم" (الانفال/آیت ۷)

اور (یہ وہ وقت تھا) جب خدا تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ (کفار مکہ کی) دو جماعتوں میں سے ایک تمہارے لیے ضروری ہے اور تم یہ چاہتے تھے کہ کمزور جماعت تمہارے ہاتھ لگے (تاکہ بغیر لڑے بھڑے مال غنیمت ہاتھ آئے)

اسی طرح مسلمانوں کو مسجد الحرام میں داخل ہونے کے سلسلے میں جو وعدہ دیا تھا اس کے الفاظ اور اس کا ظہور یوں بیان ہوا :

"لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام
انشاء اللہ آمنین محلقین رؤوسکم ومقصرین لا تخافون
فعلم مالم تعلموا" (الفتح / آیت ۲۷)

بے شک خدا نے اپنے رسولؐ کو سچا مطابق واقع خواب دکھایا تھا کہ تم لوگ انشاءاللہ مسجد الحرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے تھوڑے سے بال کتروا کر بہت امن واطمینان سے داخل ہوگے (اور) کسی طرح کا خوف نہ کرو گے، تو جو بات تم نہیں جانتے تھے اس کو معلوم تھی۔

خداوند کریم نے مومنوں سے جو وعدہ فرمایا تھا کہ وہ انہیں زمین پر گذشتہ قوموں کا جانشین بنائے گا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :

"وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم" (النور/ آیت ۵۵)

اے ایمان لانے والو! تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے اچھے کام کیے۔ ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو (ایک نہ ایک دن) روئے زمین پر ضرور (اپنا) نائب مقرر کرے گا۔ جس طرح ان لوگوں کو نائب بنایا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے (اسلام) اس پر انھیں ضرور بالضرور پوری قدرت دے گا۔

[ھ] ۔ علمی حقائق بھی قرآن کے اعجازی پہلو کی ایک شکل ہیں، کیوں کہ جن حقائق کا انکشاف اس وقت تک نہ ہوا تھا ان کے بارے میں قرآن نے پہلے پہل اشارے کیے۔ قرآن نازل اسی لیے ہوا کہ لوگوں کو اس کے سائے میں صحیح ہدایت ملے۔ قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ وہ آسٹرالوجی (نجوم)، کمسٹری اور فیزیکس کی کتاب شمار ہو۔ قرآن کا مقصد خلقت انسان یا کائنات کے بارے میں علمی نظریے پیش کرنا نہیں، لیکن جہاں خالق کائنات کے وجود اور وحدانیت یا اس کی نعمتوں کا ثبوت فراہم کرنا چاہیے وہاں خلقت انسان اور زمین و آسمان کے سلسلے میں بہت سے علمی حقائق آشکار کیے ہیں۔ موجودہ زمانے میں علم نے جس حد تک ترقی کی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی جدید علم یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ قرآن میں جن موضوعات کا ذکر ہے وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جو نئے علمی انکشافات قرآن نے کیے ہیں وہ سب سے زیادہ تعجب خیز ہیں۔ اور یہی بات آن دلائل میں ایک دلیل کا مزید اضافہ کرتی ہے کہ قرآن خداوند تبارک و تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ قرآن کے اسی اعجازی پہلو کے بارے میں اللہ عز اسمہ فرماتا ہے:

"سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق اولم یکف بربک انہ علیٰ کل شیء شھید" (فصلت/ ۵۳)

ہم عنقریب ہی اپنی (قدرت) کی نشانیاں اطراف (عالم) میں اور خود

ان میں بھی دکھا دیں گے۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہی یقیناً حق ہے۔ کیا تمہارا پروردگار اس کے لیے کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے۔

دوسرا مقام:

"بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوی بنانہ" (القیامۃ/آیت ۴)

ہاں ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی پور پور درست کریں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

"فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقاً حرجاً کانما یصعد فی السماء" (الانعام/آیت ۱۲۵)

خدا جس شخص کو راہ راست دکھلانا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام (کی دولت) کے واسطے (صاف اور) کشادہ کر دیتا ہے۔ اور جس کو گمراہی کی حالت میں چھوڑنا چاہتا ہے، اس کے سینے کو تنگ (دشوار گذار) کر دیتا ہے گویا (قبولِ ایمان) اس کے لیے آسمان پر چڑھنا ہے۔

اور ارشاد ہے:

"وارسلنا الریاح لواقح" (الحجر/آیت ۲۲)

اور ہم نے وہ ہوائیں بھیجیں (جو بادلوں کو پانی سے) بھرے ہوئے ہیں۔

ارشاد ہے:

"اولم یر الذین کفروا ان السماوات والارض کانتا رتقا، ففتقناھما وجعلنا من الماء کل شیئ حیّ" (الانبیا/آیت ۳۰)

جو لوگ کافر ہو بیٹھے کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں بستہ (بند) تھے تو ہم نے دونوں کو شگافتہ کیا (کھول دیا) اور ہم ہی نے ہر جاندار چیز کو پانی سے زندگی بخشی۔

اسی طرح ارشاد ہے:

"ولقد خلقنا الانسان من سلالۃ من طین ۔ ۔ ۔ ۔ ثم انکم یوم القیامۃ تبعثون ۔" (المؤمنون / آیت ۱۲ - ۱۶)

اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا۔ پھر ہم نے اس کو ایک جگہ (عورت کے رحم میں) نطفہ بنا کر رکھا۔ پھر ہم ہی نے نطفے کو جما ہوا خون بنایا پھر ہم ہی نے منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا پھر ہم نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر ہم ہی نے اس کو (روح ڈال کر) ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ تو (سبحان اللہ) خدا بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہتر ہے۔ پھر اس کے بعد یقیناً تم سب لوگوں کو (ایک نہ ایک دن) مرنا ہے۔ اس کے بعد قیامت کے دن تم سب کے سب قبروں سے اٹھائے جاؤ گے۔

ارشاد ہے:

"والشمس تجری لمستقر لھا ذالک تقدیر العزیز العلیم" (یٰسین / آیت ۳۸)

اور ایک (نشانی) آفتاب ہے جو اپنے ایک ٹھکانے پر چل رہا ہے، یہ (سب) غالب واقف کار (خدا) کا (باندھا ہوا) اندازہ ہے۔

ارشاد ہے:

"وکل فی فلک یسبحون" (یٰسین / آیت ۴۰)

(چاند، سورج، ستارے ہر ایک (اپنے اپنے) آسمان (مدار) میں چکر لگا رہے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

"وتری الجبال تحسبھا جامدۃ وھی تمر مر السحاب صنع اللہ الذی اتقن کل شیٔ" (النمل / آیت ۸۸)

اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر انہیں مضبوط ، جمے ہوئے سمجھتے ہو۔ حالانکہ یہ (قیامت کے دن) بادل کی طرح اڑے اڑے پھریں گے ۔ یہ بھی خدا کی کاریگری ہے کہ جس نے ہر چیز کو خوب (کامل) مضبوط بنایا ہے ۔

خلقت سے متعلق مذکورہ آیتوں کے علاوہ قرآن میں اور بھی بہت سی آیتیں ملتی ہیں جو بذات خود بیّن ثبوت ہیں کہ قرآن خداوند تبارک و تعالی کی طرف سے نازل ہوا ہے' چونکہ ایک امی جس نے ایک عرف کسی سے نہ پڑھا ہو یا دو بار کے علاوہ (وہ بھی سوریہ تک کا سفر بارہ اور پچیس سال کی عمر کے دوران) اپنے شہر مکّہ سے قدم باہر نہ رکھا ہو' وہ ان حقائق کے بارے میں ذاتی طور پر اتنی گہری باتیں کیسے کہہ سکتا ہے؟ جن کا علم نے صدیوں بعد انکشاف کیا ہے۔

[د]۔ قرآن کا ایک اور اعجازی پہلو ایسے منظم احکام و قوانین پر مشتمل ہونے میں مضمر ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبے میں موجود اور ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کی بہترین قسم کے ضامن ہیں ۔ یہ احکام و قوانین انسان کو بہترین تہذیب و تمدن سے آشنا کراتے اور فضیلت' مساوات ، اخوت و عدالت کی بنا پر ایک نئی آزاد دنیا کی داغ بیل ڈالتے ہیں ۔قرآن نے دینی اور دنیاوی امور میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے کچھ بنیادی اصول و ضوابط مقرر کیے ہیں ، انھیں کی بنا پر انفرادی و اجتماعی حقوق و مفادات کی حفاظت ہوتی ہے ۔ اس کے بغیر معاشرتی زندگی ناہموار اور ایک دوسرے کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے ۔ اس نے ایسے قوانین کی طرف رہنمائی کی جو انسان کے لیے سعادت ، اطمینان اور رفاہ کا باعث ہیں ۔قرآن ان احکام و قوانین کے ساتھ نازل ہوا جو فرد اور جماعت کے مابین تعلقات کو استوار کرتے ہیں ، یہ احکام و قوانین اُس قوم کے لیے وضع کیے گئے جو معاشرتی نظام و قوانین سے واقف نہ تھی ۔اس کا قبائلی نظام مقامی رسم و رواج سے زیادہ کچھ نہ تھا۔قرآن نے اس قوم کو اس شریعت سے آشنا کرایا جو اس بات کی قائل ہے کہ تمام انسانوں کو پیدا کرنے والا ایک خدائے لایزال ہے ، اور تمام انسانوں کی سرشت ایک ہی قسم کی مٹی سے گندھی ہوئی ہے ،

لہذا اسلامی احکام و قوانین کی رو سے سب برابر ہیں اور رنگ، نسل، جنس، مال و دولت یا اقتدار کی رو سے ایک دوسرے پر کسی کو کوئی برتری نہیں۔ اسلامی احکام و قوانین آزادی واحترام انسان کے اصول پر مبنی ہیں۔ اسلامی شریعت نے عورت کو اس کا حق دیا ہے، مال و دولت کے لحاظ سے اس کی ثروت کو شوہر کی ثروت سے علیحدہ اور مستقل جانا ہے۔

وراثت سے متعلق بھی قرآن نے عدل و انصاف پر مبنی ایسا نظام قائم کیا ہے جس کی مثال گذشتہ اور موجودہ زمانے میں نہیں ملتی۔ دنیا کے تمام انصاف پسند ماہرین قانون اعتراف کرتے ہیں کہ انسانوں نے اب تک جتنے قوانین کا تجربہ کیا ہے ان میں سے قرآن کے قوانین سب سے اعلیٰ ہیں اور آج تک کوئی شخص یہ دعویٰ ثابت نہیں کرسکا ہے کہ یہ قوانین اسلام سے پہلے کسی شریعت میں داخل تھے۔ علامہ ابوزہرہ کے قول کے مطابق روم کے قوانین صدیوں تجربوں کے بعد تشکیل پائے۔ ایتھنا، اسپرٹ، جمہوریۂ افلاطون اور ارسطو کی "کتاب سیاست" سے فائدہ اٹھانے کے باوجود ان کے دساتیر نبی امی فداہ ابی و امی کے جاری کردہ قوانین کے سامنے ناقص نظر آتے ہیں۔ اس کے بعد ہم کس بنا پر اور کس سند کے حوالے سے اس کو جھٹلا سکتے ہیں جب کہ تمام آثار و قرائن اس کے برحق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔

میں تو اعجاز قرآن کا اہم ترین پہلو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ لاجواب، مؤثر اور مستحکم قانون کا سرچشمہ ہے۔ قیامت تک اس کے معجزہ اور عرب و غیر عرب پر حجت ہونے کے لئے قیامت تک دلیل ہے۔ کوئی عربی زبان جانے یا نہ جانے قبول حجت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ یہ نکتہ بھی قرآن نے چھپایا نہیں:۔

"قد جاءکم من اللہ نور وکتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام ویخرجھم من الظلمات الی النور باذنہ ویھدیھم الی صراط مستقیم" (المائدہ / آیت ۱۵)

خدا کی طرف سے ایک دمکتا ہوا، نور اور صاف صاف بیان کرنے والی کتاب (قرآن) آچکی ہے۔ جو لوگ خدا کی خوشنودی کے پابند ہیں ان کی تو اس کے ذریعے

سے نجات کی ہدایت کرتا ہے اور اپنے حکم سے (کفر کی) تاریکی سے نکال کر (ایمان کی) روشنی میں لاتا ہے اور انھیں راہ راست پر پہنچا دیتا ہے۔
ارشاد ہے:
"ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم" (الاسراء/آیت ۹)
اس میں شک نہیں کہ یہ قرآن اس راہ کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی ہے۔

⑧ احکام قرآن

مختصر یہ کہ قرآن مجید ان احکام پر مشتمل ہے جو انسان کی دنیوی و اخروی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ اعتقادی احکام، جن کا تعلق اعتقادی مسائل اور اس کے ارکان سے ہے، جیسے اللہ، ملائکہ، کتب آسمانی، انبیا و مرسلین، قیامت اور قضا و قدر کے خیر و شر کے بارے میں عقیدہ رکھنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔

۲۔ اخلاقی احکام، جن کا تعلق اُن اخلاقی محاسن و فضائل اور رفتار و کردار سے ہے جس پر عمل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

۳۔ عملی احکام، جو دو قسموں پر مشتمل ہیں:

پہلی قسم: عبادت کے احکام جو اللہ اور بندوں کے مابین رابطہ پیدا کرتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج .....

دوسری قسم: احکام معاملات جو دو افراد یا دو گروہ ہوں یا دو ملکوں کے درمیان تعلقات کو استوار کرتے ہیں۔ اس کی قسمیں حسب ذیل ہیں:

[الف]: گھریلو احکام، جیسے حسب نسب، شادی، طلاق، ارث، نفقہ اور دوسری چیزیں جو ایک گھر یا خاندان میں شامل افراد کے مابین تعلقات کو استوار کرتی ہیں۔ خواہ وہ تعلقات میاں بیوی یا اولاد و اقارب کے درمیان ہی ہوں اسے احوالِ شخصیہ

کہتے ہیں۔

[ب] :۔ وہ احکام جو ایک شخص کی دوسرے شخص کے ساتھ رفتار و سلوک پر منحصر اور دونوں کے مابین تعلقات کو استوار کرتے ہیں، انھیں احکام معاملات یا شہری (مدنی) احکام کہتے ہیں، جیسے مالی معاوضے، امانتیں، معاہدے، خرید و فروخت، اجارہ (کرایہ) اور دیگر معتبر معاہدے . . . .

[ج] : وہ احکام جن کا تعلق داخلی نظام اور جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت اور مجرموں کی سزا و جزا سے ہے۔ اسے قصاص، حدود، تعزیرات اور جنائی احکام کا مجموعہ کہا جاتا ہے۔

[د] : وہ احکام جو لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرنے اور جن کا تعلق انتظامیہ، شہادت، (گواہی) و عدالت سے ہوتا ہے، انھیں احکام مرافعات یا احکام قضا و محاکمات کہتے ہیں۔

[ھ] : وہ احکام جو نظام حاکمیت اور اس کے اصول پر مشتمل ہیں۔ حاکم و محکوم کے مابین تعلق قائم کرکے ہر ایک کی ذمہ داری معین کرتے ہیں، انھیں دستوری یا سلطانی احکام کہلاتے ہیں۔

[و] :۔ وہ احکام جو امیر و غریب حکومت و عوام کے درمیان مالی تعلق اور حکومت کے بجٹ کو منظم کرتے ہیں انھیں اقتصادی احکام کہا جاتا ہے۔

[ز] : وہ احکام جو اسلامی ملک و حکومت کے تعلقات کو دوسرے ملکوں سے استوار بناتے، جنگ و صلح کی حالت میں معاہدے اور اسلامی ملک میں غیر مسلم افراد کے ساتھ سلوک و برتاؤ کے ضوابط منظم کرتے ہیں انھیں (احکام جہاد و سیرت یا) بین الاقوامی احکام کہتے ہیں۔

یہ ایک مختصر خاکہ تھا ان قوانین کا جن کے بارے میں قرآن نے اشارہ کیا ہے، ان میں سے ہر ایک انسان کی سعادت و خوشی اور مفادات کا ضامن ہے۔ جو شخص احکام پر مشتمل آیات کا غور سے مطالعہ کرلے، وہ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے گا کہ، قرآن نے اعتقادی مسائل، ذاتی مسائل کے احکام، ارث، حدود، کفارات اور اصول عبادات کے

بارے میں بڑی تفصیل مہیا کی ہے ۔ چونکہ اس طرح کے اکثر احکام میں عقل کے دخل کی گنجائش نہیں ہے نیز یہ کہ مختلف حالات و مقامات میں تبدیلی آنے کے نتیجہ میں، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی ۔

لیکن عبادات ، ذاتی مسائل ، ارث اور حدود سے اور متعدد احکام کے بارے میں واضح اشارے اور مکمل طریق کار قرآن مجید میں موجود ہے ، جس سے مجتہدین کے لیے وسیع امکانات فراہم ہوتے ہیں ، یہ امکانات ترقی پذیر ضرورتوں اور مختلف معاشرتی تقاضوں کے وقت قانونی نکات مہیا کرنے میں مدد دیتے ہیں ۔قرآن مجید کے اعجاز اور زندہ کتاب ہونے کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے ۔

⑨ ۔ احکام کے بارے میں قرآن کی رہ نمائی ۔

قرآن قطعی الثبوت ہے ، چونکہ (قطعی الثبوت) متواتر طریقے سے ہم تک پہنچا ہے یعنی ہر دور میں قابل لحاظ بہت سے افراد نے ، کتابت و حفظ و روایت و تلاوت کے ذریعہ یکے بعد دیگر بلا اختلاف نقل کیا ہے اس لیے عقلی طور پر سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ اتنے لوگوں نے مل کر جھوٹ گڑھنے پر اتفاق کیا ہو ۔ لہٰذا اب تک انسانیت نے جتنی سندوں اور مآخذ کو جانا ہے ان میں سے قرآن کی سند سب سے زیادہ صحیح سند ہے ۔

اس قرآن نے احکام کی رہ نمائی دو طرح کی ہے :

[الف] : نشاندہی قطعی حکم پر مشتمل ہے ، جیسے ارث و حدود کی آیتیں ۔

"یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین" (النساء / آیت ۱۱)

خدا تمھاری اولاد کے حق میں تم سے وصیت کرتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے ۔

"والذین یرمون المحصنات ثم لم یأتوا باربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدة" (النور / آیت ۴)

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر (زنا کی) تہمت لگائیں پھر (اپنے دعوے پر

چار گواہ پیش نہ کریں تو انھیں اسّی کوڑے مارو۔

"الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منھما مأۃ جلدۃ" (النور/آیت ۲)

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد۔ ان دونوں میں سے ہر ایک کو (سو) کوڑے مارو۔

سو، اسّی، نصف، ربع، ثلث اور دوسرے اس طرح کے الفاظ جو اپنے معنوں کی قطعی نشاندہی کرتے ہیں کسی تاویل کی گنجائش نہیں رکھتے، بلکہ یہاں اختلاف فہم اور اجتہاد کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ ان احکام میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی ورنہ نص کی مخالفت ہوگی۔ یہاں قرآن کی رہنمائی اور قانون سازی قطعی ہے۔

[ب] کہیں یہ نشاندہی ظنی ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب نص میں موجود ایک لفظ متعدد معنوں کا حامل ہو، مثلاً درج ذیل آیت میں لفظ "قروٗ"

والمطلقات یتربصن بانفسھن ثلاثۃ قروء

(البقرہ/آیت ۲۲۸)

اور جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہے وہ اپنے آپ کو (طلاق کے بعد) تین قرء تک (نکاح ثانی) سے روکیں۔

لفظ "قرء" حیض وطہارت، دونوں معنوں میں مستعمل اور دونوں معنوں میں مشترک ہے، یہاں مفہوم پر دلالت ظنی ہے۔ اسی بنا پر نص محل اجتہاد قرار پائی اور علماء کی رائے میں اختلاف ہوگیا۔ حنفیوں نے اس کو حیض کے معنوں میں اور شافعیوں نے طہارت کے معنوں میں لیا ہے۔

اسی طرح درج ذیل آیت میں ید (ہاتھ) کے سلسلے میں، دائیں، بائیں دونوں مشترک ہیں، دونوں میں سے کسی ایک کو کاٹا جاسکتا ہے، کچھ حضرات صرف انگلیاں مراد لیتے ہیں اور کچھ کہنیوں تک اور کچھ بازو تک۔ یہ صورت بھی حکم کی ظنی نشاندہی کی ہے، اور مسئلہ کا حل سنّت کے ذریعہ ہوتا ہے:

"والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما"

(المائدہ/آیت ۳۸)

اور چور خواہ مرد ہو یا عورت تم ان کے کرتوت کی سزا میں ان کا ہاتھ کاٹ ڈالو۔

●●

جناب سید مرتضیٰ حسین
صدر الافاضل

برصغیر میں علمائے امامیہ کی تفسیریں

بعض ایرانی احباب کی خواہش تھی کہ برصغیر کے شیعہ علما کی تفسیروں کی تفصیل مہیا کریں، تہران میں سوائے "مطلع انوار" اور اپنے حافظے کے دوسرے مصادر مہیا نہ ہو سکے۔ بہر حال یہ مختصر سی فہرست حاضر ہے۔ جس میں ترجمے، حاشیے، تفاسیر اور ضمناً کشف آیات و مفتاح قرآن کے بارے میں بھی کچھ معلومات قلم بند کر دی ہیں، یقین ہے ارباب نظر توجہ فرمائیں گے۔

میرے نزدیک ترجمہ کو تفسیر کہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ کیونکہ ترجمہ ہو یا حاشیہ، آیات کی الگ الگ تشریح ہو یا مجموعی شرح، دراصل تفسیر ہی کے مختلف و متعدد انداز ہیں ترجمہ اگر لفظی ہو جب بھی اصل عبارت و الفاظ کے معانی سے نقاب کشائی کرتا ہے اور اگر آزاد و عام فہم ہو تو ظاہر ہے کہ وہ سادہ تفسیر ہی کے ضمن میں ہے۔ کسی کام کی کسی زبان میں ابتدا ترجمہ ہی سے ہوتی ہے۔ تشریح و تفسیر اس موضوع و ادب کے پڑھنے پڑھانے کے بعد کی جاتی ہے۔ اس لیے ہم نے اس تعارف نامۂ مختصر میں ہر درجے کی تفسیر کا تذکرہ کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ارباب دانش و بینش نے جو کام کیا ہے اور شیعوں کو قرآن مجید سے جو محبت رہی ہے اس کا ایک حوالہ محفوظ ہو جائے۔

ہمارے یہاں قرآن مجید پر براہ راست جو کام کرنے والے کام کرتے رہے ہیں وہ اپنا نام اس لیے نہیں لکھتے تھے کہ اس سے ان کا اجر ضایع نہ ہو، وہ خوشنودئ خدا اور عبادت کے طور پر یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض ترجمے اور تفسیریں چھپنے سے محروم رہیں۔ بعض چھپیں تو نام و نسبت سے خالی ہیں۔

سردست ہم ایک فہرست پیش کر رہے ہیں امید ہے اہل خبر ہمارے اندراجات کے بارے میں اپنے اطلاعات سے نوازیں گے تاکہ بحث و نظر مکمل کر سکوں۔

انگریزی ترجمے اور تفسیریں

۱۔ ترجمۂ عماد الملک سید حسین بلگرامی متوفی ۱۳۴۴ھ۔ یہ ترجمہ بلا متن ۱۹۳۰ء سے پہلے چھپا تھا۔

۲۔ ترجمہ و مقدمہ و حواشی نصف قرآن از بادشاہ حسین بن فدا حسین سیتاپوری متوفی ۱۳۵۶ھ مقدمہ و سورۃ البقرہ کا ترجمہ دو جلدوں میں مؤید العلوم مدرسۃ الواعظین لکھنؤ سے ۱۳۵۰ھ میں چھپ چکا ہے۔

بادشاہ حسین صاحب کے بعد جناب نجم العلما سید نجم الحسنؒ صاحب نے سید افتخار حسین سشن جج سے ترجمے کو مکمل کرایا۔ سید افتخار حسین صاحب ۱۳۷۱ھ میں فوت ہو گئے، مکمل ترجمہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

۳۔ حجۃ الاسلام باقر علی خان صاحب لکھنوی نجفی متوفی ۱۳۷۶ھ نجف سے فارغ التحصیل ہو کر لندن گئے اور وہاں سے آ کر قرآن مجید کے ترجمۂ و حواشی لکھنے بیٹھے۔ کام مکمل کر چکے تھے کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات ہوئے جس میں یہ ترجمہ پنجاب (مشرقی) میں ضایع ہو گیا، مولانا باقر علی صاحب نے میانوالی میں رحلت کی۔

۴۔ سید اقبال حسین صاحب لاہوری نے قرآن مجید کا ترجمہ و حواشی کا کام شروع کیا تھا اور جہاں تک مجھے یاد ہے پانچ پارے مکمل کر چکے تھے۔ ۱۹۶۲ء کے قریب رحلت کی۔ ترجمہ ان کے گھر میں تھا۔

۵۔ ترجمہ از پروفیسر عسکری صاحب (متوفی حدود ۱۹۷۲ء) جس پر چند جگہ سیٹھ محمد علی حبیب صاحب نے حاشیے لکھے اور کراچی سے بلا متن غالباً ۱۹۵۶ء میں مترجم کا نام لکھے بغیر اپنے تعارف نامے کا اضافہ کر کے اسے چھاپا۔ سرورق پر ہے FOOT NOTES BY. M.H. SHAKIR یہ ترجمہ متن کے ساتھ تہران سے اور نظر ثانی کے بعد قم سے شایع ہوا ہے۔

۶۔ مقدمہ و حواشی و ترجمہ مع متن یہ مفصل تفسیر پروفیسر میر احمد علی و فا خانی اور مولانا آغا مرزا

مہدی پویا صاحب کے افادات پر مبنی ہے۔ آغا پویا صاحب نے ۱۶ جمادی الثانیہ ۱۳۹۳ھ اور میر احمد علی صاحب نے ۲۱ رمضان سنہ ۱۳۹۶ھ کو رحلت فرمائی۔
یہ تفسیر خلیل صاحب نے کراچی سے ۱۹۶۴ء کے قریب شائع کی۔

اردو تراجم و تفاسیر

○ توضیح مجید فی تنقیح کلام اللہ الحمید، لکھنؤ سے دو جلدوں میں چھپی، سنہ اشاعت ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء ہے۔

تالیف سید علی بن غفران مآب سید دلدار علی۔ متوفی ۱۲۵۶ھ در کربلا۔

توضیح مجید، عارفانہ و موالیانہ تفسیر ہے۔ اس میں حساب جمل سے فضائل محمد و آل محمد علیہم السلام پر گفتگو اور آیات سے مربوط مختصر سا تفسیری بیان ہے۔

مطبوعہ نسخہ کاتب کی غلط کاریوں کا شاہ کار۔

○ ترجمہ و حواشی، مطبوعہ لکھنؤ، سنہ ندارد یہ ایڈیشن بظاہر پہلا شیعہ مطبوعہ ترجمہ ہے۔[1] موجودہ نسخے کا سرورق نہیں ہے۔ سردست افسوس ہے کہ مترجم و حاشیہ نگار کا نام بھی معلوم نہیں ہو سکا۔

البتہ حاشیے کی عبارت کے خاتمے پر "ام" بطور علامت درج ہے۔

ممکن ہے، اس سے مراد امداد علی ہو۔ تاریخ و تذکرۂ علمائے شیعہ میں امداد علی نامی تین مفسر ملتے ہیں:

(الف) راجہ امداد علی خان بن رحمان بخش کنتوری تلمیذ حکیم سید علی کنتوری و مولانا اعظم علی متوفی ۱۲۹۲ھ عالم و مفسر و ادب عربی کے ماہر تھے۔ تذکرۂ بے بہا میں ان کی کئی کتابوں کے نام درج ہیں۔ مثلاً

منہج السداد تفسیر قرآن مجید۔ تفسیر سورۂ یوسفؑ عربی بلا نقط۔ شرح خطبۂ شقشقیہ۔ شرح مقامات حریری ۔۔۔۔ یہ نہیں معلوم کہ تفسیر عربی میں لکھی یا فارسی یا اردو میں

---

[1] حامد حسن قادری نے اردو میں پہلا تفسیری ترجمہ حکیم محمد شریف خان متوفی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۷ء کا ترجمہ قرار دیا ہے اور حکیم محمد شریف خان شیعہ تھے۔

(ب) میر امداد علی ، کیرانہ مظفر نگر کے عالم و خطیب ۔ جو دہلی سے لکھنؤ آئے تھے علم دین حاصل کیا ۔ سید العلما مولانا سید حسین صاحب کی شاگردی اور خطابت کی بدولت سرکار دربار تک رسائی پائی ۔ لکھنے کا شوق تھا اور ثقہ تقریر و تحریر کا ملکہ رکھتے تھے ۔ بحر المصائب ان کی مشہور کتاب ہے جو مطبع شاہی اودھ سے اور اس کے بعد بھی بار ہا چھپ چکی ہے ۔ موصوف نے بھی ترجمہ و حواشی قرآن لکھے تھے ۔ ممکن ہے زیر نظر نسخہ انھیں کا ہو ۔

(ج) حاجی مرزا امداد علی صاحب جن کے بارے میں پروفیسر مسعود حسن صاحب ادیب مرحوم نے اطلاع دی تھی کہ ان کے کتب خانے میں " ثابت نامۂ نو طرز " کا قلمی نسخہ تھا جس کے دیباچے کی عبارت ہے :

> "اس عاصی کو تمام عمر شوق اور ذوق کتب تفاسیر اور احادیث اور کتب تواریخ کے دیکھنے اور لکھنے اور ترجمہ کرنے کا رہا ...... اکثر کتابیں اردو میں تالیف کیں .... تفسیر منہج الصادقین کہ ملا فتح اللہ مغفور نے فارسی میں لکھی تھی ، بندے نے اس کو ہندی ترجمہ کیا .... اور کتابیں مثل نسخۂ چہار دہ نور اور مسیب نامہ اور مختار نامہ وغیرہ کے بہت سی ترجمہ کی ہیں ....
> بعض احباب نے فرمائش کی تم ترجمہ " ثابت نامہ " کا کہ اس میں حال امیر ثابت پسر مختار کا ہے اور وہ فارسی ہے تم اس کو زبان اردو میں ...... تحریر کرو ..... در عہد امجد علی شاہ .... ۱۲۵۹ھ ترجمے سے ثابت نامے کے فارغ ہوا .... (نذر ذاکر ص ۴۲)

جس ترجمہ کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۵ء کے لگ بھگ چھپا ہے ممکن ہے یہ کام انھیں کا ہو ۔

تفصیل کے لیے دیکھیے مطلع انوار " امداد علی " ۔ اور " شاہان اودھ کا علمی و ادبی ذوق " شمولہ نذر ذاکر طبع دہلی ۔

○ ایک اردو ترجمہ حامل المتن مترجم و کاتب کے نام سے خالی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے کتاب خانے میں موجود ہے یہ ترجمہ شیعہ مترجم کا ہے ۔

قرآن مجید مترجم، بحواشی۔ جس کے سرورق پر ۱۲۹۷ھ درج ہے۔ یہ ترجمہ مطبع عمدۃ المطابع امروھہ سے باہتمام سید علی حسن خاں طبع ہوا تھا۔ آخری صفحہ پر خاتمہ کی عبارت یہ ہے "للّٰہ الحمد والشنا کہ خالق ارض وسما (ست) بہ ساعت سعید، قرآن مجید، فرقان حمید، مترجم، محشّٰی مذہب امامیہ بہ خط بے نمط خاکسار عصیاں شعار، رحیم بخش، برتر امروہوی نقل ہوکر بہ مطبع عمدۃ المطابع واقع امروھہ محلہ دانشمندان بہ اہتمام جناب سید علی خان صاحب مالک مطبع و نیز کار پرداز مطبع طبع ہوکر ہدیۂ مومنینِ قاریانِ قرآنِ مبین ہے......" تاریخ از راقم ؎

برتر کتاب خالقِ اکبر بروز سعد مطبوع بہر درد ثواب عظیم شد

بو دم بفکر سال کہ آمد ندائے غیب تاریخ طبع خوب کتاب کریم شد (۱۳۰۱ھ)

یہ نسخہ جناب مولانا سرور حسن صاحب کے پاس مجیدیہ لائبریری مبارک پور ضلع اعظم گڑھ میں موجود ہے موصوف ہی نے اس سے مطلع فرمایا۔ ترجمہ و حواشی لکھنے والے کا نام نہیں معلوم ہوسکا

تنویر البیان ترجمہ تفسیر خلاصۃ المنہج مولانا محمد حسین صاحب عرف علن صاحب متوفی ۱۳۲۵ھ کے حکم سے پہلی مرتبہ لکھنؤ سے اور ۱۸۹۵ء پھر ۱۹۰۴ء میں آگرے سے چھپا میرے خیال میں یہ ترجمہ حاجی مرزا امداد علی کا ہے۔

عمدۃ البیان: تالیف مولانا الحاج سید عمار علی صاحب سونی پتی، فاضلِ لکھنؤ موصوف نے صفر ۱۳۰۴ھ کو رحلت کی تفسیر عمدۃ البیان ۱۳۰۴ھ سے ۱۳۰۷ھ تک دہلی میں پہلی مرتبہ چھپی اس کے بعد متعدد بار شایع ہوتی رہی۔

ترجمۂ قرآن: از قلم نواب حاج محمد قلی خان کان پوری۔ ایک ادبی ترجمہ جو اس وقت بہت مشہور رہا۔ یہ ترجمہ بلا متن قرآن ۱۳۲۰ھ/۱۸۸۶ء کو مطبع اثنا عشری لکھنؤ سے چھپا۔

ترجمہ و حواشی و فہرست مطالب از قلم حافظ مولانا سید فرمان علی صاحب۔ ممتاز الافاضل متوفی ۱۳۳۴ھ۔

یہ ترجمہ عوام میں بہت مقبول ہوا اور حامل المتن ایڈیشن عمدہ سے عمدہ چھپ چکے ہیں، ۱۹۷۰ء میں مولانا نجم الحسن کراروی و مولانا ابن حسن رضوی صاحبان کی نظر ثانی سے کراچی میں چھپا

ترجمہ و حواشی و مقدمات مولانا مقبول احمد صاحب دہلوی متوفی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء۔ اصل میں

یہ ترجمہ اردو میں ایک عمدہ قسم کی شیعہ تفسیر ہے۔ لیکن اسے مفتاح الآیات و ضمیمہ و مقدمہ کے نام سے جزو جزو کر کے چھاپا گیا۔

اب تک اس کے متعدد ایڈیشن ہندوستان و پاکستان سے شایع ہو چکے ہیں۔

○ آثار حیدری، ترجمہ تفسیر امام حسن عسکری ؑ، از سید شریف حسین متوفی ۱۳۶۱ھ (ابن امام علی) بھرلی ضلع انبالہ پنجاب کے رہنے والے تھے۔ ۱۳۶۱ھ میں فوت ہوئے۔

○ ترجمہ و حواشی از شیخ محمد علی صاحب متوفی حدود ۱۹۴۷ء۔ یہ ترجمہ حواشی کے ساتھ دہلی سے چھپ چکا ہے۔

○ ترجمہ و حواشی، سید زیرک حسین امروہوی ملا فاضل، مناظر۔ متوفی حدود ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۵ء حواشی میں آیات کے تاثیرات اور حساب جُمل و تعویذات کا بیان ہے۔

○ ترجمہ و حواشی از مرزا احمد علی صاحب امرتسری متوفی ۱۹۷۰ء طبع لاہور۔

○ تفسیر المتقین ترجمہ و حواشی از سید امداد حسین صاحب کاظمی متوفی ۱۹۷۵ء میرے مقدمے کے ساتھ لاہور سے کئی مرتبہ چھپ چکا ہے۔ اچھا ترجمہ اور مناسب حواشی۔

○ قرآن کریم مع تفسیر توضیح القرآن: الحاج سید مجاور حسین صاحب نے بڑی محنت سے تفسیری نوٹ لکھے ہیں اور نسبتاً متوسط تفسیر کا رنگ دیا ہے۔ یہ تفسیر ۱۹۷۲ء میں کراچی سے شائع ہوئی اور مترجم نے ۱۹۸۰ء کے قریب رحلت کی۔

○ ترجمہ و حواشی از قلم استاذ علام مولانا سید محمد صادق صاحب استاد ادبیات شیعہ عربی کالج لکھنؤ۔ عالمانہ و ادیبانہ تفسیر ہے۔ لکھنؤ سے چھپی۔ مولانا محمد صادق قبلہ نے رجب ۱۴۰۴ھ کو رحلت فرمائی۔

○ انوار النجف، علمی تفسیر ہے جسے مولانا حسین بخش صاحب جاڑا نے تکمیل کو پہنچایا یہ تفسیر شایع ہو گئی ہے (جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان)

○ تفسیر از قلم ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی یہ تفسیر بڑی اچھی زبان اور صاف و روان اسلوب میں تکمیل کو پہنچ کر تین جلدوں میں چھپ چکی باقی جلدیں زیر طباعت ہیں (کراچی)

○ تفسیر از قلم سید العلما مولانا الحاج سید علی نقی صاحب لکھنوی آپ نے مدت ہوئی مقدمۂ تفسیر قرآن عربی و اردو میں لکھا تھا جو چھپ چکا ہے، پھر سورۃ الحمد و البقرہ کی تفسیر لکھنؤ سے چھاپی

اب بحمدہ تفسیر کا دورہ کامل کر لیا ہے جس کی تین جلدیں سری نگر کشمیر سے چھپی ہیں۔ باقی زیر اشاعت ہیں۔

تفسیر رضی، مولانا سید محمد رضی زنگی پوری متوفی ۱۳۷۰ھ کے وہ تفسیری نوٹ جو موصوف نے رام پور میں تیار کیے تھے۔ نواب صاحب رام پور، رضا علی خان مرحوم کی خواہش سے جناب حافظ کفایت حسین صاحب مرحوم، خطیب اعظم مولانا الحاج سید محمد صاحب دہلوی۔ حجۃ الاسلام مولانا سید محمد داؤد صاحب زنگی پوری پر مشتمل ایک بورڈ تشکیل پایا جس کو ایک جامع تفسیر لکھنا تھی۔ ابھی کام شروع ہی ہوا تھا کہ تقسیم ہندو پاک اور آزادی کا اعلان ہو گیا جس سے پورا ملک قتل وغارت گری کی لپیٹ میں آگیا، ریاست ضبط ہو گئی اور بورڈ ٹوٹ گیا۔ مولانا محمد رضی صاحب قبلہ ہمت نہ ہارے۔ ان کا مطالعہ جاری تھا کہ بیمار ہو گئے اور کام مکمل نہ ہو سکا۔

مولانا سید ظفر الحسن صاحب قبلہ مرحوم نے ان یادداشتوں کو بنارس ہند سے شایع کردیا ہے۔

○ انوار القرآن، گوپال پور صوبہ بہار، ہند کے جلیل القدر عالم حجۃ الاسلام سید راحت حسین صاحب قبلہ نے مفصل تفسیر لکھنا شروع کی جس کا مقدمہ اور سورۂ آل عمران تک ایک حصہ چھپا باقی اجزا نہ چھپ سکے اور مولانا ۱۳۷۵ھ میں وفات پا گئے۔

○ تفسیر از حجۃ الاسلام مولانا سید حیدر حسین صاحب نکہت لکھنوی متوفی حدود ۱۳۹۰ھ صاف وسادہ و رواں تفسیر جو سورۂ دخان تک بخط مصنف لکھی ہوئی مولانا سید ابن حسن صاحب قبلہ کربلائی کے پاس کراچی میں موجود ہے۔

○ ترجمۂ تفسیر مجمع البیان طبرسی، ڈاکٹر سید محمد حبیب الثقلین صاحب کراچی، دوسری جلد قریب تکمیل ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے وجوہ اعراب کی بحث چھوڑ دی ہے۔

سندھی تفسیر

○ ضیاء الایمان، تفسیر القرآن۔ جناب محمد خان لغاری صاحب متوفی حدود ۱۹۴۰ء۔ یہ تفسیر سندھی زبان میں سندھ سے دو جلدوں میں چھپی ہے۔

گجراتی تفسیر

○ حاجی غلام علی حاجی اسماعیل متوفی حدود ۱۹۴۶ء نے گجراتی میں بہت کتابیں لکھی ہیں مرحوم نے قرآن مجید کا ترجمہ و حواشی بھی گجراتی میں شایع کیا۔ جو بھاؤ نگر سے چھپ چکا ہے۔

منظوم اردو ترجمے:

○ آغا شاعر قزلباش مرحوم دہلوی کا مکمل ترجمہ۔
○ شمیم الحسن صاحب (حی) کا مکمل ترجمہ۔
دونوں ترجمے جزوی طور پر چھپ چکے ہیں۔

منظوم پشتو ترجمہ:

○ سید جعفر حسین صاحب استرزئی پایان ضلع کوہاٹ نے پشتو میں ترجمہ نظم کیا یہ ترجمہ پشاور پاکستان سے چھپ چکا ہے۔

فارسی تفاسیر:

○ علی رضا تجلی، شاگرد آقای سید حسین خوانساری کی تفسیر جس کے بارے میں ۱۲۱۸ھ کا مؤلف احمد علی سندیلوی مخزن الغرائب میں کہتا ہے کہ:
سادہ و فصیح و واضح انداز میں یہ تفسیر علما میں مقبول و رائج ہے۔
علی رضا شیرازی عہد شاہ جہان میں وارد ھند ہوئے، تفسیر اور متعدد کتابیں دہلی میں لکھیں فقیہ تھے اور قاضی، نور اللہ شہید ثالث کے بعد شیعیان ہند میں مرجعیت کے مالک ہوئے۔ لیکن آخر میں وطن شیراز چلے گئے اور وہیں ۱۰۸۵ھ کے لگ بھگ فوت ہوئے۔
○ بحر المعانی / زبدۃ بحر المعانی
محمد بن احمد خواجگی بن عطاء اللہ شیرازی۔ نظام شاہ دکن کے عہد میں وارد ہند ہوئے

اور بیسجا پور میں کیا کام کیا۔ فلسفہ و کلام کے ماہر خواجہ جلال الدین محمد کے شاگرد اور ملک العلماء قاضی شہاب الدین دولت آبادی، جون پوری کے استاد تھے۔ موصوف نے بڑی مفصل تفسیر لکھی جس میں معقولات پر بڑا زور دیا ہے۔ اسی تفسیر کو بعض حضرات نے خلاصۂ مجمع البیان بتایا ہے۔

○ صفی بن ولی قزوینی (متولد در کربلا ۱۰۲۹ھ) نے زیب النسا متوفی (۱۱۱۳ھ/۱۷۰۲ء) کی فرمائش سے دہلی میں ایک مفصل تفسیر کا ۱۰۷۷ھ میں آغاز کیا۔ اس وقت مصنف کا سن اڑتالیس سال تھا، آٹھ سال میں نو جلدیں لکھ کر تفسیر مکمل کی کام کا زیادہ حصہ کشمیر میں انجام دیا جیسا کہ آخری جلد میں ۱۰۸۶ھ کی تصریح ہے۔ زیب التفاسیر کے مآخذ میں تفسیر نیشاپوری۔ تفسیر فخرالدین رازی۔ جواہر التفسیر کاشفی۔ تفسیر بیضاوی۔ تفسیر بحر مواج۔ تفسیر کشاف کے نام ہیں۔

بعض حضرات نے اسے زبدۃ التفاسیر کے نام سے یاد کیا ہے۔

○ تفسیر از سید نجف علی نونہروی (شاگرد جناب غفراں مآب مولانا دلدار علی) متوفی ۱۲۶۱ھ

○ لوامع التنزیل و سواطع التاویل: از حجۃ الاسلام سید ابوالقاسم حائری۔ از اول تا پارہ سیزدہم و سید علی حائری مرحوم از پارہ سیزدہم تا پارہ بیست و ہفتم۔

اس کا پورا دورہ آیت اللہ آقای شہاب الدین مرعشی نجفی کے کتاب خانہ قم میں محفوظ ہے۔

برصغیر کی تفسیروں میں ایک وقیع اور قابل قدر تفسیر ہے، اس کی زبان فارسی اور اسلوب جدلی ہے، عبقات الانوار کا انداز اور فخر الدین رازی کی طرح تفصیل ہے۔

مولانا ابوالقاسم حائری اور ان کے فرزند شمس العلما سید علی حائری نے تفاسیر کا ایک بہت قیمتی کتاب خانہ جمع کیا اور بڑی تندہی سے مبسوط و مفصل تفسیر لکھی، لوامع التنزیل وسعت معلومات اور شیعوں پر اتہامات کے جواب نیز قرآن مجید پر مسیحی و غیر مسلم معترضین کے حملوں کی رد قلم بند کی گئی ہے۔

تفسیر لوامع التنزیل چھپنے کے بعد علماء ایران و عراق میں بے حد مقبول ہوئی اور اس وقت کے اکابر علماء و محققین نے بڑی گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور بڑے بڑے مصنفین نے بڑی شاندار تقریظیں لکھیں، یہ تقریظیں اسی زمانے میں چھپی تھیں۔

لوامع التنزیل کی اکیس جلدیں لاہور سے چھپ چکی ہیں۔
مولانا ابوالقاسم حائری لاہوری کی تاریخ وفات ۱۳۲۴ھ ہے اور مولانا سید علی حائری کی تاریخ وفات ۱۳۵۰ھ ہے۔

سورتوں کی تفسیریں :

عربی میں :

○ ینابیع الانوار : دو پاروں کی دو جلدیں۔ فخر الدین کے اسلوب اور بحث و رد۔
خطی : موجود در کتب خانہ ممتاز العلما لکھنؤ۔
تالیف : سید محمد تقی بن سید العلما سید حسین لکھنوی۔ متوفی ۱۲۹۸ھ۔
تیسری جلد، مولانا محمد تقی کے فرزند محمد ابراہیم متوفی ۱۳۰۷ھ نے لکھی یہ نسخہ بھی مذکورہ کتب خانے میں محفوظ ہے۔

○ تفسیر سورۃ الاخلاص : خطی
تالیف : سید ابوالمعالی متوفی ۱۰۴۶ھ بن سید نور اللہ شوستری الشہید۔

○ روائح القرآن فی فضائل امناء الرحمن : مطبوع
تالیف : مفتی سید محمد عباسؒ متوفی ۱۳۰۶ھ۔
مؤلف مذکور کی دو اور کتابیں ہیں :
۱. تفسیر سورۃ ق قلمی
۲. تفسیر سورۃ الرحمن قلمی

○ مصباح البیان فی تفسیر سورۃ الرحمن۔ قلمی۔
تالیف : سید محمد محسن زنگی پوری، متوفی ۱۳۲۵ھ

○ تفسیر سورۃ ھل اتی۔ قلمی۔
تالیف : تاج العلما سید علی محمد متوفی ۱۳۱۲ھ

○ تفسیر سورۂ یوسف۔ قلمی
تالیف : راجہ امداد علی خان متوفی ۱۲۹۲ھ بن رحمان بخش۔

فارسی

- تفسیر سورۃ الحمد ۔ خطی
- تفسیر سورۃ البقرہ ۔ خطی
- تفسیر سورۃ الدھر ۔ خطی
- تفسیر سورۃ الاخلاص خطی

تالیف : سید العلما سید حسین ابن غفران مآب دلدار علی متوفی ۱۲۷۳ھ ۔

- کشف الغطا فی تفسیر سورۃ ھل اتیٰ ۔ مطبوع ۔
- سراکبر تفسیر سورۃ والفجر ۔ مطبوع از لودھیانہ ۔ ھند ۔

تالیف : ارسطو جاہ سید رجب علی شاہ، جگراؤں ضلع لودھیانہ ۔

- تفسیر سورۃ الحمد ۔ خطی ۔ در کتابخانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ ۔

تالیف : حجۃ الاسلام سید محمد تقی بن سید محمد ابراھیم متوفی ۱۳۴۱ھ ۔

- تفسیر سورۃ الحمد ۔

تالیف : علامہ شیخ عبدالعلی تہرانی ہروی لاہوری متوفی ۱۳۴۱ھ ۔

- از ھار التنزیل در وجوہ سور قرآنیہ ۔ قلمی

تالیف : سید محمد محسن زنگی پوری متوفی ۱۳۲۵ھ

- تفسیر سورۃ الحجرات، شمولہ در انوار الآیات، مطبوع ۔
- دس چھوٹے سوروں کی تفسیر ۔ مطبوع لاہور ۔

تالیف : سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل ۔

تفاسیر سورۂ یوسف

- مفتی میر محمد عباس ... / مفدر علی بن حیدر علی رضوی، فارسی، قلمی ۱۲۹۱ھ

محفوظ در کتب خانہ حاجی سید علی اکبر رضوی، کراچی ۔

مؤلف نے مقدمہ میں اس کتاب کی تالیف عہد امجد علی شاہ میں لکھی ہے ۔

- انوار یوسفیہ : فارسی، قلمی ۔

تالیف : مفتی سید محمد عباس صاحب رحمتہ اللہ علیہ

○ محمد ابراہیم فردوس مکاں (متوفی ۱۳۰۷ھ) بن سید محمد تقی کی تالیف ہے۔

ظل ممدود، تفسیر سورۂ ہود و کہف و یوسف۔ فارسی قلمی۔ موجود در کتب خانہ ممتاز العلماء۔

○ تفسیر سورۂ یوسف۔ اردو۔ قلمی ۵۵۲ صفحات موجود در کتب خانہ مدرسۃ الواعظین لکھنؤ

تالیف : سید محمد تقی بن محمد ابراہیم سابق الذکر۔

○ ابواب المصائب، تفسیر سورۂ یوسف با تطبیق واقعات امام حسین علیہ السلام۔ اردو مطبوع

تالیف : مرزا سلامت علی دبیر لکھنوی۔ متوفی ۱۲۹۲ھ۔ اس کتاب پر میرا مفصل مضمون "پیام عمل" لاہور دبیر نمبر میں چھپ چکا ہے۔

○ احسن القصص۔ عربی مطبوع ۱۳۰۵ھ عظیم آباد، بہار، ہند۔

تالیف : تاج العلما سید علی محمد متوفی ۱۳۱۲ھ

○ تفسیر سورۂ یوسف۔ اردو۔ مطبوع لکھنؤ۔

تالیف : علی اکبر متوفی ۱۳۲۷ھ بن سلطان العلما سید محمد صاحب لکھنوی

تفسیر آیات

○ انس الوحید فی آیت العدل والتوحید۔ عربی قلمی۔

○ تفسیر "فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام۔" عربی قلمی۔

○ تفسیر انما المشرکون نجس۔ عربی قلمی۔

○ تفسیر آیت التطہیر۔ عربی۔ مطبوعہ۔

یہ کتابیں، کتب خانہ ناصر الملت، لکھنؤ میں موجود ہیں۔

تالیف : شہید ثالث، نور اللہ شوستری۔ ۱۰۱۹ھ، آگرہ ہند۔

○ نور الانوار، تفسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ فارسی قلمی۔

تالیف : احمد بن محمد علی بن وحید بہبہانی متوفی ۱۳۳۵ھ

○ تقریب الافہام در آیات الاحکام۔ فارسی قلمی۔

موجود در کتب خانہ ناصر الملت۔ لکھنؤ۔

تالیف ۔ مفتی سید محمد قلی کنتوری، متوفی ۱۲۶۰ھ

○ تفسیر کنتم خیر امۃ اخرجت للناس ۔ فارسی ۔ قلمی ۔

تالیف : سید العلما سید حسین متوفی ۱۲۷۳ھ

○ تفسیر آیۂ سیجنبها الاتقی الذی ۔

تالیف : مفتی محمد عباس ۔ لکھنؤ ۔

○ تفسیر آیت التطہیر ۔ اردو ۔ مطبوع ۔

تالیف : محمد باقر دہلوی ۔ متوفی ۱۲۷۲ھ

○ ایجاز التحریر، فی تفسیر آیت التطہیر ۔ اردو ۔ مطبوع ۔

تالیف : سید ناصر حسین متوفی ۱۳۱۳ھ ابن سید مظفر حسین جون پوری ۔

○ تفسیر، اللہ نور السموات و الارض ۔ عربی ۔ مطبوع ۔ ضمن موعظۂ حسنہ ۔ طبع لاہور ۔

تالیف : علامہ عبد العلی تہرانی متوفی ۱۳۴۱ھ ۔ لاہور ۔

○ تفسیر، اللہ نور السموات و الارض ۔ عربی ۔ قلمی ۔

تالیف : محمد علی طبسی ۔ حیدرآبادی، متوفی حدود ۱۳۳۱ھ ۔

○ تفسیر آیۂ معراج ۔ بنام اتقان البرہان ۔ اردو ۔ طبع لکھنؤ ۔

تالیف : محقق ہندی، سید محمد حسین لکھنوی، متوفی ۱۳۳۷ھ

○ "تفسیر" اینما تولوا فثم وجہ اللہ ۔

تالیف : علامہ غلام حسنین کنتوری ۔ متوفی ۱۳۳۷ھ

○ برہان مجادلہ فی تفسیر آیۂ مباہلہ ۔ اردو ۔ طبع لکھنؤ

تالیف : شیخ محمد اعجاز حسن بدایونی ۔ متوفی ۱۳۵۰ھ

○ تفسیر آیۂ صلوٰۃ الوسطیٰ ۔ عربی ۔ قلمی

تالیف : سید محمد تقی بن ابراہیم ۔ متوفی ۱۳۴۱ھ لکھنؤ ۔

○ التکمیل، آیۂ اکملت لکم ...... اردو ۔ طبع لکھنؤ ۔

تالیف : حکیم سید مرتضیٰ حسین الہ آبادی متوفی حدود ۱۹۵۰ء

○ انوار الآیات ۔ اردو ۔ طبع لاہور
سو سے زائد آیات کی تفسیر مع تفسیر مختصر سورۃ الحجرات ۔
تالیف : سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل ۔

تفسیروں پر حاشیے :

○ حاشیہ بر تفسیر بیضاوی ۔ عربی ۔ قلمی ۔
تالیف : ملا طاہر بن سید رضی الدین ہمدانی ۔ دکنی ۔ متوفی ۹۵۲ ھ

○ حاشیہ بر تفسیر بیضاوی ۔ دو جلد ۔ عربی ۔ قلمی

○ حاشیہ بر تفسیر بیضاوی ۔ مختصر ۔ عربی ۔ قلمی
محفوظ در کتب خانہ ناصر الملت ۔ لکھنؤ
تالیف : شہید ثالث نور اللہ شوستری

بیضاوی کی تفسیر پر دو حاشیے ، شہید کے دو بیٹوں کے نام سے فہرست و رجال کی کتابوں میں درج ہیں ۔ لیکن چونکہ ان کے والد اور جناب شریف الدین صاحب اور جناب علاء الدولہ کے حاشیے مقابلہ کر کے نہیں دیکھے گئے ۔ اس لیے جہاں یہ ممکن ہے کہ باپ بیٹوں کے الگ الگ تین حاشیے ہوں وہاں اس کا بھی امکان ہے کہ باپ کے حاشیے بیٹے کے قلم سے نقل شدہ ہوں ۔ کسی کی دسترس میں یہ نسخے ہوں تو حقیقت معلوم ہو سکتی ہے ۔

○ حاشیہ بر تفسیر کشاف ۔ عربی ۔ قلمی ۔
مسلم یونیورسٹی ، حبیب الرحمٰن خان شروانی کلکشن میں یہ نسخہ موجود ہے ۔
تالیف : ابوالحسن آخری تاجدار دکن ۔ متوفی ۱۱۱۱ ھ

○ حواشی التفسیریہ ۔ فارسی ۔ قلمی
تالیف : مفتی محمد عباس صاحب ۔
مفتی صاحب کی اکثر قلمی کتابیں سرکار نجم العلما کے ذاتی کتب خانے میں ، میں نے دیکھی تھیں ۔

○ الامالی التفسیریہ ۔ عربی ۔ قلمی ۔ کتب خانہ مولانا سید آغا مہدی صاحب کراچی میں محفوظ ہے ۔
تالیف : سید محمد تقی آل غفران مآب ۔

تفسیر موضوعی

○ میزان الایمان — کے نام سے جناب حجۃ الاسلام مولانا مرزا یوسف حسین صاحب قبلہ مدظلہ ایک مبسوط کام کر رہے ہیں۔ ایک ایک موضوع اور اس کے اجزاء پر آیات۔ ترجمہ اور خلاصۂ مطالب۔

میزان الایمان کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں۔

○ توحید القرآن — اردو طبع دہلی

○ امامۃ القرآن — اردو طبع دہلی

تالیف: مولانا محمد ہارون زنگی پوری متوفی ۱۳۳۹ھ

مؤلف کی متعدد کتابوں میں سے قرآن سے مربوط دو کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

علوم القرآن — اوراد القرآن

کشف آیات:

آیات شماری قرآن مجید کی تدوین و ترتیب کے بعد پہلا اہم مسئلہ تھا۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن کو تیس پاروں اور سورتوں اور رکوعات کے نام دیے گئے۔ رکوع ان آیتوں کے مجموعے کو کہا گیا جو ایک مفہوم و موضوع پر حاوی ہیں۔ رکوع یا سورتوں کی آیتوں پر نمبر لگانے کا مرحلہ ابھی گذشتہ دو صدی قبل زیر بحث آیا۔

محققین نے حروف کی شکل، اختلاف اشکال، اعراب، علامات وقف و وصل و فصل پر حیرت انگیز اور نئے سے نئے کام کئے۔ جب اس مسئلہ کو حل کر چکے تو آیت اور مطلوبہ آیت کے محل وقوع معلوم کرنے اور بہ آسانی تلاش کرنے کی بات پر توجہ دی۔ موجودہ اطلاعات کی روشنی میں یہ کام گیارہویں صدی میں شروع ہوا اور سو سال میں متعدد کتابیں لکھی گئیں جن کا تفصیلی مطالعہ محققین کے ذمے ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں تین کتابوں کا تذکرہ مطلع انوار میں کیا ہے۔ اس وقت جناب محترم کاظم مُش نزچی کے مقالہ مطبوعہ "مشکواۃ" "شمارہ دوم" بہار ۶۲ مشہد مقدس، پڑھ کر زیر نظر مقالہ میں ایک جزء کا اضافہ ضروری سمجھا۔ مولانا کاظم مدیر شانہ چی صاحب کے مقالہ کا

معنوان ہے ؛ "قرآنِ مجید کی کشف آیات" . اسی کا ایک حصہ ہے جس کو ہم مختصر و باضافہ نقل کر رہے ہیں مولانا کا خیال ہے کہ مندرجہ موضوع پر موجود کتابوں کی ترتیب یہ ہے :

○ کشف الآیات : موسیٰ ہزاری بترتیب اسماء و افعال و حروف ۔ صاحب الذریعہ نے ۱۰۵۶ھ کا مخطوط آقای سلطان المتکلمین کے پاس تہران میں دیکھا تھا ۔

○ دلیل الحیران فی الکشف عن آی القرآن، مشہور بہ ترتیب زیبا ۔

تالیف : حافظ محمود دو دادی ۔ ۱۰۵۴ھ میں کتاب لکھی گئی اور آستانے سے ۱۲۸۴ھ وقا زان سے ۱۳۱۰ھ اور ۱۳۱۸ھ میں شایع ہوئی ۔

○ کشف الآیات از میرزا محمد رضا نصیری طوسی منشی الممالک سال تالیف ۱۰۶۷ھ ۔ موجود در کتب خانہ آستان قدس رضوی مشہد ۔ مؤلف نے مقدمہ میں کہا ہے کہ وہ اس کام میں پہلا آدمی ہے ۔ لیکن اسے واقعاً اصفہان میں یہ معلوم نہ تھا کہ مؤلف قطب شاہی دکن میں اور حافظ محمود ترکیہ میں یہ محنت انجام دے چکے ہیں (رکاظم مدیر شانہ چی) ۔

○ الرسالۃ الواضحہ ۔ یا ہدیہ قطب شاہی در استخراج آیات کلام الٰہی ۔

تالیف : ملا محمد علی کربلائی شاگرد ابن خاتون عاملی ۔ استاد ہی کے حکم سے محمد علی نے یہ کتاب لکھی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ (متوفی ۱۰۸۳ھ) کے نام معنون کی ۔ اس کتاب کی سابقہ دونوں کتابوں پر ترجیح کا سبب یہ ہے کہ مولف نے مفردات کے کلمۂ ماقبل و مابعد کو بھی لکھا ہے اور جزء و حزب کو معین کیا ہے ۔

اس کا ایک نسخہ آستان قدس رضوی مشہد اور ایک نسخۂ مخطوط ۲۱ محرم ۱۰۸۴ھ کتاب خانہ آیت اللہ مرعشی، قم میں محفوظ ہے ۔

○ کشف الآیات ۔

تالیف : سید محمد رضا بن محمد مؤمن خاتون آبادی معاصر شیخ حر عاملی متوفی ۱۱۰۴ھ ۔

○ الجداول النورانیہ ۔

تالیف : الحافظ السید ناصر بن حسین حسینی النجفی متوفی حدود ۱۱۱۸ھ معنون بنام اورنگ زیب عالم گیر و پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں لعل محمد الہ آبادی کے قلم سے لکھا ہوا ۱۱۲۱ھ کا نسخہ

موجود ہے - انداز یہ ہے :

كان الناس امة واحدة	السورة	الركوع	الجزء	ربع الجز
	البقرة	العاشر	الثانی	اوائل الثا

○ نجوم الفرقان لتخریج آیات القرآن ، مصطفی بن محمد سعید افغانی وابستۂ دربار شاہ محمد اعظم شاہ نے ۱۱۰۳ھ میں اسے مرتب کیا ۔ اس کا پہلا ایڈیشن سلطان العلما کے حکم سے ۶۲ میں لکھنؤ سے چھپا ۔ اس کا ایک اور ایڈیشن لاہور سے چھپا ۔ اس میں پارہ اعداد سے اور رکوع کے لیے حروف ابجد استعمال ہوئے تھے ۔

○ اسی نجوم الفرقان کے ساتھ گوستاو فلوگل متوفی ۱۸۷۰ء نے قرآن با نمبر آیات شایع کیا ، نجوم الفرقان جو انڈکس کے نام سے بطور ضمیمہ چھاپا تھا ، اس میں پارہ و حروف ابجد کے بجائے نمبر آیات درج کیے تھے ۔ یہ انڈکس قرآن کے ساتھ لیپزگ سے ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۲ء میں چھپا۔

۱۲۷۴ھ میں فلوگل کا انڈکس فارسی میں حاجی محمد جعفر تہرانی نے چھاپا ۔

۱۲۹۰ھ میں میرزا عبد الوہاب منجم نے قرآن مجید کے ساتھ فارسی ترجمہ انڈکس فلوگل کو ضمیمہ بنا کر چھاپا ۔

۱۹۰۲ء/ ۱۳۱۹ھ میں غثمان او غلی کریم اف نے اڈنبرگ سے شائع کیا ۔

۱۳۴۴ھ ش دبیر سیاقی نے لیپزگ کا قرآن اور فلوگل کے انڈکس کا ترجمہ کتابفروشی اقبال سے شائع کیا اور فلوگل کا کام اپنا کام قرار دیا۔

۱۳۱۳ھ میں نجوم الفرقان ، محمد صادق تویسرکانی کی طرف سے ایک قرآن کے ساتھ تہران سے چھپا۔

○ کشف الآیات محمد شاہی ، سید محمد بن مہدی حسینی نے ۱۲۵۷ھ میں محمد شاہ قاجار کے نام معنون کرکے لکھی ۔ یہ کتاب پہلے تبریز سے پھر جلالین کے ساتھ ۱۲۷۶ھ میں تہران سے چھپی ۔

○ کشف الآیات میرزا علی بن محمد بن محمد حسین قمی متوفی حدود ۱۳۶۰ھ بقول صاحب الذریعہ

توحید،

○ مفتاح کنوز القرآن، کسی روسی فاضل نے لکھی جو استنبول اور یورپ سے چھپی۔
○ فتح الرحمٰن لطالب آیات القرآن تالیف فیض اللہ علمی طبع بیروت ۱۳۲۳ھ
○ ارشاد الراغبین فی الکشف عن آی القرآن المبین۔ فیض اللہ کی دوسری کتاب۔
○ المرشد: محمد فارسی برکات کی تالیف۔ چھاپ مصر۔
○ المعجم المفہرس: محمد فواد عبدالباقی کی کتاب نے سب سے زیادہ شہرت پائی اور بہت کارآمد ثابت ہوئی۔
○ سلطان عبدالحمید کے نسخہ قرآن مجید کے ضمیمہ میں ڈاکٹر رامیار نے نسبتاً جامع ترکشف الآیات مرتب کی جو تہران سے چھپی۔
○ معدن الانوار و مشکوٰۃ الاسرار۔

تالیف: محمد بن صالح الملقب بہ کاشف الاسرار، قزوینی، کربلا میں رہتے تھے۔ یہ کتاب در اصل ان کی تفسیر کا مقدمہ ہے جو محرم ۱۲۰۷ھ میں مکمل ہوا۔ میرے کتب خانے میں ربیع الاول ۱۲۰۷ھ کا مخطوط ہے۔ اس میں الفاظ و کلمات قرآن کے معانی اور آیات کی نشاندہی ہے۔ علمی کتاب ہے اور مجموعی طور پر نہ سہی جزوی طور پر ایک اچھا انڈکس ہے۔

○ مفتاح القرآن ۔ مطبوع

تالیف: مرزا قلیچ بیگ خان۔ متوفی ۱۳۴۸ھ حیدر آباد۔ پاکستان۔

○ مفتاح الآیات: مطبوع دہلی

تالیف: مقبول احمد دھلوی

مولانا حافظ فرمان علی اور مقبول احمد صاحب نے اپنے اپنے ترجموں سے پہلے، موضوع اور موضوع سے مربوط آیات کا پارہ، سورہ، آیت نمبر یا صفحہ نمبر لکھ کر آیت تلاش کرنے والوں کو ایک انڈکس دیا ہے۔

اور یہ کام پاک و ہند میں ابھی جاری ہے۔

●●●

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

توحید

جلد ۲، شمارہ ۲، شعبان تا شوال ۱۴۰۵ھ / مئی تا جولائی ۱۹۸۵ء

مقاصد

کلمة التوحید

و

توحید الکلمه

قرآن وسنت وسیرت پر نئے زاویوں سے بحث اور علمی وعملی پہلوؤں کی تلاش۔

علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔

اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔

فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔

عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی فکری وسماجی انقلاب و نتائج پر گفتگو۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۶۵۰ فلس
افریقہ	۴ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴½ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۳۵
سازمان تبلیغات اسلامی (مطبوعات خارجی)
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۴
خیابان طالقانی نبش فرصت
تہران - اسلامی جمہوریہ ایران



اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد ۲، شمارہ ۲،

ترتیب

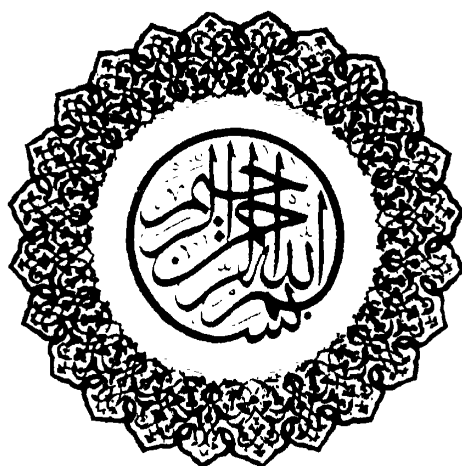
اداریہ

قرآن



مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۳۱۹۵
تہران، جمہوری اسلامی ایران
فون ۲۵-۸۲۵۰۲۲

شعبان تا شوال ۱۴۰۵ھ / مئی تا جولائی ۱۹۸۵ء



شذرہ

علمی اجتماع

شنبہ ۷ ، جمادی الاول ۱۴۰۵ھ

نہایت خوش گوار موسم ، بڑی شاندار صبح ، بڑا فکر انگیز جلسہ تھا ہوٹل لالہ کا ہال ــ کم از کم پانچ سو مہمانوں اور اتنے ہی دوسرے شرکا سے چھلک رہا تھا۔ عرب ، افریقہ ، یورپ اور ایشیا کے دانش ور اور علماء دین فکری نہضت اور اسلامی انقلاب کے نتائج سے خوش خوش ایک دوسرے بھائی سے مل رہے تھے۔

کانگریس کا موضوع تھا " حکومت اسلامی "۔ خالص علمی فکری گوشہ جس پر بہت کم لکھا گیا ــ ایک آرزو جو صدیوں پوری نہ ہوسکی۔ ایک نصب العین جس کے علمی پہلو سب پر روشن نہ تھے ، ایک اقدام جس کے لیے ایمان و استقامت کے ساتھ تائید خدا درکار تھی ــ ایک تجربہ جو کامیاب ہوگیا۔ اور مسلمانوں کی اس سیاسی پیش قدمی نے مشرق و مغرب کی سوچ کا رخ موڑ دیا ہے ۔

اسلامی حکومت ؟ یعنی ، مسلمان سیاستدانوں ، مسلمان قائدوں

۔مگر۔ مغرب نواز دانشوروں کی حکمرانی ۔ اسلامی حکومت ـــ یعنی، لنکن ۔ لینن ـ لوتھر کے فکری مجسے کو اسلامی لباس پہنا کر پیش کرنے کا خواب ـ اسلامی حکومت ؟ یعنی مسلمان عوام پر سیاست و مذہب کو جدا نہ ماننے والے کلمہ گو افراد کی حکمرانی ۔ دوسری لفظوں میں ـ اسلام کو ہمہ جہاتی نظام نہ ماننے والوں کی تائید ۔

حضرت آیت اللہ امام خمینی مدظلہ العالی نے ایران کے سرفروش مسلمانوں کی مدد سے "قرآن وسنت" کی حکومت قائم کر کے بین الاقوامی فکر و نظر و سیاست کی قدریں بدل دیں ۔ کم از کم دو صدیوں سے پاک و ہند، مصر و افریقہ ۔ ترکی و ایران میں علماء اسلام اجنبی راج کے خلاف کام کر رہے تھے ۔ مسلمان عوام کئی مرتبہ "اللہ اکبر" کہہ کر اٹھے لیکن مغرب نواز، فرنگی مزاج لیڈر مسلمان عوام کی بڑی بڑی قربانیوں کا سودا کر کے یا مشرقی راج کے تاجدار بن بیٹھے یا مغربی انداز کے حکمران ـ بقول اقبال ؎

نئے جال لائے پرانے شکاری

(۲)

جناب سید علی خامنہ ای، ایک عالم دین، دانشور۔ روشن فکر، سیاسی مدبر اور بین الاقوامی سیاست و حالات سے باخبر، صدر جمہوری اسلامی ایران نے علما و دانشوران ممالک اسلامیہ کے اس شاندار اجتماع سے فرمایا:

> پچاس سال پہلے مسلمان مفکر اسلام کی بہتری کے لیے منصوبے بناتے تھے تو ان کا منتہائے نظر یہ تھا کہ ایک یونیورسٹی یا اسلامی مطبوعات کے لیے کوئی پریس قائم کیا جائے ۔ اس وقت مسلمان مجاہد سوچتا تھا کہ دنیا کے کسی دور دراز جزیرے ہی میں سہی ایک اسلامی حکومت قائم ہو جائے، اسے خیال بھی نہ تھا کہ یہ تمنا دنیا کے اہم ترین خطے میں پوری ہو گی ۔

آج دنیا اس حقیقت سے دوچار ہے کہ ایک ایسی مضبوط حکومت موجود ہے جس کی اساس کتاب و سنّت پر قائم ہے جس کا قانون فقہ اسلام ہے" و آرزوی حکومتِ اسلامی دیگر یک خیال بلند پرواز نیست" ۔ ایک اور اسلامی حکومت کا قائم ہونا کوئی بڑی خیال آفرینی نہیں۔

صدر خامنہ ای، بول رہے تھے اور افریقہ، یورپ اور ایشیاء کے دانشور سوچ رہے تھے کہ مولانا کتنے باخبر ہیں ۔ تاریخ و فلسفۂ سیاست، اسلامی تحریکات اور دنیا کے نشیب و فراز سے گہری واقفیت کا نتیجہ ہے جو ایران اسلامی، معاشی، سیاسی و ثقافتی لحاظ سے مضبوط و توانا مملکت کے طور پر اسلام کی عظمت کا پرچم لہرا رہا ہے۔

(۳)

بحث تھی کہ "کتاب و سنت" فقہ و اصول کی روسے حکومت اسلامی کا ڈھانچہ اس کی اساس اور اس کے عملی حدود کیا ہیں ؟

انقلاب اسلامی ایران کے بعد علماء دین نے کتاب و سنّت پر مبنی جو آئین بنایا ہے اس کو پرکھا جائے۔

اسلامی جمہوری ایران میں حکومت، عوام، شریعت اور قانون ساز اداروں میں ہم آہنگی کا انداز کیا ہے۔ اسلام کیا چاہتا ہے، اس کا عملی تجربہ کیا ہے ؟ لوگوں نے کیا سوچا اور ایران میں کیا ہوا ؟

مقالے پڑھے گئے ۔ انقلاب اسلامی کے عملی پہلو دیکھے گئے ۔ اسلام دشمن پروپیگنڈے کے تار و پود بکھرے اور اسلام کے عملی مظاہر کے زندہ معجزوں کا مشاہدہ کیا گیا اور دین و سیاست، اسلامی اخلاق و فکر، اسلامی اقتصاد و ترقی کے حیرت انگیز کارناموں کے مطالعات نے افکار میں چراغاں کیا۔

(۴)

ماہِ رمضان مبارک موسمِ بہار قرآن ہے۔ یہ مہینہ مسلمانوں کی فکری وعملی تربیت وجائزہ کا مہینہ ہے۔ تدبّر فی القرآن۔ تلاوت قرآنی، درسِ قرآن اور تعلیمات قرآن کی اشاعت مسلمانوں کا عام پروگرام ہوگا۔

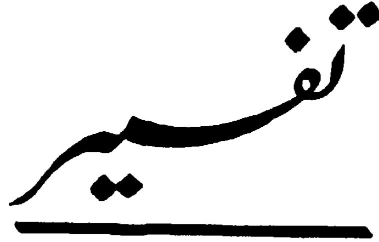
زیر نظر شمارے میں قرآن مجید پر مقالے کچھ پہلو سامنے لاتے ہیں۔ اور مشترک روایات میں رمضان کے فضائل پر حدیثیں محنت سے جمع کی گئی ہیں، یہ مقالہ آیندہ قسطوں میں رویت و احکام صیام جیسے عنادین پر حدیثیں سامنے لاتا رہے گا۔ انشاء اللہ۔

تقویٰ اور جفاکشی، جہاد بالنفس اور تعمیر ذات کے لیے کوشش اور اس کے نتائج کا احتساب مردِ مسلماں اسی ماہ میں کیا کرتے ہیں۔ اگر ہم سب ذکر و فکر اور علم و عمل میں ہم آہنگی پیدا کرکے آگے بڑھیں تو اسلام کی سربلندی کے لیے ایک حق ادا کرسکیں گے۔

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز

نوٹ

ادارہ کا مقالہ نگار کی ہر رائے سے اتفاق ضروری نہیں۔



- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

وَقَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللَّهُ
أَوْ تَأْتِينَا آيَةٌ كَذَٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّثْلَ
قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يُوقِنُونَ ۝

ترجمہ :

بے علم وخبر لوگ کہتے ہیں، اللہ ہم سے بات کیوں نہیں کرتا یا کوئی آیت ہمارے پاس کیوں نہیں آتی؟ ان سے پہلے والوں نے بھی انھیں جیسی بات کہی تھی، ان کی ضمیروں آن سے ملتے جلتے ہیں۔ ہم نے (اہل یقین) حقیقت طلب لوگوں کے لیے آیتیں واضح کردی ہیں (۱۱۸)

تفسیر :

انسان کی کج بحثی اور لامذہب لوگوں کی منطق یا جاہلوں کی سوچ بھی عجیب ہے، ان کی عقلی سطح بلند ہو یا نہ ہو خود فیصلہ کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ نے اس خلل کو دور کرنے اور فکر وخیال کو معتدل رکھنے کے واسطے معصوم رہنما بھیجے، رسول پر کتابیں نازل کیں۔ آخر میں حکیم اعظم، نبی خاتم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا، قرآن نازل کیا اور اعلان کردیا کہ ان کی بات ہماری بات ہے۔ اب نہ تم ہم سے بات کرتے ہیں نہ ہماری وحی پڑھتے ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ براہ راست ان پر وحی کیوں نہیں آتی۔ یہ تو وہی باتیں ہیں جو ان سے پہلے اسرائیل موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے یہ ان جیسے بن گئے ہیں اور ان کا حال ونتیجہ سنایا جاچکا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا وَلَا تُسْأَلُ عَنْ أَصْحَابِ
الْجَحِيمِ ۝ وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ
مِلَّتَهُمْ قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم
بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا

نَصِيرٍ ۝ الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ
أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۗ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ ۝

۱۴ ع ۱۴

ترجمہ :

بے شک ہم نے آپ کو سچا دین دے کر بھیجا، خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا (بنا کر)، اور آپ سے جہنم والوں کے بارے میں جواب طلبی نہیں کی جائے گی (۱۱۹) اور تم سے نہ کبھی یہودی راضی ہوں گے نہ عیسائی، یہاں تک کہ تم ان کی ملت کے تابع ہو جاؤ اور بلاشبہ ہدایت تو صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ اور اگر تم اس کے بعد بھی کہ تمہارے پاس علم آ چکا ہے ان کی مرضیوں کے پابند ہوئے تو پھر اللہ کے عوض نہ کوئی سربراہ ملے گا نہ مددگار (۱۲۰) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ لوگ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جو اس کے پڑھنے کا حق ہے، وہی لوگ اس پر ایمان لائے اور جو اس سے انکار کرتے ہیں وہی لوگ گھاٹے میں ہیں (۱۲۱)

تفسیر :

۱۱۹۔ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ ....

تمام پیغمبر تشویق و تنبیہ پر مامور تھے۔ فبعث اللہ النبیین مبشرین و منذرین۔ البقرہ ۲۱۳۔ آنحضرت بھی چونکہ خاتم النبیین تھے۔ اس لیے تربیت بشر کے اس اصول پر کاربند رہے، بشارت نہ ایسی کہ لوگ بے خوف ہو جائیں ورنہ احساس بندگی نہ رہے گا نہ اتنا ڈرانا کہ لوگ ترک دنیا کر دیں۔ عیسائی اور ہندوؤں کا انتہا پسند طریقہ دو متوازی افراط و تفریط کے نقطے ہیں جن کی طرف وہ نکل گئے اور ناکارہ محض ہو گئے۔ اسلام حق و اعتدال کا پیام ہے اور رسول بشیر بھی ہیں نذیر بھی۔ مگر مہربان و دل سوز۔ حضور کے جذبۂ رحمت کا تقاضا تھا کہ سب انسان مسلمان ہو جائیں اور کوئی جہنم میں نہ جائے۔ اللہ عز اسمہ نے اپنے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا: آپ مطمئن رہیں ان ہٹ دھرم جہنمیوں کے بارے میں آپ سے کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ آپ نے

حق کا پیام پہنچا دیا، دلیل دی، شوقِ جنت و خوف جہنم و نتائج نیک و بد سمجھا دیے۔ آپ کا اس سے بڑھ کر کوئی کام نہیں۔ ہر مسلمان کے لیے تبلیغ کی یہی راہ ہے اور یہی طریقہ ہمیں اپنانا چاہیے، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مقصد ہی تبلیغ کے عمل کا تسلسل ہے۔

۱۲۰۔ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى ....

آپ حق لے کر آئے اور یہود و نصاریٰ باطل پر اڑے ہوئے ہیں، آپ کچھ بھی کر لیں حتیٰ کہ بفرضِ محال ان کے اندر داخل ہو جائیں جب بھی یہ لوگ خوش تو شاید ہو جائیں مگر آپ کی بات نہ مانیں گے اور آپ سے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ صاف کہہ دیجیے۔

اللہ کی ہدایت۔ اسلام۔ ہی راہ حق ہے۔ اور بس۔ اس کے بعد آپ۔ یعنی آپکے مخاطب۔ اس علم و دانش کے بعد (قرآن و احکام، عقائد و استدلال کے بعد بھی) ان گمراہوں کے ساتھی ہوئے تو پھر اللہ کی سربراہی و سرپرستی و نصرت سے محروم ہو جائیں گے نہ مغفرت ہوگی نہ شفاعت۔ نیز دیکھیے آیت نمبر ۱۴۵۔

۱۲۱۔ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ ....

تورات و انجیل و قرآن کے حامل ایسے بھی ہیں جو اسے سمجھ کر پڑھتے اور اس سے ہدایت حاصل کرتے ہیں جیسے عبداللہ بن سلام، ثعبہ بن عمرو اور تمام بن یہودا اور ان کے ساتھی جو اسلام قبول کر چکے یا آئندہ مسلمان ہوں گے۔

ایک قول یہ ہے کہ جعفر بن ابی طالبؑ کے ساتھ کچھ لوگ حبشے سے مدینے آئے ان میں تیئس ۳۲ اہل حبشہ تھے اور آٹھ آدمی شام کے راہب تھے، ان سب نے مدینے آکر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔ آیت نے ایسے افراد کی تعریف بھی کی اور یہ بھی بتایا کہ اہل نظر اپنے کفر کو چھوڑ دیا کرتے ہیں اور جو نہیں چھوڑتے وہ نقصان اٹھاتے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ

فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ
عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا وَلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ
وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝

ترجمہ:

اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تم کو دیں اور میں نے تمھیں سارے جہانوں پر برتری بخشی تھی (۱۲۲) اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص کسی کی طرف سے نہ فدیہ ہو سکے گا نہ اس کی طرف سے کوئی بدلہ قبول ہو گا اور نہ کوئی سفارش اس کے کام آئے گی اور نہ ان کو مدد دی جائے گی (۱۲۳)

تفسیر:

۱۲۲۔ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اذْكُرُوا ....

بنی اسرائیل کی تاریخ وجبلت و کردار کی بات اب ختم ہو رہی ہے اور انھیں پھر تنبیہ کی جا رہی ہے، سابقہ انعام جو اب چھن چکے ان کو یاد دلا کر ایک مرتبہ پھر دعوت اسلام کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے۔ تاکہ غافل ہوشیار ہوں اور حجت خدا تمام ہو۔

۱۲۳۔ وَاتَّقُوا يَوْمًا لَا تَجْزِي نَفْسٌ عَنْ نَفْسٍ شَيْئًا ....

اتنے انعام ٹھکرانے کے بعد قیامت کی فکر کرو وہاں فدیے اور عوض معاوضے یا سعی و سفارش تمھارے بارے میں کام نہ آئے گی۔ اللہ کا غضب اور جہنم کی سزا تمھارے لیے مقرر ہو چکی ہے۔ اس سے نجات کا ذریعہ صرف اسلام ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ
قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ

عَھۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ ؀

ترجمہ:

اور جب آزمایا ابراہیمؑ کو ان کے رب نے کئی باتوں سے اور انھوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا. فرمایا میں تمہیں سب لوگوں کا امام بنا رہا ہوں۔ وہ بولے اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا، میرے عہد سے ظالم فائدہ نہ اٹھائیں گے (۱۲۴)

تفسیر:

اُس دور کے حجاز میں آباد قبائل حضرت ابراھیمؑ پر قدرے متفق تھے سب کے جدِ اعلیٰ ہونے کی وجہ سے یہود و مشرک دونوں کے لیے ان کی شخصیت کے کئی پہلو احترام و توجہ کا باعث تھے۔ اسی حوالے سے ان کے ایک امتحان پھر اس میں حضرت کی ثابت قدمی و کامیابی کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ اسلام فقط زبانی احترام کا قائل نہیں بلکہ ان کے اقوال و افعال پر عمل بھی چاہتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کتنے مشکلات کا سامنا کیا؟ ان پر کیا کیا ذمے داریاں تھیں جن کو بوجہِ احسن ادا کیا؟ قرآن نے ہدایت آفرین انداز سے ان کو بیان کیا ہے مثلاً شرک و بت پرستی کے ماحول سے ٹکر۔ چاند، سورج اور شہر و مملکت کے بتوں کا انکار اور توحید کا پرچار، پھر بت خانے میں جا کر بتوں کو توڑنا۔ آگ میں جلنا قبول کرنا مگر نمرود وقت کے سامنے نہ جھکنا، وطن چھوڑنا مگر خدائے وحدہ لا شریک سے منہ نہ موڑنا، بے آب و گیاہ پتھریلی زمین پر خاندان کو آباد کرنا۔ کعبۃ اللہ کی تعمیر و آبادی، بیٹے کو قربان گاہ میں ذبح کے لئے تیار ہونا۔ حج کرنا اور اس کی دعوت دینا۔ نبیِ آخر الزماںؐ کی آمد کی دعا اور ان کے صفات کا بیان۔ امامت مانگنا، دین اللہ کا نام اسلام اور اس کے پرستاروں کو مسلمان کہنا ایسے مقامات ہیں جہاں سے ابراہیمؑ بت شکن گذرے اور بڑے قد آور نکلے کہ اللہ نے خلیل بنایا، رسول بنا کر صحیفے دیے۔ آخر میں خلعت امامت بخشا۔

حضرت ابراہیمؑ نے یہ منصب عظیم اپنی نسل کے لیے خدا سے طلب کیا اور خود سے کسی کو

امام نہ بنایا۔ اللہ نے جواب میں اس منصب کو اپنے خصوصی اختیار میں رکھنے کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ شرک و بدکاری وگنہ گاری جیسے ظلم وعیب سے تعلق رکھنے والے اس منصب کے اہل نہ ہوں گے۔ امامت اسے ملے گی جو عادل و معصوم ہوگا۔ عدل ضمیر و خلقت، عدل کردار و خصلت، اپنی ذات اور غیر کی بات میں مرضی الٰہی سے ذرہ بھر انحراف کا شائبہ نہ ہو، اول خلقت سے آخر حیات تک پاک و معصوم ہوگا تو امامت دوں گا۔ منصب ختم نبوت حضرت اسماعیلؑ کی ذریت میں رکھا تو ایک مدت دراز تک آخری نبی کا انتظار کرایا، نبی آیا تو سب نبیوں کا سردار، اب اس کی شریعت کا محافظ بھی گر فخر انبیاء نہ ہوا تو بات کیا ہوئی۔ نبی آیا تو کتاب معجزہ و علم و ادراک کا گنجینہ لایا، صفات الٰہیہ کا مظہر صبر و استقامت و شجاعت و بصیرت و علم لدنی کا آئینہ" ماینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ" کی بات بات پر تصدیق اب اس کا وارث اگر ان کمالات سے آراستہ نہ ہوا تو آخری شریعت کی حفاظت کی ضمانت کہاں سے ملے۔

ارشاد ہوا " وجعلناھم ائمۃ یھدون بامرنا"۔ (انبیاء: ۷۳) ہم انھیں امام بناتے جو ہمارے اشاروں پر ہدایت کرتے ہیں۔ اور سورۂ سجدہ میں فرمایا: " وجعلنا منھم ائمۃ یھدون بامرنا لما صبروا ....(۲۴) اور جب انھوں نے صبر (ثابت قدمی) کا مظاہرہ کیا تو ہم نے ان میں سے امام بنائے جو ہماری حکم سے ہدایت کرتے ہیں۔ یعنی رہنمائی و پیشوائی میں اپنی رائے کو دخل نہیں دیتے جو ہم چاہتے ہیں وہ کرتے ہیں۔

توجہ طلب بات ہے۔ حضرت آدمؑ کو خلیفہ بناتے وقت ملائکہ سامنے تھے، نور و تقدس کی بات تھی تو اللہ نے اپنے خلیفہ کی بنیادی صفت علم میں سب پر فوقیت بتائی ___ دیکھیے آیات بالا ۳۰ ـ ۳۳۔ یہاں مکہ و شہر کعبہ میں بات جاہ طلب ظالموں سے ہے۔ لہٰذا بڑی صفت خلیفہ کا غیر ظالم ہونا بتائی۔ وہاں فرمایا تھا " انی جاعلٌ فی الارض خلیفۃ" یہاں پھر ایک تفصیل ہے اور وہ بھی " انی جاعلک للناس اماما" وہاں انسان پیدا نہیں ہوئے تھے لہٰذا زمین کی خلافت کے حوالے سے یہاں انسان موجود تھیں لہٰذا انسانوں کے حوالے سے خود نصب امام کیا، وہاں صاحب منصب کی بڑی صفت علم یہاں بڑی صفت غیر ظالم ہونا، تاکہ انسانوں کے نظام کو قیامت تک عدل کی بنیادوں پر چلا سکے اور خود معصوم عن الخطا، یعنی شائبۂ ظلم سے پاک ہو۔

جعل کے معنی خلق اور نصب و تعین کے ہیں جو اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔
رشید رضا نے تفسیر المنار میں اس آیت کی تفسیر میں بہت سی توجہ طلب باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے۔ علماء اہلِ سنت کے ائمہ اربعہ نے اپنے زمانے کے خلفاء کو برحق نہیں مانا یعنی مسلمانوں کے نزدیک تخت و تاج و اقتدار امامت و خلافت و قیادت کی بنیاد نہیں بلکہ اساس افضلیت ہے، علم و کردار میں سب سے بہتر اور غیر ظالم ہونا۔ اس کے علاوہ جو تاویلیں موقع پرست اہلِ دستار کرتے ہیں وہ ناقابلِ اعتبار تھیں اور آج بھی ہیں۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ
وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى
اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ
وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۞ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا
اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى
عَذَابِ النَّارِ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۞

ترجمہ:
جب ہم نے خانۂ کعبہ کو تمام لوگوں (عوام) کے لیے اجتماع اور پناہ کی جگہ قرار دیا۔ اور بنالو ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ۔ اور ابراہیم و اسماعیل کو ہم نے حکم دیا کہ تم دونوں میرے گھر کو پاک رکھو طواف اور اعتکاف اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے (۱۲۵)
اور جب ابراہیم نے دعا مانگی۔ پروردگار! اس شہر کو شہرِ امن بنادے اور یہاں والوں میں جو اللہ۔ اور قیامت پر ایمان لائے اسے طرح طرح کے پھل عطا فرما۔ اللہ نے فرمایا۔ اور جو کفر اختیار کرے گا اسے چند روز فائدہ اٹھانے دوں گا پھر اسے مجبور کر کے عذاب دوزخ میں کھینچوں گا اور وہ بہت بری جگہ ہے (۱۲۶)

تفسیر

۱۲۵۔ وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً ....

بنی اسرائیل کی رسواکن تاریخ و کردار کے بعد دین کا پس منظر اور اسلام کا مرکز واضح ہو رہا ہے۔ کعبہ، دنیا میں پہلا گھر، جو مبارک و ہدایت ہے۔ اس کا مطلب فقط تقدس نہیں بلکہ اللہ نے اسے "امن و سلامتی" کی جگہ بنایا۔ شہر مکہ حرم ہے، یہاں قتل و فساد منع ہے۔ آبرو اور مال کا احترام لازم ہے۔ یہاں ایک جگہ حضرت ابراہیمؑ کے قیام کی علامت بنی ہوئی ہے، حکم ہے کہ نماز طواف "مقام ابراہیم" کے سامنے پڑھا کرو۔ "مقام ابراہیم" شعائر اللہ ہیں۔ کعبے میں تین قسم کے افراد آئیں گے۔ طوافِ حج و عمرہ کرنے والے۔ اعتکاف کرنے والے اور نماز پڑھنے والے۔ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے خدا سے عہد کر لیا کہ اس گھر کو ہر طرح کی نجاست سے پاک رکھیں گے۔ چنانچہ جب تک دونوں نبی رہے، کعبۃ اللہ نجس آدمیوں اور نجس بتوں سے پاک رہا۔ اپنے بعد کے لیے محمدؐ و آل محمدؐ کو دعا کر کے مانگا۔ جنھوں نے بیت اللہ کو دوامی ظاہری پاکیزگی سے آراستہ کیا۔

۱۲۶۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا ....

یہاں سے خلیل اللہ علی نبینا و علیہ السلام کی دعاؤں کا تذکرہ شروع ہوا ہے۔ ایک تمنا یہ کی۔ کعبہ کو مرکزِ امن بنا دے۔ گذشتہ آیت میں قبول دعا کا حوالہ آچکا۔ "جعلنا البیت مثابۃ ولنا" دوسری آرزو۔ مومنوں کو نتائج و ثمرات سے سرفراز فرما۔ جواب ملا، اچھا۔ مگر غیر مومن، مشرک و کافران پھلوں سے دائمی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے آخرت میں انھیں سخت سزا دی جائے گی۔ یہی اسلوبِ بشارت و نذارت۔ تشویق و تنبیہ۔ قرآن کا معجزہ ہے۔

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ
مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ
الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً
مُسْلِمَةً لَكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ

التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ
آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ
أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝

۱۵
ع ۸
۱۵

ترجمہ:

(الف) اور جب ابراہیم کعبہ/بیت کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے اسماعیل (بھی شریک) تھے۔ ہمارے رب! ہم سے (یہ خدمت) قبول کر۔ بے شک تو، تو ہی بہت سننے اور بہت جاننے والا ہے (۱۲۷)

(ب) اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا فرماں بردار قرار دے۔ اور ہماری ذریت/اولاد میں ایک جماعت کو اپنا فرماں بردار بنا۔ اور ہمیں ہمارے مقامات حج (وارکان حج، بتا دکھا) دے اور ہماری توبہ قبول کر۔ بے شک تو، تو ہی بہت توبہ قبول کرنے اور بہت رحم کرنے والا ہے (۱۲۸)

(ج) اے ہمارے پروردگار! ان لوگوں میں، انھیں میں کا ایک رسول بھیج دے وہ ان کے روبرو تیری آیتیں پڑھے اور انھیں تعلیم کتاب و حکمت (تہہ کی باتیں) بتائے۔ اور ان کو پاک کر دے۔ بے شک تو، تو ہی غالب اور صاحبِ تدبیر ہے (۱۲۹)

تفسیر:

۱۲۸- وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ ....

سورۂ آل عمران (آیت ۹۶) میں ارشاد باری ہے ـ "بلاشبہ لوگوں کے لیے پہلے گھر بنایا گیا... اور حضرت علیؑ نے فرمایا" الا ترون ان اللہ سبحانہ... تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ نے آدم سے لے کر اب تک اولین و آخرین کو پتھروں کے چند ٹکڑوں سے آزمایا... اسے

اپنا بیت الحرام قرار دیا پھر آدمؑ اور انکی اولاد کو اس کے گرد طواف کا حکم دیا... (خطبۂ قاصعہ نہج البلاغہ) کعبۃ اللہ کی تعمیر و تجدید حسب ضرورت ہوتی ہی رہی لیکن خلیل اللہ کی یہ کوشش اللہ نے یوں قبول کی کہ قرآن میں اس کا بار بار تذکرہ کیا۔ انہوں نے فقط گھر ہی نہیں بنایا بلکہ اسے دائمی طور پر روحانی و مادی طور پر آباد رکھنے کا اہتمام بھی کیا۔ انھوں نے سب سے پہلے دعا کی۔ پروردگارا ہم دونوں باپ بیٹوں کی یہ محنت قبول فرما۔

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ ....

دوسری دعا ۔ ہم دونوں کو اپنے ان خاص بندوں میں شمار کر جو تیرے سامنے سر تسلیم جھکانے والے ۔ مسلم ۔ ہیں ۔ تیسری دعا کہ یہ شرف ہم دونوں کے ساتھ ہماری اولاد میں بھی رہے "امت مسلمہ" ہونے کی عزت انھیں بھی دے۔ چوتھی دعا ۔ مناسک ۔ حج کے طور طریقے، خاص عبادتوں کے ڈھکانے تو خود بتا کہ ہم تیری رضا کے مطابق فرائض انجام دیں، اپنی رائے شریک نہ کریں۔

اس قربت کے بعد بھی اس کی بارگاہ میں توبہ و طلب رحمت ہے ۔ یہ بات نہ بھولیے کہ دین کی خدمت کر کے مطمئن ہونا کافی نہیں ۔ کوشش ہونا چاہیے کہ دینداری کے تحفظ کے لیے اپنی اولاد در اولاد کو اس طرح پا لیے اور ان کی ایسی تربیت کیجئے کہ شمع ایمان اپنے گھر میں فروزاں رہے ۔ یہی دستور خلیل اللہؑ و حبیب اللہ ہے ۔

۱۲۹ ۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ ....

بیت اللہ کی تعمیر سے فراغت کے بعد خلیل اللہ نے بڑی عاجزی و نبوی خلوص سے دعائیں شروع کر دیں، گذشتہ آیات میں پانچ درخواستوں کا تذکرہ ہو چکا ، حضرت کی ایک بڑی اہم دعا یہ تھی کہ ان لوگوں میں ایک ایسا رسول پیدا کر جو ان کے لیے اجنبی نہ ہو ۔

(الف) ، اس پر جو وحی نازل ہو وہ خود پڑھے کہ لوگ سنیں اور اسے یاد کریں ۔
(ب) ، انھیں الکتاب (مجموعۂ وحی) کی تعلیم دے ۔ (ج) اور حکمت ، تہہ کی باتیں ، گہرے نکات اور عقل کو پختہ ، علم کو جلا اور دانش و بینش کو تصدیق بخشنے والے حقائق سکھائے ۔ (د) اور

وتعلیم دی انہیں تربیت بھی دی ان کی ضمیر پاک ان کا کردار بے داغ، ان کے احساسات شفاف
ان کے ادراک خدانما بنادے ۔ خدایا تیرے لیے یہ سب کچھ بھی نہیں غلبہ واقتدار، تدبیر و
ت تیری مشیتوں کا نام ہے ۔

تینوں آیتوں میں سمیع وعلیم ـ تواب ورحیم ـ عزیز وحکیم ـ کی ترکیب پر غور کیجئے
بلاغ و اسلوب، معنویت اور صوتی حسن، گہرائی اور مناسبت کا عجیب معجزہ ہے ۔

آیت میں رسول اعظم و نبی خاتم کے لیے جو صفات بیان ہوئے ہیں ان میں تعلیم اور تربیت کے تمام
اور ایک نبی کامل و مکمل کے بلند ترین صفاتِ ذات و کردار کو جمع کر دیا ہے ۔ مزید گفتگو
آنے والی آیت ۱۵۱ ، نیز آل عمران و سورۂ جمعہ میں ہوگی انشاء اللہ ۔

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرٰهِيمَ إِلَّا مَنْ
سَفِهَ نَفْسَهُ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا وَإِنَّهُ فِي الْآخِرَةِ
لَمِنَ الصّٰلِحِينَ ۝ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ قَالَ أَسْلَمْتُ لِرَبِّ
الْعٰلَمِينَ ۝ وَوَصّٰى بِهَا إِبْرٰهِيمُ بَنِيهِ وَيَعْقُوبُ يٰبَنِيَّ إِنَّ
اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّينَ فَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۝
أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ
لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلٰهَكَ وَإِلٰهَ
آبَائِكَ إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ إِلٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ
مُسْلِمُونَ ۝ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ
مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝

ترجمہ :

اور کون ہے جو ابراہیمؑ کے مذہب سے روگرداں ہو (نفرت کرے) مگر جو خود ہی فضل

سے دور ہو جائے۔ اور ہم نے ابراہیمؑ کو دنیا میں منتخب کر لیا اور وہ ختماً آخرت میں بھی اچھوں ہی میں سے ہوں گے (۱۳۰) اور جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا اسلام لاؤ (مکمل طور پر فرمانبردار بن جاؤ) تو عرض کی میں سارے جہانوں کے رب پر اسلام لایا (۱۳۱) اور اسی طریقے کی ابراہیم نے اپنی اولاد سے وصیت کی اور یعقوبؑ نے بھی۔ اے بیٹو! یقیناً، اللہ نے تمہارے واسطے دین (اسلام) کو چن لیا ہے۔ اب تم ہرگز نہ مرنا مگر مسلمان (۱۳۲) کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوب کی موت سر پر کھڑی تھی؟ اس وقت انھوں نے اپنی اولاد سے کہا: میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا: ہم آپ کے اللہ اور آپ کے بزرگوں ابراہیم و اسماعیل کے واحد و یکتا اللہ و معبود کی عبادت کریں گے۔ اور ہم اسی ذات کے کے فرمانبردار ہیں (۱۳۳) وہ ایک قوم تھی جو گذر گئی۔ جو ان لوگوں نے کیا وہ ان کے آگے آئے گا جو تم عمل کرو گے وہ تمہارے آگے آئے گا۔ اور جو کچھ وہ کرتے رہے، تم سے اس کی جواب طلبی نہیں کی جائے گی (۱۳۴)

تفسیر:

۱۳۰۔ وَمَن يَرْغَبُ عَن مِّلَّةِ إِبْرَاهِيمَ . . . .

۱۳۱۔ إِذْ قَالَ لَهُ رَبُّهُ أَسْلِمْ . . . .

مِلَّۃ: دین، شریعت (ملت خدا کی طرف سے لکھا ہوا، دستور و قانون)۔
ابراہیم علیہ السلام کے طور طریقے، دعوت و اہتمامِ توجہ الی اللہ اور توحید و مرکز کی حفاظت کے انتظامات بیان کرنے کے بعد، سمجھایا گیا کہ ملت ابراہیمی کی پیروی کرو۔ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آل عمران ۔ ۹۵) (اس ابراہیمؑ کی ملت کے پیرو کار بن جاؤ جو سب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو رہا اور مشرکوں میں سے نہ تھا) اتنے اچھے نبی کا عقل و دانش پر مبنی راستہ وہی چھوڑے گا جو عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ خلیل اللہ

نے تو وحی کے اشاروں اور عقل خداداد نیز منصب بلند کی وجہ سے اس راہ کو ہمیشہ کے لیے ہموار کر دیا ہے۔

ملت ابراہیمی کی دوسری تعبیر اسلام ہے۔ خود خلیل اللہ نے دعوت خدا "اَسْلِمْ" کے جواب میں "اَسْلَمْتُ" کہا۔ کعبے کے پڑوسیوں اور ابراہیمؑ کے پرستاروں کو اب اعتراض کا حق کیا رہ جاتا ہے۔

تم کو ابراہیمؑ کا وہ خلوص بندگی یاد رکھنا چاہیے، جس میں اپنی خواہش، غیر کا تصور، غرض ہر اورا کو چھوڑ کر فقط اور فقط اللہ کے ہونے کا عقیدہ و عمل پیش کیا گیا ہے۔

۱۳۲۔ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ . . . .

۱۳۳۔ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ . . . .

ابراہیمؑ و اسماعیلؑ، اسحاقؑ و یعقوبؑ کے نام کی تسبیح جپنے والو مشرکو! تم میں ایک بھی اصل واصول پر باقی نہیں۔ ابراہیمؑ وہ پاک نبی ہے کہ زندگی بھر توحید کی تبلیغ کی دنیا سے جاتے ہوئے اپنی اولاد سے اقرار توحید لیا اور سمجھایا کہ مرنا تو دین اسلام پر مرنا۔

یہودیو! باپ دادا کی نجات پر اپنی بخشش کا عقیدہ رکھنے والو یعقوبؑ نبی نے بھی آخری وقت ابراہیم و اسماعیل و اسحاق علیہم السلام کا نام لے لے کر وحدہ لاشریک کا سب سے کلمہ پڑھوایا اور اولاد کو اس دین کا پابند بنایا تھا۔ تم نے آج الگ الگ اپنے اپنے مذہب و دین بنا رکھے ہیں اور شرک کی دعوت دیتے پھرتے ہو۔ آؤ اور دین ابراہیمی یعنی اسلام کو مانو۔

۱۳۴۔ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ . . . .

عقل و دانش کی بات تو یہ ہے کہ اپنی خیر مناؤ، وہ کرو جو کل کام آئے، باپ نے جو کیا بیٹا اس کا جواب دہ نہیں ہوگا۔ خدا کے یہاں ہر شخص سے اس کے عقیدہ و عمل کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔

وَقَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنزِلَ إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِن رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ ۝ فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ صِبْغَةَ اللَّهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللَّهِ صِبْغَةً وَنَحْنُ لَهُ عَابِدُونَ ۝

ترجمہ:

ان لوگوں نے کہا: تم سب یہودی یا نصرانی بن جاؤ، راہ راست پر آجاؤ گے۔ ان سے کہیے: (یہ نہیں) بلکہ ابراہیم کے خالص (توحید پر مبنی) طریقہ پر چلو، وہ ہرگز مشرکین سے نہ تھے (۱۳۵) تم کہو: ہم اللہ پر ایمان لا چکے، جو ہم پر نازل کیا گیا اور جو ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ اور اولاد یعقوب پر (صحیفے) نازل کیے گئے اور جو (کتب) موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دی گئی تھیں اور جو دوسرے نبیوں کو عطا کی گئی تھیں ان کے رب کی طرف سے۔ ہم تو ان میں سے کسی ایک میں بھی تفریق نہیں کرتے۔ اور ہم صرف اللہ کے فرماں بردار (مسلم) ہیں (۱۳۶) اس کے بعد جیسے تم ایمان لائے وہ لوگ بھی ایمان لے آئیں تو یقیناً راہ راست پر آگئے اور اگر وہ منہ پھیر لیں (نہ مانیں) تو وہ لوگ صرف ضد پر ہیں۔ پھر تو ان کے مقابلے کے لیے تمہاری طرف سے اللہ کافی ہے اور وہ بہت سننے اور بہت جاننے والا ہے (۱۳۷) "اللہ کا رنگ" اور اللہ سے بہتر رنگ کون (رنگ) ہوگا اور ہم تو صرف اسی کی عبادت کرنے والے ہیں (۱۳۸)

تفسیر :

۱۳۵- وَقَالُوا کُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارٰی ....
۱۳۶- قُولُوا آمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا ....

مدینے میں یہود و نصاریٰ کی معاشی و سماجی و سیاسی حیثیت مستحکم تھی ہجرت کے بعد مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوچکا تھا اور اسلام کو فروغ، اسے دیکھ کر یہاں کے ربّی اور پادری ہمت کرکے بڑھے اور مسلمانوں کو اپنے اپنے دین میں آنے کی دعوت دینے لگے، ان کی دعوت کے جواب میں ارشاد باری ہوا کہ تم تو ہوچکے ہو بت پرست اور ہم اللہ کو مانتے ہیں۔ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور تمام انبیا علیہم السلام نیز ان پر نازل شدہ کتابوں اور صحیفوں، سب پر ہمارا عقیدہ ہے ہم تمھاری طرح مشرک نہیں، موحد ہیں اور دین حنیف یعنی اسلام پر قائم ہیں۔ ہم موسیٰؑ کو مان کر عیسیٰؑ کو نہ ماننے والے اور عیسیٰؑ کو مان کر محمدؐ کا انکار کرنے والے نہیں ہیں۔ سب نبی اپنے اپنے وقت میں برحق تھے اور آج بھی محترم ہیں۔ تم انبیاء سے ناروا سلوک کرنے والے لوگ کس منہ سے ہمیں دعوت دیتے ہو۔ عقیدوں میں تم نے شرک اور کتابوں میں تم نے تحریف کی۔

۱۳۷- فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهِ ....

پس بہت بحث ہوچکی۔ اگر یہ بالکل تمھاری طرح دعوت و حقائق کو مانتے ہیں تو خیر قبول کرلو اور اپنا بنالو یہ مسلمان ہیں اور اگر ہٹ دھرمی پر جمے رہیں تو، اللہ خود ان کے لیے کافی ہے۔ دلائل کے وقت دلائل دیے جائیں گے۔ مباہلے کے وقت مباہلہ ہوگا اور تلوار کے جواب میں خندق و خیبر کے معرکے ہوں گے۔ جیسی مصلحت ہوگی وہ کیا جائے گا۔

۱۳۸- صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ أَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ ....

ان لوگوں نے "بپتسمہ" کا ڈھونگ رچا رکھا ہے، جیسے ہندو تلک لگاتے ہیں یہ لوگ بچے کو یا نئے آدمی کو عیسائی بنانے کے لیے رنگین یا زرد پانی میں غسل دیتے ہیں، تعمید یا بپتسمہ کا یہ عمل سیدھے سادے عوام کو متاثر کرتا ہے، وہ لوگ اسے پیدائشی گناہوں اور باپ دادا کے پاپ سے پاک کرنا اور اللہ کے رنگ میں رنگنا کہتے ہیں۔ اسلام ان لوگوں کے ٹوٹکوں اور رنگوں کا

قائل نہیں، یہاں عقل و دانش کی بات ہے۔ سب سے اچھا رنگ اللہ کا ہے۔ اس کی رضا میں ڈوب جاؤ۔ تخلقوا باخلاق اللہ۔ خدائی صفات پیدا کرو۔ ہم موسیٰؑ اور عیسیٰ علیہما السلام کو خدا یا اس کا بیٹا ماننے والے نہیں ہیں، ہم اللہ کے بندے اور اسی کے عبادت گذار ہیں۔
صبغۃ اللہ ــ یعنی اتخذوا صبغۃ اللہ ــ اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے
صبغۃ اللہ ــ سے اسلام مراد ہے۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ
وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ
اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَ
الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ
وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

ترجمہ:

ان سے کہیے، کیا تم ہم سے "اللہ" کے بارے میں بحث کرنا چاہتے ہو؟ حالانکہ وہ ہم سب کا رب ہے۔ ہمارے اعمال ہمارے کام آئیں گے اور تمہارے کرتوت تمہارے۔ اور ہم تو بے اخلاص (بے عقیدۂ شرک) اس کے (عبادت گذار) ہیں (۱۳۹) یا تم یہ کہتے ہو کہ یقینی طور پر ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ و یعقوبؑ و اسباط (اولاد یعقوبؑ) یہودی یا نصرانی تھے؟ (جواب میں) کہیے: تم زیادہ واقف (حال) ہو یا اللہ؟
اور اس سے زیادہ ستم گار کون ہوگا جس کے پاس خدا کی طرف سے گواہی ثبت موجود ہو پھر وہ اسے چھپائے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے (۱۴۰)

وہ ایک قوم تھی جو گذر گئی۔ جو ان لوگوں نے کیا وہ ان کے آگے آئے گا جو تم کرو گے
وہ تمہارے آگے آئے گا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے تم سے اس کی جواب طلبی نہیں
کی جائے گی (۱۴۱)

تفسیر:

۱۳۹- قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ ....

عیسائی دیہودی مبلغین سے پوچھیے کہ ہم سے " اللہ کے موضوع پر بحث کرنا چاہتے ہو؟ یعنی تمہارا خدا سے کوئی خاص تعلق ہے۔ یہ خیال غلط ہے، دیکھ لو وہ جیسا تمہارا پالنے والا ہے اسی شان سے ہماری پرورش فرما رہا ہے۔ اب رہا بندگی میں تمہاری برتری تو یہ بھی پرکھ لو تم اپنی عبادت میں غیر کو شریک کرتے ہو، ہم جو عبادت کرتے ہیں وہ خالص اللہ وحدہ لاشریک کے لیے ہوتی ہے۔ تمہاری طرح باپ دادا کے لیے اور تعصب و قوم پرستی کی بنیاد پر نہیں کرتے اس کے بعد کتنا غلط عقیدہ ہے کہ تمہارے اگلوں کے اعمال قبول ہوں گے اور ہمارے اعمال رد ہوجائیں گے؟ اللہ عادل ہے۔ ہر ایک کو اس کے کیے کا بدلہ دے گا اور تمہارا خیال عقیدۂ عدل کے خلاف ہے۔

۱۴۰- اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ ....

نحن ابناء اللہ واحباؤہ ــ ہم اللہ کی اولاد و دوست ہیں ــ نعوذ باللہ ــ کا دعویٰ تو غلط ہوچکا، کیونکہ وہ جس طرح تمہیں پال رہا ہے ہمیں بھی اسی طرح پرورش دے رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ابراہیمؑ و اسماعیلؑ۔ اسحاقؑ و یعقوب علی نبینا و آلہ علیہم السلام اور اسباط یہودی تھے بقول یہود۔ اور نصرانی تھے بقول نصاریٰ۔ یہ بھی جھوٹ اور غلط ہے۔ ان کے پاس توریت و انجیل کے ثبوت موجود ہیں کہ وہ اسلام کے پرستار تھے اور انھوں نے نبی آخر الزمان کی خبر دی ان کو ہادی و نبی و رسول ماننے پر زور دیا۔ اس حقیقت سے باخبر ہونے کے بعد بھی یہ ربی ــ اور ــ اسقف ــ میرے رسول ہونے کی گواہی نہیں دیتے۔ تحریف و تاویل کرتے ہیں جسے خدا خوب جانتا ہے اور اس نے ان حقائق کو واشگاف بھی فرد یا۔

۱۴۱ - تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ . . . . .

خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ قومیں اور ان کے اعمال نامے سب کے سامنے ہیں اور تمھارے اعمال نامے تمھارے سامنے۔ اللہ کے حضور میں ہر عاقل و دانا سے صرف اس کے عقائد، اس کی نیت اور اس کے اعمال کی باز پرس ہوگی اور اس کی جزا یا سزا ملے گی۔ اب ہر شخص کو اپنے بارے میں ہوشیار و تیار رہنا چاہئے۔ قیامت کے دن ہر شخص کے اعمال ہی کام آئیں گے۔ کیونکہ خدا عادل ہے۔

یہاں تک یہود و نصاریٰ کے نفسیات و مقاصد اور تاریخ و کردار کی بات تھی اور اسلام کا موقف، لیکن متقی اور موحد افراد کی ہدایت آموزی کے اسباق ابھی تمام نہیں ہوئے، احکام کی منزل بھی آنے والی ہے۔

جناب سید محمد باقر حکیم

ترجمہ : محمد حسن معروفی

نزولِ قرآن کا مقصد

اہمیت موضوع "نزول قرآن کے مقصد" پر قلم اٹھانے سے پہلے اس موضوع کی اہمیت و افادیت پر مختصراً یوں روشنی ڈالی جاسکتی ہے:

پہلی بات تو یہ کہ قرآن کریم کے مطالب و مفاہیم کا سمجھنا اور اس کی گہرائیوں کا درک کرنا ایک مخصوص گروہ کی معرفت پر موقوف ہے کیونکہ تفسیر کا بہر حال اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ہونا ضروری ہے، قرآن کو سمجھنے کے لئے وحی الٰہی کا خاص اسلوب جاننے کی ضرورت کے ساتھ ساتھ آیتوں کے شان نزول، جائے نزول اور اسباب نزول سے واقفیت بھی بے حد لازمی ہے تاکہ آیتوں کے قرآنی مفاہیم میں کم از کم ان کا یقینی مصداق سامنے رہے۔

معرفت اسلوب قرآن کے سلسلے میں سب سے زیادہ مفید طریقہ نزول قرآن کے اغراض و مقاصد سے کما حقہ واقفیت ہے کیونکہ مقصد ایسی شے ہے جو فطری طور پر قرآن کے مفاہیم و معانی پر اثر انداز ہے اور اسے ہم پورے قرآن کی آیتوں کو سمجھنے کے سلسلے میں "قرینۂ منفصلہ" قرار دے سکتے ہیں۔

خود قرآن میں سبب نزول یوں بیان ہوا ہے «و نزلنا عليك الكتاب تبياناً لكل شيء وهدىً ورحمة وبشرىٰ للمسلمين» (نحل/۸۹) یعنی ہم نے قرآن اس لئے نازل کیا ہے کہ وہ تمام چیزوں" کو (بہچنوائے) بیان کرے، اور مسلمانوں کے لئے سبب ہدایت و رحمت و بشارت ہو۔ اس آیۂ کریمہ میں" لکلّ شیٔ" سے نزول قرآن کا مقصد سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ اس طرح کے مقامات قرآن مجید میں اور بھی ہیں۔

۲۔ نزول قرآن کے مقصد سے واقفیت آیتوں کے مجموعی ظواہر کی تفسیر میں بھی بہت کارآمد ہے کیونکہ آیتوں کے اسباب نزول کی تبدیلی سے ان کی تفسیریں بدل سکتی ہیں۔ جیساکہ مکرر قصص میں کہیں مفسر ادبی تفسیر کرتے ہیں اور کہیں تربیتی۔

۳۔ انداز بیان، معنی و مضمون اور نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کا اسلوب منفرد و خاص ہے۔ مفہوم سمجھنے اور نتیجہ حاصل کرتے وقت آدمی اس کے معیار کو نہیں پا سکتا، پھر بھی اس قرآن کو ایک مثالی اسلوب ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ انبیاؑ و مرسلین کی راہ پر چلنے والوں نے ایسا ہی کیا ہے۔ دراصل اس قسم کے اتباع میں "مقصد کی دریافت" کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ قرآن حصول مقصد کے مرحلے میں مثالی اسلوب رکھتا ہے۔ اسلامی پیام رسانی کے راستوں میں "دریافت مقصد" کے بعد اسی انداز و اسلوب کی پیروی فائدہ دے سکتی ہے۔ مثلاً قرآن میں ایک واقعہ کا تاریخ کا سادہ سا تذکرہ ہوا ہے، تو اس مقصد کے لیے یہی انداز مثالی ہے۔ لیکن اگر مقصد تربیت و تبدیلی ہے تو مذکورہ اسلوب اختیار کرنا مناسب ہوگا اس کے لیے اسی قرآن کا دوسرا مقام دیکھنا ہوگا جہاں اس کا مقصد بھی تبدیلی و تربیت ہو۔

قرآنی زاویے سے مقاصد کے اشارے

مقصد نزول قرآن کی تعیین کے سلسلے میں اگر خود قرآن ہی کو مشعل راہ قرار دیا جائے تو بہتر ہوگا قرآن کریم کی ان آیتوں کا جنہیں نزول قرآن کے مسئلے پر روشنی ڈالی گئی ہے، جائزہ لیا جائے یا ان آیتوں کا تحلیل و تجزیہ کیا جائے جن میں قرآن نے اپنے اوصاف و امتیازات یا اپنے لانے والے نبی اکرمؐ کے صفات و خصوصیات بیان کئے ہیں، تو ہمیں اس سے بہت سے اغراض و مقاصد معلوم ہو سکیں گے۔ اس کے بعد تصورات، مفاہیم، مقامات، قانون سازی اور تعبیرات و وعظ کے مقاصد و اسالیب سے واقفیت اور بہت سے دوسرے مقاصد کے حصول میں مزید آسانی ہو گی۔

(الف) **قرآن کی روشنی میں مقاصد نزول** ارشاد باری تعالیٰ ہے:

«واوحي إليَّ هـذا القرآن لأنذركم به ومن بلغ...» (انعام/۱۹)

اس آیت میں بزبان پیغمبر اکرمؐ مقصد نزول کی یوں وضاحت ہو رہی ہے کہ یہ قرآن مجھ پر بطور وحی اس لئے نازل ہوا ہے کہ میں تم لوگوں کو اس کے ذریعہ (عذاب الٰہی) سے ڈراؤں دھمکاؤں اور ان لوگوں کو بھی جن تک میرا پیغام پہنچ سکے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

«کتابٌ أنزل الیک فلایکن في صدرک حرج منه لتنذر به وذکری للمؤمنین (اعراف/۲)

یعنی قرآن آپ پر نازل ہوا ہے اپنے سینے میں تنگی کا احساس نہ کریں تاکہ آپ اس کے ذریعہ لوگوں کو ڈرا دھمکا سکیں اور وہ مومنین کے لیے یاد دہانی کا ذریعہ قرار پائے۔

ایک اور جگہ پر یوں ارشاد ہو رہا ہے:

«طٰه ما أنزلنا علیک القرآن لتشقیٰ إلاّ تذکرة لمن یخشیٰ» (طه/۱ و۳)

اے طٰہ (پاک و پاکیزہ نبیؐ)، میں نے آپ پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا کہ خود کو مشقتوں میں ڈال دیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں خوف الٰہی پایا جاتا ہے، قرآن ان کے لئے (تلقین خیر) اور یاد دہانی کا ذریعہ ہو۔"

مندرجہ بالا آیتوں کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نزول قرآن کا مقصد "انذار و تذکر" یعنی ڈرانے دھمکانے اور تلقین و یاد دہانی ہے۔

اس سلسلے میں دوسری بہت سی آیتیں بھی ملیں گی جن سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن ذریعہ تلقین و نصیحت ہے، جیسے:

«ان هو إلاّ ذکرٌ وقرآنٌ مبین» (یس/۶۹) لعلهم یتذکرون (زمر/۲۷)

یعنی شاید لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں «ولقد یسرنا القرآن للذکر فهل من مدّکر» (قمر/۱۷)

یعنی ہم نے قرآن کو تلقین و نصیحت کا ذریعہ بنایا کیا اس سے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

إنما أنت نذیر والله علی کل شيءٍ وکیل (هود/۱۲) نبی! آپ محض نذیر (عذاب آخرت سے ڈرانے والے) ہیں اور اللہ ہر شے کا ذمہ دار ہے۔

۲۔ بعض آیات میں نزول قرآن کا مقصد مثل بیان کرنا۔ عبرتیں پیش کرنا اور اسباق دینا

بیان ہوا ہے ۔ جیسے ولقد صرّفنا فی هذا القرآن من كل مثل. (اسراء/۸۹). یعنی ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی مثل بیان کی ہے۔

۳۔ بعض آیتوں کے مطالعہ سے نزول قرآن کا مقصد دلائل و براهین لانا اور معجزات کا ظاہر کرنا سمجھ میں آتا ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے : «إئتونی بکتاب من قبل هذا أواثارة من علم (احقاف/٤)» یعنی اس قرآن سے پہلے کوئی علمی نمونہ اور شاہکار پیش (کرسکتے ہو تو) پیش کرو۔

دوسری جگہ یوں ارشاد ہے : «و ان کنتم فی ریب مما نزّلنا علی عبدنا فأتوا بسورة من مثله» (بقرة/۲۳) یعنی ہم نے جو کچھ اپنے بندہ پر نازل کیا ہے، اگر اس کے بارے میں تم شک و شبہ میں مبتلا ہو تو اس کے ایک (چھوٹے سے) سورہ کا مثل ہی بنا لاؤ۔

مزید ارشاد ہوا : «قل لئن اجتمعت الانس والجن علی أن یأتوا بمثل هذا القرآن لایأتون بمثله ولو کان بعضهم لبعض ظهیراً» (اسراء/۸۸) یعنی اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ اگر تمام جنات و انسان یکجا ہو کر بھی قرآن کا مثل و نظیر لانا چاہیں اور ایک دوسرے کے بھرپور معین و مددگار بھی بن جائیں تب بھی قرآن کا مثل لانے سے قاصر رہیں گے ۔

ایک اور جگہ ہے : «هذا کتاب انزلناه مبارک فاتبعوه واتقوا لعلکم ترحمون * ان تقولوا إنما انزل الکتاب علی طائفتین من قبلنا» (انعام/۱۵۵، ۱۵۶) یعنی قرآن کو ہم نے خیر و برکت کے ساتھ نازل کیا ، تم اس کی پیروی کرو اور تقویٰ اختیار کرو شاید تم رحمت الٰہی کے مستحق قرار پاؤ۔

یہ آیۂ کریمہ اس مفہوم کی طرف یوں اشارہ کر رہی ہے : «یا ایها النّاس قدجاء کم برهان من ربّکم وانزلنا الیکم نوراً مبیناً (نساء/۱۷٤)» یعنی اے لوگو ! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے برھان آئی اور ہم نے تم پر آشکارا نور نازل کیا ۔

۴۔ بعض مقامات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن دستور اور قانون اور احکام کی تفصیل پر مشتمل ایک کتاب ہے ۔ جیسا کہ ان آیتوں سے ظاہر ہو رہا ہے : «وانزلنا معهم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط» (حدید/۲۵) ہم نے ان پر کتاب میزان نازل کی تاکہ وہ انسانوں میں عدل قائم کرسکیں ۔

«إنّا أنزلنا الیک الکتاب بالحقّ لتحکم بین الناس بما اراک الله» (نساء/۱۰۵)

اے رسولؐ! ہم نے بے شک آپ پر کتاب برحق نازل کی تاکہ آپ لوگوں کو اللہ کے بتلائے ہوئے احکام سے باخبر کریں۔ «ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شيء وهدیً ورحمة» (نحل/۸۹)

اے رسولؐ! ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی جو ہر شئے کی حقیقت اور اس کے رموز کو بیان کرنے والی ہے اور سرچشمۂ ہدایت ورحمت ہے۔

۵۔ دوسری آیتوں میں وارد ہوا ہے کہ قرآن اس لئے ہے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے، اختلافات کو ختم کرے اور حق و باطل کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرکے پہچنوا دے چنانچہ ارشاد ہے «وانزل معهم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیه» (بقرہ/۲۱۳) اللہ نے ان کے لئے کتاب برحق نازل کی جو اختلافات کے وقت ان میں فیصلہ کرتی ہے۔

«وما أنزلنا علیك الکتابَ إلّا لتُبین لهم الذي اختلفوا فیه» (النحل/ ٦٤). یعنی ہم نے آپ پر کتاب صرف اس لئے نازل کی کہ آپ لوگوں کے اختلافات کو ان پر واضح کردیں۔

«ان هذا القرآن یقص علی بني اسرائیل اکثر الذي هم فیه یختلفون» (نمل/۷۶) بے شک یہ کتاب بنی اسرائیل کے بہت سے اختلافات کو بیان کرتی اور ان کی نشاندہی کرتی ہے۔

۶۔ اسی سورت میں ہمیں دوسرے مقامات پر نظر آتا ہے کہ نزول قرآن کا مقصد انبیائے ماسبق کی تصدیق اور ان پر نازل شدہ کتابوں کی تائید ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

«وانزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیه من الکتاب ومهیمناً علیه» (مائدہ/۴۸) یعنی ہم نے آپ پر قرآن حق کے ساتھ نازل کیا تاکہ وہ گذشتہ کتابوں کے لئے ذریعہ تصدیق ہو «ولما جاءهم کتاب من عندالله مصدقٌ لما معهم» (بقرہ/۸۹) ان کے پاس اللہ کی جانب سے کتاب نازل ہوئی جو گذشتہ کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔

«نزّل علیک الکتاب بالحق مصدقاً لما بین یدیه وأنزل التوراة والانجیل من قبل هدیً للناس وأنزل الفرقان.» (آل عمران/۳)

یعنی آپ پر وہ کتاب برحق نازل ہوئی جو توریت و انجیل جیسی کتابوں کی تصدیق کرنے والی اور لوگوں کے لئے ذریعہ ہدایت ہے۔

۷۔ جب ہم قرآن کے مطالب و مفاہیم کا جائزہ لیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کا ایک حصّہ انسانی تحرّک و ارتقا کی تاریخ اور ان اصول و ضوابط پر مشتمل ہے جو انسانی عروج و ارتقا میں مؤثر ہیں۔ قصص قرآن اور سابقہ اقوام و ملل پر گفتگو ان کی راست روی و گمراہی، خوش حالی و استقلال، بدبختی اور تباہی و بربادی کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ نزول قرآن کا مقصد انسانی رویّہ کی نشاندہی اور اسلامی پیام کی تاریخ اور اس راہ میں پیش آنے والے حادثات و واقعات کی یاد دہانی ہے۔

۸۔ قرآن میں کائنات و زندگی، علّت حیات اور مبدء وجود اس کے کردار اور اس کی انتہا کا ایک مکمل خاکہ بھی موجود ہے۔

۹۔ اس کے علاوہ دوسری آیتوں میں ہمیں نظر آئے گا کہ قرآن کتاب ہدایت اور سرچشمہ نور و رحمت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

«شهر رمضان الذي أنزل فيه القرآن هدىً للناس وبينات من الهدى والفرقان (البقرة/۱۸۵)

رمضان وہ مہینہ ہے جسمیں قرآن نازل کیا گیا، لوگوں کی ہدایت کے لئے دلائل و براہین ہیں اور وہ حق و باطل کے درمیان فرق کا ذریعہ ہے۔

«ذلک الکتاب لاریب فیه هدیً للمتقین» (بقره/۲)

یعنی بے شک یہ کتاب صاحبان تقویٰ کے لئے سبب ہدایت ہے۔

«ان هـذا القـرآن يهدي للتي هي أقوم ويبشر المؤمنين» (اسراء/۹)

بے شک یہ قرآن انتہائی مناسب عنوان سے ہدایت کرتا ہے اور صاحبان ایمان کو بشارت دیتا ہے۔

وننزّل من القرآن ما هو شفاء و رحمة للمؤمنين (اسراء/۸۲)

یعنی ہم وہ قرآن نازل کریں گے جو مؤمنین کے لئے سبب شفاء و رحمت ہوگا۔

«قد جاء کم من الله نور وکتاب مبین یهدي به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ویخرجهم من الظلمات الی النور باذنه ویهدیهم الی صراط مستقیم.» (مائده/۱۵،۱۶)

خدا کی جانب سے تمہارے پاس ایک نور اور ایک واضح کتاب آچکی جس کے ذریعہ خدا اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے والوں کی سلامتی کے راستوں کی طرف ہدایت کرتا ہے اور انھیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور صراط مستقیم کی رہنمائی کرتا ہے۔

«کتاب انزلناه الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور باذن ربهم الی صراط العزیز الحمید». (ابراهیم/۱)

یعنی اے رسولؐ! قرآن ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم نے آپ پر نازل کیا ہے تاکہ آپ اس کے ذریعہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں اور بحکم پروردگار انکی اس راستے کی جانب رہنمائی کریں جو ذاتِ عزیز و حمید کا راستہ ہے۔

غرضکہ ہم نے جن مقاصد کا تذکرہ کیا ان میں سے بعض ایک دوسرے میں مدغم اور بعض ایک دوسرے پر اثر انداز نظر آئیں گے۔ ایسے اہداف و مقاصد بھی ملیں گے جو ایک دوسرے سے مربوط ہیں لیکن جب کسی آیت کی تفسیر کی جاتی ہے تو یہ اہداف ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہماری یہ سعی ہوگی کہ ان کے درمیان سے اہم ترین بنیادی اغراض و مقاصد دریافت کرسکیں

نزول قرآن کا بنیادی مقصد انقلابی تبدیلی اور انقلابی قوانین کا نفاذ ہے

بحث کو مزید واضح و روشن کرنے کے لیے مندرجہ ذیل عنوان سے ایک سوال پر غور کرتے چلیں۔ وہ بنیادی مقصد کیا ہے جسے قرآنی ظواہر نمایاں کرتے ہیں اور جسے ہر جگہ دیکھا جاسکتا ہے اور قرآن کی ہر آیت خواہ اس کا مضمون و مفہوم و رنگ کچھ بھی ہو مگر اس بنیاد کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ ابھی جن مقاصد کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے خود ان کے باہمی تناظر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دراصل یہ مقاصد سمٹ کر ایک نکتہ بنتے اور ایک ہدف کی نشان دہی کرتے ہیں، اس بنیادی مقصد کے تین "بُعد" ہیں، تمام مقاصد اس سے مربوط ہیں جیسے مرکز سے دائرے کے خطوط

ہماری یہ بات قرآن ہی سے ثابت ہوتی ہے۔

انسانیت میں وسیع اجتماعی تبدیلی لانا اصلی مقصد ہے جسے ایک پروگرام اور انقلابی قواعد و قوانین کے ذریعہ مشخص و معین کیا گیا ہے۔

الف: پہلا بعد ۔ عمقی تغیر

یہ سہ بعدی مقصد جس کا پہلا بعد وسیع بنیادی تغیر ہے ۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے :
«يخرجهم من الظلمات الى النور» اس قانون کی بنیاد پر کہ ان الله لا يُغير مابقوم حتى يغيروا ما بانفسهم (رعد/۱۱) اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک تبدیل نہیں کرتا جب تک کہ خود وہ اپنے کو نہیں بدل لیتے ۔ «ذلك بان الله لم يك مغيراً نعمة أنعمها على قوم حتى يغيروا ما بأنفسهم» (انفال/۵۳) یہ اس لئے ہے کہ اللہ کسی قوم کو جب نعمت سے نوازتا ہے تو جب تک وہ قوم خود کو نہیں بدلتی اللہ اس کی نعمت کو تبدیل نہیں کرتا ۔

اس بعد کی طرف قرآن کریم کی متعدد آیات میں اشارات موجود ہیں جبکہ خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی دعوت کا بھی اصلی مقصد یہی ہے ۔

«قد جاء كم من الله نورٌ و كتابٌ مبينٌ * يهدي به الله من اتبع رضوانه سبل السلام ويخرجهم من الظلمات الى النور باذنه ويهديهم الى صراط مستقيم» (مائدہ/۱۵-۱۶)

تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح و روشن کتاب اور نور آیا جس کے ذریعہ خداوند عالم پیروان راہ خدا کو سلامتی کے راہ کی ہدایت کر کے ان کو اپنے اذن سے تاریکیوں سے نور کی جانب لاتا اور راہ راست کی ہدایت کرتا ہے ۔

«كتاب انزلناه اليك لتخرج الناس من الظلمات الى النور باذن ربهم الى صراط العزيز الحميد» (ابراهیم/۱)

وہ کتاب جس کو ہم نے تم پر اس لیے اتارا کہ تم عوام کو تاریکی سے نور کی طرف اپنے پروردگار کے اذن سے خدائے عزیز و حمید کی راہ پر لاؤ ۔

«هو الذي ينزل على عبده آيات بينات ليخرجكم من الظلمات الى النور وان الله بكم لروف رحيم» (حدید/۹)

وہ وہ خدا ہے جو اپنے بندہ پر روشن آیات کو نازل کرتا ہے تاکہ تم کو تاریکیوں سے نور کی طرف لائے اور اللہ تم پر مہربان و رحیم ہے ۔

«قد أنزل الله اليكم ذكراً رسولاً يتلوا عليكم آيات الله مبينات ليخرج الذين آمنوا وعملوا الصالحات من الظلمات الى النور»
(طلاق/١٠،١١)

اس نے تمہاری جانب رسول کو ذکر بنا کر بھیجا ہے تاکہ تمہارے سامنے اللہ کی واضح آیات کی تلاوت کرے تاکہ مومن اور صالح اعمال بجالانے والوں کو ظلمت سے نور میں لائے۔

«يا أيها الذين آمنوا اذكروا الله ذكراً كثيراً *... هوالذي يصلي عليكم وملائكته ليخرجكم من الظلمات الى النور وكان بالمؤمنين رحيماً (الاحزاب: ٤١ــ٤٣)

اے ایمان والو: اللہ کو ذکر کثیر کے ساتھ یاد کرو، وہ اور اس کے ملائکہ تم پر درود بھیجتے ہیں تاکہ تم کو تاریکیوں سے نور میں لائے اور وہ مومنین کے لئے بڑا رحیم ہے۔

قرآن کریم کی ان آیات کریمہ میں اس بنیادی وسیع تبدیلی و تغییر کو دو متناقض و متضاد (نور و ظلمت) مرکز سے ایک دوسرے مرکز کی طرف نکلنے سے تعبیر کیا گیا ہے اور تنہا مقصد نزول قرآن اور صفت قرآن ہے جو پہلی آیت میں ہے وہ مقصد نہیں ہے بلکہ جو پہلی آیت میں آیا ہے وہ نزول قرآن کا اس مقصد سے جیسا کہ دوسری اور تیسری آیت میں بھی یہی بات کہی گئی ہے جیسا کہ یہ مقصد ہی نزول قرآن اور پیغمبر اکرم کی دعوت کے مابین ارتباط کا بخوبی پتہ دیتی ہے کیونکہ چوتھی آیت میں ذکر سے رسول اکرم کے لیے یہی تعبیر ہوئی ہے اس وقت آپ اسی مقصد کو خدا اور انسان کے مابین رابطہ کہہ سکتے ہیں بہ عنوان کا رابطہ خدا کی نسبت انسان کی رفتار و سلوک اور بندے کی نسبت اللہ کی رحمت و عنایت کا رابطہ جیسا کہ پانچویں آیت میں کہا گیا ہے۔

قرآن کریم میں مومن کا فر کو دو متضاد مرکزوں سے وابستہ کیا گیا ہے "اللہ" اور "طاغوت" اس سے بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ قرآن کا بنیادی مقصد "یخرجہم من الظلمات الی النور" یعنی اجتماعی تبدیلی لانا ہے۔ جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے:

«الله ولي الذين آمنوا يخرجهم من الظلمات الى النور والذين كفروا أولياؤهم الطاغوت يخرجونهم من النور الى الظلمات أولئك اصحاب النارهم فيها خالدون.» (بقره/٢٥٧)

اللہ، اہل ایمان کا ولی ہے، انھیں تاریکیوں سے نور کی طرف لاتا ہے اور کافروں کا ولی طاغوت ہے جو انھیں نور سے ظلمت کی طرف لے جاتا ہے، یہی لوگ جہنمی ہیں اور ہمیشہ جہنم میں رہیں گے۔
اور شاید یہی ایک ایسا پہلو ہے جو اولوالعزم پیغمبروں اور دوسرے تمام رسولوں کے اصلی مقصد میں فرق پیدا کرتا ہے۔ سورہ ابراہیم میں جو آیت حضرت موسیٰ کی شان میں نازل ہوئی ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے۔

«ولقد ارسلنا موسی بآیاتنا ان اخرج قومک من الظلمات الی النور وذکرهم بایام الله ان في ذلک لایات لکل صبار شکور»
(ابراهیم/۵)

میں نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی میں لاؤ انھیں ایام الٰہی کی یاد دلاؤ یقیناً اس میں ہر صابر و شکور کے لئے نشانیاں موجود ہیں۔
خصوصاً جب ہم بہ نظر غائر دیکھتے ہیں کہ یہ آیت آیۂ «کتاب انزلناه الیک لتخرج الناس من الظلمات الی النور باذن ربهم...» (ابراهیم/۱) کے سیاق میں واقع ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید اس سے پیغمبر اکرمؐ اور حضرت موسیٰ کی عظیم ذمہ داریوں کے مابین تقابل بتانا مقصود ہے۔
عملی تغییر کا پھیلاؤ قرآن مجید میں اس عملی تغیر کی طرف بہت واضح اشارے اور منظر کشی ہے (یخرجهم من الظلمات الی النور) ان کو تاریکیوں سے روشنی میں لاتا ہے یہ قول عین وہاں ارشاد ہوا ہے جہاں رسول اکرم کی عظیم ذمہ داریوں کو دوسرے اہل کتاب کے مقابلے میں بیان کیا ہے۔

«الذین یتبعون الرسول النبي الأمِيَّ الذي یجدونه مکتوباً عندهم فی التوراة والانجیل یامرهم بالمعروف وینها هم عن المنکر ویحل لهم الطیبات ویحرم علیهم الخبائث ویضع عنهم اصرهم والاغلال التی کانت علیهم فالذین آمنوا به وعزّروه ونصروه واتبعوا النور الذي انزل معه أولئک هم المفلحون» (اعراف/۱۵۷)

جو لوگ اس پیامبر امی کی پیروی کرتے ہیں جس کی تعریف و توصیف توراۃ و انجیل میں پاتے ہیں۔ وہ پیغمبر جو انھیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتے ہیں اور وہ جوان کے لئے طیب و طاہر چیزوں کو حلال اور خبیث اور بری چیزوں کو حرام بتاتا ہے اور وہ جو ان کے کاندھوں کے بھاری بوجھل

گناہوں کو ہلکا کرتا ہے۔ پس جو لوگ اس کی مدد اور اس کی نصرت کریں اور اس کے ساتھ نازل ہونے والے نور کی پیروی کریں وہی لوگ فلاح پائیں گے۔

لقد من الله علی المؤمنین اذبعث فیهم رسولاً من انفسهم یتلو علیهم آیاته و یزکیهم و یعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین» (آل عمران/١٦٤)

یقیناً اللہ نے مومنین کے درمیان ہی سے رسول بھیج کر مومنین پر احسان کیا ہے تاکہ وہ اس کے لئے اس کی آیتوں کی تلاوت کرے اور ان کا تزکیہ نفس کرے، کتاب و حکمت سکھائے اگر اس کے پہلے وہ کھلی گمراہی میں زندگی گزارتے تھے۔

اس تبدیلی کا صحیح طریقہ

یہ بنیادی تبدیلی درحقیقت ایک سیدھے راستے اور صحیح روش کی محتاج ہے جس سے بنیادی مقصد کا دوسرا بعد سامنے آتا ہے اور اس طریقہ کو کتاب و حکمت کا وسیلہ بتایا جاتا ہے۔ کتاب جو کہ شریعت کا آئینہ ہے اور دین حکمت جو ان قوانین و سنن کی آئینہ دار ہے جو انسان اور اس کی ارتقائی حرکت کی تاریخ میں موثر رہی ہے اور اس کی سعادت و شقاوت میں اثر انداز ہے اور قرآن اسی لئے آیا ہے تاکہ ایک راہ متعین کرے چنانچہ قرآن ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کرتا ہے۔

«هدیً للناس و بینات من الهدی والفرقان» (بقره/١٨٥)

عوام کی ہدایت کا سرمایہ اور راہ ہدایت کا پتہ بتانے والا اور فرقان ہے۔

اور قرآن «ذلک الکتاب لاریب فیه هدیً للمتقین» (بقره/٢)» ہے۔

«ان هذا القرآن یهدي للتي هی اقوم و یبشر المؤمنین الذین یعملون الصالحات ان لهم أجراً کبیراً (اسراء/٩)

یقیناً یہ قرآن سیدھے راستے کی دعوت دیتا اور جو مومنین اعمال صالح انجام دیتے ہیں ان کو اجر عظیم کی بشارت دیتا ہے «وننزل من القرآن ماهوشفاء ورحمة للمؤمنین ولایزید الظالمین إلاّ خساراً» (اسراء/٨٢) ہم قرآن سے جو شفا و رحمت ہے، مومنین کے لئے نازل کرتے ہیں اور ستمگاروں کے لئے خساروں کے علاوہ کچھ زیادہ نہ ہوگا۔

«(ویخرجهم من الظلمات الی النور باذنه و یهدیهم الی صراط مستقیم) (المائدة/۱٦) «ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شيء وهدیً ورحمة و بشری للمسلمین» (نحل/۸۹)

اے پیغمبر ہم نے تم پر کتاب نازل کی جو تمام چیزوں کو بیان کرنے والی ہے اور مسلمانوں کے لئے بشارت و رحمت اور ہدایت کا سرمایہ ہے۔

«ان هذا القرآن یقص علی بني اسرائیل اکثرالذي هم فیه یختلفون وانه لهدیً و رحمة للمؤمنین» (نمل/۷٦،۷۷)

یقیناً یہ قرآن بنی اسرائیل کی ان اکثر چیزوں کو بیان کرتا ہے جس میں انھیں اختلاف ہے اور وہ قرآن مومنین کے لیے رحمت و ہدایت ہے۔

«یا أیها الناس قد جاءتکم موعظة من ربکم وشفاء لما فی الصدور وهدیً ورحمة للمؤمنین.» (یونس/۵۷)

اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے دلوں کے لیے شفاء اور مومنین کے لیے رحمت و ہدایت آئی ہے۔

«ما کان حدیثاً یفتری ولکن تصدیق الذي بین یدیه وتفصیل کل شي وهدیً ورحمة لقوم یؤمنون» (یوسف/۱۱۱)

یہ قرآن بشری کلام نہیں ہے بلکہ گذشتہ کتابوں کے بارے میں تصدیق اور تمام چیزوں کی تفصیل نیز ایمان والوں کے لیے رحمت و ہدایت ہے۔

«إنَّ في هذا لبلاغاً لقوم عابدین * وما أرسلناک الا رحمة للعالمین» (انبیاء/۱۰٦،۱۰۷)

یقیناً یہ قرآن عبادت گذاری کے لیے ہے اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا ہے مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔

«وأوحي إليَّ هذا القرآن لأنذرکم ومن بلغ...» (انعام/۱۹)

یہ قرآن مجھ پر وحی ہوا ہے تاکہ تمھیں اور ہر اس آدمی کو (عذاب خدا سے) ڈراؤں جس تک پیغام پہونچا ہے۔

اس صحیح روش کی تعبیر قرآن کریم نے متعدد جگہوں پر صراط مستقیم سے کی ہے، اس صراط کی تعبیر کی ہے جو کمال انسانیت اور کمال نعمت بشری ہے۔

«اهدنا الصراط المستقيم * صراط الذين انعمت عليهم غيرالمغضوب عليهم ولاالضالين.» (فاتحة/۷،۶)

ہمیں راہ راست کی ہدایت کر، ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے اپنی نعمت نازل کی ہے ان لوگوں کے راہ کی نہیں جن پر تو نے اپنا غضب نازل کیا ہے اور ان لوگوں کے راہ کی جو گمراہ ہیں۔

«قل انني هداني ربي الى صراط مستقيم ديناً قيّماً ملة ابراهيم حنيفاً وما كان من المشركين» (انعام/۱۶۱)

کہو میرے پروردگار نے مجھے اس راہ راست کی ہدایت کی ہے جو صحیح دین اور ملت حنیف ابراہیمؑ ہے اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔

«ان ابراهيم كان أمةً قانتاً لله حنيفاً ولم يک من المشركين شاكراً لأنعمه اجتباه وهداه الى صراط مستقيم» (نحل/۱۲۱)

یقیناً ابراہیمؑ امت و پیروکار و مطیع تھے اور مشرک نہ تھے اور وہ اللہ کی نعمتوں کے شکر گذار تھے۔ اللہ نے ان کو منتخب کیا اور راہ راست کی ہدایت کی۔

«إنا فتحنا لک فتحاً مبيناً * ليغفرلک الله ماتقدم من ذنبک وما تأخر ويتم نعمته عليک ويهديک صراطاً مستقيماً». (فتح/۲،۱)

ہم نے تم کو کھلی فتح دی تاکہ اللہ تمہاری آیندہ و گذشتہ گناہوں کو بخش دے اور اپنی نعمتوں کو تم پر کامل و مکمل کردے اور تم کو راہ راست کی ہدایت کرے۔

ج: انقلابی چھاؤنی کی بنیاد

اجتماعی تبدیلی لانے کا کام ایک انقلابی چھاؤنی کے وجود کا محتاج ہے اور اسی انقلابی چھاؤنی سے تیسرا بُعد وجود میں آتا ہے۔ اسی لئے قرآن نے اس چھاؤنی کو وجود میں لانے کی ضرورت پر زور دیا اور یہ چاہا کہ یہ چھاؤنی رسالت سے ابھرنے والے حوادثات کا مقابلہ کرسکے اور نبی اپنے عظیم مقصد

تک پہونچنے کا موقف اختیار کریں ظاہر ہے ایسی چھاونی کو وجود میں لانا اور وہ بھی ایسے سخت وقت میں، اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ رسالت کے مستقبل کے لیے اس کی وسعت کے علاوہ بقاء اور دوام کا مسئلہ ہے۔

لہذا قرآن نے جس تغیری عمل کو مقصد قرار دیا ہے۔ اس میں کیفی بعد کے علاوہ ایک کمی بعد بھی ہے کہ قرآن خاص طور سے چاہتا ہے کہ پیغمبر اس کے تحقق کے لیے اقدام کریں اور اسکو اس طرح محکم کریں کہ پیغمبر کی وفات اور وحی کے بند ہونے کے بعد بھی یہ رسالت باقی رہے اور اس چھاؤنی کے ذریعہ جس کو خاص اہمیت دی گئی ہے، رسالت کے مستقبل کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ بہت سی آیتیں ہیں جو عصر رسالت کے حوادثات کو بیان کرتی ہیں نیز عادات و رسوم و قوانین یا زیان کے اسباب کی تحقیق کرتی ہیں۔

جزیرۃ العرب ام القریٰ ومن حولھا کے رہنے والوں کی طرف قرآن کریم نے خاص توجہ مبذول کی تاکہ یہاں سے رسالت کو وسعت دینے کے لیے انقلابی چھاؤنی کو وجود میں لایا جاسکے۔

یہ خصوصی توجہ دوسرے افراد بشری کی بہ نسبت جزیرے کے لوگوں کو فوقیت دینے کیلئے نہیں ہے بلکہ کمی مقصد یا اسلام کا پیغام پہنچانے کی ایک منزل کے لیے ہے اس لیے کہ یہ سب پیغمبر کے دائرہ عمل میں اور یہ سب ایسی جمعیت کو وجود میں لاتے ہیں جہاں پیغمبرؐ نے رسالت کا آغاز کیا ہے۔

«وهذا كتاب أنزلناه مبارك مصدق الذي بين يديه ولتنذر أمّ القرىٰ ومن حولها والذين يؤمنون بالآخرة يؤمنون به وهم على صلاتهم يحافظون» (انعام/۹۲)

یہ وہ کتاب ہے جس کو با برکت بنا کر بھیجا ہے تاکہ گذشتہ لوگوں کی تصدیق کرنے والی اور ام القریٰ اور اس کے اطراف کے لوگوں کے لیے خوف دلانے والی ہو، اور جو لوگ آخرت کا عقیدہ رکھتے اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں، نیز اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ان سب کے لیے نذارت ہے۔

«وکذلک أوحیناً الیک قرآناً عربیاً لتنذرأمّ القریٰ ومن حولها وتنذریوم الجمع لاریب فیه فریق فی الجنة وفریق فی السعیر.»
(شوری/۷)

اسی طرح ہم نے قرآن عربی کو تمہاری طرف وحی کیا تاکہ تم ام القریٰ اور اس کے اطراف کے افراد کو خوف دلاتے رہو۔

«هوالذي بعث في الأميين رسولاً منهم يتلوا عليهم آياته و يزكيهم و يعلمهم الكتاب والحكمة وان كانوا من قبل لفي ضلال مبين.»
(جمعه/۲)

وہ وہی خدا ہے جس نے جاہل لوگوں میں انہیں میں سے رسول بنا کر بھیجا تاکہ ان کے لیے اس کی آیات کی تلاوت کرے اور اس کا تزکیہ نفس کرے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے اگرچہ وہ اس کے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

«لقد منّ الله على المؤمنين اذبعث فيهم رسولاً من انفسهم.»
(آل عمران/۱٦٤)

اللہ نے مومنین پر احسان کیا کہ انہیں میں ان کا رسول بھیجا۔

وهذا كتاب أنزلناه مبارك فاتبعوه واتقوا لعلكم ترحمون. أنْ تقولوا إنما أنزل الكتاب على طائفتين من قبلنا وان كنا عن دراستهم لغافلين. أوتقولوالَوْأنّا أُنزل علينا الكتاب لكنّا أهدىٰ منهم فقد جاءكم بيّنة من ربكم وهدى ورحمة فمن أظلم ممن كذب بآيات الله...»

(انعام/۱۵۷،۱۵۵)

یہ بابرکت کتاب تم پر نازل کی لہذا اس کا اتباع کرو اور پرہیزگار بنو تاکہ شائد لائق رحم ہوجاؤ، یہ جو کہتے ہو کہ ہم سے پہلے دو گروہوں پر کتاب نازل ہوئی اور

ہم اس کو پڑھنے سے غافل رہے یا یہ کہو کہ اگر کتاب ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس سے زیادہ ہدایت کرتے تو اب واضح اور کھلی دلیل اور بینہ اور ہدایت و رحمت تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل ہوتی ہے تو پھر کون آیات خدا کو جھٹلانے والے سے زیادہ ظالم ہو سکتا ہے۔

۳۔ بنیادی مقصد میں شریک دوسرے مقاصد

مذکورہ تفسیر سے ان دوسرے مقاصد کے نقوش کو بھی سمجھا جا سکتا ہے جن کا تذکرہ ہم نے بنیادی مقصد تک پہونچنے کے سلسلے میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ خود اصلی ہدف کی اہمیت کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز یہ کہ دوسرے مقاصد فرعی ہیں۔ ان فرعی مقاصد کا مجموعہ بنیادی مقصد کو وجود میں نہیں لا سکتا چہ جائیکہ وہ خود منفرداً بنیادی مقصد بن جائیں۔

۱۔ یاد دہانی اور عذاب خدا سے ڈرانا ــ یہ دونوں چیزیں بھی قرآن میں قرآن کے نزول کے مقصد کے عنوان سے بتائی گئی ہیں جیسا کہ کچھ آیات کی طرف میں نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے یہی دونوں چیزیں پیغمبروں کی ذمہ داری کے عنوان سے بھی بتائی گئی ہیں۔

«اولم يتفكروا ما بصاحبهم من جنة إن هو إلا نذير مبين»
(اعراف/۱۸٤)

کیا تم یہ نہیں سوچتے کہ ان کے ساتھی ناعقلی کی تاریکی نہیں ہے وہ صرف کھلا ہوا نذیر ڈرانے والا ہے۔

«إن أنا إلا نذيرٌ و بشير لقوم يؤمنون» (اعراف/۱۸۸)

میں ایمان والوں کے لیے نذیر و بشیر کے علاوہ کچھ نہیں ہوں۔

«انما انت نذيرٌ والله علىٰ كل شيءٍ وكيل». (هود/۱۲)

تم نذیر کے علاوہ کچھ نہیں ہو اور اللہ ہر چیز کا حافظ و نگہبان ہے۔

«قال يا قوم اني لكم نذير مبين» (نوح/۲)

کہا کہ اے میری قوم میں تمہارے لیے کھلا ہوا نذیر ہوں۔

یہ انذار اور خوف دلانا پیغمبروں کی بعض ذمہ داریوں کو بتاتا ہے اور کچھ نزول قرآن کے

مقصد اور عمل تغیر کو متحقق کرنے کی سعی کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے ۔

اس بات کی وضاحت کے لیے یہ عمل کافی ہے کہ ہم انذار اور عذاب خدا سے خوف دلانے کے کام کو ان دوسرے مسائل کے ساتھ قرار دیدیں جن کے متکفل خود قرآن اور پیغمبر اکرمؐ ہیں ۔

«قد جاءتكم موعظة من ربكم وشفاء لما في الصدور وهدى ورحمة للمؤمنين» (يونس/۵۷)

تمہارے پروردگار کی جانب سے موعظہ اور تمہارے دلوں کے لیے شفاء اور مومنین کے لیے ہدایت و رحمت نازل ہوئی ہے ۔ اسی لیے یہ موعظہ شفاء و ہدایت و رحمت کے ساتھ ساتھ ہے ۔ جیسا کہ بہت سی آیات میں انذار کو بشارت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے ۔

«كان الناس أمة واحدة فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين وأنزل معهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه، وما اختلف فيه إلاّ الذين أوتوه من بعد ما جاءتهم البيّنات بغياً بينهم فهدى الله الذين امنوا لما اختلفوا فيه من الحق باذنه والله يهدي من يشاء الى صراط مستقيم» (بقره/۲۱۳)

سبھی لوگ ایک امت تھے اللہ نے پیغمبروں کو خوف دلانے اور بشارت دینے کے لیے بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب بھیجی تا کہ ان کے اختلافات کا فیصلہ کر سکیں اور انھوں نے دین میں کوئی اختلاف نہیں کیا ہے مگر ان لوگوں نے اپنے اوپر تجاوز و بغاوت حاکم ہونے کی وجہ سے اختلاف کیا ہے جن کے پاس دین پہونچا ۔ اس وقت اللہ نے مختلف فیہ مسئلہ میں مومنوں کی ہدایت کی اور اللہ جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت کرتا ہے ۔

یہ آیت کریمہ پیغمبروں کے عمل اور قرآن میں انذار اور خوف دلانے کے اثرات پر روشنی ڈالتی ہے اور بتاتی ہے ۔ انذار ایسی ذمہ داری ہے جسے پیغمبروں کو راہ راست کی ہدایت کرنے والی کتاب کے ساتھ کام میں لانا ہی چاہیے ۔

ہمیں جب یہ معلوم ہو تا کہ قیام عدل کا دار و مدار انذار پر موقوف ہے تو ہم اس بات کی

طرف بھی متوجہ ہوں گے قرآن کریم میں انذار کو نزول کے بنیادی مقصد اور پیغمبروں کی ذمہ داری کے عنوان دینے پر تاکید کی وجہ کیا ہے؟ یہ تائید اس لیے ہے کہ اصل حیات اور وہ معیار جو عدل و انصاف کے ذیل میں دین کے لیے مورد اعتماد ہے بنیادی طور پر اس ارتباط موت کے بعد کی دنیا اور اس دنیا میں عذاب کا خوف دلائے اور بہشت کی بشارت ہے۔

اس طرح اسی انذار کو پیغمبروں کی ذمہ داری قرار دینے کی تائید پیغمبر سے متعلق روحی شکل کو بھی حل کر سکتی ہے کہ پیغمبر اپنے کو عوام میں بنیادی تبدیلی لانے ایسا ذمہ دار تصور کرتا رہے کہ اگر عوام میں وہ تغیر حاصل نہ ہو سکا تو خدا کے سامنے سخت صورت حال سے دوچار ہونا ہوگا۔

«لعلّک باخع نفسک الایکونوا مؤمنین. ان نشأ ننزل علیهم من السماء آیة فظلّت أعناقهم لها خاضعین» (شعرا/۳،۴)

اے میرے رسول شاید تم اپنے کو ہلاکت میں ڈال دو گے کہ یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے ہم اگر چاہیں تو ان پر آسمان سے ایک نشانی نازل کریں جو انھیں سر جھکانے پر مجبور کر دے۔

«ومن ضلَّ فقل إنما أنا من المنذرین» (نمل/۹۲)
«طٰه ما أنزلنا علیک القرآن لتشقىٰ الا تذکرة لمن یخشىٰ»
(طه/۱-۳)

- اور جو گمراہ ہو، اس سے کہیے کہ میں تنبیہ کرنے والا ہوں۔
- اے پیغمبر، ہم نے قرآن کو اس لیے نہیں نازل کیا کہ اپنے کو مشقت میں ڈالیں بلکہ مقصد اس شخص کے لیے ذکر ہے جو ڈرتا ہے۔

«فلعلک تارک بعض مایوحی الیک وضائق به صدرک ان یقولوا لَوْلاأنزل علیه کنزٌ أوجاء معه ملک إنما أنت نذیرٌوا لله علی کل شيء وکیل.» (هود/۱۲)

اے رسول کہیں ایسا نہ ہو کہ بعض آیتیں جو آپ پر وحی کی گئی ہیں ان کو نہ پہنچائیں یا لوگوں کے یہ کہنے سے کہ کوئی خزانہ کیوں نہ نازل ہوا یا فرشتہ کیوں نہیں آیا دل تنگ نہ ہوں، آپ صرف نذیر ہیں اور اللہ ہر چیز کا نگہبان ہے۔

قرآن نے یہاں پر پیغمبر کی ذمہ داری صرف انذار بتائی ہے۔ ذمہ داری اور اس مقصد کے درمیان فرق ہے رسول اکرم کو انجام دینا ہے۔ رسول کو اپنی تمام طاقت کام میں لانی ہے وہ انذار و فداکاری کے ذمہ دار ہیں لیکن افراد میں تبدیلی پیدا کرنا اگرچہ ان کا مقصد ہے اور تمام چیزوں کے مقابلے میں اہم ہے اور اس کو انہیں انجام دینا ہے لیکن وہ اس کے نتائج کے ذمہ دار نہیں ہیں جیسا کہ بعض مواقع پر انذار کے لیے محنت و مشقت اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہے کہ پیغمبر میں ذرہ برابر بھی جاہ و منزلت قدرت و طاقت مادی فوائد کا لالچ نہ تھا بلکہ وہ صرف اپنے فریضہ کو پورا کرنا چاہتے تھے۔

«واتل عليهم نبأ نوح إذْقال لقومه يا قوم إنْ كان كبرعليكم مقامي وتذكيري بآيات الله فعلى الله توكلت فاجمعوا أمركم وشركاءكم ثم لايكن امركم عليكم غمة ثم اقضوا الي ولا تنظرون فان تولّيتم فماسألتكم من اجرٍإنْ أجريَ إلّاعلى الله وأمرت أنْ أكون من المسلمين.»
(يونس/۷۱، ۷۲)

خبر نوح کو ان کے لیے دہراؤ کہ جب نوح نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم اگر میرا مقام اور خدا کی آیات کا یاد دلانا تمھارے لئے گراں گذرتا ہے تو میرا اللہ پر بھروسہ ہے پس تم اپنے اور اپنے شرکاء کے امر کو فراہم کرو اور تمہارے امر میں کسی پیچیدگی و ابہام کا وجود نہ تھا پھر میرا کام پورا کرو اور مجھے مہلت نہ دو اور جب بھی میری طرف رخ موڑے تو میں اپنے کام کا کوئی بدلہ نہیں چاہوں گا میرا اجر تو اللہ پر ہے اور میں اس کے امر کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہوں۔

۲۔ قرآن میں مثال پیش کرنے کا مقصد انذار و یاد دہانی ہے جیسا بعض آیات میں اشارہ ہوا ہے۔

«ولقد ضربنا للناس فى هٰذا القرآن من كل مثل لعلهم يتذكرون.» (زمر/۲۷)

ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کی مثال پیش کی ہے تاکہ لوگ یاد رکھ سکیں۔

۳۔ جب قرآن حجت، برہان اور موعظہ ہے تو انذار و ہدایت میں شریک ہونا چاہیے اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ برہان ہدایت و نور و صراط مستقیم کے خود قرآن میں ساتھ ہے۔

«یا أیہا الناس قدجاء کم برھان من ربکم وأنزلنا الیکم نوراً مبیناً فامّا الذین آمنوا باللہ واعتصموا بہ فسیدخلھم فی رحمۃ منہ وفضل ویھدیھم الیہ صراطاً مستقیماً» (نساء/۱۷۴-۱۷۵)

اے لوگو تمہارے پروردگار کی طرف سے برہان نازل ہوئی اور تم پر کھلا نور اترا لہٰذا جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس سے متمسک ہوئے۔ اللہ انھیں اپنے فضل و رحمت میں داخل کرے گا اور انھیں راہ مستقیم کی ہدایت کرے گا۔

۴۔ احکام کی تفصیل و تشریح ــــ یہ نکتہ بنیادی عمومی تبدیلی میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن کی بنیاد پر مکمل تبدیلی کے وقت قرآن کی وسعت و گہرائی کو سامنے رکھا جائے وہ تبیان کل شئے ہے، ہدایت و رحمت ہے اور صراط مستقیم کو مجسم کرتی ہے۔

«ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شي وھدی ورحمۃ وبشریٰ للمسلمین» (نحل/۸۹)

اے پیغمبرؐ ہم نے تم پر کتاب نازل کی تاکہ ہر شے کی بیان کرنے والی ہو اور مسلمانوں کے لیے ہدایت و رحمت و بشارت ہو۔

۵۔ سورہ بقرہ کی مذکورہ آیت (۲۱۳، کی تشریح کے مطابق قرآن مجید ختم اختلاف، حق و باطل میں جدائی اور تفرقہ سے دوری کرتا ہے یہی اس کا اسلوب عام ہے یعنی ہدایت و نور۔

۶۔ رسالتوں کی تصدیق اور انکی تکمیل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سماج میں بنیادی تبدیلی کا وجود نہیں رہا اس لیے کہ کبھی سماجی انحراف اس حد تک پہونچ جاتا ہے کہ پھر سماج ماقبل کی رسالتوں کے مقصد سے دور ہو جاتا ہے چہ جائیکہ جدید رسالتوں کے مقاصد! یہی وجہ ہے کہ مختلف مواقع پر خصوصاً اہل کتاب سے جدال ان کے تعصب کے ذکر ان کے انحرافات تھوڑی قیمت میں آیات

خدا نہ سمجھنے کے موقعہ پر قرآن کریم مذمت کرتا ہے اسی لئے قرآن کریم ماسبق کی رسالتوں کی تکمیل ان کی تصدیق اور ان پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ ان رسالتوں اور آسمانی مفاہیم سے دور ہو جانے والے سماج کے لیے ایک بنیادی عمل انجام دیتا ہے تاکہ ان کی فکر اور ان کا عمل صحیح راستے سے ہٹ گیا ہو تو اسے نظریہ اور تطبیق کی شاہراہ پر واپس لائے۔ دراصل گذشتہ تعلیمات کی تصدیق ہدایت و صراط مستقیم کی نگہداشت ہے۔ یہی انبیاء و مرسلین کا کام ہے۔ ہم نے اساسی و بنیادی مقصد نزول قرآن میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

«قل انني هداني ربي الى صراط مستقيم ديناً قيماً ملة ابراهيم حنيفاً وما كان من المشركين.» (انعام/۱۶۱).

اور اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ سورۂ اعراف کی آیت ۱۵۷ میں بیان کیا ہے:

«الذين يتبعون الرّسول النبيَّ الامّيَّ الذي يجدونه مكتوباً عندهم في التوراة و..» (الأعراف/۱۵۷)

۷۔ "تاریخ انسان" ۔ انبیاء کرام اور امتوں کے قصّے، اور پوری تاریخ پر حکمران کلیات دراصل "اِنذار" کے قانون اساسی کی ایک شق ہیں۔ اس سے وہ حکمت بھی سمجھ میں آتی ہے جو عام اسلوب قرآن میں موجود ہے۔ یہ پہلو اساسی ستون اور اسلوب و مقصد کے ابعاد کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اسی سے مستقبل کے بارے میں کلیات و قوانین فطرت کا وہ رشتہ بھی سامنے آتا ہے جو مستقبل کو ماضی سے ملاتا ہے۔

۸۔ اصل بات جو قرآن ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ ہے زندگی کا کامل و مکمل تصور، قرآن کا اسلوب اسی تمثیل کاری پر قائم ہے۔ پھر حیات انسانی پر صحیح حکمراں کلیات وہ اقدار بیان کرتا ہے جن پر عدالت و انصاف کو بالادستی ہو۔ دین و قرآن کا یہی پیام ہے۔

انسان کا وجود میں کیا مرتبہ ہے اور اس میں اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔

اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ دوسرے مقاصد اہم ہونے کے باوجود۔ اساسی مقصد کے بعد فرعی بن جاتے ہیں۔ یہ مقاصد بڑی حد تک بنیادی نکتے تک پہنچنے میں مددگار ہیں۔ تاریخ قرآن سے ہم کو اب تک یہی سبق ملا ہے۔

جناب ڈاکٹر بی آزار شیرازی
ترجمہ و اضافہ :- جناب سید مرتضیٰ حسین

تفسیر سورۂ بقرہ کے بارے میں ایک نظر

نام اور آیات :

قرآن مجید کا یہ دوسرا سورہ ہے اور اس کا نام " البقرہ " ہے ۔ کیونکہ بنی اسرائیل نے گائے کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ انتہائی گمراہ کن تھا ، یوں تو وہ اپنے تئیں خدا پرست اور برتر از ہمہ جیاتے تھے مگر شرک کا عالم یہ تھا کہ گائے کی پوجا اور وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حیات مبارک میں کرکے اپنے رجحانات کی نمایش کر چکے تھے ۔

سورے میں دو سو چھیاسی آیتیں اور چالیس رکوع ہیں ۔

زمانۂ نزول :

مجموعی طور پر اسے مدنی سورہ کہا جاتا ہے ، اس لیے کہ اس کی اکثر آیتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہیں ۔ آخری چند آیتیں البتہ مکی ہیں ۔

پس منظر :

سورۂ بقرہ کی آیتیں مختلف اوقات و حالات میں نازل ہوتی رہیں ، اس لیے کہ ہر ایک آیت یا آیات کی نزول الگ الگ ہے ۔ بصورتِ موجودہ یہ ایک مکمل سورہ ہے اور امام

محمد باقر علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث بیان فرمائی ۔

اعطیت الطوال مکان التوراۃ والمئین مکان الانجیل، واعطیت المثانی مکان الزبور و فضلت بالمفصل سبع وستین سورۃ ۔ (تفسیر البرہان)	مجھے طویل سورے تورات کے بجائے اور سو سے زیادہ آیتوں والے سورے انجیل کے عوض اور مثانی زبور کے بدلے عطا کیے گئے اور ۶۷ مفصل سورے بطور شرف زیادہ مرحمت ہوئے۔

گویا سوروں کی حد آنحضرت ؐ کے لیے اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ۔ بظاہر سورۂ بقرہ و آل عمران میں اسی طرح کی بات پائی جاتی ہے ۔ یعنی البقرہ میں جناب موسیٰ ؑ اور بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے اور آل عمران میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور نصاریٰ کا تذکرہ ہے ۔ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی مناسبت سے دونوں سورتوں کا آنا بجائے خود ایک معجز نما بات ہے ۔

آغاز میں تین گروہوں کو تعارف ہے اور ان کے اعمال و عقائد ، افکار و کردار پر روشنی کہ اسلام کو ہمیشہ انھیں گروہوں سے سابقہ رہے گا متقی (مومن) کافر (منکر) منافق (موقع پرست) دوسرے مرحلے میں یہودیوں کے سماجی اثر و نفوذ اور تعلیمی و تبلیغی معاملات میں نسل پرستی اور آقائیت کا پروپیگنڈہ ، انبیاء پر بہتان ، آسمانی کتاب میں تحریف ، قصص و حکایات اور خرافات کو ، اللہ کی طرف منسوب کرنا اور انبیا کے نام کو بدنام کرنا ۔ ایسی خطرناک صورت حال تھی کہ مشرک و غیر مشرک اس سے مرعوب بنے ہوئے تھے ۔ مدینے میں ان کا اقتصادی نظام بھی غالب تھا اس لیے ان کے افکار و کردار ، پروپیگنڈے اور تعلیمات کی حقیقت واضح کی گئی اللہ نے حضرت آدم ؑ سے حضرت ابراہیم و اسماعیل اور موسیٰ و داؤد علیہم السلام تک اپنی حکمت کے مطابق اصل واقعات سے سب کو آگاہ کیا اور نئے نبی علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام ، نئی کتاب یعنی قرآن اور نئی امت یعنی مسلمانوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کی راہیں کھولیں اور قیامت تک باقی رہنے والے مثالی کردار و اصول روشن کیے ۔

احکام بتائے ، نئے معاشرتی ، انتظامی ، اقتصادی ، قانونی اور فکری ضابطے مقرر کیے جو آیات کے ساتھ درجہ بدرجہ سامنے آتے ہیں ۔ اس ضمن میں فاضل معاصر جناب بے آزار شیرازی صاحب کا مقالہ ۔ "تفسیر قرآن بہ قرآن با توجہ بہ ہم بستگی آیات" ایک

محنت و عمیق مطالعہ کا آئینہ دار ہیں محترم قارئین کی نذر کرتا ہوں اور فاضلِ موصوف کی اجازت کا شکر گذار ہوں۔

سورۂ بقرہ کے آیات و مطالب کا باہمی ربط

تقویٰ۔ خلافت آدم۔ بنی اسرائیل۔ خاندانِ ابراہیمؑ رسالت پیغمبر اکرمؐ مسلمانوں کی عزت شجرۂ ممنوعہ و حدودِ الٰہی۔ سورۂ بقرہ کے بڑے بڑے نکات میں سے چند نکتے ہیں۔

قرآن نے اپنا موضوع "متقین کی ہدایت بتایا ہے۔ اور آدمیوں کے تین گروہ کیے ہیں متقی۔ کافر۔ منافق۔

خلقت کائنات۔ حضرت آدمؑ کی خلافت ارضی کا واقعہ۔ بنی اسرائیل کے تذکرے کے بعد امامتِ حضرت ابراہیمؑ و خاندان ابراہیمؑ کا بیان ہے۔ اور کم و بیش پانچ سو حدود الٰہی کا ذکر ہے۔

- ان مطالب کا متقی لوگوں اور تقوے سے کیا تعلق ہے ؟
- واقعہ حضرت آدمؑ کا ماجرائے بنی اسرائیل سے کیا ربط ہے ؟
- اور ان دونوں تذکروں سے خاندان ابراہیمؑ کا جوڑ کیا ہے ؟
- پانچ سو احکام، اصل موضوع تقویٰ و متقین سے کیوں کر مربوط ہیں ؟

ان سوالات کے جواب غور و فکر کے بعد یہ ملتے ہیں :

۱۔ تقوے اور خلافت ارضی کا تعلق ؛

"انّ الارض للّٰہ یورثہا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتّقین"

(الاعراف /۱۲۸)

یقیناً زمین اللہ کی ہے وہ اپنے (باصلاحیت) بندوں میں جسے چاہتا ہے وارث (خلافت) بناتا ہے اور عاقبت (خلافت) متقی لوگوں کی ہے۔"

حصولِ کامیابی کے لیے حضرت موسیٰؑ کی نصیحت کا بیان ہے۔ کلیم اللہ قوم کو سمجھا رہے تھے کہ وراثت و خلافتِ ارضی زیر سایۂ تقویٰ ہے۔ جب باہمی اعتماد و تعاون ہو تو قدرت

پیدا ہوتی ہے ، بے ایمان و تقویٰ دشمن انتشار کا شکار ہو کر شکست کھاتے اور مومن فتح یاب ہوتے ہیں
اللہ ، اقوام و ملل کو زمین پر قدرت و اختیار دیتا ہے کہ انھیں تقوے کی بنیاد پر جانچے
اور امتحان لے۔

" وھو الذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض درجات
لیبلوکم فیما آتاکم " (الانعام/۱۶۵)

۔ اللہ وہ ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور ایک کا رتبہ دوسرے سے
بڑھایا تاکہ جو تمھیں دیا گیا ہے اس میں تمہارا امتحان لے۔

وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ناطاقتوں کو اقتدار و حکمرانی حاصل کر کے اللہ کی نعمتوں کو بھلاتے ہیں یا اس پر شکر ادا کر کے اللہ کا رخ کرتے ہیں - مادیات میں الجھتے ہیں یا ایمان کو مستحکم بناتے ہیں ۔کردار و اخلاق میں شیطان بنتے ہیں یا اخلاق الٰہیہ کو اپناتے ہیں ، غرور و خودسری کر کے ناتوان عوام کو غلام بناتے ہیں یا انکساری و عاجزی اختیار کر کے بے یار و بے مددگار کی یاری اور غریبوں کی دستگیری کر کے انھیں اونچی سطح پر لاتے ہیں ، مستضعفین پر ظلم ڈھاتے ہیں یا خوف خدا سے راہ تقویٰ پر چلنے اور مستکبرین کو نظر انداز کرتے اور خستہ حال عوام کو گلے لگاتے ہیں ۔ اس امتحان میں نتیجہ اور عاقبت اہل تقویٰ کے حق میں ہوگی ۔

خلافت و تقویٰ کے باہمی تعلق پر گفتگو کے بعد سورۂ بقرہ کے موضوع " تقویٰ "۔ متقین ۔ اور کافرین و منافقین پر نظر ڈالتے ہیں ۔ زمین پر خلافتِ آدمؑ اور بنی اسرائیل کی خلاف تقویٰ رفتار و کردار کی وجہ سے خلافت ارضی کے لیے نا اہلی کا قرآنی بیان سامنے رکھ کر حضرت ابراہیمؑ اور ان کے پاکیزہ خاندان کے تقویٰ اور صلاحیت امامت و خلافتِ ارضی پر غور کریں ، اس تناظر میں بنی اسرائیل و تذکرۂ ابراہیمؑ و اولاد ابراہیمؑ کا معیار تقویٰ واضح ہوگا ۔

۲۔ داستان آدم و بنی اسرائیل :

" الٓر کتاب اُحکمت آیاتہ ثم فُصّلت من لدن حکیم خبیر "
(ہود/۱)

قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ شروع میں ایک مطلب کو مختصر اور دوسری مرتبہ تفصیل ایک مرتبہ کلی دوسری بار جزئیاتی انداز سے بیان کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں "انسان شناسی" "تعمیر انسانیت" پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے لیے حضرت آدمؑ کا مجمل اور بنی اسرائیل کی داستان مفصل ہے۔ بنی اسرائیل نے نعمتِ حیات و آزادی، زمین آسمان سے ملنے والے کھانے، اس دور کے انسانوں پر برتری، اقتدار و خلافت جیسے انعامات سے نوازا لیکن اس نااہل قوم نے عہد الہی توڑ کر شیطان کا راستہ اختیار کیا، آخر کار "ظالمین" کے زمرے میں شمار ہوئی۔ ناشکری کی سزا ملی اور "ھبوط" نصیب ہوا۔ اللہ نے ایک مرتبہ پھر وقت دیا اور پیغمبر آخر الزمانؐ کو بھیجا۔ بنی اسرائیل کو خاص طور پر مطلع کیا، ان کو دعوت میں خصوصی توجہ سے دیکھا مگر یہ قوم نہ ماننا تھا نہ مانی۔ اس پس منظر میں آیات کا ربط دیکھیے؛

شمار	قصہ آدمؑ	سورۃ و آیت	قصہ بنی اسرائیل	سورۃ و آیت
۱	اذ قال ربك للملائكة انى جاعل فى الارض خليفة۔	البقرہ ۳۰	قال عسى ربكم ان يهلك عدوكم	الأعراف ۱۲۹
۲	قالوا اتجعل فيها من يفسد فيها و يسفك الدماء۔	البقرہ ۳۰	ثم انتم هولاء تقتلون انفسكم	البقرہ ۸۵
۳	واذ قلنا للملائكة اسجدوا لآدم	البقرہ ۳۴	واذ قلنا۔۔۔ وادخلوا الباب سجداً وقولوا حطة	البقرہ ۵۸
۴	فسجدوا الا ابليس	البقرہ ۳۴	فبدل الذين ظلموا قولاً غير الذى قيل لهم	البقرہ ۵۹
۵	ابى واستكبر	البقرہ ۳۴	افكلما جاءكم رسول بما لا تهوى انفسكم استكبرتم۔	البقرہ ۸۷
۶	وكان من الكافرين	البقرہ ۳۴	وآمنوا بما انزلت مصدقاً لما معكم ولا تكونوا اول كافر به	البقرہ ۴۱
۷	وقلنا يا آدم اسكن انت وزوجك الجنة	البقرہ ۳۵	واذ قلنا ادخلوا هذه القرية (الارض المقدسه) فكلوا منها حيث شئتم رغداً	البقرہ ۵۸ البقرہ ۵۸
۸	وكلا منها رغداً حيث شئتما	البقرہ ۳۵	ولا تعثوا فى الارض مفسدين	البقرہ ۶۰
۹	ولا تقربا هذه الشجرة	البقرہ ۳۵	ثم اتخذتم العجل من بعده وانتم ظالمون	البقرہ ۵۱

۱۰	فتکونا من الظالمین	البقرۃ ۳۵	واتبعوا ماتتلوا الشیاطین علی ملک سلیمان	البقرۃ ۱۰۲
۱۱	فازلھما الشیطان عنھا فاخرجھما مما کانا فیہ	البقرہ ۳۶	اھبطوا مصراً فأن لکم ما سألتم	البقرۃ ۶۱
۱۲	وقلنا اھبطوا	البقرۃ ۳۶	وضربت علیھم الذلۃ و المسکنۃ وباؤا بغضب من اللہ	البقرۃ ۶۱
۱۳	بعضکم لبعض عدو	البقرۃ ۳۶	قال فانھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ یتیھون فی الارض	المائدۃ ۲۶
۱۴	ولکم فی الارض	البقرۃ ۳۶	ثم عفونا عنکم من بعد ذلک لعلکم تشکرون	البقرۃ ۵۲
۱۵	فتلقّٰی آدم من ربہ کلمات فتاب علیہ	البقرہ ۳۷	فتاب علیکم انہ ھو التواب الرحیم	البقرۃ ۵۴
۱۶	انہ ھو التواب الرحیم	البقرۃ ۳۷	ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصاریٰ والصابئین من آمن باللہ والیوم الاخر و عمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون	البقرۃ ۶۲
۱۷	قلنا اھبطوا منھا جمیعا فاما یأتینکم منی ھدیً فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولاھم یحزنون	البقرۃ ۳۸		

۳۔ قصصِ بنی اسرائیل و آدمؑ وابراہیمؑ کے روابط :

تاریخ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی داستان بنی اسرائیل کے مانند واقعات حضرت آدم سے مسئلہ خلافت مطابقت رکھتے ہیں۔ دونوں میں نفی و اثبات کا فرق ہے اور انھیں نکات کو دونوں جگہ نمایاں درجہ حاصل ہے۔

واقعۂ آدمؑ میں، اللہ نے ملائکہ سے فرمایا" انی جاعل فی الارض خلیفۃ" میں زمین پر خلیفہ بنانے والا ہوں۔ ملائکہ نے عرض کیا" اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء"؟ خلافت ان میں قرار دی ہے جو زمین میں فساد و خوں ریزی کریں گے۔

اللہ نے جواب دیا، جو حقائق میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔

ماجرائے بنی اسرائیل میں خلیفہ زمین کے منفی پہلو ملاحظہ ہوں۔ اور واقعات ابراہیمؑ میں امامت کا اعلان و خطاب ابراہیمؑ کا، اسماعیل و سرور دو عالمؐ اپنی اولاد کے لیے درخواست پھر اس کا جواب۔ قصۂ آدمؑ کے" اِنّی اعلم ما لا تعلمون" کی تفصیل ملتی ہے۔

بنی اسرائیل	آلِ ابراہیمؑ
۱۔ قالوا اتجعل فیہا من یفسد فیہا و یسفک الدماء" سورۂ بقرہ کی تیسویں آیت میں ملائکہ نے بے تقویٰ اور مفسدین کی خلافت پر سوال اٹھایا ہے	اسی آیت میں" انّی اعلم ما لا تعلمون" تفصیلی جواب ہے اور تذکرۂ ابراہیمؑ میں متقین و صالحین کے مثالی کردار۔
۲۔ چوراسی اور پچاسی نمبر آیتوں میں بنی اسرائیل کی فساد انگیز و خون آشام تاریخ کا تعارف۔	سورۂ بقرہ ہی کی ایک سو چوبیس نمبر آیت میں ابراہیمؑ اور آل ابراہیمؑ کے حسن کردار و صلاحیت کا بیان ہے۔
۳۔ سورۂ مائدہ کی چوبیسویں آیت میں ہے کہ بنی اسرائیل امتحان میں ناکام ہوگئے انہوں نے کہا تھا" فاذہب انت وربک فقاتلا اِنا ھٰہنا قاعدون"	سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۴ میں امتحانات میں حضرت ابراہیمؑ کی کامیابیوں کا تذکرہ ہے: "واذ ابتلیٰ ابراہیم ربّہ بکلمات فأتمّھن" اس سلسلے میں حضرت آدمؑ کے اس امتحان کا تذکرہ بھی ملاحظہ ہو جس میں کلمات و اسماء کا ذکر ہے۔
۴۔ بنی اسرائیل ظالمین کے نمونے تھے آیت نمبر ۵۱، ۹۵ سورۂ بقرہ۔	حضرت ابراہیم علیہ السلام صالحین و عادلین کا نمونہ تھے۔ سورۂ بقرہ ۱۳۰
۵۔ بنی اسرائیل روحِ شیطانی نافرمانی و ظلم کے نمودار تھے: "…. ذٰلک بما عصوا و کانوا یعتدون" سورۂ بقرہ آیت ۶۱	" اذ قال لہٗ ربّہ اسلم قال: اسلمت لربّ العالمین" سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۱ ہے اور ابراہیمؑ و آل ابراہیمؑ کی فرماں برداری و اسلام کی نمود ہے۔

۶۔ "ولن یتمنوہ ابداً بما قدمت ایدیھم" (بقرہ/۹۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کو نہ اللہ سے محبت تھی نہ شہادت کا خیال۔

۷۔ بقرہ کی آیت ۶۱ : ۵ : اھبطوا مصراً ... وضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل امامت وخلافت کی اہلیت کھو چکی تھی۔

۸۔ آیات نمبر ۵۱ ، ۵۴ ، ۵۹ ، ۶۵ ، ۸۳ ، ۸۴ ، ۸۵ ، ۹۳ ، ۱۰۰ میں بنی اسرائیل کی عہد شکنی پر مذمت ہے۔

۹۔ بنی اسرائیل نے "باب" میں سر جھکانے کے بجائے بت پرستی کی اور اللہ کی بات بدل دی "وادخلوا الباب سجداً... فبدل الذین ظلموا" (آیت ۵۸ - ۵۹)

۱۰۔ سورۂ اعراف کی آیت ۱۳۸ میں ہے کہ بنی اسرائیل جاہل قوم تھی "انکم قوم تجھلون"

۱۱۔ "ثم قست قلوبکم من بعد ذلک" سورۂ بقرہ کی آیت ۷۴ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کے دل سخت اور عیب وار تھے۔

۱۲۔ انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل" سورۂ بقرہ کی آیت ۵۴ ہے جس نے

اس کے مقابلے میں "فلا تموتن الا وانتم مسلمون" (بقرہ/۱۳۲) سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد عشق الٰہی میں آخری سانس لینے کی آرزومند تھی۔

اسی سورے کی آیت ۱۲۵ : "قال انی جاعلک للناس اماماً" سند ہے کہ خلیل خدا نیز ان کی ذریت اہلیت خلافت زمین کے لیے مثالی حیثیت کی مالک تھی۔

آیت نمبر ۱۲۵ میں ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی عہد پورا کرنے کا بیان ہے "وعھدنا الی ابراھیم واسماعیل"

حضرت ابراہیم و اسماعیل نے "البیت" کو بتوں سے پاک کیا۔ توحید پرستی کو رواج دیا : "وعھدنا الی ابراھیم واسماعیل ان طھرا بیتی" بقرہ آیت ۱۲۵

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت ابراہیمؑ مثال علم وعقل تھی: "ومن یرغب عن ملۃ ابراھیم الا من سفہ نفسہ"

وان من شیعتہ لابراھیم اذ جاء ربہ بقلب سلیم" سورۂ صافات کی آیت ۸۴ بتاتی ہے کہ ابراہیمؑ و آل ابراہیم قلب سلیم کے مالک تھے۔

"تاللہ لاکیدن اصنامکم" سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۵۷ سے معلوم ہوا کہ خلیل اللہؑ

بتایا کہ بنی اسرائیل گوسالے کی پوجا کرتے اور بت بنلتے تھے۔

۱۳۔ سورۂ بقرہ کی اکسٹھویں آیت بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل نعمتوں کی ناقدری کرتے تھے
"أتستبدلون الذی ھوادنٰی بالذی ھوخیر"

۱۴۔ "ذلك بانھم کانوایکفرون بآیات الله" (بقرہ/۶۱)
بنی اسرائیل آیات الٰہی کے منکر قرار دیئے گئے ہیں۔

(دآل خلیل) کا عمل بت شکنی ہے۔

سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۲۱ میں ابراہیمؑ کو نعمتوں پر شکر گذار قرار دیا گیا ہے:
"شاکراً لانعمه"

"انه من عبادنا المؤمنین" سورۂ الصافات/۱۱۱ میں حضرت ابراہیمؑ کو مومن باللہ کے عنوان سے یاد فرمایا ہے۔

۴۔ دونوں ملتوں کے تقابل کا مقصد

اس تقابل کا مقصد گزشتہ قوموں کی زندگی سے اسباق حاصل کرنا ہے۔ ایک اور بات جو سامنے آتی ہے وہ یہودیوں کی قوم پرستی اور خود پسندی ہے جسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسترد فرمایا، یہودی کھلم کھلا یہ چاہتے تھے کہ سب ان کی پیروی کریں: "ولن ترضیٰ عنك الیھود ولاالنصاریٰ حتیٰ تتبع ملتھم"۔ بقرہ/۱۲۰۔
ان کا دعویٰ تھا کہ جنت میں یہودی ہی جائیں گے، بہت ہوا تو نصاریٰ بھی جا سکیں گے؛
"لن یدخل الجنة الامن کان ھوداً اونصاریٰ" البقرہ۔ ۱۱۱

تقابلی مطالعے سے یہ نتیجہ بھی حاصل ہوا کہ بنی اسرائیل خلافت و امامت کے لائق نہیں ہیں کیونکہ اسی سورے کی آیت ۱۲۴ میں کلیہ ارشاد فرمایا ہے: "لاینال عھدی الظالمین" اور بنی اسرائیل ظالم ہیں۔

سنتِ ابراہیمی کے پیرو کار جن کے رسولؐ نتیجۂ دعاء خلیل اللہ ہیں۔ دیکھیے البقرہ آیات ۱۲۹ــ ۱۴۲، مسلمان امامت و خلافت کے زیادہ حقدار ہیں۔ اسی بنا پر ان کا قبلہ بدل گیا۔ آیات ۱۴۲، ۱۴۳۔

آیات نمبر ۱۰۴ ــ ۱۱۰ میں ایسے امور بیان ہوئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل سے خلافت مسلمانوں کو منتقل فرمادی ہے۔

۵۔ شجر ممنوع۔ حدود کی پابندی اور تقوے کا ربط:

اللہ عزاسمہ نے امتوں کو زمین کا وارث بنایا معین عہد و پیمان اور شرائط کی پابندی کے بعد خلافت کا شرف بخشا۔ جیسے حضرت آدمؑ کو جنت میں اس شرط سے رہنے کی اجازت دی تھی کہ " ولا تقربا هذه الشجرة "یہی شرط آج تک مسلمانوں پر عائد ہے" تلك حدود الله فلا تقربوها " (بقرہ / ۱۸۷)

سورۂ بقرہ میں تقریباً پانچ سو احکام و حدود بیان ہوئے ہیں۔ کلمۂ "حدود" سورۂ بقرہ میں کم و بیش سات اور النساء، النور، المجادلہ والطلاق میں سات جگہ استعمال ہوا ہے۔ حدود سے تجاوز ممنوع ہے۔ ان کی مخالفت سے بچنے کا حکم ہے۔ محرمات بجالانے کی سخت سزا بلکہ اسے ظلم قرار دیا ہے۔ اس بچاؤ کا نام تقویٰ ہے اور تقوے سے آراستہ لوگوں کو اچھے نتائج کی خوش خبری دی ہے" والعاقبة للمتقين "۔

۱۔ شجر ممنوع سے محرمات الہی مراد لیے جاسکتے ہیں۔

۲۔ شجر ممنوع، کانٹوں سے لدا ہوا ہے اس سے بچنا تقویٰ ہے۔

۳۔ اس درخت سے قربت نفس پر ظلم اور جنت سے نکلنا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدود، شجر ممنوع ملتی جلتی تعبیریں ہیں اس سے قریب جانا ظلم اور بچنا تقویٰ ہے۔

۴۔ تقویٰ جنت میں داخل ہونے اور رہنے کا سبب ہے۔

جیسے ممالک کی سرحدیں ہوتی ہیں جن سے ایک ملک کا رہنے والا عبور نہیں کرسکتا کبھی کبھی ان سرحدوں پر بجلی کے تار اور خاردار حد بندیاں ہوتی ہیں کہ ان سے قریب جانا خطرناک ہوتا ہے۔ حدود اللہ اسی طرح کی چیز محسوس ہوتی ہے۔ اس حدود سے بچنے کو بھی قرآن نے تقویٰ کہا ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۸۷ ہے:

"تلك حدود الله فلا تقربوها كذلك يبين الله آياته للناس لعلهم يتقون"

"یہ اللہ کے حدود ہیں تو ان کے قریب نہ جانا۔ اللہ اپنی آیتیں لوگوں پر اسی طرح واضح کرتا ہے تاکہ لوگ "تقویٰ" اختیار کریں۔

- اور جو شخص حدود الٰہی سے تجاوز کرے گا اور اس شجر ممنوع کے قریب جائے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا:

"تلك حدود الله فلا تعتدوها ومن يتعد حدود الله فاولئك هم الظالمون" (البقرہ / ۲۲۹)

یہ اللہ کی سرحدیں ہیں ان کے آگے نہ بڑھنا اور جو بھی اللہ کی سرحدوں سے تجاوز کرے گا وہ ظالموں میں ہوگا۔

- حدود الٰہیہ سے بچنا (تقویٰ) جنت کی ضمانت اور بڑی کامیابی کی سند ہے۔

"تلك حدود الله ومن يطع الله ورسوله يدخله جنات تجري من تحتها الانهار خالدين فيها وذلك الفوز العظيم"

یہ اللہ کی سرحدیں ہیں، اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کا فرماں بردار ہوگا اللہ اسے اس جنت میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں وہ لوگ ہمیشہ رہیں گے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ (النساء/۱۳)

- ان حدود سے تجاوز عدم تقویٰ اور خلود فی النار ہے۔

"ومن يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين"

اور جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود سے آگے بڑھے گا وہ جہنم میں داخل کیا جائے گا اسی میں ہمیشہ رہے گا، اور اسے رسوا کن عذاب ہوگا (النساء/۱۴)

۶۔ سورۂ بقرہ کے آیات ومطالب کا تناظر فہرست مطالب ونشان آیات

موضوعات	آیات
• تقویٰ اور نیکوکاری۔	۱ ـ ۲
• موضوعات سورۂ بقرہ۔	
• ہدایت کے مقابلے میں انسانوں کے گروہ۔	
الف۔ متقی	۳ ـ ۵
ب ۔ کافر	۶ ـ ۷
ج ۔ منافق	۸ ـ ۲۰

حصۂ اول

راہ تقویٰ اور سرگذشت آدمؑ — زمین پر اللہ کے خلیفہ

پہلی فصل: تقویٰ مختصر راستہ

۱۔ توحید در عبادت	۲۱
۲۔ فطرت واجزاء کائنات میں ہم آہنگی توحید باری کی دلیل ہے۔	۲۲
۳۔ انبیاء اور کتاب اللہ پر ایمان۔	۲۳-۲۴
۴۔ ایمان وعمل صالح	۲۵
۵۔ فاسق	۲۶ ـ ۲۷
۶۔ ہدایت وضلالت	۲۶

دوسری فصل: تخلیق آدمؑ، اللہ کی نعمتیں۔

۱۔ نعمتِ حیات۔	۲۸
۲۔ نعمتِ زمین۔	۲۹
۳۔ نعمتِ آسمان۔	۲۹

حصّہ دوم

بنی اسرائیل تقوے سے دور اور خلافتِ زمین کے لیے نااہل تھے۔

تفسیر "من یفسد فیہا و یسفک الدماء"

چوتھی فصل: بنی اسرائیل کی عہد شکنی و تکبّر:

پانچویں فصل: خلافت، بنی اسرائیل سے مسلمانوں کو منتقل ہو گئی۔

چھٹی فصل: یہودیوں کے جاہلانہ تعصبات و توقعات۔

تیسرا حصہ

خلافت و امامت کے لیے خاندان ابراہیمؑ تقوے اور اہلیت کی مثال

تفسیر: انی اعلم ما لا تعلمون۔

پہلی فصل: واقعاتِ آدمؑ و بنی اسرائیل و ابراہیمؑ و پیغمبر اسلام کا باہمی ربط۔

دوسری فصل: ادیان کے اصول اور ان کی باہمی ہم آہنگی۔

تیسری فصل: مسلمانوں کا استقلال:

چوتھی فصل: احکام و میثاق اہلِ اسلام:

چوتھا حصّہ

تقویٰ کی سرحدیں اور تفسیر۔ "ولاتقربا ھذہ الشجرۃ"

پانچواں حصہ

تقویٰ مزاج افراد کے لیے احکام اور الہی سرحدیں۔ اور تفسیر "ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین"

چھٹا حصّہ

برّ و تقویٰ کی تین قسموں کے بارے میں توضیحات

پہلی فصل: برّ و تقویٰ در عمل ۔ جنگ ۔

دوسری فصل: برّ و تقویٰ ۔ عقیدۂ توحید میں ۔

تیسری فصل: برّ و تقویٰ ۔ عقیدۂ قیامت میں ۔

چوتھی فصل : بر و تقویٰ اخلاق ۔ انفاق میں ۔

پانچویں فصل تقویٰ اور پرہیزگاری ۔ ربا سے ۔

جناب محمد علی تسخیری

ترجمہ: جناب خادم حسین ام۔اے علیگ

قرآن کی روشنی میں بین الاقوامی تعلقات

قرآن مجید میں "بین الاقوامی تعلقات و روابط" کی جستجو سے پہلے ایسے چند نکات پر نظر ڈالنا ضروری ہے جن کا تعلق موضوع بحث سے بہ راہ راست ہے۔

(۱) اس بحث سے مطلب کیا ہے؟ اسلام وہ دین ہے جو محض فرد اور معاشرے کی زندگی کے ان پہلوؤں کو منظم کرتا ہے جن کا تعلق بہ راہ راست فرد سے ہوتا ہے۔ بین الاقوامی تو کیا معاشرے میں موجود تعلقات سے بھی اس کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اس بنا پر ہمیں فی الحال کچھ نہ کہنا چاہئے، چونکہ اس شبہ کا جواب مل چکا ہے اور یہ تصور، غلط مان لیا مل گیا ہے یہاں تک کہ اسلام سے بے خبر افراد نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ یہ شبہ مغربی طرز فکر اور گرجا گھروں کی دین تھا۔ یہ شبہ پیدا اسی لیے ہوا کہ ان لوگوں نے اسلام کو ایک شخصی مسئلے اور نجی حیثیت سے دیکھا تھا۔ اگر یہ لوگ مذہبی آزادی پر یقین رکھیں جواب تک انھیں حاصل نہیں۔ تو یقیناً اسے بھی شخصی امور میں شمار کریں۔ اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ "جان جاک روسو" دینی قوانین کو ضروریات زندگی پوری کرتے برداشت نہیں کر سکتا، اسی وجہ سے وہ دینی و انتظامی قوانین و مقررات کے درمیان تصادم و تضاد کا قائل نظر آتا ہے، تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ تصور بھی گرجا گھروں کے مفروضات میں سے ایک ہے۔ ان لوگوں کو

یقین رکھنا چاہیے کہ حقیقی اسلام کی رو سے، کائنات، انسان اور زندگی کے سلسلے میں دین کا ایک خاص موقف ہے۔ دین، انسانی جذبات کا وہ مرکز ہے جو انسانی رفتار کی مختلف جہتوں میں رونمائی کرسکتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ اسلامی تعلیمات کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس میں معاشرتی پہلو کا حصہ زیادہ ملے گا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ شخصی طرز زندگی کو اعلیٰ ترین الٰہی اہداف کے ساتھ معاشرتی زندگی میں پورے طور پر جذب ہونے کے بعد ہی معین کیا جا سکتا ہے۔ سردست اس غلط فہمی کے غلط ہونے کی طرف محض اشارہ کرنا مقصود تھا۔ اسلام میں معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں یہاں کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔

(۲) جب ہم اسلام میں موجود معاشرتی زندگی کی اعلیٰ قدروں کا جائزہ لیتے اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ اعلیٰ اقدار کن بنیادوں پر قائم ہیں۔ تو ہمیں بنیادی چیز برابری و مساوات نظر آتی ہے جو ذرا بڑھ کر الفت و محبت اور مزید ارتقا کے نتیجہ میں ایثار و قربانی سے بدل جاتی ہے۔

اگر ہم عدل کے صحیح مفہوم کو سمجھنا چاہیں تو کمیت یا تعداد معلوم کرنے والے آلات۔ ترازو یا پیمانوں کے ذریعے نہیں سمجھ سکتے اور اگر اس قسم کی کوشش کی جائے گی تو ادراک حقیقت کی راہ بند ملے گی عدل کی حقیقت صرف اس صورت میں سمجھنا ممکن ہے جب الٰہی حقائق پر ایمان کامل ہو۔ وہ حقیقت جو ہر شئی کی مالک ہے، جس نے ہر شئی کو کائنات میں شرف وجود بخشا اور دنیا میں عدل وانصاف پر قائم رہنے کی ہدایت دی۔ یا پھر اس صورت میں عدالت کے مفہوم کو سمجھ سکتے ہیں جبکہ اپنے ایمان کو انسانی فطرت اور اس فطرت کو اس کی حقیقی رفتار کی بنیادوں پر استوار کریں۔ کیونکہ ہر وہ شئی جو اپنی فطری اور مناسب جگہ پر قرار پا کر ارتقا کی منزلیں طے کرے "عدل" ہے، اور ہر وہ عمل جو طبیعت کے تقاضوں کے خلاف ہو "ظلم" محسوب ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ خود فطرت میں ایک ایسی طاقت مضمر ہے جو عدل کی موافق اور ظلم وستم کی مخالف ہے۔ دوسرے الفاظ میں فطرت کو ظلم و عدل کے مظاہر کو پہچاننے اور اس کے مفہوم کو معین کرنے کا ملکہ سپرد کیا گیا ہے۔

(۳) عدالت کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت۔ قانون سازی میں انسانی پہلو کا

لحاظ رکھنا ہے۔ قانون سازی میں انسانی پہلو کو ملحوظ رکھنے والی خصوصیت معلوم کرنے کی غرض سے اسلامی شریعت و احکام پر مجمل نظر ڈالنا کافی ہے۔ چونکہ انسانی پہلو قانون ساز کا مطمح نظر رہا ہے خصوصاً فطرت اور اس سے ہم آہنگی پر اصرار۔ اس لیے محسوس ہوتا ہے کہ قانون انسانی ہے پھر، یہ بات ہم سب ہی جانتے ہیں کہ انسانی پہلو کا لحاظ ہی فطرت سے ہم آہنگی ہے۔

قرآن مجید پوری صراحت کے ساتھ اس بات پر زور دیتا ہے کہ بشریت تمدن کی مشکلات میں پڑنے اور فردی و اجتماعی فلاح و بہبود کی راہیں تلاش کرنے سے پہلے ایک سادہ و فطری زندگی سے ہمکنار تھی۔ لیکن جب مشکلات پیش آنے لگیں تو اللہ نے پیغمبروں کو بھیجا کہ وہ انسانوں کو راہِ فطرت کی ہدایت کریں۔

اس حقیقت کے ساتھ قرآن مجید نے دوسری حقیقت پر بھی زور دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ جس فرق کو لوگ جھوٹی فضیلت و برتری کا سبب تصور کرتے ہیں۔ دراصل وہی فرق قوموں، معاشروں اور تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور متعارف کرانے کا آسان ذریعہ رہا ہے۔ درحقیقت یہی وہ مناسب زمین ہے جس پر معاشرے میں صحیح و سالم تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک فطری امتیاز و برتری کی بات ہے۔ اس کی بنیاد تقویٰ پر ہوگی۔ اس سلسلے میں مزید توضیح آگے پیش کریں گے۔

(۴) اسلام ایک فطری دین ہے۔ اس میں انسانی پہلو پر زور دیا گیا ہے، اگر اسلامی منصوبہ سازی کو تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو اس میں زمان کی رعایت اور عوامل تفرقہ جیسے مکان، زبان، رنگ، نسلی امتیاز اور ہر طرح کے انحرافات سے دوری نظر آتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ولی امر کو عوامی مفادات اور زمان و مکان کے پیش نظر مشورہ کر کے قوانین و مقررات وضع کرنے کی جو آزادی ہے، اس کی مثال کسی دوسرے نظام کی منصوبہ سازی میں نہیں ملتی۔ لہٰذا بین الاقوامی تعلقات عامہ کے بارے میں اسلام کا موقف جاننے کے لیے مذکورہ پہلو کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔

(۵) یہ بات مسلم ہے کہ قرآن مجید بذات خود تمام قوانین کا مجموعہ ہے۔ لیکن حالات و اسباب نزول کا مطالعہ و لحاظ ہر آیت کی تفسیر میں بہت زیادہ فوائد رکھتا ہے۔ اسی طرح

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اصحاب اور صدر اسلام کے مسلمانوں کی رفتار و سیرت معصوم کی تائید کو ظاہر کرنے میں مؤثر و مفید ہے۔ درحقیقت یہ وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ اسلامی مفاہیم اور علوم پر ایک نئے انداز میں روشنی ڈالی جا سکتی ہے اور متن قرآن بنیادی اصل کے طور پر محفوظ رہتا ہے۔

(۶) اس مقدمہ کے اختتام پر یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ ہم اس مقالہ میں صرف اسلام کی رو سے بین الاقوامی تعلقات کو زیر بحث لانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن کس حد تک اسے عملی شکل دے سکتے ہیں؟ یا خاص حالات میں ایک پہلو دوسرے پہلو پر کس حد تک فوقیت حاصل کر سکتا ہے؟ اور اس کے مقابلے میں ردّ عمل کو مختلف حالات میں کس طرح روکا جا سکتا ہے؟ اس مسائل کا تمام اُن مسائل میں ہوتا ہے، جن کے بارے میں اسلامی ملکوں کے سربراہوں کو موجودہ حالات کے پیش نظر غور و فکر کر کے حل تلاش کرنا ضروری ہیں۔ ان معاملات کا تعلق عملی و نفاذی مرحلے سے ہے۔

۲۔ اسلام اور عالمی حکومت

شاید عالمی حکومت قائم کرنے کی دعوت اسلام یا کم سے کم مسلمان علماء و فقہاء کی ذمہ داریوں میں سے ایک ذمہ داری ہے۔

اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی خاص جغرافیائی علاقے میں محدود نہیں۔ وہ ہمہ گیر ہے، دنیا کے تمام افراد کے لئے ہے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسے دخل حاصل ہے اور یہی وہ واحد دین ہے جو انسانیت کے قافلے کو ارتقا کی اعلیٰ منزلوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ زندگی کا واحد بے خطر راستہ ہے جس کی بنیاد غیر محدود الٰہی علم اور خالق کون و مکان کی حکمت آمیز منصوبہ سازی پر مبنی ہے۔

اسلام دین حیات ہے، حیات کا محور معاشرہ ہے اور کوئی معاشرہ بغیر حکومت کے قائم نہیں رہ سکتا۔ اسلام متحدہ عالمی حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتا ہے تاکہ پوری دنیا میں صرف اللہ کا دین حاکم رہے۔

اسلام وہ پیام ہے جس نے تمام دوسری شریعتوں کو منسوخ اور اپنی شریعت کے ثابت اصول و نظریات پر زور دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ تمام شریعتوں کا عکس اور تمام انسانی

فلاح وبہبود اسی شریعت میں موجود ہے ۔ لوگوں نے یہ بات تسلیم بھی کی ہے ۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایک قبیلے، گروہ، فرقہ یا کسی خاص جغرافیائی علاقے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ وہ خالق بشریت کی جانب سے تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے تھے۔

یاایھاالناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعاً (الاعراف/آیت ۱۵۸)

"اے لوگو! میں تم سب کے پاس خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں ۔"

ارشاد ہوتا ہے :

وماارسلناک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً (سورہ سبا/۲۸)

اے رسولؐ ہم نے تم کو دنیا کے لوگوں کے لیے (نیکوں کو بہشت کی) خوش خبری دینے والا اور (بدوں کو عذاب سے) ڈرانیوالا (پیغمبر) بناکر بھیجا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری دنیا کے باشندوں کو اسلام کی دعوت دی۔ آنحضرتؐ نے بڑے بڑے حکمرانوں کو قبول اسلام کے لیے خطوط لکھے انہوں نے اسلام کی آفاقیت کا اعلان اس وقت کیا، جب خود مکہ کے اندر تحریک پوری طرح بارور نہیں ہوئی تھی درج ذیل آیت مذکورہ بیان کی تائید کرتی ہے :

وان یکاد الذین کفروا لیزلقونک بابصارھم لما سمعوا الذکر ویقولون انہ لمجنون وماھو الاذکر للعالمین۔ (القلم/۵۱-۵۲)

اور کفار جب قرآن کو سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ تمہیں گھور گھور کر (راہ راست سے) ضرور منحرف کردیں گے، اور کہتے ہیں کہ یہ تو سڑی ہے - اور (یہ قرآن) تو سارے جہان کی نصیحت ہے۔

مذکورہ بالا آیت کا مضمون رسول اکرم صلی اللہ والہ وسلم نے ایک خط میں لکھ کر خسرو پرویز "کسریٰ" کو بھی روانہ کیا ۔خط کا مضمون درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم - من محمد رسول اللہ الی کسریٰ عظیم فارس سلام علی من اتبع الھدیٰ، وآمن باللہ ورسولہ، واشھد ان لاالہ الااللہ، وحدہ لاشریک لہ، وان محمداً عبدہ ورسولہ

ادعوک بدعایۃ الاسلام ، فانی انا رسول اللہ الی الناس کافۃ ، لانذر من کان حیا ویحق القول علی الکافرین ، اسلم تسلم فان ابیت فعلیک اثم المجوس۔[1]

"...... سلام اُن پر جنہوں نے ہدایت کی پیروی کی، اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے، سلام ان پر جو خدا کے سوا کسی غیر کی پرستش نہیں کرتے، اس کو وحدہ لاشریک اور محمدؐ کو خدا کا بندہ و رسول مانتے ہیں۔ میں تم کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں، میں خدا کی طرف سے تمام لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجا ہوا نبی ہوں، تاکہ زندہ افراد کو خدا کا خوف دلاؤں اور کافروں پر اتمام حجت کروں۔ بھلائی چاہتے ہو تو اسلام قبول کر لو ورنہ تمہیں اپنی قوم۔ مجوس۔ کے گناہوں کا بوجھ اٹھانا ہوگا۔"

بین الاقوامی حکومت عدل کے یوم موعود کی خبر تمام پیغمبروں نے دی ہے وہ دن جب اللہ کا دین پوری دنیا پر حاکم اور حضرت صاحب العصر والزمان علیہ السلام کا ظہور ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک آفاقی نظام ہے اور عالمی حکومت کی نوید اس کا نتیجہ، اسلامی قوانین کے کسی بھی حصّے پر غور کر کے دیکھ لیں، اس کا ہر حصّہ انسانیت پر زور دیتا ہوا نظر آئے گا۔ اس لیے کہ وہ کسی خاص رنگ، زمان و مکان یا قوم و قبیلہ سے مخصوص نہیں یہ تمام باتیں بذات خود واضح ہیں اور مزید بحث کی ضرورت نہیں۔

لیکن یہاں جس بات پر خاص توجہ دلانا ہے وہ ہے ـ" اسلام کی آفاقیت"۔ اسلام کا مزاج آفاقی ہے۔ کیونکہ دوسرے نظاموں کے برعکس اسلام کا ڈھانچہ اپنی بنیاد سے مختلف نہیں ہے۔ اسلام کے مقابلے میں جب کسی ایک کے عالمی ہونے کے دعوے پر غور کریں تو فوراً ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کونسی چیز ہے جو حکمراں طبقے کو اپنے نظام حکومت کی توسیع اور عالمی شکل دینے پر توجہ دلاتی ہے؟ اور کس نے انہیں یہ ذمّہ داری سونپی ہے؟ مادیت کے سب سے بڑے مکتب فکر یعنی مارکس ازم کا جائزہ لے کر دیکھیں تو اس میں بھی بنیاد اور ڈھانچے میں اختلاف نظر آئے گا۔ اور اگر بالفرض ـ اختلاف نہ ہونے کا دعویٰ تسلیم بھی کر لیں ـ نیز ناقابل نظر انداز منطقی بحثوں کو بھی چھوڑ دیں۔ جب بھی یہ کہنا

پڑے گا کہ ایسا ڈائیلکٹیکل قانون دنیا میں نہیں ملے گا جو کسی ایک گروہ یا قوم کی حکومت کو پوری دنیا پر مسلط کر سکے۔ اس لیے کہ مختلف قوموں کے قوانین بھی مختلف ہوتے ہیں پھر یہ کہ تمام قومیں ایک جیسی اقتصادی حالت سے بہرہ ور نہیں ہوتیں ان کے معاشرتی تعلقات ایک دوسرے سے جدا اور بہت ہی پیچیدہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مارکسیسٹ جب کبھی عالمی حکومت کا اعلان کرتے ہیں۔ تو اپنے نظریات پر ان کا پورا بھروسہ ظاہر نہیں ہوتا۔

سرمایہ داری نظام اس سے بھی گیا گذرا ہے، جب وہ اپنے نظام ہی کے لیے فلسفی بنیادیں وضع نہیں کر سکا تو عالمی حکومت کی تشکیل کے لیے کون سے منصوبے پیش کر سکتا ہے۔

ان سب نظریات و افکار کے مقابلے میں۔ بلکہ براہ راست اسلام کی آفاقیت کا مطالعہ کرنے کے لیے دیکھیے:

۱۔ انسان کے خالق اور اس کے مالک مطلق کی طرف سے اسلام پوری انسانیت کے لیے ایک پیام اور ارتقا کا بہترین وسیلہ ہے۔

۲۔ اسلام دین فطرت ہے، اور فطرت نہ صرف یہ کہ ایک سے دوسرے انسان میں نہیں بدلتی بلکہ دوسری چیزوں پر اس کی برتری بھی ثابت کرتی ہے۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایک قوم یا فرقے سے مخصوص نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام تمام انسانیت سے بات کرتا اور آفاق پر غلبہ رکھتا ہے۔ فی الحال ہمارا مقصد صرف انہیں باتوں کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ ضمناً یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اسلامی نقطہ نظر کا دوسرے نقطہ ہائے نظر سے موازنہ کرنا ممکن ہے۔ اسلام ایک الٰہی مشن ہے، وہ کسی گورے انسان کی تاریخ و تہذیب یا فرضی معبودوں کا پیام نہیں جسے استعماری عقل نے قوموں کی ثروت و دولت ہڑپ کرنے کے لیے تیار کیا ہو۔

اسلام کے نزدیک ہر انسان کو دلیل معلوم کرنے کا حق ہے۔ ہاں، قبول کر لینے کے بعد حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا۔

بہرحال؛

اگر بین الاقوامی اسلامی حکومت کا خواب پورا ہو جائے (جو انشاء اللہ پورا ہوگا) تو بین الاقوامی تعلقات کے بارے میں گفتگو اور بحث کرنے کی گنجائش نہ رہے گی۔ اس وقت صرف متحدہ اسلامی حکومت میں موجود مختلف طبقوں کے تعلقات پر غور کرنا ہوگا جو بشریت کی رو سے فطری اور بنیادی چیز ہے۔

اسلام کا ایک مقصد یہ ہے کہ کرۂ زمین توحید کے محور (کعبہ) پر گردش کرے، جس طرح سے پوری کائنات عرش کے چاروں طرف گردش کرتی ہے۔ اس طرح کی تعبیروں کا مطالعہ حضرت علی علیہ السلام کے خطبوں میں کیا جا سکتا ہے، جہاں وہ کعبہ کا طواف کرنے والوں کو عرش کا طواف کرنے والوں سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"واختار من خلقه سُمّاعًا، اجابوا الیه دعوته وصدّقوا کلمته، ووقفوا مواقف انبیائه وتشبّهوا بملائکته المطیفین بعرشه" (نہج البلاغہ / ص ۴۵)

اس نے (خدا نے) اپنی مخلوقات میں اُن فرمانبردار افراد کو منتخب کیا، جنہوں نے:
اس کی دعوت قبول کی
اس کی باتوں کو تسلیم کیا
اس کے پیغمبروں کا موقف اختیار کیا
اور خود کو عرش کا طواف کرنے والے ملائکہ کی صفت سے آراستہ کیا۔

۳۔ تقسیم، ایک استثنائی صورت ہے:

تقسیم کے سلسلے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ پوری دنیا کو دو حصوں میں بانٹ دیا جائے، ایک حصہ دار الاسلام اور دوسرا دار الکفر۔ اس طرح سے دارین کا درمیانی حصہ اسلامی حکومت کا حصہ قرار پاتا ہے۔

استاد شہید عبد القادر عودۃ لکھتے ہیں:

الاصل فی الشریعۃ الاسلامیۃ انها شریعۃ عالمیۃ لامکانیۃ

".... ولكن لما كان الناس جميعاً لا يؤمنون بها ولا يمكن فرضها عليهم فرضاً، فقد قضت ظروف الامكان، ان لا تطبق الشريعة الا على البلاد التى يدخلها سلطان المسلمين، دون غيرها من البلاد."

دراصل اسلامی شریعت، علاقائی نہیں، عالمی ہے، لیکن جب دنیا کے تمام لوگ اس پر ایمان نہ لائیں تو شریعت ان پر زبردستی تھوپی نہیں جا سکتی حالات کے پیش نظر اس کا نفاذ انھیں علاقوں اور ملکوں میں ہو سکے گا جہاں مسلمان۔ فاتح کے طور پر داخل ہوں لہذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں: علمی نقطۂ نظر سے اسلامی شریعت بنیادی طور پر ایک عالمی شریعت ہے لیکن عمل درآمد اور عملی نقطۂ نظر سے وہی شریعت علاقائی شریعت نظر آتی ہے۔ (التشریع الجنائی طبع طہران، ص ۲۸۰)

اس اعتبار سے دار الاسلام میں ہر وہ ملک شامل ہے، جس میں اکثریت یا حکومت مسلمانوں کی ہو۔

لیکن دار الکفر بذات خود دو حصوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ دار الحرب ۲۔ دار العہد

اسلام کا دار الحرب سے تعلق، انسانی سلوک و ہمدردی کے دائرے سے خارج ہوئے بغیر، جنگ کے تقاضوں پر مبنی ہے۔

جب کہ دار العہد میں غیر مسلم افراد کے ساتھ سلوک و رفتار کے عام قوانین و مقررات کے علاوہ عہد و پیمان کے اُن تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا جائے گا، جن پر اسلام نے زور دیا ہے۔ قرآن مجید پوری وضاحت کے ساتھ اُن عہدوں کو برقرار رکھنے کا حکم دیتا ہے، جن کی شرطیں پوری ہو چکی ہوں۔

واوفوا بالعہد ان العہد کان مسئولا (الاسراء/۳۴)

اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (قیامت میں) عہد کی ضرور پوچھ گچھ ہوگی۔

اسلامی خارجی سیاست درج ذیل دو بنیادوں پر مستحکم ہے۔

۱۔ موجودہ صورتحال کے پیش نظر اسلام کی بلند پایہ مصلحت۔

۲۔ وہ تعلقات جو محبت والفت، انسان دوستی اور اخلاقی بنیادوں پر مستحکم ہوں۔
اسلامی شریعت کے اصل ماخذ یہی دو ہیں۔
درحقیقت اسلامی احکام و قوانین کے ہر پہلو میں، طلب حقیقت وفضیلت کا جوہر بڑی اہمیت رکھتا ہے جس چیز کے بارے میں آگے بیان کرنا ہے اس کی بنیاد بھی انہی دو چیزوں پر مبنی ہے۔
لیکن اپنے تجزیہ و تحلیل میں جن نکات پر زیادہ زور دینا چاہتا ہوں۔ وہ ہیں:
۱۔ امت اسلامیہ کو انسانی معاشرے میں دوسری ملتوں کے لئے نمونہ و مثال بنانے کی کوشش۔
قرآن مجید جس امت اسلامیہ کا ذکر کرتا ہے وہ امت وسطیٰ ہے اور وسطیٰ سے مراد "اعلیٰ نمونہ" ہے، جیسے موتیوں کی لڑی میں سب سے بڑے اور قیمتی درمیانی موتی جو قدر و قیمت کے اعتبار سے دوسرے موتیوں پر بھاری ہوتا ہے۔
"لتکونوا شہداء علی الناس" کی رو سے یہی امت شاہد ہے اور یہی دوسری اُمتوں میں سب سے بہتر ہے۔ "خیر امۃ اخرجت للناس" لھذا اسلامی خارجہ سیاست یا دوسرے مراحل میں تمام مقاصد حاصل کرنے کے لیے داخلی سیاست سے ہم آہنگی ضروری ہے۔ یہی امتیاز امت کو کسی نہ کسی طرح دوسروں کے تجربوں سے با اصول فائدہ اٹھانے کی طرف متوجہ کرتی ہے۔
امت اسلامیہ کے مثالی ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں سربلندی حاصل کر کے انسانی تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کا عمل بحسن وخوبی انجام دے سکے۔
ہم یہ بات کہتے ہوئے اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کرتے کہ امت کو جس منزل پر ہونا چاہئے، متعدد وجوہ کی بنا پر اس سے کافی دور ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ منزل مقصود تک رسائی کی کوششیں چھوڑ دے اور خاص طور پر جب یہ معلوم ہو کہ بین الاقوامی تعلقات قائم کرنا اور بین الاقوامی طور حرکت و اقدامات کا یہی وقت ہے۔
۲ تعلقات عامہ کے اصول:
عام طور پر ہر سیاسی جماعت کا لائحہ عمل کچھ اصول وضوابط پر مبنی ہوتا ہے، خواہ وہ اس کا داخلی نظام ہو یا خارجی۔

اسلامی حکومت، بنیادی اعتبار سے ایک نظریاتی و اصولی حکومت ہے، وہ انسانی زندگی کے انفرادی و معاشرتی تمام منصوبے اپنے خاص اصولوں کی بنیاد پر تیار کرتی ہے۔
وہ دوسروں سے اسی حد تک دور یا نزدیک ہوتی ہے جس حد تک وہ اس کے اصول سے دور یا نزدیک ہوں، غرض یہ کہ اسلامی حکومت اصول سے ہٹ کر تعلقات قائم نہیں کرتی، اس لئے اصول کی روشنی میں ہی بین الاقوامی تعلقات معین کئے جا سکتے ہیں یعنی وہ روابط کس طرح کے ہوں؟ بنیادی طور پر اچھے ہوں؟ دوستانہ ہوں یا خراب ہوں؟
برادرانہ تعلقات: یہ تعلقات ایمان کی بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں، اور زندگی کے ہر شعبہ میں ایمانی اخوت اور بھائی چارگی کی نشاندہی کرتے ہیں، لہٰذا جو لوگ ایمان کی دولت سے عاری ہیں ان سے اس قسم کے تعلقات قائم نہیں جا سکتے۔
۳ کافروں کی بالادستی کا سدباب: مسلمانوں پر کافروں کی برتری کا سدباب خارجہ سیاست کے اصولوں میں سب سے اہم اصول ہے اور اسے ایک حیثیت سے پہلے ضابطے کا تتمہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ضابطہ اسلام اور مسلمانوں کی برتری کو دوسرے نظریاتی گروہوں پر ظاہر کرتا اور مسلمانوں کی اس عظمت کی نشاندہی کرتا ہے جس کے بارے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اس قاعدے کی رو سے ہر وہ قرارداد یا کام، جس کے ذریعہ کافروں کو مسلمانوں پر برتری حاصل ہو بنیادی طور پر غلط ہوگا۔ فقہاء کا کہنا ہے کہ یہ قاعدہ "لاضرر ولا ضرار فی الاسلام" اور "نفی العسر والحرج" کی طرح ثانوی حیثیت رکھتا ہے، اور حکم جہاد (جس میں بنیادی طور پر ایک معین ہدف تک رسائی کے لئے نقصان کا متحمل ہونا لازمی ہے) کے سوا باقی تمام دوسرے احکام پر حکم فرما ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ درج ذیل دلائل کی رو سے درست مانا جاتا ہے۔
(الف) ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا" (النساء/۱۴۱)
اور خدا ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دے گا۔
(ب) وہ احادیث جو بعض حالتوں میں اصول و قانون و کلیہ بتاتی ہے۔ بعنوان مثال

"من لایحضرہ الفقیہ" کی حدیث:

"الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علیہ والکفار بمنزلۃ الموتیٰ، لایحجبون ولا یورثون" (من لا یحضرہ ج ۴)

اسلام دین فضیلت و برتری ہے، اس پر کسی چیز کو فوقیت حاصل نہیں ہو سکتی اور کافروں کی حیثیت مردوں کی ہے، جو میراث میں نہ حاجب ہو سکتے ہیں نہ وارث۔

(ج) اس کی تائید اجماع فقہا سے بھی ہوتی ہے ــ بلکہ یہ کہنا درست ہے کہ حکم و موضوع یا اسلامی رجحانات کا رخ اسی سمت ہے، دیکھئے ارشاد باری ہے:

"وللّٰہ العزۃ ولرسولہ وللمومنین ولٰکن المنافقین لایعلمون"

(المنافقون/۸)

ــ "عزت تو صرف اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنین کے لیے ہے مگر منافقین نہیں جانتے۔"

یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے چلیں کہ اس توجیہ میں کسی طرح کا تکبر نہیں ہے۔ جیسے بعض لوگوں نے شبہ کیا ہے ــ بلکہ یہ بیان دوسرے نظاموں پر اسلامی نظام کی برتری و فضیلت کو ظاہر اور سب سے کامل ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ نتیجتاً جو لوگ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ خاص طور پر اس نقطۂ نظر سے کہ وہ انسانی اقدار پر عمل کرتے ہیں سب سے برتر قرار پاتے ہیں۔ اس بات کا امکان ہے کہ بعض لوگ شبہ کا شکار ہو کر اقدار و معیار کے بارے میں سوال کریں۔ ایسی صورت میں دلائل کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اگر کوئی شخص اس توجیہ کی تردید کر کے اس کی مذمت کرتا ہے اور اس کو نسلی امتیاز سے تعبیر کرتا ہے، تو اس کا یہ عمل سب سے بڑا ظلم ہے۔

مذکورہ قاعدہ تعلقات عامہ کی رو سے بڑی اہمیت کا مالک ہے اور ہر سطح پر قابل عمل بھی ہے۔ سیاسی سطح پر تو خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

عالمی استکبار جو اقوام عالم کی ثروت و دولت کو مختلف بہانوں سے ہضم کرنا چاہتا ہے

اس کے ساتھ ہمارا برتاؤ اور سلوک اس قانون کے عملی ہونے کی بہترین دلیل ہے۔

اسی قانون وضابطے پر عمل کی اہم ترین مثال، آیت اللہ میرزائے شیرازی کا فتویٰ ہے وہ زمانہ، جب ناصرالدین شاہ قاچار نے حکومت برطانیہ کو تمباکو کا ٹھیکہ دیا اور اس کا سربراہ "رگی" نامی شخص قرار پایا۔ اب قانونِ "لن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین" لاگو کرنے کا لمحہ تھا۔ چنانچہ آیت اللہ میرزا شیرازی نے اپنا فتویٰ صادر کیا:

"آج سے تمباکو اور اس سے بنی چیزوں کا استعمال حرام قرار دیا جاتا ہے، اور تمباکو نوشی حضرت صاحب العصر والزمان (عج) سے جنگ کے برابر ہے۔"

مذکورہ قاعدے پر عمل درآمد کی دوسری اور اہم ترین مثال ہے CAPITALIZATION کے خلاف امام خمینی مدظلہ کی تحریک ہے۔ اس معاہدے کی شرط یہ تھی کہ غیر ملکی افراد پر اسی ملک کے قوانین کا اطلاق ہوگا جہاں کے وہ باشندے ہیں، اور نفاذ کا اختیار متعلقہ ملک کے کونسلر کو تھا۔

اس معاہدے سے غیر ملکی افراد کو قانونی گرفت سے بچانا ہی مقصود نہ تھا بلکہ انہیں مسلمانوں پر مسلط بھی کرنا تھا۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں جب ظالم و جابر شاہنشاہی حکومت نے مذکورہ معاہدہ پر دستخط کئے تو علماء دین نے امام خمینی مدظلہ کی قیادت میں مخالفت کی آواز بلند کی۔ شاہ خائن کی حکومت نے انھیں ترکی جلاوطن کردیا۔ درحقیقت یہی پہلا موقعہ تھا جس میں اسلامی انقلاب کی داغ بیل پڑی اور بڑی عجیب بات یہ ہے کہ اس موقع پر امام خمینی مدظلہ نے اپنی جرأت مندانہ تقریر کا آغاز کلام پاک کی حسب ذیل آیت سے کیا:

"ولن یجعل اللہ للکافرین علی المؤمنین سبیلا" (النساء ۱۴۱)

اور خدا ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ نہیں دے گا۔

اگر ملت اسلامیہ یا اسلامی ملکوں کے سربراہوں کا سلوک ظالم و جابر حکومتوں کے ساتھ اس کلیہ کے مطابق ہوتا، تو آج مسلمانوں کا حال یہ نہ ہوتا، آج یہ دن بھی دیکھنا پڑا ہے کہ چند اسلامی ملک نہ صرف اسرائیل جیسے دشمن، مسلمانوں کے حقوق کے غاصب اور ان کی عزت و آبرو سے کھیلنے والے کی مخالفت نہیں کرتے بلکہ اس کے وجود کو اہمیت دیتے

اور اسے تسلیم بھی کرتے ہیں۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ تینوں اصول، اسلامی عزت و استقلال کی روح کو غیر ملکیوں کے ذلت آمیز تسلط سے بچنے کی ضمانت ہیں۔

۴ قدم بقدم آگاہی :

اسلام، دین تربیت و آگاہی ہے، وہ ایک فطری و واقعی دین کے تقاضوں کی طرح جس انسان کو اپنے دائرے میں لیتا ہے اس کو صاحب علم بنانا لازمی و فرض اولین سمجھتا ہے۔

اسلام کو جس معاشرے میں سرایت و نفوذ پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، وہاں وہ اپنے بیش بہا جواہر یہ جانتے ہوئے پیش کرتا ہے کہ ان کی قیمت کا انکشاف آسانی سے ہو جائے گا یہی وجہ ہے کہ عقیدہ کے معاملے میں وہ ہر طرح کی تقلید کو رد کرکے تحقیق و دلائل کی چھان بین کی دعوت دیتا ہے "قل هاتوا برهانكم" اسی طرح وہ عقیدے کے بارے میں جبر و تشدد کی اجازت نہیں دیتا" لا اكراه فى الدين" وہ امت کو فکر و عمل کے لحاظ سے مضبوط اور صاحب عقل و بصیرت دیکھنا چاہتا ہے۔ اور جہاں تک دوسروں کو دعوت دینے اور ان سے سلوک کی بات ہے تو اسلام دلائل اور حسن خلوص کی شرط لگاتا ہے:

"ادع الى سبيل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتى هى احسن ان ربك هو اعلم بمن ضل عن سبيله وهو اعلم بالمهتدين" (النحل/۱۲۵)

(اے رسولؐ تم لوگوں کو اپنے پروردگار کی راہ پر حکمت اور اچھی اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلاؤ اور بحث و مباحثہ کرو بھی تو اس طریقہ سے جو (لوگوں کے نزدیک) سب سے اچھا ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹک گئے، ان کو تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے اور ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی خوب واقف ہے۔

"فلذلك فادع واستقم كما امرت ولا تتبع اهواءهم" (الشوریٰ/۱۵)

(اے رسولؐ تم لوگوں کو اسی (دین) کی طرف بلاتے رہو اور جیسا کہ تم کو حکم ہوا ہے (اس پر) قائم رہو اور انکی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

"ومن احسن قولاً ممن دعا الی الله وعمل صالحاً وقال انني من المسلمین۔" (فصلت/ ۳۳)

اور بات میں اس سے کون اچھا ہو سکتا ہے جو (لوگوں کو) خدا کی طرف بلائے، اور اچھے اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً (خدا کے) فرمانبردار بندوں میں ہوں۔

"قل هذه سبیلی ادعوا الی الله علی بصیرة انا ومن اتبعنی وسبحان الله وما انا من المشرکین۔" (یوسف/ ۱۰۸)

(اے رسولؐ) ان سے کہدو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں کو) خدا کی طرف بلاتا ہوں۔ میں اور میرا پیرو (دونوں) مضبوط دلیل پر ہیں اور خدا (ہر عیب و نقص سے) پاک و پاکیزہ ہے۔ اور میں مشرکین سے نہیں ہوں۔

اس کے بارے میں شہید سید محمد باقر صدر اپنی کتاب "اقتصادنا" میں تحریر فرماتے ہیں:

"دوسری اہم بات یہ ہے کہ مسلمان مبلّغین کو چاہیے کہ وہ ہر کام سے پہلے واضح دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعالیم سے لوگوں کو آشنا کریں، یہاں تک کہ اتمام حجت ہو جائے اور صحیح منطقی بحث ومباحثہ کی گنجائش دوسروں کے لیے باقی نہ رہے۔ اگر اس کے بعد بھی لوگ رد کرتے ہیں تو (اسلامی تبلیغ جو بین الاقوامی سطح پر انسانیت کے حقیقی مفادات کو تشکیل دیتی ہے) اس کے سامنے مادی طاقت یا مسلح جہاد کے ذریعے اپنا راستہ بنانے کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں رہتی۔ (صفحہ ۲۷۵۔ جلد ۱)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایک روایت مرحوم کلینی کی کتاب "کافی" میں درج ہے۔ جس میں انہوں نے فرمایا:

قال امیر المومنین ع، : بعثنی رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم الی الیمن، فقال: یا علی لا تقاتلن احداً حتیّٰ تدعوه الی الاسلام وأيم الله لئن یهدی الله عزوجل علی یدیك رجلاً خیر لك مما طلعت علیه الشمس وغربت ولك ولاؤه یا علی" (وسائل الشیعہ جلد ۱۱ ص ۳۰)

امیرالمومنین علیہ السلام فرماتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے یمن کی طرف روانہ کرتے ہوئے فرمایا: اے علیؑ! جب تک تم کسی کو اسلام کی طرف آنے کی دعوت نہ دو اس وقت تک کسی سے جنگ نہ کرنا اور خدا سے ہمیشہ یہ چاہنا کہ تمہارے ذریعہ کسی کو اسلام کی طرف آنے کی ہدایت کرے۔ اس لیے کہ یہ تمہارے لئے سورج کے نکلنے اور ڈوبنے سے زیادہ بہتر ہوگا، اور تم ہدایت یافتہ لوگوں کے ولی ہو گے۔

یہ طریقہ خدا نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو بھی سکھایا:

اذھبا الیٰ فرعون انہ طغیٰ، فقولا لہ قولاً لینا لعلہ یتذکر ویخشیٰ (طہٰ/ ۴۳ - ۴۴)

تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ۔ بے شک وہ بہت سرکش ہوگیا ہے۔ پھر اس سے (جاکر) نرمی سے باتیں کرو تاکہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے۔

دعوت حق صرف نیک افراد کے لیے مخصوص نہیں بلکہ برے لوگوں کو بھی دعوت دینا چاہیے ممکن ہے وہ حق کی جانب مائل ہوجائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلطان روم اور بادشاہ ایران کے نام جو خط روانہ کئے تھے۔ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارہا اس جملہ کو بار بار لکھواتے رہے (ادعوک بدعایۃ الاسلام) "ہم تم کو تبلیغ اسلام کی دعوت دیتے ہیں" اس کا مطلب ہر شخص تک پیغام اسلام پہنچانا تھا۔

اسی طرح تبلیغ اسلام کے لیے دنیا کے گوشے گوشے میں مبلغین روانہ ہوئے، ان میں سے وہ پہلا گروہ پہلے دعوت حق کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پیغمبر اسلامؐ کی طرف سے بھیجا گیا، یہ تھا:

نام	ملک
عبداللہ بن حذافۃ السہمی	ایران بھیجے گئے رسول اللہ کے ایلچی
حاطب بن ابی بلیعہ	مصر میں "متوقس" کو دعوت اسلام دینے کے لئے رسول اللہؐ کے ایلچی۔

دحیۃ الکلبی	روم بھیجے گئے رسول اللہؐ کے ایلچی
عمرو بن امیہ	حبشہ بھیجے گئے رسول اللہؐ کے ایلچی
سلیط بن عمرو	یمامہ بھیجے گئے رسول اللہؐ کے ایلچی
عمرو بن العاص	عمان بھیجے گئے رسول اللہؐ کے ایلچی
حرملہ بن زید	ایک وفد کی معیت میں "ایلہ" (جو بحر احمر کے ساحلی علاقے میں واقع ہے) بھیجے گئے ایلچی۔
المھاجر بن ابی امیۃ	حمیر کے بادشاہوں کی طرف بھیجے گئے رسول اللہؐ کے ایلچی
خالد بن ولید	ھمدان، بھیجے گئے رسول اللہؐ کے ایلچی
علی بن ابی طالبؑ	ھمدان، بھیجے گئے رسول اللہؐ کے دوسرے ایلچی۔
حذیفہ بن الیمان	ھندوستان، بھیجے گئے اسلام کے ایلچی
عبد اللہ بن عوسجہ	قبیلہ حارثہ بن قریظہ کی طرف بھیجے گئے رسول اللہؐ کے ایلچی۔
جریر بن عبد اللہ البجلی	ذی الکلاع حمیری قبائل کی طرف بھیجے گئے۔

ان کے علاوہ اور بھی افراد تھے جو مختلف قوموں تک اسلام کا پیغام لے گئے۔

اگر ہم مذکورہ سیاسی اصول کے اثر کو بین الاقوامی تعلقات کے دائرے میں پرکھنا چاہیں تو ان ایلچیوں کے انداز بیان، بین الاقوامی اجتماعات میں فرستادہ تجاویز اور توضیح حقائق کے اسلوب کو سمعی و بصری وسائل کے ذریعہ دیکھ سکتے ہیں۔

لیکن جو خصوصیت اسلام کے بین الاقوامی تعلقات میں خاص طور پر موجود ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام آگاہی اور بیداری کو ہر چیز سے پہلے مد نظر رکھتا ہے۔ اس کے بعد سیاسی، فوجی یا دوسرے قسم کے تعلقات قائم کرتا ہے۔

موجودہ زمانے کے بین الاقوامی تعلقات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تعلقات محض جعلی سیاست پر قائم ہیں، اس لئے کہ اس میں وقت کے تقاضے کے مطابق حقائق اور معیار بدل جاتے ہیں۔

۵۔ رفتار و سلوک میں عدل و انصاف کی رعایت:

درحقیقت اسلامی تصور کا بنیادی محور عدل و انصاف ہے۔

"شهد الله انه لا اله الا هو، والملائكة واولوا العلم، قائما بالقسط"

(آل عمران / ۱۸)

خدا نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور تمام فرشتوں نے اور صاحبان علم (انبیاء و اولیاء) جو عدل پر قائم ہیں دیہی شہادت دی ہے)

اور معاشرتی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ سلوک و رفتار میں بھی عدل و انصاف بنیادی محور کی حیثیت رکھتا ہے۔

"یا ایها الذین آمنوا کونوا قوّامین بالقسط، شهداء لله" (النساء/ ۱۳۵)

اے ایمان لانے والو، مضبوطی کے ساتھ انصاف پر قائم رہو اور خدا کی خاطر گواہی دو۔

فطری بات ہے کہ عدل و انصاف قائم کرنے پر زور اسی وقت دیا جاتا ہے جب بغض دشمنی اور کینہ پردازی کا دور دورہ ہو اور انصاف باقی نہ رہے۔

ارشاد ہوتا ہے :

"ولا یجرمنّکم شنآن قوم علیٰ ان لا تعدلوا، اعدلوا هو اقرب للتّقویٰ." (المائدہ / ۸)

اور تمہیں کسی قبیلہ کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسوا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو (خبردار) بلکہ تم (ہر حال میں) انصاف کرو یہی پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔

دوسروں کے ساتھ اسلام کے برتاؤ اور سلوک کا جائزہ لیکر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام اپنے اصول میں انسانی پہلو سے بے خبر نہیں، یہی نہیں ـ جہاد، معاہدات . . . . میں بھی اسلام اسی پر زور دیتا ہے کہ عدل و انصاف کا لحاظ رکھا جائے۔ یہ امر اس بات کی نشاندہی ہے کہ اسلامی حکومت دنیا کے محروم و مستضعف افراد کی حمایت اور ہر جگہ ظلم و طغیان سے مقابلہ کرتی ہے، خواہ براہ راست اسے نقصان نہ بھی پہنچا ہو، اسلامی حکومت ظالم حکومتوں

سے تعلقات سے بچتی ہے۔

مستضعفین و محروم افراد کی ہماری حمایت کسی غرض یا پروپیگنڈے کی بنا پر نہیں ہے اور نہ یہ بات ہمیں زیب دیتی ہے کہ جب تک ہماری حکومت باقی رہے اور ان لوگوں سے کام نکلتا رہے، ہم حمایت کرتے اور ظلم ڈھاتے رہیں۔ یہ ہمارا نہیں، مشرقی و مغربی سامراج کا شیوہ ہے۔

ہمارا موقف اسلامی اصولوں پر استوار ہے اور ہمیں اسی پر عمل کرنا ہے اور اس موقف سے جب بھی انحراف کریں گے تو ہمارا شمار بھی ان مستکبروں کی فہرست میں ہوگا جن کے بارے میں باری تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"فهل عسيتم ان توليتم أن تفسدوا في الارض وتقطعوا ارحامكم اولئك الذين لعنهم الله فأصمهم واعمیٰ ابصارهم"

(محمدؐ / ۲۲ - ۲۳)

(منافقو!) کیا تم سے بعید ہے، کہ اگر تم حاکم بنو تو روئے زمین میں فساد پھیلانے اور اپنے رشتے ناتوں کو توڑنے لگو، یہ وہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی ہے اور (گویا خود اس نے) ان کے (کانوں) کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔

اس کے برعکس قرآن مجید تو مسلمانوں کی صلاحیتوں کا تعارف کرتا ہے۔ ارشاد ہے:

الذين ان مكنا هم في الارض اقاموا الصلاة وآتوا الزكاة وامروا بالمعروف ونهوا عن المنكر ولله عاقبة الامور" (حج / ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں روئے زمین پر قابو دے دیں تو (بھی) یہ لوگ پابندی سے نمازیں ادا کریں گے، زکات دیں گے اور اچھے اچھے کام حکم کریں گے اور بری باتوں سے لوگوں کو روکیں گے، اور یوں تو سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

۶۔ دلوں کو جیتنے کا اصول:

اسلامی شریعت میں دلوں کو جیتنے کا اصول بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جس ماحول میں دلوں کو جیتنے پر توجہ دی جاتی ہے، اس کے افراد حقیقت کو تسلیم کرنے پر

تیار اور واقعیت سے قریب ہوجاتے ہیں، مذکورہ اصول میں ایک بنیادی نکتہ مصرف زکاۃ میں، حصۂ مؤلفۃ القلوب ہے۔ یہ مثبت اقدام ایک باقاعدہ عمل کو بروئے کار لانے کا میدان مہیا کرتا اور دنیا کے محنت کش عوام (مستضعفین) کے پہلو بہ پہلو آجاتا ہے، ان کے مسائل کا حل تلاش کر کے ان کے دلوں کو اسلام کی طرف مائل کرتا ہے۔

مؤلفۃ القلوب کے بارے میں فقہا کا اختلاف ہے، کہ آیا صرف مسلمانوں سے مخصوص ہے یا منافقین بھی شامل ہیں؟ یا مسلمانوں کے اس طبقے سے متعلق ہے جن کا ایمان کمزور ہے؟ ... لیکن یہاں اسلامی روح اور اس کے اقتصادی رجحان نیز، شیعہ، سنی فقہاً اور امام خمینی کے اقوال کی روشنی میں جو چیز نظر آتی ہے وہ ہے، لوگوں کو مائل کرنے کے لیے قانون، جو اسلامی حکومت کے لئے وہ موقع فراہم کرتا ہے جس سے وہ حسب مصلحت کام لیتا اور بین الاقوامی تعلقات اور مختلف مذہب و مسلک رکھنے والی شخصیتوں، انجمنوں نیز ملکوں کو مدد بہم پہنچانے کی حدیں مقرر کرتا ہے۔

یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مذکورہ اصول پر ایک خاص زمانے تک اور مخصوص افراد کے ذریعہ عمل درآمد ہوتا رہا ہے، تو پھر بعد کے زمانوں میں اس کے لزوم اور اسلامی ہونے میں قطعی طور پر کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہتا۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ حصۂ مؤلفۃ القلوب کا تعلق زکاۃ ہی سے نہیں بلکہ اسلام امام کو مکمل اختیار دیتا ہے کہ وہ اسلامی مصلحت کے پیش نظر بیت المال کی دولت استعمال کرے۔ اس سلسلے میں مزید تفصیلات اسلامی اقتصادیات کی بحثوں میں آتا ہے۔

اس باب کے کھلنے سے سیاسی میدان میں وسیع پیمانے پر اقدامات کے امکان روشن ہوتے ہیں۔ مثلاً دلوں کو جیتنے یا دوسرے ملکوں کو ہم خیال بنانے کے لئے حکومت کو سیاسی و اقتصادی امداد بہم پہنچانے کا جواز بھی ملتا ہے۔ لیکن محدود سیاسی مفاد کے ساتھ ایسے مفادات و معاملات کی جانچ پرتال بھی ضروری ہے جن سے امت

اسلامیہ کو دوچار ہونا پڑے گا۔

۷ ۔ بین الاقوامی معاہدوں کا احترام :

اسلامی حکومت کے ان اہم اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اور اس پر اسلامی سیاست استوار ہے، پہلے کہا جاچکا ہے، اس اصول کا بنیادی مأخذ ایک طرف اگر اسلام کی حقیقت دوستی ہے تو دوسری طرف انسانی اخلاق و اقدار کا احترام ہے اور یہ دونوں نکتے اسلامی طرزِ فکر میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسلامی سربراہ ہر معاہدے پر غور کرتا ہے، اگر معاہدے کی تمام شرطیں قابلِ قبول ہوتی ہیں تو پوری طرح سے اس پر عمل کرتا ہے۔

"اوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولا" (الاسراء/ ۳۴)

اور عہد کو پورا کرو کیونکہ (قیامت کے روز) عہد کی ضرور پوچھ گچھ ہوگی۔

جو معاہدے غیر مسلم افراد یا ممالک کے ساتھ کئے جاتے ہیں، ان کے بارے میں اسلام نے وضاحت کے ساتھ ساتھ کچھ اور ضابطے بھی وضع کئے ہیں جن پر عمل کرنا لازمی ہے کچھ معاہدے ایسے ہوتے ہیں جن میں ولی امر کو اختیار ہے کہ وہ عظیم اسلامی مصلحت کے پیش نظر عمل درآمد کرے۔

معاہدے دو قسم کے ہیں :

پہلی قسم کا نمونہ : ذمیوں سے معاہدہ، معاہدۂ صلح و امن و امان۔

دوسری قسم کا نمونہ : دوسرے معاہدوں کے علاوہ ان معاہدوں پر مشتمل ہے جو فوجی واقتصادی میدانوں میں کئے جاتے ہیں۔ معاہدہ خواہ پہلی قسم کا ہو یا دوسری، دونوں صورتوں میں اسلامی تعلیمات کا دارومدار قرآن و حدیث ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرزِ عمل پر ہے۔

ذمیوں سے معاہدہ کے لیے درج ذیل آیت سے استفادہ کیا جاتا ہے : ۔

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" (التوبہ/ ۲۹)

اہل کتاب میں سے جو لوگ نہ تو خدا ہی پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ روز آخرت پر
اور نہ خدا اور اس کے رسولؐ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ سچے
دین ہی کو اختیار کرتے ہیں، ان لوگوں سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ وہ لوگ ذلیل
ہو کر (اپنے) ہاتھ سے جزیہ دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذمیوں سے جو معاہدے کئے، ان میں نجران کے نصاریٰ، بنی تغلب اور بعض یہودی گروہوں کے معاہدے توجہ طلب ہیں۔

یہاں معاہدوں کے بارے میں تفصیلی بحث پیش کرنا مقصود نہیں بلکہ جس چیز پر توجہ مبذول کرانا ہے وہ یہ کہ معاہدوں کا مسئلہ اسلامی فقہ کے بڑے حصے پر پھیلا ہوا ہے اور اس کا ماخذ قرآن کریم ہے۔

یہاں ہیں دو متوازی نکات کو مدنظر رکھنا چاہیے۔

پہلا نکتہ: ہماری مراد وہ معاہدے ہیں جو ولی امر یا حاکم شرع کرتا ہے۔ وہ معاہدے جو ظالم و جابر حکمران کیا کرتے ہیں۔ ان کی پابندی کسی مسلمان کے لیے ضروری نہیں، اس لیے کہ معاہدہ کرنے والا ایسا شخص نہیں جسے مسلمانوں کے معاملات سپرد کئے گئے ہوں حکمران اپنی انفرادی حیثیت سے معاہدہ کریں اور اسلامی احکام میں اس پر عمل کرنے کی گنجائش ہو تو قانون و شریعت کی رو سے پابندی کرنا ہوگی۔ جیسا کہ (بعض صورتوں میں) معاہدۂ امن۔
ایسے معاہدوں میں بہرحال یہ دیکھنا لازمی ہے کہ اس میں مسلمانوں کے فائدے کی صورت کیا ہے۔

دوسرا نکتہ: معاہدوں میں جس طرح مسلمانوں کی ذمہ داری پر نظر کی گئی اسی طرح یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فریق ثانی مسلمانوں اور ان کے نمائندے کے ایمان و علم و ذمہ داری کو کس حد تک تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ معاہدے کا ایک فریق ہے۔ اگر واضح طور پر پہلے فریق کے موقف کا اندازہ نہ ہو سکے جب بھی سرکاری معاہدہ شکنی سے احتیاط کرنا چاہیے۔

یہ مطلب اس وقت واضح ہوتا ہے جب فقہا ان محارب افراد کی آزادی کے لحاظ کو واجب قرار دیتے ہیں، جو اسلامی ملک میں امن و امان کے شبہ میں داخل ہوئے ہوں۔

مسلمانوں کو ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن میں ان کے حکام ایسی حکومت سے معاہدہ کرتے ہیں جسے پورا یقین ہوتا ہے کہ یہ لوگ ظالم و جابر ہیں ایسے معاہدے کا رابطہ اسلامی اصول اور عوام سے نہیں ۔ ایسے ظالمانہ معاہدے کو تسلیم کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری نہیں۔

۸ ۔ مساوی سلوک :

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

"الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات قصاص ، فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدیٰ علیکم واتقوا اللّٰہ واعلموا ان اللّٰہ مع المتقین ." (البقرہ / ۱۹۴)

حرمت والا مہینہ، حرمت والے مہینے کے برابر ہے (اور مہینہ کی خصوصیت نہیں) سب حرمت والی چیزیں ایک دوسرے کے برابر ہیں پس جو شخص تم پر زیادتی کرے تو جیسی زیادتی اس نے تم پر کی ہے ویسی ہی زیادتی تم بھی اس پر کرو اور خدا سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ خدا پرہیز گاروں کا ساتھی ہے۔

ایک طرف قصاص اور دوسری طرف نیکی کا بدلہ نیکی کے اصول کو انفرادی و اجتماعی تعلقات میں انسانی منطق دو بنیادی اصولوں کے طور پر قبول کر سکتی ہے تو بین الاقوامی تعلقات میں بھی ان پر ضرور عمل کیا جا سکتا ہے ، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان دونوں اصولوں میں سے ایک دشمن کے حملے کو پسپا کرنے یا دلوں کو جیتنے کے لئے موثر بھی ہو سکتا ہے ۔ مثلاً، گذشتہ صدیوں میں دشمن مسلمانوں کو غلام بناتے تھے۔ لہٰذا اس کا فطری ردِ عمل بھی یہی ہونا چاہیے ۔ البتہ دوسرے پہلو بھی مدنظر رکھنا ہوں گے ۔

غلام بنانے کا حکم اس قائد کو دینے کا حق ہے جو انسانی محبوبیت اور مذکورہ اصول کے منافی شریعت کے اعلیٰ مدارج پر فائز ہو ۔ یہ قائد اگر غلام بنانے کے عمل کو ایک طرف دشمن کو زک پہنچانے اور دوسری طرف اسیر کے سماج میں داخل ہونے، مسلمانوں سے گھل ملنے اور اس کے بعد اسلام قبول کرنے نیز موجود صفات سے عاری ہونے کے برابر سمجھتا ہے ، تو وہ اس حکم کو بے مثال موقف کا عنوان اس وقت دے سکتا ہے جب

لوگ اس عمل کو گذشتہ زمانے کی وحشیانہ غلامی سے موازنہ نہ کریں۔

آیت اللہ باقر الصدر شہیدؒ نے لکھا ہے:

"اس بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ "ولی امر" قیدی کے (عفو۔ فدیہ۔ غلام بنانے) حالات ثلاثہ میں سے افضل کی تطبیق کر سکتا ہے۔ نیز وہ تطبیق، "مصلحت علمہ" کے زیادہ موافق بھی ہو۔ (تو فقط غلام بنانے والا فیصلہ تو حتمی نہ ہوا؟)۔ اس حق ولیِ امر کی تصریح فاضلؒ اور شہید ثانیؒ نیز دوسرے فقہاء اسلام نے بھی کی ہے۔ اس پر ایک اور اسلامی کلیہ وحقیقت کا اضافہ بھی کر لیجئے۔ جنگ کی کھلی چھٹی اسلام نے نہیں دے رکھی ہے۔ اس کی اجازت خاص حالت میں وجود وحضور معصوم سے وابستہ ہے۔ وہی جہاد کی سربراہی کریں وہی اسلامی لشکر کو حملہ کے لیے بھیجیں۔

دونوں حقیقتوں کو یکجا کریں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام اس وقت تک اسیر کو غلام بنانے کی اجازت نہیں دیتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ غلام بنانا معاف کرنے اور فدیہ لینے سے بہتر ہے۔ اس کے علاوہ معصوم ولی امر جو مناسب وغیر مناسب کو اچھی طرح پرکھ سکتا ہے، اس کے سوا اسلام کسی دوسرے کو اس مسئلہ میں دخل دینے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔

مذکورہ اسلامی قانون میں نہ صرف یہ کہ کوئی نقص نہیں بلکہ اس قانون سے دوسرے سماجی مذاہب بھی (خواہ ان کے مقاصد کچھ بھی رہے ہوں) اختلاف نہیں رکھتے۔ لہٰذا کن صورتوں میں غلام بنانا، معاف کرنے یا فدیہ لینے سے زیادہ مناسب ہوتا ہے؟ جب کہ دشمن اپنے اسیروں کو غلام بنائے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں دشمن سے نپٹنے کے لئے مساوی سلوک کرنا ضروریات میں محسوب ہوتا ہے۔" (اقتصادنا ص۲۷۵)

آپ نے مسئلہ کا منفی پہلو ملاحظہ کیا اسی طرح سے مثبت پہلو کا جائزہ بھی لے لیجئے یہاں آپ کو ایک برتری نظر آئے گی۔ یعنی اسلام جب بھی دشمن کے رویہ میں حسن سلوک کی جھلک پاتا ہے جواب میں حسن سلوک اور نیکی کے ساتھ پیش آنے کی تاکید کرتا ہے،

اور مسلمانوں کے رقیبے سے ذرہ برابر بے رخی نہیں برتتا۔

ارشاد ہے :

"وان جنحوا للسلم فاجنح لها" (الانفال/ ٦١)

اور اگر یہ کفار صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو۔

"لا ینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبرّوھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحبّ المقسطین ۔" (ممتحنہ / ٨)

جو لوگ تم سے (تمہارے) دین کے بارے میں نہیں لڑے بھڑے اور نہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا۔ ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے ساتھ بہ انصاف پیش آنے سے خدا تمہیں منع نہیں کرتا۔ بے شک خدا انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

٩ ۔ نظام جہاد اور اس کی مختلف قسمیں :

نظام جہاد، مختلف پہلوؤں پر مشتمل ایک وسیع باب ہے، جس میں اسلام نے جنگ سے متعلق اقدامات کو منظم کرنے کی کوشش اس لیے کی ہے، کہ اسلامی تبلیغ کی راہیں ہموار، رکاوٹیں زائل اور اس کا انقلابی پہلو باقی رہے اور ساتھ ہی ساتھ ممکن انسانی اخلاق و آداب کی پابندی بھی ہو سکے۔ موضوع کی وسعت اور وقت کی کمی دیکھتے ہوئے ہم تفصیل میں نہیں جاتے۔

قرآنی تعلیمات پر مبنی بین الاقوامی تعلقات کا یہ ایک مختصر سا نمونہ تھا۔ اس بحث میں خاص بات موضوعات کی ایک دوسرے سے ہم آہنگی و وابستگی ہے۔ جیسے : "بین الاقوامی تعلقات کے اصول" یا "نظام جہاد" ان دونوں کا باہمی ربط بے حد اہمیت رکھتا ہے جسے ہم کبھی زیر بحث لائیں گے۔

"دار الاسلام اور دار الکفر" کے روابط پر جب اصولی گفتگو کرتے ہیں تو ہم اس ماحول میں ہوتے ہیں جہاں ایک بین الاقوامی "اسلامی حکومت" کا تصور ذہن پر غالب ہوتا ہے

اور یہی تصور تعلقات کی نوعیت اور اس کے حدود متعین کرتا ہے۔

اس موقعہ پر یہ کہنا درست ہوگا، کہ اسلامی جمہوریۂ ایران کی سیاست، عالم استکبار کی طرف سے عائد کردہ تمام سیاسی، اقتصادی، فوجی اور تبلیغی پابندیوں کے باوجود، بڑی تیزی سے بین الاقوامی تعلقات کے میدان میں مذکورہ عظیم اسلامی مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کوشاں ہے اور اس نے سازشوں کو بے نقاب کرنے میں آبرومندانہ کامیابی حاصل کی ہے۔

اسلامی دستور

جب ہم اسلامی دستور کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کو سامراجیت اور داخلی امور میں غیر ملکی مداخلت کے خلاف پاتے ہیں۔ اس کی خارجہ پالیسی اسلامی اصولوں پر مبنی ہے، دنیا کے تمام مسلمانوں کی حمایت اور مستضعفین کے حقوق کا تحفظ اس کا نصب العین ہے۔ اس میں تمام وہ باتیں موجود ہیں جن کا شمار اسلامی حکومت کے اغراض ومقاصد میں ہوسکتا ہے۔

اقتصادی میدان میں آرٹیکل نمبر (۴۳) یہ عبارت ہے: "اقتصادی آزادی اور ملک کے اقتصاد میں غیر ملکی عدم مداخلت کا شمار اسلامی اقتصاد کے مسلمہ امور میں ہے۔

آرٹیکل (۱۴۶) کی رو سے: ملک میں ہر قسم کے غیر ملکی فوجی اڈوں کا قیام ممنوع ہے، اگرچہ ان اڈوں کا مقصد پرامن استعمال ہی کیوں نہ ہو۔

اسلامی دستور کا دسواں باب خارجہ پالیسی سے متعلق ہے:

آرٹیکل نمبر (۱۵۲) کے مطابق:

"اسلامی جمہوریۂ ایران کی خارجہ پالیسی کی بنیاد، ہر قسم کی تسلط آمیز ہوس کی نفی، ملک کے حدود کی سالمیت، ہر قسم کی آزادی، تمام مسلمانوں کے حقوق کے دفاع، تسلط پسند حکومتوں سے غیر جانبداری اور غیر جنگ آزما ممالک کے ساتھ صلح آمیز تعلقات پر مبنی ہے۔"

آرٹیکل نمبر (۱۵۳) کی رو سے:

"ہر قسم کا ایسا معاہدہ، ممنوع ہے، جو کسی غیر ملکی طاقت کو ملکی پیداوار و ذخائر زیر زمینی پر تسلط و تصرف یا ملک کے اقتصادی، ثقافتی، فوجی و دیگر معاملات میں دخل اندازی کی اجازت دیتا ہو۔"

آرٹیکل نمبر (۱۵۴) میں ہے:

"اسلامی جمہوریۂ ایران انسانی معاشرے میں انسانی خوش حالی کو اپنا مطمع نظر گردانتی ہے اور اس امر کا اعتراف کرتی ہے کہ خود مختاری، آزادی اور عدل و انصاف پر مبنی حکومت تمام دنیا کے انسانوں کا حق ہے۔

اس بنا پر اسلامی جمہوریۂ ایران تمام دوسرے ممالک کے داخلی معاملات میں دخل اندازی سے پرہیز کرتے ہوئے دنیا کے تمام علاقوں میں طاقتور حکومتوں کے مدمقابل مستضعفین کے جائز مطالبات اور ان کی منصفانہ جدوجہد کی حمایت کرتی ہے۔

آخر میں آرٹیکل نمبر (۱۵۵) میں یہ پرزور بات:

"اسلامی جمہوریۂ ایران کی حکومت ہر ایسے شخص کو سیاسی پناہ دے سکتی ہے جو اس کا خواہاں ہو، سوائے ان افراد کے جو ایرانی قانون کی رو سے تخریب کار اور غدار شمار ہوں۔

دوسری استثنائی صورت

بیان کیا جا چکا ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا کو دو (دارالاسلام اور دارالکفر) حصوں میں بانٹنے کا تصور ایک استثنائی صورت ہے، پہلا مفروضہ جس میں ایک بین الاقوامی اسلامی حکومت کا قیام شامل تھا، اس میں ہم دیکھ چکے کہ دونوں (دارالاسلام اور دارالکفر) حصوں میں اسلامی حقیقت و اخلاق کی بنیاد پر کیسے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔

ہم نے پہلے مفروضہ میں ایک ایسی بین الاقوامی اسلامی حکومت کے قیام کو فرض کیا تھا جس میں اگر شرعی اعتبار سے امام قیادت حاصل کرتا ہے تو وہی دار الاسلام کا ولی امر بھی ہوگا۔

مندرجہ ذیل نکات کی رو سے دار الاسلام میں ایک طبعی صورت یہ ہوگی:

الف: ثابت شدہ اسلامی قوانین کی یکسانیت۔

ب: کسی خاص علاقے تک محدود رہے بغیر خلاء پر کرنے میں امام کی صلاحیت، جو معاشرے کے بدلتے ہوئے پہلوؤں کا حل تلاش کرتی ہے۔

ج: مسلمانوں کی تحریک میں اسلام کی ظاہری شکل کے بجائے اس کی روح رواں کی موجودگی جو اتحاد بین المسلمین کا باعث اور مسلمانوں میں اختلاف و انتشار کے لیے رکاوٹ ہے

یہ بات بے حد اہم ہے۔

ہم بعض اساتذہ کے نظریے سے یوں اتفاق نہیں کرتے وہ کہتے ہیں:

"دار الاسلام میں متعدد حکومتوں کا ہونا اسلامی احکام کے منافی نہیں، اور دلیل یہ ہے کہ جس دور میں اسلامی نظریات قائم ہوئے، وہ عباسی حکومت کا دور تھا اور اس وقت متعدد اسلامی حکومتیں موجود تھیں۔ مثلاً مشرق میں عباسیوں، مغرب میں علویوں اور اندلس میں امویوں کی شاہی تھی۔"

(التشریع الجنائی الالٰہی ص ٦٤ ٤)

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جلیل القدر استاد "عبد القادر عودۃ" نے لکھا ہے:

اسلام، موجودہ عرب لیگ جیسی تنظیم کے منافی نہیں۔ جب کہ آج دیکھ رہے ہیں کہ عرب لیگ چھوٹے سے چھوٹے مقصد کو بھی عملی جامہ پہنانے سے قاصر ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ طریقۂ کار ہرگز اپنی صحت ثابت نہیں کر سکتا، خاص طور پر جب یہ جانتے ہیں کہ امت مسلمہ کی تباہی کا اصلی سبب نفسانی خواہشات، طغیان، منفعت طلبی اور تصور برتری کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ایسی صورت میں ہمیں صدر اسلام کی حکومت بے شک وہ واحد حکومت نظر آتی ہے، جو ہر لحاظ سے اسلامی احکام کے مطابق تھی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پوری دنیا میں، امام معصوم کی قیادت کے بارے میں جب ہم اہل بیت اطہار علیہم السلام کے مکتب فکر کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہ رائے مزید واضح ہو جاتی ہے کہ امام معصوم کی قیادت، پیغمبر اکرمؐ کی قیادت ہے، اور اس کے بعد ملت اسلامیہ کی باگ ڈور عادل ولی فقیہ سنبھالتا اور حد اکثر صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے۔
دارالاسلام میں اگر ہم متعدد حکومتوں کو پاتے بھی ہیں تو ہمیں اس صورت کو ایک اور استثنائی حالت کے طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔ مسلمانوں کو تابہ حد امکان اس حالت سے چھٹکارا حاصل کر کے اصل فطری حالت کی طرف بڑھنا چاہیے جو ہر طرح کی وحدت ہو۔
جب ہم دوسری استثنائی حالت کو مفروضہ قرار دیتے ہیں تو اس میں تعلقات قائم کرنے والے مذکورہ دو بنیادی اصولوں کے علاوہ کچھ اور اصول بھی بڑھ کر سامنے آتے ہیں اور ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، جیسے "اسلامی اخوت"، "اسلامی تمام مسلمانوں کے باہمی تعلقات قائم کرنے میں اسلامی احکام کی پیروی"، اور ان تقاضوں کی فراہمی جن سے فائدہ یا نقصان نیز مصلحت کی منطق باقی نہ رہے۔" کیونکہ اسلام تو ویسے بھی ایک مسلمان کا حق دوسرے مسلمان پر گردانتا ہے، جس سے کوئی بھی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔
اور جب یہ صورت ہے تو ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان بھائی کا دکھ درد محسوس کرنا چاہئے، دوسرے مسلمان بھائی کی معاشی حالت کا اپنی معاشی حالت سے مقابلہ کرنا چاہیے اور مسلمان خواہ کہیں بھی رہے اپنا وطن سمجھ کر اسلامی سرزمین کے ہر بالشت کی حفاظت کرنا چاہیے، اسلامی احکام کی پیروی کرنے والوں کے ہم نوا رہیں اور ہر اسلامی سرزمین کے طبیعی ذخائر کو مسلمانوں کی ملکیت سمجھیں اور اسلامی تعلیمات کے دیگر حیاتی پہلوؤں سے غافل نہ رہیں۔
اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا لازمی ہے:
جب ہم اسلامی سرزمینوں پر موجودہ صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں تو مختلف طرح کی حکومتیں نظر آتی ہیں۔

کچھ علاقے ایسے ہیں جن میں اکثریت مسلمانوں کی نظر آتی ہے لیکن وہ کفر والحاد اور اسلام مخالف حکومت کے زیر سایہ زندگی گذار رہے ہیں۔ یا ایسی حکومت کے زیر سایہ جس نے اصلی صورت پر نقلی چہرے چڑھا رکھے ہیں، یا ایسی حکومت جو اسلام کی حیات آفرین تعلیمات کے منافی اور اسلام مخالف تصورات کے مطابق ہے، یا ایسی حکومت جو دین کی نقلی نقاب چہرے پر ڈالے ہوئے مسلمانوں کی جان اور مال ودولت دشمن کے حوالے کرکے ان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی غرض سے بڑی طاقتوں کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے۔

ہم مکمل طور سے درج ذیل قرآنی مضمون پر اتفاق کرتے ہیں:

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون" (المائدہ/۴۴)
جو شخص خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہ دے، تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون" (المائدہ/۴۵)
جو شخص خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہ دے، تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون" (المائدہ/۴۷)
جو شخص خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہ دے، تو ایسے ہی لوگ بدکار ہیں۔

ہمارے عقیدے کے مطابق غیر ملکی کافروں کا آلۂ کار ہونا بذات خود کفر ہے اور مسلمانوں کے حقوق کی پامالی کا مطلب اسلام سے بغاوت کے سوا کچھ نہیں۔

اسلام کے تقاضوں کو دیکھتے ہوئے ہم اپنے تئیں اس بات کا ذمّہ دار محسوس کرتے ہیں، کہ ہمیں ہر طرح کے طاغوت کا مل جل کر مقابلہ کرکے، اسے ختم اور امت اسلامیہ کے دیرینہ اتحاد کو دوبارہ بحال کرنا چاہیئے۔ ۔۔۔۔۔۔

تقابلی مطالعہ

جناب شیخ محمود قانصوہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

کتاب الصّوم

باب اوّل

فضیلت روزہ و روزہ دار و ماہ رمضان ۔

ابواب عشرہ

(۱) رمضان میں شیطان زنجیر بند ہوتا ہے۔ جنت کے دروازے کھلتے اور جہنم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں ۔ (چار احادیث)

(۲) رمضان میں گناہ بخشے جاتے ہیں۔ (آٹھ احادیث)

(۳) ماہ رمضان کے متعدد فضائل ۔ (آٹھ احادیث)

(۴) جنت کے ایک دروازے کا نام "الریّان" ہے۔ (دو احادیث)

(۵) روزہ دار کی دعا قبول ہوتی ہے۔ (تین احادیث)

(۶) روزہ جسم کی زکات ہے ۔ (دو احادیث)

(۷) شکر گذار شکم سیر، روزہ دار جیسا ہے۔ (دو احادیث)

⑧ ہر شب، اللہ گناہ گار آزاد کرتا ہے۔ (دو احادیث)
⑨ "ماہ رمضان" کو صرف رمضان کہنا بُرا ہے۔ (دو احادیث)
⑩ ماہ رمضان کے علاوہ کسی مہینے کے روزے واجب نہیں۔ (دو احادیث)

باب اوّل

ماہ رمضان میں شیطان زنجیر بند ہوتا ہے

جنّت کے دروازے باز اور جہنّم کے دروازے بند ہوتے ہیں

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمد بن الحسن، عن محمد بن عبيد بن عتبة، عن الفضل بن دكين أبي نعيم، عن عبدالسلام بن حرب، عن أيوب السجستاني (السختياني) عن أبي قلابة عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: قد جاء كم شهر مضان شهر مبارك ، شهر فرض الله عليكم صيامه، تُفتح فيه أبواب الجنان، وتغل فيه الشياطين... الحديث[١] وروى نحوه في البحار عن النوادر بسنده الى أبي هريرة، وعن مجالس المفيد وآمالي الطوسي، عن المفيد، عن الجعابي، عن محمد بن يحيى بن سليمان المروزي، عن عبيدالله بن محمد العبسي، عن حماد بن سلمة عن أيوب، عن أبي قلابة مثله، وعن مجالس الشيخ عن أحمد بن عبدون، عن علي بن محمد، عن علي بن فضال، عن محمد بن عبيد مثله، ونقل نحوه عن ثواب الأعمال، عن أبي، عن سعد، عن ابراهيم بن مهزيار، عن أخيه علي، عن الأهوازي، عن القاسم بن محمد، عن علي بن أبي حمزة، عن أبي عبدالله[٢] وكذا في الوسائل[٣] ونحوه مارفعه الصدوق عن جابر، عن أبي جعفر[٤].

١۔ .... ابو ہریرہ کے بقول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ماہ رمضان آگیا، مبارک مہینہ، وہ مہینہ جس میں اللہ نے تم پر روزے فرض کیے۔ اس میں جنت کے دروازے کھلتے اور دوزخ کے دروازے بند ہوتے ہیں... الی آخر حدیث ..... اسی طرح کی روایت بحار میں ـــ النوادر کی سند... ابو ہریرہ سے، اور مجالس مفید

وامالی طوسی .... صدوق نے جابر و امام ابوجعفرؑ سے مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

٢ ــ أحمد بن محمد، عن الحسين بن سعيد، عن الحسين بن علوان، عن عمرو بن شمر، عن جابر عن أبي جعفر(ع) قال: كان رسول الله (ص) يقبل بوجهه الى الناس، فيقول: يا معشر الناس إذا طلع هلال شهر رمضان، غلت مردة الشياطين، وفتحت أبواب السماء وأبواب الجنان وأبواب الرحمة، وغلقت أبواب النار، واستجيب الدعاء، وكان لله فيه عند كل فطر عتقاء يعتقهم الله من النار وينادي مناد كل ليلة هل من سائل؟ هل من مستغفر؟ أللهم أعط كلّ منفق خلفاً وأعط كلّ ممسكٍ تلفاً حتى إذا طلع هلال شوال نودي المؤمنون أن أغدوا الى جوائزكم فهو يوم الجائزة. (الحديث)[5] ورفعه الصدوق عن جابر عن ابي جعفر(ع)[6].

۲ــ . . . . جابر کے بقول امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی طرف رخ کر کے فرماتے تھے:

لوگو! جب ماہ رمضان کا چاند نکلتا ہے تو سرکش شیطان زنجیر بند کر دیے جاتے ہیں اور آسمانوں، جنتوں اور رحمتوں کے دروازے کھول دیے جاتے۔ دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ دعا قبول ہوتی ہے۔ اس مہینے، عید فطر کے قریب اللہ، گنہ گاروں کو دوزخ سے آزادی عطا فرماتا ہے۔ ہر رات کو منادی صدا دیتا ہے: "کوئی سائل ہے؟" "کوئی توبہ کرنے والا ہے؟ یا اللہ، ہر سخی کو عوض اور بخیل کو نقصان دے۔ جب شوال کا چاند نکلتا ہے تو مومنوں کو ندا دی جاتی ہے۔ انعام کا دن ہے سویرے سویرے انعام لینے چلو .... صدوق نے جابر سے (انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے) مرفوع حدیث نقل کی ہے۔

روایاتِ اہلِ سنت:

١ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أنبأنا أبو عمرو عثمان بن أحمد بن السماك ببغداد، حدثنا أحمد بن عبد الجبار، حدثنا أبو بكر بن عياش عن الأعمش، عن أبي صالح، عن أبي هريرة، قال: قال رسول

الله (ص): إذا كان أول ليلة من رمضان، صفدت الشياطين ومردة الجن، وغلقت أبواب النار، فلم يفتح منها باب، وفتحت أبواب الجنان، فلا يغلق منها باب، ونادى مناد ياباغي الخير أقبل ويا باغي الشر أقصر، ولله عتقاء من النار[7]. وروى البخاري نحوه عن يحيى بن بكير عن الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب، عن أبي أنيس، عن أباه، عن أبي هريرة[8]. ورواه ابن ماجة عن أبي كريب، عن أبي بكر مثله[9].

۱- ابوہریرہ سے روایت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ماہ رمضان کی پہلی رات کو شیطان اور سرکش جن زنجیروں میں جکڑ دیے جاتے ہیں، دوزخ کے دروازے بند جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اس کا کوئی دروازہ بند نہیں ہوتا۔ ایک منادی ندا دیتا ہے۔ بھلائی کے طلب گار! آگے بڑھ۔ بدی چاہنے والے، باز آجا، اللہ گنہگاروں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے ... بخاری ... ابن ماجہ .....

٢ ـ حدثنا أبو كريب محمد بن العلاء بن كريب، حدثنا أبو بكر بن عياش عن الأعمش، عن أبي صالح، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا كان أول ليلة من شهر رمضان، صفدت الشياطين، ومردة الجن، وغلقت أبواب النار، فلم يفتح منها باب، وفتحت أبواب الجنة، فلم يغلق منها باب... الحديث[10]. وروى في البحار هذا الحديث عن نوادر الراوندي، عن الوراق، عن أبي محمد، عن عماد بن أحمد، عن الحسين بن علي، عن محمد بن العلاء مثله[11]. وروى الترمذي هذا الحديث، عن محمد بن اسماعيل، عن الحسن بن الربيع، عن أبي الأحوص، عن الأعمش، عن مجاهد، مثله[12]. وروى مسلم نحوه عن يحيى وقتيبة وابن حجر جميعاً، عن اسماعيل بن جعفر، عن ابي سهيل، عن أبيه، عن أبي هريرة. وروى نحوه بسندين آخرين[13]. وروى عبدالرزاق، عن معمر، عن أيوب، عن أبي قلابة عن النبي (ص) نحوه، وأخرج نحوه أيضاً عن معمر، عن أبان، عن ابن جبير ـ قال ـ أحسبه ـ عن ابن عمر[14]. وأخرج النسائي نحوه عن اسماعيل كمسلم[15]. ونحوه أيضاً عن ابراهيم بن يعقوب، عن ابن أبي مريم، عن نافع بن يزيد، عن عقيل، عن ابن شهاب، عن أبي سهيل. وأيضاً عن عبدالله بن سعد، عن عمي، عن أبي، عن صالح، عن ابن شهاب، عن

نافع بن أبي أنس، عن أباه. ونحوه أيضاً بأسانيد أخرى، فراجع[۱۶]. ورواه الحاكم في المستدرك باسناد من ابي بكر مثله[۱۷]. وأخرج مالك نحوه عن عمه أبي سهيل[۱۸]. وأخرج الدارمي عن أبي الربيع الزهراني، عن اسماعيل كمسلم[۱۹].

۲۔ .... ابوہریرہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ماہ رمضان کی پہلی رات کو شیطان اور سرکش جن زنجیروں میں جکڑ دیے جاتے ہیں، دوزخ کا ایک دروازہ بھی کھلا اور جنت کا ایک دروازہ بھی بند نہیں رہتا.... یہ حدیث مروی ہے بخاری میں نوادر الراوندی سے ..... ترمذی ... مسلم ...

باب دوم

ماہ رمضان میں گناہ بخشے جاتے ہیں

روایاتِ اہلِ بیتؑ :

۱ ــ في المجالس، عن أبيه، عن محمد بن أبي القاسم، عن محمد بن علي الكوفي، عن نصر بن مزاحم، عن المسعودي، عن العلا بن يزيد القرشي، قال: قال الصادق (ع): حدثني أبي، عن أبيه، عن جده عن رسول الله (ص) (في حديث قال): من صام شهر رمضان، وحفظ فرجه ولسانه، وكفّ اذاه عن الناس، غفر الله له ذنوبه ماتقدّم منها وما تأخّر، وأعتقه من النار، وأحلّه دار القرار... (الحديث)[۲۰]. ونحوه مارواه في الكافي، عن عدة من أصحابنا، عن سهل بن زياد، عن بكر بن صالح، عن ابن سنان، عن منذر بن يزيد، عن يونس بن ظبيان، عن الصادق (ع)[۲۱].

۱۔ .... علا بن یزید قرشی نے امام جعفر صادقؑ سے روایت کی، حضرت نے اپنے آباء کرامؑ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ... جس نے ماہ رمضان میں روزے رکھے، شرمگاہ اور زبان کی حفاظت کی، لوگوں کو اذیت نہ دی اللہ اس کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے گا۔ دوزخ سے آزاد کرے گا جنت میں منزل دے گا .... اسی قسم کی حدیث کافی میں ....

٢ ـ محمد بن الحسن بإسناده عن علي بن الحسن بن فضال، عن محمد بن عبيد، عن عبد (عبيد) الله بن موسى، عن نصر بن علي، عن النضر بن سنان، عن أبي سلمة بن عبدالرحمن بن عوف، عن أبيه، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: شهر رمضان، شهر فرض الله عليكم صيامه، فمن صامه ايماناً واحتساباً خرج من ذنوبه كيوم ولدته أمه[٢٢]. وروى نحوه في البحار، عن آمالي الطوسي، عن المفيد، عن الجعابي، عن محمد المروزي، عن عبيد الله العبسي، عن حماد، عن محمد بن عمر، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة، ونقله في البحار عن مجالس الشيخ (ره)، عن ابن عبدون، عن ابن الزبير مثله[٢٣].

۲۔ . . . . . . عبد الرحمٰن بن عوف نے اپنے والد انھوں نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں اللہ نے تم پر اس ماہ کے روزے فرض کیے ہیں، جو شخص اس میں ایمان کے ساتھ قربۃً الی اللہ روزے رکھتا ہے وہ گناہوں سے یوں پاک ہوتا ہے جیسے وہ شکم مادر سے پیدا ہوا تھا۔ بحار میں امالی طوسی سے . . . . .

٣ ـ البحار عن دعائم الإسلام، عن النبي (ص) أنه صعد المنبر، فقال: آمين، ثم قال: أيها الناس ان جبريل استقبلني، فقال: يا محمد من أدرك شهر رمضان فلم يغفر له، فمات فأبعده الله قل آمين، فقلت آمين. ونقله أيضاً عن نوادر الراوندي، قال (وبهذا الإسناد عن محمد بن أحمد، عن اسماعيل بن اسحاق، عن عبدالله بن مسلمة، عن سلمة بن وردان، قال: سمعت أنس بن مالك فساق الحديث. ونقل نحوه في البحار عن ثواب الأعمال والامالي، عن أبي، عن سعد، عن ابن عيسى، عن الحسين بن سعيد، عن فضالة، عن سيف بن عميرة، عن عبيدالله بن عبدالله، عمّن سمع الباقر (ع)[٢٤]. ونحوه أيضاً عن كتاب الامامة والتبصرة عن سهل بن أحمد، عن محمد بن محمد بن الأشعث، عن موسى بن اسماعيل بن موسى بن جعفر (ع)[٢٥].

۳۔ بحار میں، دعائم الاسلام سے نقل ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالائے منبر آئے اور فرمایا: آمین۔ پھر فرمایا: لوگو! جبرئیل آئے اور کہنے لگے ۔ محمدؐ! جس نے ماہ رمضان پایا اور اس کے گناہ نہ بخشے گئے اور وہ مر گیا، اللہ اسے دور رکھے ۔ کہیے، آمین۔

میں نے کہا: آمین۔ مجلسیؒ نے "نوادر الراوندی" سے .... ثواب الاعمال، امالی.... کتاب الامامت و التبصرہ سے ......

روایاتِ اہلِ سنّت:

١ ـ حدثنا هنّاد، حدثنا عبده والمحاربي، عن محمد بن عمرو، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من صام رمضان وقامه ايماناً واحتساباً، غفرله ما تقدَّم من ذنبه... الحديث[٢٦]. ونحوه أيضاً عن عبد بن حميد، عن عبد الرزاق، عن معمر، عن الزهري، عن أبي سلمة. وأخرجه عبدالرزاق، عن معمرومالك، عن الزهري، عن أبي سلمة مثله، وليس فيه (صام رمضان) وكذا عن مالك، عن ابن شهاب، عن حميد بن عبدالرحمان، عن النبي (ص)[٢٧]. وأخرجه البخاري عن مسلم بن ابراهيم، عن هشام، عن يحيى، عن أبي سلمة. وأخرج نحوه عن يحيى بن بكير، عن الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب، عن ابي سلمة، وعن عبدالله بن يوسف، عن مالك، عن ابن شهاب، عن حميد، عن ابي هريرة. وأخرج النسائي نحوه عن محمد بن عبدالله، عن شعيب، عن الليث، عن خالد، عن ابن أبي هلال، عن ابن شهاب، عن سعيد بن المسيب. وكذا عن محمد بن جبله، عن المعافي، عن موسى، عن اسحاق بن راشد، عن الزهري، عن عروة، عن عائشة[٢٨]. وأخرجه عن الربيع بن سليمان، عن ابن وهب، عن يونس، عن ابن شهاب مثل البخاري. وأخرج نحوه بأسانيد متعددة عن أبي هريرة، فراجع[٢٩]. وأخرج أبو داود الطيالس عن سفيان، عن علي الحداني، عن ابن شيبان، عن أبي سلمة وفيه زيادة في أوله نحوه[٣٠]. وأخرج البزار عن أسد بن خالد العسكري، عن جعفر بن عون، عن ابراهيم بن اسماعيل بن مجمع، عن الزهري كالنسائي.

١۔ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ماہ رمضان میں باایمان و خالصاً للہ روزہ رکھتا اور نمازیں پڑھتا ہے، اللہ اس کے گذشتہ گناہ معاف کرتا ہے .... یہ حدیث عبد بن حمید۔ عبدالرزاق۔ معمر۔ زہری ابی سلمہ سے بھی مروی ہے۔ اور عبدالرزاق نے ..... اس طرح روایت کی ہے مگر

اس میں "صام رمضان" کا فقرہ نہیں ہے........... بخاری نے مسلم بن ابراہیم کی سند سے.......... نسائی نے....... ابوداؤد طیالسی نے....... البزاز نے اسد بن خالد عسکری کی سند سے........

۲ ـ حدثني أبو محمد عبدالله بن يوسف الأصبهاني، أنبأنا أبوسعيد أحمد بن محمد بن زياد البصري بمكة، حدثنا الحسن بن محمد بن الصباح الزعفراني، حدثنا سفيان بن عيينة، عن الزهري، عن أبي سلمة بن عبدالرحمن، عن أبي هريرة، عن النبي (ص)، قال: من صام رمضان ايماناً واحتساباً، غفرله ما تقدّم من ذنبه. ونحوه مارواه البيهقي عن ابي الحسن، عن ابن عبيد الصفار، عن أبي مسلم، عن مسلم، عن هشام، عن يحيى، عن أبي سلمة نحوه بزيادة في فضل قيام ليلة القدر، ونحوه أيضاً مارواه البيهقي عن ابوطاهر، عن أبوحامد، عن محمد بن حيويه، عن ابي اليمان، عن شعيب، عن أبي الزناد، عن الأعرج نحوه[31]. وأخرجه البخاري في ذيل حديثٍ، عن مسلم بن ابراهيم، عن هشام، عن يحيى عن أبي سلمة، وأخرجه أيضاً عن علي بن عبدالله، عن سفيان مثله[32]. ورواه ابن ماجه عن ابن أبي شيبه، عن محمد بن فضيل، عن يحيى بن سعيد، عن أبي سلمة[33]. وأخرجه النسائي عن قتيبة، عن سفيان مثله، وعن اسحاق ابن ابراهيم، عن سفيان مثله، وعن علي بن المنذر، عن ابن فضيل، عن يحيى بن سعيد، عن ابي سلمة مثله[34]. ورواه الحميدي، عن سفيان مثله بزيادة في ليلة القدر[35]. ورواه أبو داود الطيالسي، عن هشام كالبيهقي في الثاني[36]. وروى الدارمي عن وهب بن جرير، عن هشام كالبخاري[37].

۲۔ مجھ سے حدیث بیان کی ابو محمد عبداللہ بن یوسف اصفہانی نے...... .... ابی سلمہ بن عبدالرحمٰن نے ابوہریرہ سے روایت کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایمان ونیت قربت کے ساتھ جو بھی رمضان کے روزے رکھتا ہے۔ اللہ اس کے گذشتہ گناہ بخش دیتا ہے۔ اسی طرح کی روایت بیہقی نے ابوالحسن ....

....

٣ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ، أنبأنا أبو محمد الحسن بن حليم بن محمد الدهقان بمرو، أنبأنا أبو الموجه، أنبأنا عبدان، أنبأنا عبدالله بن المبارك ، أنبأنا يحيى بن أيوب، حدثنا عبدالله بن قرط، أن عطاء بن يسار حدَّثه أنه سمع أبا سعيد الخدري، يقول: سمعت رسول الله (ص) يقول: من صام رمضان، فعرف حدوده وتحفَّظ له ما ينبغي له أن يتحفَّظ فيه، كفَّر ما قبله[٣٨]. ورواه الهيثمي عن أحمد وأبو يعلى وابن ابي حاتم[٣٩].

۳۔ .... عطا بن یسار سے حدیث ہے کہ ابو سعید خدری سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ رسول اللہؐ سے میں نے سنا حضرت فرماتے تھے، جو بھی رمضان میں روزہ رکھتا اور اس کے آداب و قواعد کی پابندی کرتا ہے اس کے گذشتہ گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے ۔ اس روایت کو ہیثمی نے احمد و ابو یعلے و ابن ابی حاتم سے نقل کیا ہے ۔

٤ ــ أخبرنا أبو عبدالله الحافظ وأبو سعيد بن أبي عمرو، قالا: حدثنا أبو العباس هو الأصم، حدثنا الربيع بن سليمان، حدثنا عبدالله بن وهب، عن سليمان يعني ابن بلال، عن كثير بن زيد (ح وأخبرنا) القاضي أبو عمرو محمد بن الحسين بن محمد بن الهيثم البسطامي، أنبأنا أحمد بن محمود بن خرزاد قاضي الأهواز، حدثنا موسى بن اسحاق الأنصاري، حدثنا ابراهيم بن حمزة الزبيري، حدثنا عبدالعزيز بن أبي حازم، عن كثير بن زيد، عن الوليد بن رباح، عن أبي هريرة، أن رسول الله (ص) ارتقى المنبر، فقال: آمين (الى ان قال) قال لي جبريل (ع) رغم أنف عبد، دخل عليه رمضان، فلم يغفر له، فقلت آمين ... (الحديث)[٤٠].

۴۔ ہمیں خبر دی ابو عبد اللہ الحافظ و .... ابو ہریرہ سے روایت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالائے منبر تشریف لائے اور فرمایا: آمین ــ ... . مجھ سے جبرئیل نے کہا: وہ بندہ رسوا ہے جس پر رمضان آیا اور اس کے گناہ نہ بخشے گئے ۔ میں نے کہا ــ آمین . . . . .

باب سوم

ماہِ رمضان کے متعدد فضائل

روایاتِ اہلِ بیتؑ :

١ ــ وفي معاني الأخبار عن علي بن عبدالله بن أحمد بن بابويه، عن علي بن أحمد الطبري، عن الحسن بن علي العدوي، عن خراش، عن أنس، قال: قال رسول الله (ص): قال الله عزّوجلّ كل أعمال ابن آدم بعشرة أضعافها الى سبعمائة ضعف، إلاّ الصبر، فإنه لي، وأنا أُجزي به، فثواب الصبر مخزون في علم الله والصبر الصوم... ونقله في البحار[٤١].

١۔ معانی الاخبار میں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بقولِ انس، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : اللہ عزّ اسمہ کا ارشاد ہے ، فرزند آدمؑ کے تمام اعمال دس سے سات سو گنا تک بڑھتے ہیں سوائے صبر کے، وہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں دوں گا، تو صبر کا ثواب علم الٰہی میں راز ہے ــ اور صبر کے معنی ہیں صوم ۔۔ ۔ یہ روایت بحار میں ہے ۔

٢ ــ علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن أبي عمير، عن سلمة صاحب السابري، عن أبي الصباح الكناني، عن أبي عبدالله (ع) أنه قال: للصائم فرحتان: فرحة عند افطاره، وفرحة عند لقاء ربه[٤٢]. ونحوه ما نقله في البحار عن الخصال، عن ماجيلويه، عن عمه، عن البرقي، عن الحسين بن سعيد رفعه الى الصادق (ع) وكذا ما نقله عن الأمالي، عن جماعة عن أبي المفضل، عن اسحاق بن محمد بن هارون، عن أبيه، عن أبي حفص الأعشى، عن عمرو بن خالد، عن زيد بن علي، عن آبائه عن رسول الله (ص) ونحوه أيضاً ما نقله في البحار عن الخصال بسنده، عن ابن عباس، عن النبي (ص) (وذكرنا سنده في حديث الصوم لي) وفيه زيادة (فيطعم ويشرب) وهذا المتن نقله في البحار عن معاني الأخبار، عن علي المذكر، عن علي الطبري، عن الحسن بن علي بن زكريا، عن خراش، عن أنس، عن النبي (ص)[٤٣]. وأرسله الفقيه ضمن حديث، وقد يظهر من ملاحظة الحديث السابق ان هذا الحديث مُقطّع، وأرسله ايضاً مقطّعاً.

۲۔ علی بن ابراہیم . . . . ابوعبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا، روزہ دار کو دو خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ایک خوشی افطار کے وقت، اور خوشی لقاء رب کے لمحہ ایسی ہی روایت بحار میں خصال سے . . . . ایک حدیث کے ضمن میں ارسال ہے . . . . . .

۳ ـــ علي عن أبيه ومحمد بن اسماعيل، عن الفضل بن شاذان جميعاً، عن ابن أبي عمير، عن بعض أصحابنا، عن أبي عبدالله (ع) قال: أوحى الله عزَّوجلَّ الى موسى (ع) (الى أنْ قال): يا موسى لخلوف فم الصائم أطيب عندي من ريح المسك [44]. ونحوه مارواه في البحار عن رسول الله (ص) ونقلنا سنده في حديث «للمؤمن فرحتان». ونحوه ما نقله في البحار عن الخصال، عن ابن عباس عن النبي (ص) (ونقلنا سنده في حديث «الصوم لي») وأرسله الصدوق عن الصادق (ع) [45].

۳۔ علی نے اپنے والد (ابراہیم) سے اور محمد بن اسماعیل نے فضل بن شاذان سے.... . . . . ابوعبد اللہ علیہ السلام نے فرمایا: اللہ عز اسمہ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی کی.... موسیٰ! روزے دار کی خوشبوئے دہن مجھے مشک کی خوشبو سے زیادہ پسند ہے۔ اسی طرح کی روایت بحار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے . . . . اور صدوق نے اس حدیث کو مرسل نقل کیا ہے . . . . . .

٤ ـــ علي بن ابراهيم بن هاشم، عن أبيه عن حماد بن عيسى، عن حريز، عن زرارة عن أبي جعفر (ع) قال (في حديث) وقال رسول الله (ص): «الصوم جنة من النار» [46]. ونحوه مارواه في الكافي عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد بن عيسى، عن ابن فضال، عن ثعلبة، عن علي بن عبد العزيز، عن أبي عبدالله [47]. ونحوه ما نقله في البحار عن معاني الأخبار، عن علي بن عبدالله المذكر، عن علي بن أحمد الطبري، عن الحسن بن علي بن زكريا، عن خراش مولى أنس، عن أنس، عن رسول الله (ص) [48]. ونحوه أيضاً مانقله في البحار عن المحاسن، عن ابن فضال، عن ثعلبة، عن علي بن عبدالعزيز كما في الكافي [49]. وأرسله في الصدوق عن الباقر (ع) عن النبي (ص) وأرسله ضمن حديث [50].

۴۔ علی بن ابراہیم بن ہاشم .... زرارہ نے حضرت ابوجعفر علیہ السلام سے حدیث نقل کی ہے .... اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ـ روزہ عذاب کے لیے ڈھال ہے" اور کافی میں محمد بن یحییٰ ...... بحار میں معانی الاخبار سے .... نیز المحاسن سے .... صدوق نے ......

٥ ــ علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن سلمة صاحب السابري، عن أبي الصباح، عن أبي عبدالله (ع) قال: إنَّ الله تبارك وتعالى: يقول: الصوم لي وأنا أُجزي عليه [٥١]. ونحوه ما نقله في البحار عن الخصال، عن عبدوس بن علي بن العباس، عن عبدالله بن يعقوب، عن محمد بن يونس، عن أبي عامر، عن زمعة، عن سلمة، عن عكرمة، عن ابن عباس، عن النبي (ص). ونقله في البحار عن المجالس، عن ابن عبدون، عن ابن الزبير، عن ابن فضال، عن فضل بن محمد الأموي، عن ربعي ابن عبدالله، عن الفضيل بن يسار، عن أبي جعفر (ع) قال: قال رسول الله (ص) وساق الحديث مثله [٥٢].

۵۔ علی بن ابراہیم .... ابوالصباح نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے حضرت نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے۔ روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا (میری رضا اس کی جزا میں دی جائے گی)........

روایاتِ اہلِ سنّت:

١ ــ أخبرنا أبوزكريا بن أبي اسحاق المزكي بنيسابور أبومحمد الحسن بن أحمد بن ابراهيم بن فراس بمكة حرسها الله تعالى، قالا: أنبأنا أبوحفص عمر بن محمد أحمد الجمحي، حدثنا علي بن عبدالعزيز، حدثنا أبونعيم الفضل بن دكين، حدثنا الأعمش عن أبي صالح، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: يقول الله عزّوجلّ الصوم لي وأنا أُجزي به. يدع شهوته وأكله وشربه من أجلي، والصوم جنة، وللصائم فرحتان؛ فرحة إفطاره، وفرحة عند لقاء ربه، ولخلوف فيه أطيب عند الله من ريح المسك [٥٣]. وروى نحوه عبدالرزاق، عن

معمر، عن همام، عن أبي هريرة[54] وأخرج النسائي نحوه عن هلال بن العلاء، عن ابي، عن عبيدالله عن زيد، عن أبي اسحاق، عن عبدالله بن الحارث، عن علي (ع). وأيضاً عن اسحاق بن ابراهيم، عن جرير، عن الأعمش مثله[55]. ونحوه عن علي بن حرب، عن محمد بن فضيل، عن أبي سنان، عن ضرار بن مرة، عن أبي صالح، عن أبي سعيد. وأيضاً عن سليمان بن داود، عن ابن وهب، عن عمرو، عن المنذر بن عبيد، عن أبي صالح السمان، عن أبي هريرة[56] وروى الدارمي نحوه عن يزيد بن هارون، عن محمد بن عمرو، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة[57].

۱- ابوزکریا . . . . ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، اللہ ارشاد فرماتا ہے: روزہ میرے لیے ہے اور اس کا بدلہ میری طرف سے دیا جائے گا. روزہ دار اپنے خواہشات اور کھانا پینا میرے لیے چھوڑتا ہے، اور روزہ ڈھال ہے۔ اور روزے دار کو دو مسرتیں ملتی ہیں۔ ایک خوشی افطار کے وقت، ایک خوشی حضور پروردگار میں حاضری کے وقت۔ روزے دار کی خوشبو اللہ کے نزدیک مشک سے بہتر ہے . . . عبدالرزاق نے معمر سے . . . . نسائی نے ہلال . . . . . دارمی نے یزید بن ہارون کی سند . . . .

۲ ـ أخبرنا أبوزكريا بن أبي اسحاق، وأبوبكر بن الحسن، قالا: حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، حدثنا بحر بن نصر، حدثنا عبدالله بن وهب، أخبرني جرير بن حازم، عن ابن أبي سيف، عن الوليد بن عبدالرحمن، عن غياض بن غطيف، عن ابي عبيدة بن الجراح، قال: سمعت رسول الله (ص) يقول: الصوم جنة مالم تخرقه.[58] ونحوه مارواه مسلم عن زهير، عن سفيان، وعن عبدالله بن مسلمة وقتيبة بن سعيد، عن المغيرة، عن الحزامي جميعاً، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة[59]. وأخرج ابن ماجة نحوه، عن ابن رمح، عن الليث، عن ابن أبي حبيب، عن سعيد بن أبي هند، عن مطر، عن عثمان بن أبي العاص[60]. وأخرج النسائي نحوه عن معاذ بأسانيد متعددة. وكذا عن أبي هريرة، وعن قتيبة، عن الليث كابن ماجة. وأخرج الحديث نفسه عن يحيى بن حبيب، عن حماد، عن واصل، عن بشار بن أبي سيف، عن الوليد مثله[61] وأخرجه الدارمي عن عمرو بن عون، عن خالد بن عبدالله، عن واصل، عن بشار مثله[62].

۲۔ ابوزکریا ابن ابی اسحاق .... ابوعبیدہ بن جراح نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: روزہ ڈھال ہے جب تک اسے توڑو نہیں ... مسلم نے زہیر ...... ابوہریرہ سے ..... ابن ماجہ نے ابن رمح ..... نسائی نے معاذ ...
.... ابن ماجہ ...... دارمی ....

۳ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أنبأنا أبوالحسن أحمد بن محمد بن عبدوس، حدثنا عثمان بن سعيد، حدثنا القعنبي فيما قرء على مالك، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة انَّ رسول الله (ص) قال: والذي نفسي بيده لخلوف فم الصائم اطيب عند الله من ريح المسك، إنما يترك شهوته وطعامه وشرابه من أجلي والصيام لي، وأنا أُجزي به كل حسنة بعشرة أمثالها الى سبع مائة ضعف، إلاّ الصيامن لي، وأنا أُجزي به[٦٣]. وروى الترمذي نحوه، عن عمران القزاز، عن عبد الوارث بن سعيد، عن علي بن زيد، عن ابن المسيب، عن أبي هريرة[٦٤]. وروى مسلم نحوه عن ابن أبي شيبة، عن أبومعاوية ووكيع عن الأعمش (ح) وعن زهير بن حرب، عن جرير، عن الأعمش (ح) وعن الأشج، عن وكيع، عن الأعمش، عن أبي صالح، عن أبي هريرة[٦٥]. وروى عبدالرزاق نحوه وبزيادة «فرحتان للصائم» عن الثوري، عن الأعمش، عن ذكوان، عن أبي هريرة[٦٦]. وأخرجه البخاري في ذيل حديث عن عبدالله بن مسلم، عن مالك مثله[٦٧]. وروى أبو داود الطيالسي نحوه عن شعبة، عن محمد بن أبي هريرة[٦٨]. وروى الدارمي عن يزيد بن هارون، عن محمد بن عمرو، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة نحوه[٦٩].

۳۔ ابوعبداللہ حافظ .... ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم اس کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے روزے دار کے دہن کی خوشبو اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ بہتر ہے۔ روزہ دار اپنے خواہشات اور کھانا پینا میری خاطر چھوڑتا ہے اور روزہ میرے لیے ہے اور میری خاص رحمت اس کا بدلہ ہے۔ ہر نیکی کا بدلہ دس گنے سے سات سو گنے تک ہوگا سوائے روزے کے جو فقط میرے لیے۔ اور میں خود یعنی رضاء خاص۔ اس کا بدلہ ہے ....
ترمذی ..... مسلم .... بخاری ...... ابوداؤد طیالسی ....

توحید ۱۱۴

..... واری

الرّیّان جنّت کے ایک دروازے کا نام

الف ۔ روایاتِ اہلِ بیتؑ :

۱ ـــ وفي معاني الأخبار عن علي بن عبدالله بن أحمد بن بابويه، عن علي بن أحمد الطبري، وعن الحسن بن علي العدوي، عن خراش، عن أنس، قال: قال رسول الله(ص): إنَّ للجنة باباً يدعى الريان لا يدخل منه إلّا الصائمون[٧١]. ونقله في البحار عن معاني الأخبار بالسند المتقدم، ونقله أيضاً عن أعلام الدين مرسلاً بزيادة: فإذا دخل آخرهم أغلق ذلك الباب[٧٢].

۱۔ معانی الاخبار ... انس .... رسول اللہؐ نے فرمایا: جنّت میں ایک دروازہ ہے جسے الرّیان کہتے ہیں۔ اس میں صرف روزہ رکھنے والے ہی جاسکیں گے ... بحار میں معانی الاخبار سے۔ نیز اعلام الدین کے حوالے سے باضافہ۔ فاذا دخل آخرھم اغلق ذلک الباب۔ جب آخری شخص داخل ہوجائے گا تو دروازہ بند کردیا جائے گا۔

ب ۔ روایاتِ اہلِ سنت :

۱ ـــ وأخبرنا أبو علي الروذباري بطوس، أنبأنا أبوالنضر الفقيه، حدثنا عثمان بن سعيد، حدثنا سعيد بن أبي مريم إملاء، حدثنا أبوغسان حدثني أبوحازم، عن سهل بن سعد ان رسول الله(ص) قال: «إنَّ للجنة ثمانية أبواب، منها باب يسمى الريان، لا يدخله الا الصائمون»[٧٣]. وروى الترمذي نحوه عن محمد بن بشار، عن أبو عامر القعدي، عن هشام بن سعد، عن أبي حازم، عن سهل[٧٤]. وروى مسلم نحوه بزيادة عن ابن أبي شيبة، عن خالد بن مخلد، عن سلمان بن بلال، عن أبي حازم[٧٥]. وأخرج البخاري نحوه بزيادة عن خالد بن مخلد، عن سليمان بن بلال، عن أبي حازم[٧٦]. وروى ابن ماجة نحوه عن عبدالرحمن بن ابراهيم، عن ابن أبي فديك، عن هشام بن سعد، عن أبي حازم[٧٧]. وأخرج النسائي نحوه عن علي بن حجر، عن سعيد بن عبدالرحمن، عن أبي حازم[٧٨]. وعن قتيبة، عن يعقوب، عن أبي حازم[٧٩]. وأخرج أحمد نحوه، عن أحمد بن عبدالملك، عن حماد بن زيد، عن أبي حازم[٨٠].

۱۔ ابوعلی رودباری نے طوس میں ..... سہل بن سعد ..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم نے فرمایا جنت کے آٹھ دروازے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام الرّیان ہے۔ اس سے صرف روزہ دار ہی گذریں گے ..... ترمذی ..... مسلم .... ابن ماجہ .... نسائی ....

باب پنجم
روزہ دار کی دعا قبول ہوتی ہے

الف۔ روایاتِ اہل بیتؑ :

١ ــ ومنه ــ كتاب فضائل الأشهر الثلاثة ــ عن محمد بن الحسن بن أحمد بن الوليد ــ ره ــ عن محمد بن الحسن الصفار، عن محمد بن الحسين بن ابي الخطاب، عن علي بن النعمان، عن عبدالله بن طلحة النهدي، عن جعفر بن محمد (ع)، عن أبيه، عن آبائه، عن علي (ع) قال: قال رسول الله (ص): أربعة لا ترد لهم دعوة، و يفتح لهم أبواب السماء، و يصير الى العرش: دعاء الوالد لولده، والمظلوم على من ظلمه، والمعتمر حتى يرجع، والصائم حتى يفطر. ونحوه في استجابة الدعاء للصائم عن دعوات الراوندي مرسلاً عن أبي الحسن (ع) «إنَّ للصائم عند افطاره دعوة لا ترد» [٨٠].

١۔ ..... محمد بن حسن بن احمد بن ولید .... امیرالمومنینؑ سے روایت ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا چار آدمیوں کی دعا رد نہیں ہوتی۔ آسمان کے دروازے ان کے لیے کھلے رہتے ہیں اور دعا عرش تک جاتی ہے۔ باپ کی دعا بیٹے کے حق میں، مظلوم کی بددعا ظالم کے لیے۔ عمرے والے کی دعا واپسی تک۔ روزدار کی دعا افطار تک ... دعوات الراوندی میں مرسل روایت ہے، ابوالحسنؑ نے فرمایا، افطار کے وقت روزہ دار کی دعا رد نہیں ہوتی۔

ب۔ روایاتِ اہل سنت :

١ ــ حدثنا هشام بن عمار، حدثنا الوليد بن مسلم، حدثنا اسحاق بن عبيدالله المدني، قال: سمعت عبدالله بن أبي مليكة، يقول: سمعت عبدالله بن عمرو بن العاص يقول: قال رسول الله (ص): «إنَّ للصائم عند فطره لدعوة ماترد» [٨١]. ورواه الحاكم عن عبدالعزيز بن عبدالرحمن، عن محمد بن علي بن زيد، عن الحكم بن موسى، عن الوليد مثله، وفيه زيادة في آخره [٨٢]. وأخرج ابوداود الطيالسي، عن أبي محمد المليكي، عن عمرو بن شعيب، عن أبيه، عن جده حديثاً بهذا المعنى [٨٣]. وأخرج البزار نحوه بالسند المذكور في رواية العتق [٨٤].

۱۔ ...... ھشام بن عمار .... عبداللہ بن عمر عاص سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : روزہ دار کی دعا افطار کے وقت رد نہیں ہوتی ...
....

۲ ــ حدثنا علي بن محمد، حدثنا وكيع عن سعدان الجهني، عن سعد أبي مجاهد الطائي (وكان ثقة) عن أبي مدلة (وكان ثقة) عن أبي هريرة قال: قال رسول الله (ص): ثلاثة لا تُرد دعوتهم: الإمام العادل، والصائم حتى يفطر، ودعوة المظلوم يرفعها الله دون الغمام يوم القيامة وتفتح لها أبواب السماء و يقول بعزتي لأنصرنّك ولو بعد حين[۸۵].

۲۔ علی بن محمد .... وکیع .... ابوہریرہ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : تین آدمیوں کی دعا رد نہیں ہوتی : امام عادل ۔ روزہ دار جب تک افطار کرے ۔ اور مظلوم کی دعا جو قیامت کے دن بادلوں تک جاتی ہے یہاں تک کہ آسمان کے دروازے کھلتے ہیں اور صدا آتی ہے اپنی عزت (وجبروت) کی قسم خواہ کچھ دیر بعد سہی تیری مدد ضرور کروں گا ۔

باب ششم

روزہ زکاتِ جسم ہے

روایاتِ اہل بیتؑ :

۱ ــ علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن عبدالله بن المغيرة، عن اسماعيل بن أبي زياد، عن أبي عبدالله، عن آبائه (ع) (في حديث) ولكل شيء زكاة، وزكاة الأبدان الصيام. ونحوه في الكافي بسنده عن موسى بن بكر مقطوعاً[۸۶]. وهذا الحديث المقطوع رواه المفيد في المقنعة مرسلاً عن الصادق (ع)[۸۷]. ونحوه في المحاسن عن عدة من أصحابنا، عن هارون بن مسلم، عن مسعدة، عن الصادق[۸۸]. ونحوه في نهج البلاغة[۸۹]. وأخرجه في الأمالي عن ابن المغيرة بإسناده الى السكوني الى الصادق (ع) وعن كتاب فضائل الأشهر الثلاثة عن جعفر بن

علي بن الحسن بن علي بن عبدالله بن المغيرة، عن اسماعيل مثله، وعن نوادر الراوندي بإسناده الى موسى بن جعفر(ع) عن آبائه مثله [٩٠]. ومرسلاً عن المحاسن والدعائم [٩١].

۱۔ علی بن ابراہیم .... اسماعیل بن ابی زیاد نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے روایت کی ہے . . . . . ہر شے کی زکات ہے، زکات بدن روزہ ہے ... کافی .... المقنعہ .... المحاسن ...... نہج البلاغہ .... الامالی .... فضائل الاشہر الثلاثہ .... نوادر الراوندی ...... المحاسن ۔ دعائم الاسلام۔ ....

روایات اہل سنت :

١ ــ حدثنا أبوبكر، حدثنا عبدالله بن المبارك (خ) وحدثنا محرز بن سلمة العدني، حدثنا عبدالعزيز بن محمد جميعاً، عن موسى بن عبيدة، عن جمهان، عن أبي هريرة قال: قال رسول الله (ص): «لكل شيء زكاة، وزكاة الجسد الصوم» [٩٢].

۱۔ ابوبکر، ...... عبداللہ بن مبارک ...... ابوہریرہ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر شے کی زکات ہے، زکات بدن روزہ ہے ....

باب ھفتم

شکر گذار شکم سیر روزہ دار جیسا ہے

روایاتِ اہل بیت ؑ :

١ ــ البحار عن كتاب الإمامة والتبصرة، عن القاسم بن علي العلوي، عن محمد بن أبي عبدالله، عن سهل بن زياد، عن النوفلي، عن السكوني، عن جعفر بن محمد، عن أبيه، عن آبائه، قال: قال رسول الله (ص): الطاعم الشاكر له من الأجر كأجر الصائم المتسحر [٩٣]. ومثله في كتاب قرب الاسناد عنه ــ هارون بن مسلم ــ عن مسعدة بن

صدقة، عن جعفر عليه السلام [94].

۱۔ بحار...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: شکر گذار شکم سیر کا اجر سحری کھانے والے روزے دار جیسا ہے...... قرب الاسناد۔

روایات اہل سنّت:

١ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ وأبوسعيد بن أبي عمرو، قالا: حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا الربيع بن سليمان، حدثنا ابن وهب عن سليمان بن بلال، عن محمد بن عبدالله بن أبي حرة، عن عمه حكيم بن أبي حرة، عن سلمان الأغر، عن أبي هريرة، قال: لا أعلمه إلاّ عن رسول الله (ص) انه قال: انّ للطاعم الشاكر من الأجر مثل ما للصائم الصابر[95]. وأخرجه ابن ماجة، عن اسماعيل بن عبدالله الرقي، عن عبدالله بن جعفر، عن عبدالعزيز بن محمد، عن محمد بن عبدالله مثله. وكذا عن يعقوب بن حميد، عن محمد بن معن، عن أبيه، عن عبدالله بن عبدالله الأموي، عن معن بن محمد، عن حنظلة الأسلمي، عن أبي هريرة[96]. وأخرج الحاكم نحوه عن اسماعيل بن نجيد السلمي، عن جعفر بن أحمد الحافظ، عن اسماعيل بن بشر، عن عمر بن علي، عن معن[97].

۱۔ ابوعبداللہ الحافظ......... ابو ہریرہ نے کہا: مجھے یہی یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: شکر گذار شکم سیر کا اجر صابر روزہ دار جیسا ہے.........

باب ہشتم

اللہ ہر شب گنہ گاروں کو دوزخ سے آزاد کرتا ہے

روایاتِ اہل بیتؑ

١ ـ علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن ابن أبي عمير، عن جميل بن صالح، عن محمد بن مروان، قال: سمعت أبا عبدالله (ع) يقول: إنّ لله عزّوجلّ في كل ليلة من شهر رمضان عتقاء وطلقاء من النار إلاّ من أفطر

علی مسکر، فإذا کان في آخر لیلة منه أعتق فیها مثل ما أعتق في جمیعه[98]. ورواه الفقیه بسنده عن محمد بن مروان مثله[99].

۱۔ علی بن ابراہیم .... محمد بن مروان نے حضرت ابوعبد اللہ علیہ السلام سے سنا، اللہ، ماہ رمضان کی راتوں کو گنہ گاروں کو جہنم سے آزاد کرتا ہے، نشے سے افطار کرنے والا آزادی سے مستثنیٰ ہے۔ پھر آخری شب کو تمام راتوں کے برابر گنہ گار دوزخ سے آزاد ہوتے ہیں۔ فقیہ میں بھی محمد بن مروان سے یہی روایت ہے۔

روایاتِ اہل سنت:

۱ ــ حدثنا أبو کریب، حدثنا أبو بکر بن عیاش عن الأعمش، عن أبي سفیان، عن جابر، قال: قال رسول الله (ص): إنّ لله عند کل فطر عتقاء وذلك في کل لیلة[100]. ونقله الهیثمي عن أحمد والطبراني في الکبیر، ونُقِلَ عن أنس: انّ لله عزّوجلّ عتقاء في کل لیلة من شهر رمضان إلّا رجل أفطر علی خمر. ونقله عن الطبراني في الصغیر[101]. وأخرجه البزار أول حدیث عن سلیمان بن سیف الحراني، عن أبي جعفر العقیلي، عن زهیر بن معاویة، عن محمد بن جحادة، عن آبان، عن أبي الصدیق، عن أبي سعید[102]. أقول: و ینفع في هذا الباب ما ذکرناه في الباب الأول من هذا الفصل... فراجع.

۱۔ ابوکریب .... جابر نے روایت کی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، افطار کے وقت اللہ (گنہ گاروں کو) دوزخ سے آزاد کرتا ہے۔ ہیثمی نے احمد سے اور طبرانی نے معجم الکبیر میں یہ روایت نقل کی ہے اور انس سے روایت کی گئی ہے۔ "ماہ رمضان کی راتوں کو اللہ بہت سے گنہ گاروں کو آزاد کرتا ہے، شراب سے افطار کرنے والا مستثنیٰ ہے۔" اسے طبرانی نے معجم الصغیر میں نقل کیا ہے ....

نوٹ:۔ اس موضوع کے ذیل میں باب اوّل کے نقل کردہ احادیث بھی مفید مطلب ہیں۔

باب پنجم
ماہ رمضان کو صرف رمضان کہنا بُرا ہے

روایاتِ اہلِ بیتؑ :

١ ــ وعن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد بن أبي نصر، عن هشام بن سالم، عن سعد، عن أبي جعفر(ع) قال: كنا عنده ثمانية رجال فذكرنا رمضان، فقال (ع): لا تقولوا هذا رمضان، ولا ذهب رمضان، ولاجاء رمضان، فإنّ رمضان اسم من أسماء الله عزّوجلّ، لايجيء، ولا يذهب، وانما يجيء ويذهب الزائل، ولكن قولوا شهر رمضان. فالشهر مضاف الى الإسم، والإسم اسم الله عزّذكره، وهو الشهر الذي أُنزل فيه القرآن، جعله الله مثلاً ووعداً ووعيداً[١٠٣]. ونقله في البحار عن ثواب الأعمال، عن أبي، عن سعد، عن ابن عيسى، عن البزنطي مثله[١٠٤]. وفي الجعفريات عن محمد، عن موسى، عن أبي، عن أبيه، عن الصادق (ع) نحوه[١٠٥].

١۔ چند اصحاب روایت...... احمد بن محمد................ سعد نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے: ہم آٹھ آدمی حضرت کی خدمت میں بیٹھے تھے، کہ رمضان کی بات شروع ہو گئی۔ امام ؑ نے فرمایا: "یہ رمضان آگیا۔ رمضان چلا گیا، یہ "نہ کہا کرو۔" رمضان اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے، وہ نہ آتا ہے نہ جاتا ہے، جو آتا جاتا ہے وہ زوال پذیر ہوتا ہے۔ کہا کرو " ماہِ رمضان " (شہر، ماہ اسم کی طرف مضاف ہے اور اسم اللہ عزوجل کا نام ہے۔ یہ مہینہ وہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، اللہ نے اس مہینے کو مثل و وعدہ و وعید بنایا۔ (نمونہ۔ خوش خبری و تنبیہ کا مہینہ بنایا ہے)۔ یہ حدیث بحار میں کتاب ثواب الاعمال سے....... اور الجعفریات میں....... امام جعفر صادق ؑ سے مروی ہے۔

روایاتِ اہلِ سنّت :

١ ــ أخبرنا أبوالحسن علي بن أحمد بن عبدان، أنبأنا أحمد بن عبيد الصفار، حدثنا ابن ناجية، حدثنا محمد بن ابي معشر (ح وأخبرنا)

أبوسعد الماليني وأبو منصور أحمد بن علي الدامغاني، قالا: حدثنا أبو احمد بن عدي، حدثنا علي بن سعيد، حدثنا محمد بن أبي معشر، حدثني أبي عن سعيد المقبري، عن أبي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: لا تقولوا رمضان، فإنّ رمضان اسم من أسماء الله، ولكن قولوا شهر رمضان[١٠٦]. ورواه البيهقي بأسانيد متعددة.

۱۔ ابوالحسن علی بن احمد بن عبدان .... ابوہریرہ ..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "رمضان" نہ کہا کرو۔ اس لیے کہ رمضان اللہ کا نام ہے کہا کرو۔ "ماہ رمضان"۔

بیہقی نے یہ حدیث متعدد سندوں سے نقل کی ہے۔

باب دہم
ماہ رمضان کے علاوہ کسی مہینے کے روزے واجب نہیں

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمد بن الحسن، عن محمد بن خالد الأصم، عن ثعلبة بن ميمون، عن معمر بن يحيى أنه سمع أبا جعفر(ع)، يقول: لايسأل الله عبداً عن صلوات بعد الفريضة، ولا عن صدقة بعد الزكاة، ولا عن صوم بعد شهر رمضان[١٠٧]. ونقله في البحار عن مجالس الشيخ ــ ره ــ بسنده عن محمد بن خالد الأصم مثله[١٠٨].

۱۔ محمد بن حسن .... معمر بن یحییٰ ...... امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا اللہ نماز فریضہ کے بعد کسی نماز، زکات کے بعد کسی صدقہ، اور روزۂ ماہ رمضان کے علاوہ کسی روزے کے بارے میں جواب طلبی نہیں فرمائے گا۔ بحار ... المجالس شیخ طوسی ...... بسند محمد بن خالد ......

روایاتِ اہل سنّت:

١ ــ أخبرنا أبو محمد بن يوسف، أنبأنا أبوسعيد ابن الأعرابي، حدثنا الحسن بن محمد الزعفراني، حدثنا عاصم بن علي، حدثنا

اسماعيل بن جعفر، أخبرني نافع بن مالك، عن أبيه، عن طلحة بن عبيد الله: ان اعرابياً جاء الى رسول الله صلى الله عليه وسلّم، ثائر الرأس، فقال: يا رسول الله أخبرني ماذا فرض الله عليّ من الصلواة؟ فقال: الصلوات الخمس، إلاّ أنْ تتطوع شيئاً، فقال: أخبرني ماذا فرض الله عليّ من الصيام، فقال: صيام شهر رمضان، إلاّ أن تتطوع شيئاً، فقال: أخبرني ماذا فرض الله عليّ من الزكاة؟ قال: فأخبره يعني رسول الله صلى الله عليه وسلم بشرائع الإسلام، فقال: والذي أكرمك لاأتطوع شيئاً ولا أنقص مما فرض الله عليّ شيئاً، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: أفلح وأبيه إنْ صدق دخل الجنة، والله إنْ صدق[۱۰۹]. وأخرجه البخاري عن قتيبة بن سعيد، عن اسماعيل بن جعفر مثله[۱۱۰]. وأخرجه النسائي عن علي بن حجر، عن اسماعيل، عن أبي سهيل، عن أبيه، عن طلحة مثله[۱۱۱].

۱۔ ابو محمد بن یوسف . . . . طلحہ بن عبید اللہ . . . . . ایک صحرائی عرب سر جھنکتا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور کہنے لگا۔ بتایئے ہم پر نمازیں کتنی واجب ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: پنجگانہ نماز۔ البتہ اپنی خوشی سے جتنی نمازیں پڑھو۔ اس نے پوچھا: اللہ نے مجھ پر روزے کتنے واجب کیے ہیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ماہ رمضان کے روزے اور اپنی خوشی سے جتنے روزے رکھ لو۔ اس نے کہا: یہ فرمایئے کہ زکات میں مجھ پر کیا واجب ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکام کی تفصیل بتائی۔ عرب نے کہا: قسم اس کی جس نے آپ کو شرف عطا کیا ہے، اگر میں اپنی خوشی سے کوئی زائد انجام نہ دوں اور فرائض میں کمی بھی نہ کروں (تب کیا ہوگا؟) آنحضرتؐ نے فرمایا: کامیاب ہو۔ بقسم اگر با ایمان عمل کیا تو جنت میں جاؤ گے، خدا کی قسم، اگر ایمان داری سے عمل کیا . . . . . .
بخاری . . . نسائی . . . .

حاشیہ:

۱ و ۲ ـ الوسائل ج ۷، ص ۱۷۷. ۳ ـ البحارج ۹۳، ط ح، ص ۳٤۸، والبحار أيضاً ص ۳٦٦، والبحار أيضاً ص ۳۷۲، والوسائل ج ۷، ص ۲٥۹، والبحارج ۹۷، ط ق، ص ۳ والبحار أيضاً ص ۱۷. ٤ ـ الفقيه ج ۲، ص ۰۵۹. ٥ ـ الكافي ج ٤، ص ٦۷، والوسائل ج ۷، ۲۲٤.

٦ ـ الفقيه ج ٢، ص ٥٩.
٧ ـ البيهقي ج ٤، ص ٣٠٣. وارجع مجمع الزوائد ج ٣، ص ١٤٢ و١٤٣.
٨ ـ البخاري ج ٣، ص ٣١ وليس فيه (ونادى مناد.. الى آخر الحديث) وفيه اختلاف في بيان المعنى.
٩ ـ ابن ماجة ج ١، ص ٥٢٦.
١٠ و ١١ و ١٢ ـ الترمذي ج ٣، ص ٦٦. البحار من طرق الشيعة ج ٩٣، ط ح، ص ٣٥٠، والترمذي ج ٣، ص ٦٨.
١٣ ـ مسلم ج ٣ ص ١٢١ و ١٢٢. ١٤ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ١٧٥ و ١٧٦.
١٥ ـ النسائي ج ٤ ص ١٢٦.
١٦ ـ النسائي ج ٤ ص ١٢٦ و١٢٧ و١٢٨ و ١٢٩.
١٧ ـ الحاكم في المستدرك ج ١ ص ٢٨٩.
١٨ ـ موطأ مالك ج ١ ص ٢٨٩. ١٩ ـ الدارمي ج ٢ ص ٢٦.
٢٠ ـ الوسائل ج ٧ ص ١٧٤
٢١ ـ الكافي ج ٤ ص ٦٥. ورواه أيضاً ص ٦٤ غير أنه ليس فيه عن بكر بن صالح.
٢٢ ـ الوسائل ج ٧ ص ١٧٧.
٢٣ ـ البحار ج ٩٣ ـ ط ح ـ ص ٣٦٦ والبحار أيضاً ص ٣٧٥ والبحار ج ٩٧ ـ ط ق ـ ص ١٧.
٢٤ و٢٥ ـ البحار ج ٩٣/ ط ح/ ص ٣٤٢ و٣٤٧. ولعل مراده من قوله (بهذا الاسناد) عبد الجبار عن عبد الواحد عن اسماعيل بن الزاهد عن محمد بن أحمد، والبحار أيضاً ص ٣٦٣ والبحار أيضاً ص ٣٧٦.
٢٦ ـ الترمذي ج ٣ ص ٧٦ و ص ١٧١ ومجمع الزوائد ج ٣ ص ١٤٤.
٢٧ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٢٥٨.
٢٨ ـ النسائي ج ٤ ص ١٥٤ وفيها (من قام رمضان) فقط.
٢٩ ـ النسائي ج ٤ ص ١٥٥ و١٥٦ و١٥٧ وفيه (من قامه) فقط.
٣٠ ـ منحة المعبود ج ١ ص ١٨١ وفيه (كيوم ولدته أمه).
٣١ ـ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٤ والبيهقي ج ٤ ص ٣٠٦.
٣٢ ـ البخاري ج ٣ ص ٣٢ و٥٦ وفي الثاني زيادة في ليلة القدر.
٣٣ ـ ابن ماجة ج ١ ص ٥٢٦. ٣٤ ـ النسائي ج ٤ بشرح السيوطي ص ١٥٧.
٣٥ ـ مسند الحميدي ج ٢ ص ٤٢٢ و ٤٤٠. ٣٦ ـ منحة المعبود ج ١ ص ١٨١.
٣٧ ـ الدارمي ج ٢ ص ٢٦. ٣٨ ـ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٤.
٣٩ ـ مجمع الزوائد ج ٣ ص ١٤٤. ٤٠ ـ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٤. وهذا الحديث بعينه رويناه عن أنس في طرق الشيعة من البحار.

٤١ ــ الوسائل ج ٧ ص ٢٩٥ ومعاني الاخبار ص ١١٦ كما في الهامش والبحار ج ٩٣/ طح/ ص ٢٥٢.
٤٢ ــ الكافي ج ٤ ص ٦٥. والوسائل ج ٧ ص ٢٩٠ ونحوه ما أرسله الصدوق عن المعصوم بزيادة اسناد الحديث الى الله عزّوجلّ. الوسائل ج ٧ ص ٢٩٢ ونحوه عن ابن عباس عن النبي (ص). الوسائل ج ٧ ص ٢٩٤، والخصال ج ١ ص ٢٤ كما في هامشه ونحوه ما أسنده الطوسي في مجالسه. الوسائل ج ٧ ص ٢٩٧، والمجالس ص ٣١٦ كما في هامشه.
٤٣ ــ البحار ج ٩٣/ طح/ ص ٢٤٨ والبحار ج ٩٣/ طح/ ص ٢٤٩ ــ ٢٥١ وفي الخصال ج ١ ص ٢٤ كما في حاشية البحار.
٤٤ ــ الكافي ج ٤ ص ٦٤ والوسائل ج ٧ ص ٢٩٠ ونحوه ماأرسله الصدوق (ره) عن المعصوم (ع) الوسائل ج ٧ ص ٢٩٢ وأسند نحوه في ثواب الأعمال كما في الوسائل ج ٧ ص ٢٩٤. وفي ثواب الأعمال ص ٢٨ كما في هامشه. ونحوه عن ابن عباس عن النبي (ص) الوسائل ج ٧ ص ٢٩٤ وفي الخصال ج ١ ص ٢٤ كما في هامش الرسائل. ٤٥ ــ الفقيه ج ٢ ص ٤٥.
٤٦ ــ الكافي ج ٤ ص ٦٢، الوسائل ج ٧ ص ٢٨٩. وفي حديث آخر عن أبي عبدالله (ع) نحوه. الوسائل ج ٧ ص ٢٩٠، وكذا نحوه في حديث بسند عن الصادق عن النبي (ص) الوسائل ج ٧ ص ٢٩٢، ونحوه عن ابن عباس عن النبي (ص) الوسائل ج ٧ ص ٢٩٤، والخصال ج ١ ص ٢٤ كما في هامشه، ونحوه عن أنس ج ٧ ص ٢٩٥، ومعاني الأخبار ص ١١٦ كما في هامشه.
٤٧ ــ الكافي ج ٤ ص ٦٢. ٤٨ ــ نفس المصدر (٤٧).
٤٩ ــ البحار ج ٩٣/ طح / ص ٢٥١ ومعاني الاخبار ص ٤٠٨ كما في حاشية البحار، والبحار أيضاً ص ٢٥٩. ٥٠ ــ الفقيه ج ٢ ص
٥١ ــ الكافي ج ٤ ص ٦٣، الوسائل ج ٧ ص ٢٩٠، ونحوه عن أبي جعفر عن النبي (ص) بتغيير (به) مكان عليه، ونحوه عن ابن عباس عن النبي (ص). الوسائل ج ٧ ص ٢٩٤ والخصال ج ١ ص ٢٤ كمافي هامشه.
٥٢ ــ البحار ج ٩٣/ طح / ص ٢٤٩، والبحار أيضاً ص ٢٥٦.
٥٣ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٣٥، وروى البيهقي نحو هذا الحديث بأسانيد مختلفة ج ٤ ص ٢٧٣.
٥٤ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٣٠٦. وليس فيه (للصائم فرحتان وفي الباقي تقديم وتأخير واختلاف في اللفظ فقط).
٥٥ ــ النسائي ج ٤ ص ١٦١ و ١٦٢ وليس في الأول تعليل الصوم لي، ولا فيه الصوم جنة والثاني فيه زيادة في أوله.
٥٦ ــ النسائي ج ٤ ص ١٦٢ وليس فيها التعطيل ولا الصوم جنة.
٥٧ ــ الدرامي ج ٢ ص ٢٤. ٥٨ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٧٠.

٥٩ ــ مسلم ج ٣ ص ١٥٧. ٦٠ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٢٥. ٦١ ــ النسائي ج ٤ ص ١٦٧. ٦٢ ــ الدارمي ج ٢ ص ١٥. ٦٣ ــ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٤، ونحوه مارواه البيهقي بسنده عن سعيد بن المسيب عن أبي هريرة عن النبي (ص). نفس المصدر، وكذا ما رواه عن أبي صالح عن أبي هريرة نحوه. نفس المصدر وموطأ مالك ج ١ ص ٢٨٧.

٦٤ ــ والترمذي ج ٣ ص ١٣٦. ٦٥ ــ مسلم ج ٣ ص ١٥٨ واختلافه أنه فيه زيادة والتأخير فقط. ٦٦ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٣٠٦ وفي الباقي اختلاف في الألفاظ والتقديم والتاخير. ٦٧ ــ البخاري ج ٣ ص ٣٠. ٦٨ ــ منحة المعبود ج ٢ ص ١٨٢ وفيه (كل العمل كفارة إلا الصيام). ٦٩ ــ الدارمي ج ٢ ص ٢٥. ٧٠ ــ الوسائل ج ٧ ض ٢٩٥ ومعاني الاخبار ص ١١٦ كما في الهامش. ٧١ ــ والبحار ج ٩٣/ ط ح / ص ٢٥٢ والبحار أيضاً ص ٢٥٦. ٧٢ ــ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٥ ونحوه مارواه البيهقي عن الشيخ الصالح الفامي واختلاف في التقديم عن محمد بن يعقوب عن محمد بن عبدالوهاب عن خالد بن مخلد عن سليمان بن بلال عن أبوحازم عن سهل عن النبي (ص) نحوه و بزيادة. ٧٣ ــ الترمذي ج ٣ ص ١٣٧. ٧٤ ــ مسلم ج ٣ ص ١٥٨. ٧٥ ــ البخاري ج ٣ ص ٣٠. ٧٦ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٢٥. ٧٧ ــ النسائي ج ٤ ص ١٦٨. ٧٨ ــ النسائي ج ٤ ص ١٦٨. ٧٩ ــ نقله في منحة المعبود ج ١ ص ١٨٢ وقال أنه في مسند أحمد ج ٥ ص ٣٣٣. ٨٠ ــ البحار ج ٩٣/ ط ح / ٢٥٦ وص ٢٥٥. ٨١ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٥٧. ٨٢ ــ المستدرك ج ١ ص ٤٢٢.

٨٣ ــ منحة المعبود ج ١ ص ١٨٥. ٨٤ ــ كشف الأستار ج ١ ص ٤٥٨. ٨٥ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٥٧. ٨٦ ــ الكافي ج ٤ ص ٦٢ و٦٣. ٨٧ ــ الوسائل ج ٧ ص ٢٩٠.

٨٨ ــ الوسائل ج ٧ ص ٢٩٧. ٨٩ ــ نهج البلاغة ج ٤ ص ٣٤. ٩٠ ــ البحار ج ٩٣/ ط ح / ص ٢٤٦ و ٢٥٥ وفي الأخير الاجساد بدل الأبدان. ٩١ ــ البحار ج ٩٣ ص ٢٥٤ و٢٥٧. ٩٢ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٥٥. ٩٣ ــ البحار ج ٩٣ الطبعة الجديدة ص ٣١٢.

٩٤ ــ قرب الاسناد ص ٣٦ وفيه (المحتسب) بدل (المتسحر). ٩٥ ــ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٦.

٩٦ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٦١. ٩٧ ــ المستدرك ج ١ ص ٤٢٢. ٩٨ ــ الكافي ج ٤ ص ٦٨.

٩٩ ــ الفقيه ج ٢ ص ٦٠. ١٠٠ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٢٦. ١٠١ ــ مجمع الزوائد ج ٣ ص ١٤٣ وليس فيه (وذلك في كل ليلة). ونقله عن ابي سعيد ومجمع الزوائد ج ٣ ص ١٥٦.

١٠٢ ــ كشف الاستار ج ١ ص ٤٥٨. ١٠٣ ــ الوسائل ج ٧ ص ٢٣٢، الكافي ج ٤ ص ٦٩ وليس فيه (جعله الله مثلاً) بل (جعله مثلاً) كما أنه ليس فيه كلمة (ووعيداً) في آخره.

١٠٤ ــ البحار ج ٩٣/ ط ح / ص ٣٧٦ وليس فيه (ووعيداً) في آخره. ١٠٥ ــ الجعفريات ص ٣٩. ١٠٦ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٠١. ١٠٧ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٧٧ ومثله حديث آخر ص ١٧٨. ١٠٨ ــ البحار ج ٩٣/ ط ح / ص ٢٦٨. ١٠٩ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٠١.

١١٠ ــ البخاري ج ٣ ص ٢٩ وفي آخره (أودخل الجنة ابن صدق) ولايوجد قسم.

١١١ ــ النسائي بشرح السيوطي ج ٤ ص ١٢٠.

جناب سید منتظر عباس
(پاکستان)

اخلاقیات کے مابعد الطبیعاتی مسلّمات

گذشتہ باب میں صرف ایک مسلّمہ " وجود خدا " پر گفتگو کی گئی اور ذات و صفات خدا سے اخذ ہونے والے مقدمات کا تذکرہ ہوا ۔ اب اخلاقیات کے ایک اور مابعد الطبیعاتی مسلّمہ پر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے افکار عالیہ پیش کیے جاتے ہیں ۔ یہ مسلّمہ انسان اور اس کی حیات سے متعلق ہے ۔ در اصل یہ گفتگو ان سوالات کے جواب پر مشتمل ہے کہ انسانی زندگی کی نوعیت کیا ہے ؟ انسان کا کائنات سے کیا رشتہ ہے ؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی دوسری زندگی ہے ؟ اخلاقیات کا تعلق کس زندگی سے ہے ؟ اور اخلاقیات انسان پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے ؟ ۔

سب سے پہلے ہمارے سامنے یہ سوال ہے کہ کیا انسان کی طبعی زندگی اخلاقیات کا مقصود ہو سکتی ہے ؟ اس سوال کا جواب حضرت علی علیہ السلام نفی میں دیتے ہیں کیونکہ اخلاق کا مقصود ازلی ابدی اقدار کا حصول ہے ۔ طبعی زندگی سے تعلق رکھنے والی ہر چیز متغیر اور حادث ہے اس لیے طبعی دنیا کو اخلاق کا نصب العین نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ طبعی دنیا کا یہ حال ہے کہ " اے لوگو ! تم اس دنیا میں موت کی تیر اندازیوں کا ہدف ہو (جہاں) ہر گھونٹ کے ساتھ اچھو ہے اور ہر لقمہ میں گلوگیر

پھندا ہے۔ جہاں تم ایک نعمت اس وقت تک نہیں پاتے جب تک دوسری نعمت جدا نہ ہو جائے اور تم میں سے کوئی زندگی پانے والا ایک دن کی زندگی میں قدم نہیں رکھتا جب تک اس کی مدتِ حیات میں سے ایک دن کم نہیں ہو جاتا اور اس کے کھانے میں کمی اور رزق کا اضافہ نہیں ہوتا جب تک پہلا رزق ختم نہ ہو جائے۔ اور جب تک ایک نقش نہ مٹ جائے دوسرا نقش ابھرتا نہیں۔ اور جب تک کوئی چیز کہنہ و فرسودہ نہ ہو جائے دوسری نئی چیز حاصل نہیں ہوتی اور جب تک تیار فصل گر نہ جائے نئی فصل کھڑی نہیں ہوتی۔ آبا و اجداد گذر گئے اور ہم انہیں کی شاخیں ہیں جب جڑ ہی نہ رہی، تو شاخیں کہاں رہ سکتی ہیں[1]۔ دنیا اپنا دامن سمیٹ رہی ہے اور اس نے اپنے رخصت ہونے کا اعلان کر دیا ہے اس کی جانی پہچانی ہوئی چیزیں اجنبی ہو گئیں اور وہ تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ رہی ہے اور اپنے رہنے والوں کو فنا کی طرف بڑھا رہی ہے اور اپنے پڑوس میں رہنے والوں کو موت کی طرف ڈھکیل رہی ہے اس کے شیریں (مزے) تلخ اور صاف و شفاف (لمحے) مکدر ہو گئے ہیں۔ دنیا سے بس اتنا باقی رہ گیا ہے جتنا برتن میں تھوڑا سا بچا بچایا پانی یا نپا تلا ہوا جرعہ آب کہ پیاسا اگر اسے پیئے تو اس کی پیاس نہ بجھے[2]۔ اس دنیا کا گھاٹ گندلا اور سیراب ہونے کی جگہ کیچڑ سے بھری ہوئی ہے، اس کا ظاہر خوشنما اور باطن تباہ کن ہے یہ ایک مٹ جانے والا دھوکہ، غروب ہو جانے والی روشنی، ڈھل جانے والا سایہ اور جھکا ہوا ستون ہے[3]۔ جو شخص لیل و نہار کے مرکب پر سوار ہے وہ اگرچہ ٹھہرا ہوا ہے مگر حقیقت میں چل رہا ہے اور اگرچہ ایک جگہ پر قیام کیے ہوئے ہے مگر مسافت طے کیے جا رہا ہے[4]۔

طبعی دنیا کی ہر چیز فانی اور ہر شے متغیر ہے یہ بالکل منطقی نتیجہ ہے۔ کیا اگر طبعی دنیا کی کسی شے کو نصب العین بنا کر اس کے حصول کی کوشش کی جائے یا اسے بظاہر حاصل کر لیا جائے تو نہ تو کسی چیز کے حاصل کرنے کی کوشش ہو رہی ہے اور نہ کوئی چیز حاصل ہی ہو گی۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ کرۂ ارض پر موجود طبعی اشیا میں سے کسی بھی چیز کو نصب العین ہونے کا حق حاصل نہیں ہے، نہ مادیت، نہ صحت، نہ شہرت و عزت نہ مادی ارتقا اور نہ ہی حیات طبعی کو۔ چنانچہ دنیا سے صرف ایک ہی رشتہ ممکن ہے اور وہ قطع تعلق

کارشتہ ہے۔ اس دنیا کو تمہاری نظروں میں کیکر کے چھلکوں اور اون کے ریزوں سے بھی زیادہ حقیر و پست ہونا چاہیے اور اپنے قبل کے لوگوں سے تم عبرت حاصل کر لو۔ اس سے قبل کہ تمہارے حالات سے بعد والے عبرت حاصل کریں اور اس دنیا کی برائی محسوس کرتے ہوئے اس سے قطع تعلق کر لو۔ اس لیے کہ اس نے آخر میں ایسوں سے قطع تعلق کر لیا جو تم سے زیادہ اس کے والہ و شیدا تھے[5] اس دار دنیا سے کہ جس کے رہنے والوں کے لیے زوال امر مسلم ہے۔ نکلنے کا تہیہ کر لو کہیں ایسا نہ ہو کہ آرزوئیں تم پر غالب آجائیں اور اس (چند روزہ زندگی) کی مدت کو دراز سمجھ بیٹھو[6]۔ اے اللہ کے بندو! میں تمہیں اس دنیا کے چھوڑنے کی وصیت کرتا ہوں جو تمہیں چھوڑ دینے والی ہے۔ حالانکہ تم اسے چھوڑنا پسند نہیں کرتے اور وہ تمہارے جسموں کو کہنہ و بوسیدہ بنا دیتی ہے۔ حالانکہ تم اسے تر و تازہ رکھنے ہی کی کوشش کرتے ہو[7]۔

اس قطعِ تعلق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ دنیا شر ہے اور اسے ترک کر کے راہبانہ زندگی اختیار کرنی چاہیے یا زندگی سے ہی دستبردار ہو جانا چاہیے۔ یہ انداز فکر قنوطیت ہوگا اور اس پر یقین کرنے کا یہ مطلب ہوگا کہ کائنات یا دنیا کو یا تو ناقص تخلیق سمجھا جائے یا پھر اسے خدا کی تخلیق ہی نہ مانا جائے لیکن یہ دونوں صورتیں حضرت علی علیہ السلام کے بنیادی مسلمات کے بالکل خلاف ہیں۔ اس کے باوجود جب وہ ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہیں تو درحقیقت ان کا مقصودِ کلام یہ ہوتا ہے کہ دنیا نصب العین نہیں بن سکتی۔ اس کی تخلیق محض ایک ذریعہ کی حیثیت سے ہوئی ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ یہ حقیقی اخلاقی نصب العین کے حصول میں مددگار ثابت ہو۔ درحقیقت طبعی دنیا وہ مواد ہے جس کے سہارے انسان اپنے اختیار اور آزادی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس میں تمہاری آزمائش ہے[8] تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا ایسا گھر ہے کہ اس سے بچاؤ کا ساز و سامان اسی میں رہ کر کیا جا سکتا ہے۔ اور کسی ایسے کام سے جو صرف اس دنیا کے لیے کیا جائے نجات نہیں مل سکتی۔ لوگ اس دنیا میں آزمائش میں ڈالے گئے ہیں لوگوں نے اس دنیا سے دنیا کے لیے حاصل کیا ہوگا اس سے الگ کر دیے جائیں گے[9]۔ چنانچہ دنیا بذاتہ شر نہیں ہے یہ صرف اس وقت شر بن جاتی ہے جب اسے ذریعے کے بجائے نصب العین بنا لیا جائے ورنہ اگر اسے ذریعہ کے طور پر استعمال

کیلئے تو یہ عین خیر بن جاتی اور انسان کی اخلاقی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ قرار پاتی ہے۔
کیا تم دنیا کو مجرم ٹھہرانے کا حق رکھتے ہو؟ یا وہ تمہیں مجرم ٹھہرائے تو حق بجانب ہے؟
دنیا نے کب تمہارے ہوش و حواس سلب کئے اور کس بات سے فریب دیا کیا ہلاکت و کہنگی
سے تمہارے باپ دادا کے بے جان ہو کر گرنے سے ؟ یا مٹی کے نیچے تمہاری ماؤں کی
خوابگاہوں سے ؟ کتنی تم نے بیماروں کی دیکھ بھال کی اور کتنی دفعہ خود تیمارداری
کی اس صبح کو کہ جب نہ دوا کارگر ہوتی نظر آتی تھی اور نہ تمہارا رونا دھونا ان کے لیے کچھ
مفید تھا۔ تم ان کے لیے شفا کے خواہشمند تھے اور طبیبوں سے دوا دارو پوچھتے پھرتے تھے
ان میں سے کسی ایک کے لیے بھی تمہارا اندیشہ فائدہ مند نہ ثابت ہو سکا۔ اور تمہارا مقصد حاصل
نہ ہوا اور اپنی چارہ سازی سے تم موت کو اس بیمار سے ہٹا نہ سکے۔ تو دنیا نے تو اس کے
پردہ میں خود تمہارا انجام اور اس کے ہلاک ہونے سے خود تمہاری ہلاکت کا نقشہ تمہیں دکھا دیا
بلاشبہ دنیا اس شخص کے لیے جو باور کرے سچائی کا گھر ہے اور جو اس کی ان باتوں کو
سمجھے اس کے لیے امن و عافیت کی منزل ہے اور جو اس سے نصیحت حاصل کرے اس کے لیے
دولتمندی کی منزل ہے اور جو اس سے عبرت حاصل کرے اس کے لیے وعظ و نصیحت
کا محل ہے۔ وہ دوستانِ خدا کے لیے عبادت کی جگہ، اللہ کے فرشتوں کے لیے
نماز پڑھنے کا مقام، وحیِ الٰہی کی منزل اور اولیاء اللہ کی تجارت گاہ ہے۔ انہوں نے
اس میں فضل و رحمت کا سودا کیا اور اس میں رہتے ہوئے جنت کو فائدہ میں حاصل
کیا تو اب کون ہے جو دنیا کی برائی کرے جب کہ اس نے اپنے جدا ہونے کی اطلاع
دے دی ہے۔ اور اپنی علیٰحدگی کا اعلان کر دیا ہے اور اپنے بسنے والوں کی موت کی خبر
دے دی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی ابتلا سے ابتلا کا پتہ دیا ہے اور اپنی مسرتوں سے آخرت کی
مسرتوں کا شوق دلایا ہے اور رغبت دلانے اور ڈرانے، خوفزدہ کرنے اور متنبہ کرنے
کے لیے شام کو امن و عافیت کا اور صبح کو درد و اندوہ کا پیغام لے کر آتی ہے تو
جن لوگوں نے شرمسار ہو کر صبح کی وہ اس کی برائی کرنے لگے اور دوسرے لوگ قیامت
کے دن اسکی تعریف کریں گے کہ دنیا نے ان کو آخرت کی یاد دلائی تو انہوں نے

یاد رکھا اور اس نے انھیں خبردی تو انھوں نے تصدیق کی اور اس نے انھیں پند و نصیحت کی تو انھوں نے نصیحت حاصل کی۔[۲۱]

چنانچہ ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دنیا اپنے دائمی تغیر کی بدولت اخلاقی نصب العین نہیں بن سکتی۔ اس کی حیثیت ایک ذریعہ کی ہے جس کی وساطت سے ہم اخلاقی نصب العین حاصل کرتے ہیں۔ اب اگر اخلاقی نصب العین کا تعلق حیات طبعی سے نہیں ہے تو ہمیں لازمی طور پر ایک مابعد الطبیعاتی زندگی کا اقرار کرنا پڑے گا جو ہمارے اخلاقی اعمال کی اساس بن سکے۔ اسلام اور اس کی وساطت سے حضرت علی ابن ابی طالبؑ اس مابعد الطبیعاتی زندگی کو آخرت کی اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اخلاقی عمل کا حقیقی مقصود اسی آخرت کی فلاح و بہبود ہے۔ "دنیا ایک دوسری منزل کے لیے پیدا کی گئی ہے نہ اپنے (بقا و دوام) کے لیے۔[۲۱] تم اس دار دنیا میں کہ جو تمہارے رہنے کا گھر نہیں ہے مسافر راہ نورد ہو اس سے تمہیں کوچ کرنے کی خبر دی جا چکی ہے۔ اور اس میں رہتے ہوئے تمہیں زاد کے مہیا کرنے کا حکم دیا جا چکا ہے۔[۲۲] دنیا تمہاری قیام گاہ نہیں بنائی گئی بلکہ یہ تو تمہارے لیے گذرگاہ ہے تاکہ تم اس سے اپنی مستقل قیام گاہ کے لیے زاد اکٹھا کر سکو۔[۲۳]

سوال یہ ہے کہ حیات اخروی کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ طبعی دنیا سے یکسر مختلف ہوگی۔ کیونکہ دنیا کی اصل تغیر اور فنا ہے اور آخرت چونکہ اسی تغیر و فنا سے بچنے کا مقام ہے اس لیے اس حیات اخروی کی اصل بقا ہوگی چنانچہ آخرت کی صفتِ دوام وہ کیفیت ہے جس پر حضرت علی علیہ السلام خصوصیت سے زور دیتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح طبعی دنیا کی صفت تغیر ان کے نزدیک اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ "موت سے پہلے اپنے اعمال کا ذخیرہ فراہم کر لو اور دنیا کی فانی چیزیں دے کر باقی رہنے والی چیزیں خرید لو۔[۲۴] دنیا کی ساری موجود چیزیں معدوم ہو جائیں گی گویا کہ وہ موجود تھی ہی نہیں اور آخرت میں پیش ہونے والی چیزیں جلد ہی موجود ہو جائیں گی گویا کہ وہ ابھی سے موجود ہیں۔[۲۵]

حیاتِ طبعی اور حیاتِ اخروی میں تغیر و دوام کا یہ فرق بہت زیادہ اہمیت کا حامل

ہے کیونکہ اس فرق کی وساطت سے مابعد الطبیعاتی زندگی کی نوعیت کا تعین ہوتا ہے
تغیر وہ خصوصیت ہے جو زمان و مکان سے وابستہ ہے اور دوسری طرف زمان و مکان
کے لیے تغیر ناگزیر ہے کیونکہ ہر تغیر زمان اور مکان کے فرق سے پیدا ہوتا ہے جہاں
زمان اور مکان ہوگا وہاں زمانہ کا ہر لمحہ اور مکان کا ہر نقطہ دوسرے لمحے اور نقطے کے لیے
تغیر کا حامل ہوگا، اس لیے تغیر کے ساتھ زمان و مکان کا تعلق لازم و ملزوم کا تعلق
ہے۔ جب آخرت کو حیاتِ دوام اور بقا قرار دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم حیات
اخروی کو لازمی اور لامکانی تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے اس کے ساتھ ساتھ اس زندگی
کا غیر مادی ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ مادہ زمان و مکان کا جزو ہے۔

اخلاقیات کا مقصد اس لازمانی لامکانی اور غیر مادی زندگی سے وابستہ ہے حیات
طبعی میں ہم اپنی فطرت کی بنیاد پر اخلاقی اقدار کے حصول کی کوشش کرتے
ہیں طبعی دنیا محض ایک کارگاہِ عمل اور سعی و کوشش کی منزل ہے موت اس جدوجہد
کا خاتمہ کردیتی ہے، موت سے کوئی شخص اس طرح نہیں مرتا کہ وہ معدوم ہو جائے۔ بلکہ
موت درحقیقت ہماری جدوجہد اور ہمارے طبعی علائق کے لیے ہے، ہم بدستور زندہ
رہتے ہیں یہ دوسری یا حقیقی زندگی ابدی زندگی ہے طبعی زندگی کا نتیجہ ہماری اس
ابدی زندگی میں ظاہر ہوتا ہے اور ہماری جدوجہد کو اپنی کوشش کا انعام ملتا ہے اگر
ہماری جدوجہد درست سمت میں تھی اور اس کا مقصود حیاتِ ابدی کی فلاح و بہبود
تھی تو ہماری مابعد الطبیعاتی زندگی جنت کی زندگی ہے۔ اور اگر ہمارا مقصود حیات
طبعی کی ہی فلاح و بہبود تھی تو ابدی زندگی جہنم کی زندگی ہوگی۔

اب نسبتاً مشکل تر سوال یہ ہے، کہ جنت اور جہنم کیا ہے؟ بظاہر جنت اور
جہنم کا تصور لذت اور کرب و الم کے مادی تصورات سے وابستہ ہے۔ لیکن اوپر
کی سطور میں یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے نقطہ نظر سے مابعد
الطبیعاتی زندگی حیاتِ طبعی و مادی سے یکسر مختلف ہوگی اس میں کوئی شک نہیں کہ
اکثر جنت کے تذکرے میں باغات چشموں اور حوروں کے حوالے ملتے ہیں۔ اور جہنم

آگ بیماریوں اور مصائب و آلام کے مادی تصورات سے بھرا ہوا ہے لیکن اگر تھوڑے
سے غور سے کام لیا جائے تو یہ تمام حوالے سمجھ میں نہ آنے والی غیر محدود نعمتوں اور
آلام کو قابل فہم محسوس لذت و کرب کے آلات کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش ہیں۔ یہ بات
خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ نہج البلاغہ میں جنت و دوزخ کے بکثرت تذکرے کے باوجود
ان دونوں مقامات کو ان میں موجود اشیا کے حوالے کے بجائے زیادہ تر ان کی دو
صفات کی وساطت سے روشناس کرایا گیا ہے۔ یہ دو صفتیں شعوری اختیار اور
شعوری جبر ہیں۔ جنت حیاتِ ابدی کا وہ مقام ہے جہاں فرد کو شعوری طور پر کلی
اختیار حاصل ہوتا ہے اور جہنم وہ ابدی زندگی ہے جہاں فرد میکانکی طور پر نہیں بلکہ
پوری طرح آگاہ ہوتے ہوئے خود کو مجبور پاتا ہے۔ چنانچہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام
سب سے پہلے تو جنت کو اخلاق کا انعام قرار دیتے ہیں۔ "دنیا گھوڑ دوڑ کا میدان اور
موت پہنچنے کی حد اور قیامت گھوڑوں کے جمع ہونے کی جگہ اور جنت بڑھنے کا انعام
ہے آگے بڑھنے والوں کی آخری منزل جنت ہے اور کوتاہیاں کرنے والوں کی حد
جہنم ہے۔ یہ دونوں حدیں بنیادی فرق یہ رکھتی ہیں اور یہ کہ جنت کو ارادہ اور
اختیار سے حاصل کیا جاتا ہے جب کہ جہنم زبردستی بغیر خواہش کے وابستہ ہو جاتا ہے
جس طرف آگے بڑھنا ہے وہ جنت ہے اور جہاں کچھ اشخاص (اپنے اعمال کی بدولت
بلا اختیار) پہنچ جائیں گے وہ دوزخ ہے۔ جنت کی یہ صورت ہے کہ "اگر تم دیدۂ
دل سے جنت کی ان کیفیتوں پر نظر کرو جو تم سے بیان کی جاتی ہیں تو تمہارا نفس
دنیا میں پیش کی ہوئی عمدہ سے عمدہ خواہشوں اور لذتوں سے اور اس کے مناظر
کی زیبائشوں سے نفرت کرنے لگے گا۔ ... وہ (جنت کے رہنے والے) ایسے
لوگ ہیں کہ اللہ کی بخشش و عنایت ہمیشہ ان کے شامل حال رہی یہاں تک کہ وہ
اپنی جائے قیام میں اتر پڑے اور ناقوں کی نقل و حرکت سے آسودہ ہو گئے
اس (جنت) میں ایک دوسرے سے بڑھے ہوئے درجے ہیں اور مختلف معیار کی منزلیں
ہیں نہ اس کی نعمتوں کا سلسلہ ٹوٹے گا۔ نہ اس میں ٹھہرنے والوں کو وہاں سے

کوچ کرنا ہے اور نہ اس میں ہمیشہ کے رہنے والوں کو بوڑھا ہونا ہے اور نہ اس میں بسنے والوں کو فقر و ناداری سے سابقہ پڑتا ہے[۲۴] جہاں اترنے والے پھر کوچ نہیں کرتے اور نہ ان کے حالات ادلتے بدلتے رہتے ہیں اور نہ انھیں گھڑی گھڑی خوف ستاتا ہے نہ بیماریاں ان پر آتی ہیں نہ انھیں خطرات درپیش ہوتے ہیں اور نہ انھیں سفر ایک جگہ سے دوسری جگہ پیے پھرتے ہیں[۲۵] ۔ دوسری طرف جو نافرمان ہوں گے انھیں ایک برے گھر میں پھینکے گا۔ اور انکے ہاتھ گردن سے (کس کر) باندھے گا ۔ اور انکی پیشانیوں پر لٹکنے والے بالوں کو قدموں سے جکڑ دے گا ۔ اور انھیں تارکول کی قمیصیں اور آگ کے قطع کیے ہوئے کپڑے پہنائے گا ۔ وہ ایسے عذاب میں ہوں گے کہ جس کی تپش بڑی سخت ہو گی اور ایسی جگہ میں ہوں گے کہ جس میں ان پر دروازے بند کر دیے جائیں گے اور ایسی آگ میں ہوں گے کہ جس میں تیز شرارے بھڑکنے کی آوازیں اٹھتی ہوئی لپیٹیں اور ہولناک چیخیں ہوں گی اس میں ٹھہرنے والا نکل نہ سکے گا اور نہ ہی اس کے قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑایا جا سکتا ہے اور نہ ان کی بیڑیاں ٹوٹ سکتی ہیں اس گھر کی کوئی مدت مقرر نہیں کہ اس کے بعد مٹ مٹا جائے نہ رہنے والوں کے لیے کوئی مقررہ معیاد ہے[۲۶]

ہم ان اقتباسات کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہنچنے میں حق بجانب ہیں کہ جنت اور جہنم ایسی مابعد الطبیعاتی زندگی ہے جہاں ایک طرف تو انسان اخلاقی نقطہ کمال پر پہنچ کر ایک ابدی شعوری اختیار کا حامل ہو جاتا ہے وہ ہر چیز کا حاکم اور ہر شے اس کی تابع ہو جاتی ہے ۔ دوسری طرف اخلاقی نصب العین کے حصول میں کوتاہی رفتہ رفتہ انسان کے تمام اختیارات کو چھین لیتی ہے ۔ اور اپنی مابعد الطبیعاتی حیات میں آ کے مجبوراً ایک ایسی کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو مستقل جبر کی کیفیت ہے ۔ جہاں اخلاقی نصب العین سے دوری کا احساس کرب کی ایک شدید اور دائمی کیفیت کا شکار بنا دیتا ہے ۔ اس مقام پر رہنے والے مجبور انسان کو نہ تو اس مقام کے چھوڑنے کی آزادی ہے ، نہ اس کرب والم سے نجات پانے کی ۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ایک داخلی آگ میں جلتے اور سلگتے رہے ہیں ۔

مندرجۂ بالا سطور میں اخلاقیات کے اس مابعد الطبیعاتی مسلّمہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جس کا بیشتر تعلق انسان، حیات اور کائنات کے باہمی رشتے سے ہے اور یہ مسلمہ حیات بعد الممات کا نظریہ ہے۔ طبعی دنیا ایک مسلسل تغیر اور فنا پر مشتمل ہے۔ اور چونکہ یہاں کسی بھی شے کو دوام حاصل نہیں اس لیے اس طبعی دنیا کی کوئی شے نصب العین نہیں بن سکتی کیونکہ ہمہ وقت متغیر اور حادث شے کو حاصل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ بھی حاصل نہ کیا جائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ طبعی دنیا سے قطع تعلق کیا جائے لیکن یہ قطع تعلق ایک تارک الدنیا قنوطی کا قطع تعلق نہیں بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ طبعی دنیا کو اخلاقی زندگی کا نصب العین بنانے کے بجائے اخلاقی مقصود کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھا جائے اور اس کی اس حیثیت میں اسے پوری طرح استعمال کیا جائے۔

چنانچہ اخلاقی نصب العین کا تعلق اس حیات طبعی سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کا تعلق مابعد الطبیعاتی حیات سے ہے یہ حیات دائمی ہے اور تغیر زمان و مکان اور مادیت سے ماوراء ہے اس حیات ابدی کے دو پہلو ہیں۔ جنّت اور دوزخ۔ جنّت، اخلاقی نصب العین کے حصول کا انعام اور دوزخ کوتاہی کی سزا ہے چونکہ جنّت اور دوزخ دونوں مابعد الطبیعاتی حیات سے وابستہ ہیں اس لیے انھیں دنیا کی طبعی اور مادی آسائشوں اور کرب و الم کا حامل نہیں قرار دیا جا سکتا البتہ جنّت وہ حیات ابدی ہے جہاں ایک دائمی شعوری اختیار حاصل ہو جاتا ہے اور جہنم دائمی شعوری کرب اور جبر کی کیفیت ہے اختیار کلی اور جبر محض اخلاقی نصب العین کے حصول اور عدم حصول کے لازمی نتیجے ہیں ان پر گفتگو آئندہ کی جائے گی۔

اشارے

۱۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۲ ۔ خطبہ ۱۴۳ ۔ ص ۵۴
۲۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۵۲ ۔ ص ۱۸۹
۳۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۸۱ ۔ ص ۲۲۳

۴ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۳ ۔ وصیت نامہ ۳۱ ۔ ۲ ۔ ۷۵
۵ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۳۲ ۔ ص ۱۶۴
۶ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۵۲ ۔ ص ۱۸۹
۷ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۹۷ ۔ ص ۲۸۷
۸ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۸۱ ۔ ص ۲۲۳
۹ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۶۱ ۔ ص ۱۹۹
۱۰ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۳ ۔ وعظ ۱۳۱ ۔ ص ۲۱۴
۱۱ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۳ ۔ وعظ ۴۳۶ ۔ ص ۲۱۴
۱۲ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۲ ۔ خطبہ ۱۸۱ ۔ ص ۱۶۰
۱۳ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۲ ۔ خطبہ ۱۳۰ ۔ ص ۳۷
۱۴ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۶۲ ۔ ص ۲۰۰
۱۵ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۱۰۱ ۔ ص ۲۹۳
۱۶ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۱۰۴ ۔ ص ۳۰۰
۱۷ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۲ ۔ خطبہ ۱۵۵ ۔ ص ۸۶
۱۸ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۲۸ ۔ ص ۱۵۰
۱۹ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۲ ۔ خطبہ ۱۶۳ ۔ ص ۱۱۳
۲۰ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۱۰۷/۸۳ ۔ ص ۳۱۲/۲۳۶
۲۱ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۱۰۷ ۔ ص ۳۱۳
۲۲ ۔ نہج البلاغہ ۔ جلد ۱ ۔ خطبہ ۱۰۷ ۔ ص ۳۱۲

جناب سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

حکومت اسلامی اور مسئلہ حکمرانی و ولایت

[۱] دنیا میں عقل مند انسان کوئی عمل بلا مقصد انجام نہیں دیتا۔ تمام بین الاقوامی فلاحی و انتظامی منصوبے ایک نصب العین کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ اس لیے حکومت کا ڈھانچہ بھی کسی مقصد پر استوار ہوتا ہے۔

[۲] سیاست۔ دوسرے عقلی علوم کی طرح ایک فلسفہ ہے، اس فلسفے کے متعدد دبستان ہیں نیشنلزم سوشلزم۔ لیبرلزم۔ کیپٹلزم۔ اسلام۔

[۳] ذرائع ابلاغ کے عام ہونے سے پہلے مذکورہ نظریات اور ان کی تطبیق کے بہت سے نکات عام آدمی کی نظر سے اوجھل تھے لیکن اب دنیا میں کوئی بات راز اور کوئی راز مخفی نہیں ہے۔

[۴] پروپیگنڈہ اس دور کی سیاست کا سب سے بڑا حربہ ہے۔ نظریاتی جنگ استحصالی جنگ حصول اقتدار کی جنگ اور حریف نظریات کو پس منظر سے دور کرنے کی جنگ پروپیگنڈے ہی کے ذریعے لڑی جا رہی ہے۔

[۵] عوام کے روایات، قوموں کی تاریخ و ثقافت کے پس منظر میں طاقت ور افراد اپنے زور سے کام لیتے ہیں اور اپنے من مانے نظریات کو ان مانے یا نہ ماننے نفسیاتی طور پر مسلط کرتے ہیں۔

اسلام ایک مکمل نظامِ فکر و عمل ہے۔

دنیا کی نام نہاد بڑی طاقتوں کے باہمی اختلاف سے پسماندہ قوموں کو مذکورہ بالا حقائق کا علم ہوا۔ زیر استعمار ممالک کی آزادی نے قوموں کی آنکھیں کھولیں، بین الاقوامی فضا میں ارتعاش پیدا

ہوا، اور لوگوں نے پرانی سیاست کے تار پود بکھرتے دیکھے، ذاتی منفعت کی بنیاد پر قائم ہونے والے فلسفے کھوکھلے نظر آنے لگے۔ اور یہ محسوس ہونے لگا کہ اس دنیا میں ایک فلسفہ اسلام بھی ہے۔ طاقت ور فلسفہ، مکمل نظام اور آزادی و فلاح بشر کا دستور مسلمانوں کے پاس ہے جس کا معاشرتی ڈھانچہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ پر قائم ہے اور جس میں اعزاز کی اساس ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم پر ہے، جس کا نصب العین۔ اللہ کی حاکمیت ہے۔

سیاسی طور پر مدتوں سے یہ مہم چل رہی تھی کہ اسلام کو فلسفۂ سیاست میں نہ آنے دیا جائے آخر کار وہ لمحہ آیا جب ہوس پرستوں کے مقاصد سب کے سامنے آئے۔ اور لوگوں نے دیکھ لیا کہ نیشنلزم، سوشلزم لبرلزم اور کیپٹلزم ہر زمان و مکان، ہر قوم و ملت کے لیئے قابل قبول نہیں خود ان دبستانوں کے ماہرین نے اپنی رائے پر نظر ثانی اور اپنے عقیدوں کی اصلاح کی ضرورت محسوس کی۔

دوسری طرف اسلامی آئین و قانون و سیاست کے ماہر۔ یعنی علماء دین، فقہا اور فلاسفہ، مجتہدین اور مراجع اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں کی بنا پر اسلامی حکومت قائم کرنے کی سعی پیہم کر رہے تھے تا اینکہ انقلاب اسلامی ایران نے عقلی حقائق کو مشاہدات اور مشاہداتی نتائج کو کامیاب ثابت کر دیا۔

آج بین الاقوامی طور پر سوچا جا رہا ہے کہ سیاست و ریاست کے خود ساختہ فلسفوں پر نظر ثانی کی جائے اور مسلمانوں سے پوچھا جائے کہ ان کے نزدیک "حکومت" کی تعریف اور اس کا فلسفہ کیا ہے؟ تو آیئے ہم دیکھیں کہ:

"حکومت اسلامی" کا مفہوم کیا ہے اور حکمران کے صفات کیا ہیں؟ میں نے اس سوال کو حل کرنے کے لیے قرآن مجید کا پہلا صفحہ دیکھا، مجھے سورۃ الفاتحہ ہی میں آئین حکومت اسلامی کے بنیادی نکات اور قائد و حاکم کے صفات پر واضح اشارات نظر آئے۔ یعنی سورۃ الفاتحہ سے معلوم ہوا کہ:

- حکومت اسلامی کا مفہوم کیا ہے ؟
- حکمران اعلیٰ اور اس کے اختیارات (ولی مطلق) کیا ہیں؟
- حکمران اعلیٰ کے بعد ثانوی شخصیت (ولی معصوم) کون ہے ؟
- ماہر قانون کی حیثیت و حاکمیت (ولایت فقیہ) کیا ہے ؟
- راہ مستقیم کیا ہے اور اس کے قائد و حاکم کیسے ہوں ؟

ملاحظہ فرمایئے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — اللہ کے نام سے ابتداء، اللہ کا نام پہلے، اس کی صفت رحمت کا سہارا اور تذکرہ اشارہ ہے کہ اسلام کا نظام حکمرانی محبت و رحم پر قائم ہے۔

حکم فرمائی مطلق:

الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم — حمد و ثنا، کبریائی عظمت، ملک و ملکوت اللہ کی ملکیت ہے۔ وسع کرسیہ السمٰوات والارض ولا یؤدہ حفظہما اس کی ستائش کی جائے کسی اور کے سامنے نہ جھکا جائے۔ وہی ہے جو ربوبیت عالمین فرماتا ہے، رب العالمین ہے، یہی ولایت و مالکیت مطلقہ ہے۔ وہی متقن ہے وہی حاکم ہے، قدرت و عظمت اسی کے لیے ہے — پہلا اصول۔

مالک یوم الدین — جزا و سزا کا مالک اللہ ہے یعنی قانون اس کا اور نفاذ و فیصلہ و جزا و سزا اسی کے قبضے میں ہے۔

ایاک نعبد وایاک نستعین — اطاعت، سر جھکانا، تمام حالات و معاملات میں فقط اللہ کی طرف رجوع کرنا — دوسرا اصول ہے۔

اھدنا الصراط المستقیم — ہر لمحہ، قانونی و انتظامی، علمی و فکری، اقتصادی و عمرانی، سیاسی و سماجی امور کا قافلہ آگے جا رہا ہے ہر قدم نئی مشکل، نیا مرحلہ پیش آنے والا ہے لہٰذا صراط مستقیم کی جستجو کرنا ہمارا کام ہے مگر اس کی ہدایت کے مطابق ایک لمحہ بھی اس کی ولایت نہیں چھوڑ سکتے — تیسرا اصول ہے۔

صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضآلین — ولایت مطلقہ کے بعد، ان افراد کے نقش قدم پر چلنا جو پیرو خطِ الٰہی اور اس کے حافظ ہیں وہ اس لیے ولی بنائے گئے کہ معصوم تھے یا ان کے بعد قیادت و ولایت کے حقدار وہ متقی و مؤمن ہیں جو گمراہی سے محفوظ ہیں — یہ چوتھا اصول ہے۔

سورۂ مبارکہ سے حکومت و ولایت کے تین درجے سمجھ میں آتے ہیں۔
۱۔ اللہ۔ وہ رب العالمین و مالک یوم الدین و معبود ہے حکومت اعلیٰ اس کی ہے۔
۲۔ خلفاء اللہ۔ "الذین انعمت علیھم و غیر المغضوب علیھم" ہیں۔
۳۔ ان کے قائم مقام۔ یعنی ولا الضآلین
اسی بنا پر قانون و فقہ کی اصطلاح میں اسلام میں ولی تین ہیں۔
۱۔ اللہ ۲۔ رسول و امام ۳۔ فقیہ۔ یعنی: ولایت مطلقہ و ولایتِ معصوم و ولایت فقیہ۔

حکومت مطلقہ / ولایت مطلقہ:

اللہ۔ رب عالمین اور خالق کل ہے یسبح لہٗ من فی السموات والارض ولہ اسلم من فی السموات والارض (۸۳۔ آل عمران)

اللہ۔ ولی مطلق ہے، وہ تمام حالات و معاملات و تخلیق و فنا میں تصرف رکھتا ہے۔ قانون سازی اور فیصلے کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اس اقتدار کو "ولایت تشریعی و ولایت تکوینی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ولایت میں اس کا کوئی شریک و حریف نہیں۔ وہ حاکم و معبود مطلق ہے۔ وقل الحمد للہ الذی لم یتخذ ولدا و لم یکن لہ شریک فی الملک و لم یکن لہ ولی من الذل و کبرہ تکبیرا (۱۱۱۔ الاسراء)

خلاصہ یہ ہے:
۱۔ قانون، اللہ نے بنایا ہے۔ اس کے بنائے قانون میں کسی کو تبدیلی کا حق نہیں ہے۔
۲۔ حکومتِ مطلقہ اللہ کی ہے وہ جسے حکم دے وہ حاکم ہے۔

ولایت معصوم:

اللہ نے اپنی حکمرانی کا اظہار انبیاء و مرسلین کے ذریعے فرمایا اور آخری نبی حضرت محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ہاتھ سند جاری فرمائی:

- وما محمد الا رسول ..... (۱۴۴۔ آل عمران)
- وما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین .....(۴۰۔ الاحزاب)

توحید ۱۴۰

- ومآ ارسلنٰک الا کافۃ للناس بشیرا ونذیرا ... (۲۸ - الاحزاب)
ومآ ارسلنٰک الا رحمۃ للعالمین (۱۰۷ - الانبیاء)

یعنی آنحضرتؐ اللہ کے نمائندے اور ترجمان احکام و مبلغ رسالت ہیں۔ اسی لیے حکم ہے: وما اٰتیٰکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا (۷ - الحشر)

یہی نہیں کہ ان سے احکام حاصل کر کے ہم آزاد ہیں، جس طرح چاہیں عمل کریں، انہیں احکام پر عمل اسی طرح کرنا ہوگا جس انداز سے رسول اللہؐ کا عمل ہے۔

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ .... (۲۱ - الاحزاب)

یہ اسوۂ حسنہ وہی ہے جس کی تعبیر سورۂ فاتحہ میں "صراط الذین انعمت علیھم" سے کی گئی ہے۔

پھر یہ بھی نہیں ہے کہ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے جدا ہے:

- وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ .... (۶۴ - النساء)
- قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (۳۱ - آل عمران)

رسول اسلام بعد از خدا "مطاعِ مطلق" ہیں یہ منصب خود اللہ نے انھیں عطا فرمایا ہے اور اس توضیح کے ساتھ: النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسھم ..... (۶ - الاحزاب)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ نبی اہل اسلام و ایمان پر مکمل حق تصرف رکھتے ہیں وہ اسلامی نظام حکومت و عدل و قانون کے سربراہ اعلیٰ ہیں اور اس قانون کے ماننے والے آنحضرتؐ کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔ قرآن مجید نے بار بار "اطیعوا الرسول" کہہ کر آپ کی اس حکمرانی کی توثیق فرمائی ہے۔

چونکہ اسلامی عقیدے کے مطابق قرآن آخری کتاب اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی و رسول ہیں اس لیے سیاسی و مذہبی طور پر ضروری تھا کہ آنحضرتؐ کے بعد حکمرانی کے لیے اللہ خود انتظام فرماتا، ورنہ تحریف و انحراف اصول و قوانین لازم تھا۔ اس لیے اللہ نے اعلان فرمایا: انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین آمنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون (۵۵ - المائدہ) پھر یہ کہ اللہ نے رسول اور

الذین ..... کی ولایتِ عصمت کو صرف شرف نہیں بلکہ حکمرانی قرار دیتے ہوئے فرمایا:
اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم (۵۹ - النساء)
پھر مزید اہتمام کے طور پر رسول اللّٰہ کے آخری دور میں، رسول اللّٰہ کو حکم دیا کہ
یا ایہا الرسول بلّغ ما انزل الیک من ربک فان لم تفعل فما بلغت رسالتہ ...(۶۷-المائدہ)
اور جب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم نے تعمیل حکم خدا میں غدیر خم پہنچ کر اعلان ولایت وجانشینی امیر المؤمنین کیا:
الست اولیٰ بکم من انفسکم ؟ کیا میرا حق تصرف تمہارے نفوس پر تم سے زیادہ نہیں ہے ؟ تو لوگوں نے کہا۔ کیوں نہیں، آپ کو یہ حق ہے ! تو آپ نے فرمایا:
الا من کنت مولاہ فعلی مولاہ
انتظام استحکام حکومت و ولایت کے بعد تکمیل دین اسلام کی سند عطا ہوئی:
الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

حضرت علی علیہ السلام کی ولایت عصمت پھر ان کے بعد گیارہ اماموں کی ولایت، امت کی حکمرانی اور قانون اسلام عدم تغیر وتبدل کی ضمانت ہے۔ ان حضرات نے ایک طویل مدت تک مسلمان حکمرانوں کو سیاسی وسماجی، انتظامی وقانونی اقدامات میں انحراف کے وقت روکا ٹوکا اور خود آئین وقانون، فلسفہ وعلوم قرآن وسنت کو ہر قسم کی بے جا مداخلت سے محفوظ رکھا۔ انہوں نے اس نظام عقائد ونظریات وقانون وشریعت کے ماہرین تیار کیے، ان کی رہنمائی اور مستقبل کے لیے ان کے ضروریات کے پیش نظر کلیات واصول وضوابط بنائے تاکہ جہاں امام معصوم نہ ہو یا جب ولایت عصمت سے رابطہ پیدا نہ ہو سکے تو یہ دانشوران علوم کتاب وسنت وعلمائے قانون وشریعت۔ علم وتقویٰ، فکر وعمل میں افضلیت کی بنیاد پر دینی ودنیاوی ریاست وسیاست کی باگ ڈور سنبھال سکیں۔ اسلام کی اصطلاح میں ایسے شخص کو فقیہ اور ایسے اشخاص کو فقہا کہا جاتا ہے۔

ولایت فقیہ قرآن میں :

کسی نظریہ کے محافظ اور کسی آئین کے نگہبان وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اس کے حقائق سے کماحقہ باخبر ہوں، اس بنا پر آئین و قانونِ اسلام، قرآن و سنت کے ماہرین اس کی تشریح و نفاذ کے ذمہ دار قرار پاتے ہیں۔ اور چونکہ اسلام میں حاکمیت اللہ کی ہے اس لیے جو اس کا سب سے زیادہ فرمانبردار ہوگا وہی بعد رسول امام و امام قائد و حاکم ہوگا۔ اس کے لئے کتاب میں متعدد آیات ہیں :

- ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم .... (۱۳ - الحجرات)
- فسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون (۴۳ - النحل)
- قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون .... (۹ - الزمر)
- وعد اللہ الذین آمنوا منکم وعملوا الصٰلحٰت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم .... (۵۵ - النور)

ولایت فقیہ حدیث میں :

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے جدّ بزرگوار جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث نقل کی ہے :

الفقھاء امناء الرسل مالم یدخلوا فی الدنیا۔ قیل : یارسول اللہ وما دخولھم فی الدنیا ؟ قال : اتباع السلطان فاذا فعلوا ذالک فاحذروھم علی دینکم (الکافی، الاصول، ج ۱ ص ۴۶)

دوسری حدیث بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے :

من ضرب الناس بسیفہ ودعاھم الی نفسہ وفی المسلمین من ھو اعلم منہ فھو ضال متکلّف (تہذیب الاحکام ج ۶ ص ۱۵۱)

آنحضرت ہی سے ایک اور حدیث مروی ہے :

ان العلماء ورثۃ الانبیاء (الکافی، الاصول ج ۱ ص ۳۴)

عمر بن حنظلہ نے امام جعفر صادقؑ سے ایک سوال کیا تو امام نے فرمایا: من کان منکم ممن قد روی حدیثنا ونظر فی حلالنا وحرامنا وعرف احکامنا، فلیرضوا بہ حکما فانی قد جعلتہ علیکم حاکما۔ فاذا حکم بحکمنا فلم یقبلہ فانما استخف بحکم اللہ وعلینا رد، والراد علینا الراد علی اللہ وھو علی حد الشرک

ان آیات و احادیث سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فقیہ۔ ماہر آئین و قانون۔ زمانہ غیبت ولی معصوم میں قبلی و سربراہ امت ہے، اور نظام شریعت کو عملی بنانے اور نافذ کرنے کا اسے خدا اور رسول کی طرف سے حق دیا گیا ہے۔

شیخ صدوق ابو جعفر قمی نے اکمال الدین کے پینتالیسویں باب۔ باب ذکر التوقیعات کی چوتھی حدیث میں حضرت ولی عصر عجل اللہ فرجہ الشریف کی توقیع کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"واما الحوادث الواقعۃ فارجعوا فیھا الی رواۃ احادیثنا فانھم حجتی علیکم وانا حجۃ اللہ علیھم"۔

خلاصہ یہ ہے کہ حکومت اسلامی کا ڈھانچہ اور اسلامی فلسفۂ ریاست و سیاست کا علمی اور عملی نظام آج بھی "ولایت فقیہ" و حکومت نائب امام کے ذریعے قائم کیا جا سکتا ہے۔ الحمد للہ یہ نظام ایران میں باوجود شدید رکاوٹوں کے قائم اور اپنے ارتقائی منازل کی طرف رواں ہے جس کے روز افزوں مثبت نتائج دیکھ کر بین الاقوامی سیاست میں موجود نقائص کا احساس بڑھ رہا ہے۔

ولایت فقیہ اور عوام (شوریٰ):

قرآن اور سنت رسالت مآبؐ و فرامین ائمہؑ کی روشنی میں ہر ولی کو، ہر حکمران کو اور ہر حکومت کو عوام سے رابطہ رکھنے کی راہیں بتائی گئی ہیں ان میں ایک بڑا راستہ باہمی صلاح مشورے کا ہے، دوسرا طریقہ نقد و احتساب کا ہے۔ تیسرا سلسلہ عوام و حکومت میں فاصلے کا نہ ہونا ہے جس میں روزانہ کی نماز جماعت، ہفتہ وار اجتماعات جمعہ اور سالانہ اجتماع حج بہت اہم عوامی رابطے کے ذرایع ہیں۔ ایک چھوٹے معاشرتی گروہ سے دوسرے بڑے معاشرتی گروہ اور تیسرے سے بین الاقوامی ہم فکر عوام سے تعلقات استوار ہوتے ہیں۔ تبادلہ آرا کا فائدہ ہوتا ہے۔ ان تجربوں سے

فائدہ پہنچانے کے لئے افراد شوریٰ کا انتخاب اور مجلس شوریٰ کی تشکیل ہوتی ہے جیسے وامرہم شوریٰ بینہم کی تعمیل کہنا چاہئے۔

حاکم کے صفات :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس وقت مختلف علاقوں میں عامل اور سربراہ بھیجے، انھیں جو ہدایات دیتے تھے ان سے ان تمام باتوں کا استنباط ہوتا ہے کہ حاکم وصدر کا جواز بھی موجود ہے، جیسے نکتہ شناس، روشن خیال، بین الاقوامی معاملات سے آگاہ، عوام دوست، متقی اور ایسا عالم دین و باخبر از معاملات ہونا چاہیے جیسے حضرت علی علیہ السلام کے دور میں مالک اشتر تھے۔ ایسے حاکم کے لیے عوام سے رابطے اور اللہ سے تقویٰ، دین سے وابستگی اور دین کی روشنی میں انتظام کار کا طریقہ اس مکتوب میں بالتفصیل مذکور ہے جسے سید رضی نے نہج البلاغہ میں محفوظ کر دیا ہے۔

مصادر

- القرآن
- المعجم المفہرس لالفاظ القرآن الکریم : ـــــــ محمد فواد عبد الباقی
- الکافی، الاصول : ـــــــ محمد بن یعقوب، ابو جعفر کلینی
  دار الکتب الاسلامیہ، طہران، ایران
- من لایحضرہ الفقیہ : ـــــــ محمد بن حسن، ابو جعفر طوسی
  دار الکتب الاسلامیہ، طہران ایران
- اکمال الدین و اتمام النعمۃ : ـــــــ محمد بن علی، ابن بابویہ قمی ـ مکتبۃ الصدوق، طہران، ایران
- الغدیر : ـــــــ عبد الحسین امینی ـ طہران۔ ایران
- نہج البلاغہ : ـــــــ سید رضی ـ دکتر صبحی الصالح۔ انتشارات ہجرت، طہران، ایران
- رشد سیاسی : ـــــــ سی ایچ داو ـ ترجمہ عزت اللہ فولادوند
  نشر نو ـ تہران ـ ایران۔

التوحيد

بالغة العربية

مجلـــة

اسلاميـــة ــ فكريـــة ــ جامعـــة

تُعنى بالفكر الإسلامي المعمّق،

والكلمة الهادفة الصادقة،

وكل مايهمُّ الأمة من رؤىً وسلوك بنّاء.

وتفتح صدرها؛

لكل المفكرين الإسلاميين،

خدمةً لقضية التوحيد الكبرى،

وتركيزاً لخصائص الأمة الاسلامية

الواحدة،

ونشراً لأضواء الثورة الاسلامية في كل

أرجاء الوجود.

بعيداً عن؛

كل تعصب ذميم،

وتفريق بين المسلمين لاتحمد عقباه،

ولغوٍ من القولِ لا طائل تحته.

الثمـــن

■ ايران ١٠٠ ريال ■ لبنان ٤٠٠ قرش ■ سوريا ٤٠٠ قرش ■ الاردن ٤٠٠ فلس ■ الكويت ٤٠٠ فلس ■ عمان ٥٠٠ فلس ■ البحرين ٥٠٠ فلس ■ الامارات ٧ دراهم ■ السعودية ٨ ريالات ■ قطر ٨ ريالات ■ مصر ٤٥٠ مليماً ■ ليبيا ٥٠٠ درهم ■ السودان ٤٠٠ مليم ■ الجزائر ٥ دنانير ■ المغرب ٦ دراهم.

• وفي باقي دول آسيا وأفريقيا وفي أميركا واستراليا وأوروبا ٤ دولارات أو مايعادلها.

طريقة الاشتراك

■ تسدد قيمة الاشتراك في بانك ملي شعبه خشايار على رقم الحساب التالي (٩٠٠٢٥) سازمان تبليغات اسلامي ــ مطبوعات خارجي

■ يرجى ارسال الحوالات الى ادارة المجلة.

المراسلات على العنوان التالي:

الجمهورية الاسلامية في ايران ــ طهران

ص.ب (٣١٩٥ ــ ١٥٨١٥)

راجہ رشید محمود ایم اے
پاکستان

قادیانی
ایک تعارف

گورداس پور، مغربی پنجاب بھارت کا ایک ضلع ہے۔ ضلع گورداس پور میں ایک بستی کا نام قادیان ہے۔ قادیان میں مرزا غلام مرتضیٰ نامی شخص سکونت پذیر تھا۔

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے بہ فتاوائی علما، انگریزوں کے خلاف تلوار اٹھائی اور برطانیہ سے آزادی کی جنگ لڑی۔ کم و بیش چھ ماہ تک معرکہ رہا لیکن اختلاف و عدم مرکزیت کی بنا پر بے انتہا جانی و مالی قربانیاں بے ثمر رہیں۔ مگر انگریز اور مسلمان کی دشمنی مسلّم ہو گئی۔ مدّت تک غیور مسلمان انگریز سے اکّا دکّا جھڑپیں لیتے رہے اور آخر تک علما، کا بڑا گروہ ان سے نفرت کا اظہار کرتا رہا۔ ان کے مقابلے میں بے ضمیر افراد کا ایک ٹولہ تھا جو گردنیں جھکا کر انگریز کی فرماں برداری کے لیے آگے بڑھا اور زمین و جاگیر کے پٹے گلوں میں ڈال کر ملکہ وکٹوریہ کا غلام بنا، ان زمینداروں میں غلام مرتضیٰ بھی تھا۔

مرزا غلام احمد بن غلام مرتضیٰ اپنی تصنیف "نور الحق" میں رقم طراز ہے:

"میرا باپ اسی طرح خدمات میں مشغول رہا، یہاں تک کہ پیرانہ سالی تک پہنچ گیا اور سفرِ آخرت کا وقت آگیا اور اگر ہم اس کی تمام خدمات لکھنا چاہیں تو

اس جگہ نہ سما سکیں اور ہم لکھنے سے عاجز رہ جائیں پس خلاصۂ کلام یہ ہے کہ میرا باپ
سرکار انگریزی کے مراحم کا ہمیشہ امیدوار اور عند الضرورت خدمتیں بجالاتا رہا ۔ یہاں
تک کہ سرکار انگریزی نے اپنی خوشنودی چٹھیات سے اس کو معزز کیا ۔ اور ہر ایک
وقت اپنے عطاؤں کے ساتھ اس کو خاص فرمایا اور اس کی غم خواری فرمائی اور
اس کی رعایت رکھی اور اس کو اپنے خیر خواہوں اور مخلصوں میں سمجھا ۔ پھر جب میرا
باپ وفات پاگیا تب ان خصلتوں میں اس کا قائم مقام میرا بھائی ہوا ۔ جس کا نام
مرزا غلام قادر تھا اور سرکار انگریزی کی عنایات ایسی ہی اس کے شامل حال ہوگئیں
جیسی کہ میرے باپ کے شاملِ حال تھیں ۔ اور میرا بھائی چند سال کے بعد اپنے والد
کے فوت ہوگیا ۔ پھر ان دونوں کی وفات کے بعد میں ان کے نقش قدم پر چلا
اور ان کی سیرتوں کی پیروی کی ۔"

(کتابِ مذکور حصہ اول ص ۲۸)

انگریزوں کی تاحال وفاداری کے اس پرچار کرنے نے دراصل اس وقت جو سب سے بڑا کام کیا وہ
"جہاد" جیسے حکم اسلام کی نفی اور عقیدۂ ختم نبوت کا انکار ہے ۔ ایک اعلان سے وہ استعماریوں کا
قوت بازو ہوا اور دوسرے اعلان سے اس نے بخیال خود اسلام میں رخنہ ڈال دیا ۔

غلام احمد ، برلاس قوم سے ہونے کا مدعی ہے نہ عبد القادر کے بقول کوئی مستند دستاویز
ایسی نہیں جس کی بنا پر صحیح تاریخ ولادت بتائی جاسکے البتہ مرزا بشیر احمد نے بعض تحریروں سے
اندازہ لگایا کہ غلام احمد ۱۳ ، فروری ۱۸۳۵ء مطابق ۱۴ ، شوال ۱۲۵۰ھ پیدا ہوئے لے ۔ پروفیسر
محمد الیاس برنی نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف "قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ" میں مرزا صاحب کا سنہ
ولادت ۴۰ ۔ ۱۲۳۹ھ لکھا ہے ۲ ۔

جنگِ آزادی کے دس گیارہ سال بعد غلام احمد قادیانی نے الہام کا دعویٰ کیا ۔ ۱۸۸۸ء
کے اواخر میں بیعت لینے لگے اور ۱۸۹۱ء سے مسیح و مہدی فرزند . . . بنے اور ۱۹۰۱ء میں
نبی ہونے کا دعویٰ کر کے ۱۹۰۸ء میں مرگئے ۔

مسلمان پہلے ہی دن سے انھیں کافرمان رہے تھے مگر برطانوی حکومت اور اس کے زیر اثر

افسر شاہی ان کی حمایت پر کمربستہ رہی، آخر مسلمانوں کی بھرپور جدوجہد سے مجبور ہو کر پاکستان قومی اسمبلی نے ۱۹۷۴ء میں قادیانی اور لاہوری یعنی بقول خود ان کے احمدی جماعت کے افراد کو غیر مسلم اور کافر اقلیت قرار دیا۔ اور ۱۹۸۴ء میں اس اعلان پر عمل درآمد کے لئے حکومت کے سربراہ نے متعلقہ آرڈی ننس جاری کر دیا۔

خاتم النبیین کے نئے معنی

مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی جعلی نبوت کے اثبات میں قرآنی نص میں تحریف معنوی کی اور "خاتم النبیین" کی نئی تعبیر کی اور لکھا، "وہ خاتم الانبیاء ہے، مگر معنوں سے نہیں کہ آئندہ اس سے کوئی روحانی فیض نہیں ملے گا، بلکہ ان معنوں سے کہ وہ صاحب خاتم ہے بجز اس کی مہر کے کوئی فیض کسی کو نہیں پہنچ سکتا اور اس کی امت کے لئے قیامت تک مکالمہ اور مخاطبۂ الٰہیہ کا دروازہ کبھی بند نہ ہوگا" [۴] مرزا صاحب کے "ملفوظات" میں ہے "مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے۔ یہ ہم پر افترائے عظیم ہے۔ ہم جس قوت، یقین، معرفت اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیا مانتے اور یقین کرتے ہیں، اس کا لاکھواں حصہ بھی دوسرے لوگ نہیں مانتے۔۔۔ خدا تعالیٰ نے ہم پر ختم نبوت کی حقیقت کو ایسے طور پر کھول دیا ہے کہ اس عرفان کے شربت سے جو ہمیں پلایا گیا ہے، ایک خاص لذت پاتے ہیں جس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔" [۵] مرزا صاحب نے مزید کہا "خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی مہر کے بغیر کسی کی نبوت کی تصدیق نہیں ہو سکتی۔ جب مہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہو جاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح آنحضرت کی مہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو، وہ صحیح نہیں ہے۔" [۶]

قادیانیوں پر اہل اسلام کی طرف سے جو اعتراض کیے جاتے ہیں، انھوں نے "خاتم النبیین" کے معنی کے متعلق ان میں سے ایک اعتراض کا جواب یوں دیا۔ "خاتم النبیین" کے معنی ہیں "نبیوں کی مہر" جس طرح مہر کاغذ پر اپنے نقوش ثبت کرتی ہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوش قدم پر چلنے سے حسب استعداد انسان میں آپ کے فیضان نبوت کے نقوش ثبت ہو جاتے ہیں۔ گویا دوسرے انبیا کی نسبت اللہ تعالیٰ نے آپ کو خاتم النبیین کا منصب دیکر یہ خاصیت بخشی ہے کہ آپ کی روحانی توجہ نبی تراش ہے اور آپ کا کامل متبع نبوت کے مقام پر بھی فائز ہو

سکتا ہے۔" ؁

نبوت کا دعویٰ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، مرزا غلام احمد قادیانی نے پہلے اپنے آپ پر الہام ہونے کا دعویٰ کیا، پھر مجدد بنے، پھر بیعت لینا شروع کی، پھر مسیح موعود اور مہدی ہونے کا دعویٰ کیا اور آخر میں ان پر انکشاف ہوا کہ وہ "نبی" ہیں۔ "تاریخ احمدیت" میں ہے۔ "... ۱۹۰۰ء کے آخر اور ۱۹۰۱ء کے اوائل میں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (؟) پر یہ انکشاف ہوا کہ مقام نبوت صرف کثرت مکالمہ و مخاطبہ سے مشرف ہونے کا نام ہے اور نئی شریعت کا لانا، پہلی شریعت کا ترمیم کرنا یا براہ راست منصب نبوت و رسالت کا حصول نبی کی تعریف میں داخل نہیں ہے۔" ؁ تعریف نبوت کی تبدیلی کا سب سے پہلا تحریری اعلان ۵ نومبر ۱۹۰۱ء کو اشتہار "ایک غلطی کا ازالہ" ؁ کے ذریعے کیا گیا۔ ؁ مرزا بشیر الدین محمود احمد (مرزا قادیانی کے بیٹے اور دوسرے خلیفہ) لکھتے ہیں: "پس یہ ثابت ہے کہ ۱۹۰۱ء سے پہلے کے وہ حوالے جن میں آپ نے نبی ہونے سے انکار کیا ہے، اب منسوخ ہیں اور ان سے حجت پکڑنی غلط ہے۔" ؁

مرزا صاحب نے اپنے لیے نبوت کا دروازہ کھولنے کے لیے دلیل یہ دی ہے کہ خدا پہلے تو انبیا و رسل سے کلام کرتا تھا، اب کلام نہ کرے تو گویا اس کی یہ صفت معطل ہو گئی۔ انھوں نے لکھا "ہمارا خدا وہ خدا ہے جو اب بھی زندہ ہے جیسا کہ پہلے زندہ تھا۔ اور اب بھی بولتا ہے جیسا کہ وہ پہلے بولتا تھا... یہ خیال خام ہے کہ اس زمانہ میں وہ سنتا تو ہے مگر بولتا نہیں۔ بلکہ وہ سنتا اور بولتا بھی ہے۔ اس کی تمام صفات ازلی ابدی ہیں۔ کوئی صفت بھی معطل نہیں اور نہ کبھی ہوگی۔" ؁

ظلی نبی مرزا صاحب کہتے ہیں کہ وہ کوئی نئی شریعت نہیں لائے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امتی ہیں، اس لیے ظلی نبی ہیں۔ "(حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد) صرف اس نبوت کا دروازہ بند ہے جو احکام شریعت جدیدہ ساتھ رکھتی ہو یا ایسا دعویٰ ہو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے الگ ہو کر کیا جائے لیکن ایسا شخص جو ایک طرف خدا تعالیٰ کی وحی میں امتی قرار پاتا ہے، پھر دوسری طرف اس کا نام نبی بھی

رکھتا ہے۔ یہ دعویٰ قرآن شریف کے احکام کے مخالف نہیں ہے کیونکہ یہ نبوت بہ باعث امتی ہونے کے، دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ظل ہے، کوئی مستقل نبوت نہیں" "ازالہ اوہام" میں ہے "کوئی مرتبہ شرف و کمال کا اور کوئی مقام عزت اور قربت کا بجز سچی اور کامل متابعت اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم ہرگز حاصل کر ہی نہیں سکتے۔ ہمیں جو کچھ ملتا ہے، ظلی اور طفیلی طور پر ملتا ہے۔"[۱۴] مرزا صاحب نے بے شمار مقامات پر اپنے آپ کو ظلی نبی لکھا ہے۔ "چشمۂ معرفت" میں ہے۔ "میں اس کے رسول پر دلی صدق سے ایمان لایا ہوں اور جانتا ہوں کہ تمام نبوتیں اس پر ختم ہیں اور اس کی شریعت خاتم الشرائع ہے۔ مگر ایک قسم کی نبوت ختم نہیں ہوتی، یعنی وہ نبوت جو اس کی کامل پیروی سے ملتی ہے اور جو اس کے چراغ میں سے نور لیتی ہے، وہ ختم نہیں۔ کیونکہ وہ محمدی نبوت ہے یعنی اس کا ظل ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہے اور اسی کا مظہر ہے اور اسی سے فیضیاب ہے۔"[۱۵]

قادیانیوں نے بھی مرزا صاحب کی نبوت کو ظلی کہا ہے لیکن ان کا مرتبہ سب انبیا سے بڑا بتایا ہے۔ "حضرت مسیح موعود علیہ السلام (؟) نبی تھے۔ آپ کا درجہ مقام کے لحاظ سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا شاگرد اور آپ کا ظل ہونے کا ہے۔ دیگر انبیا علیہم السلام میں سے بہتوں سے آپ بڑے تھے۔ ممکن ہے، سب سے بڑے ہوں۔"[۱۶]

دراصل مرزا صاحب کے دعاوی میں تدریج کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ظلی طور پر نبی بنتے بنتے وہ آخر کار ظلی طور پر محمد اور احمد بن گئے۔ (آگے چل کر وہ "احمد" بن بیٹھے اور انہیں قرآنی آیت میں "اسمہ احمد" کا مصداق ٹھہرایا گیا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا) "حقیقۃ الوحی" میں کہتے ہیں۔ "میں آدمؑ ہوں، شیثؑ ہوں، میں نوحؑ ہوں، میں ابراہیمؑ ہوں، میں اسحٰقؑ ہوں، میں اسمٰعیلؑ ہوں، میں یعقوبؑ ہوں، میں یوسفؑ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کا مظہر اتم ہوں، یوں ظلی طور پر میں محمد اور احمد ہوں۔"[۱۷]

بُروزی نبی

کبھی مرزا صاحب اپنی نبوت کو ظلی کا نام دیتے ہیں، کبھی بروزی قرار دیتے ہیں "کشتیٔ نوح" میں ہے۔ "اب بعد اس کے (خاتم الانبیا) کوئی نبی نہیں مگر وہی جس پر بروزی طور سے محمدیت کی چادر پہنائی گئی۔۔۔ پس جو کامل

طور پر مخدوم میں فنا ہو کر خدا سے نبی کا لقب پاتا ہے، وہ ختم نبوت کا خلل انداز نہیں"۔[18] البدر کی ۴ ستمبر ۱۹۰۳ کی اشاعت میں کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا کہ بروز کسے کہتے ہیں۔ انھوں نے کہا "جیسے شیشہ میں انسان کی شکل نظر آتی ہے حالانکہ وہ شکل بذاتِ خود الگ قائم ہوتی ہے اس کا نام بروز ہے"۔[19]

مرزا صاحب نے اپنی بیویوں کو امہات المؤمنین کہا، اپنے گھر والوں کو اہل بیت کہلایا، جن لوگوں نے مرزا صاحب کی زیارت کی، انھیں صحابہ قرار دیا گیا۔ اسی قسم کے ایک "صحابی" سید سرور شاہ قادیانی کہتے ہیں۔ "بروز کے معنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے خود لکھے ہیں کہ اصل اور بروز میں فرق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ غلامی کی نسبت بیان کرتے ہیں تو فرماتے ہیں "من یک قطرہ ز آب زلال محمدم" لیکن جب آپ بروز کی رنگت میں جلوہ نما ہوتے تو فرماتے "من فرق بینی وبین المصطفٰی فما عرفنی وما رائی" کہ جو مجھ میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ذرا بھی فرق کرتا ہے، اس نے نہ مجھے دیکھا اور نہ مجھے پہچانا"۔[20]

نئی شریعت نہیں لائے

مرزا غلام احمد قادیانی نے کبھی اپنی نبوت کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظل کہا، کبھی اپنے آپ کو ان کا بروز قرار دیا۔ لوگوں کو تشریعی اور غیر تشریعی نبی کی بحث میں پھنسایا: "پہلے زمانوں میں جو کوئی نبی ہوتا تھا، وہ کسی گزشتہ نبی کی امت نہیں کہلاتا تھا، گو اس کے دین کی نصرت کرتا تھا اور اس کو سچا جانتا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ایک خاص فخر دیا گیا ہے کہ وہ ان معنوں سے خاتم الانبیا ہیں کہ ایک تو تمام کمالاتِ نبوت ان پر ختم ہیں اور دوسرے یہ کہ ان کے بعد کوئی نئی شریعت لانے والا رسول نہیں اور نہ کوئی ایسا نبی ہے جو ان کی امت سے باہر ہو"۔[21]

"حقیقی نبی"

مرزا صاحب نے جس طرح بتدریج ترقی کی، اس کی طرف توجہ دلائی جا چکی ہے لیکن یہ سمجھنا کہ مرزا صاحب کی وفات کے بعد ارتقا کا یہ عمل جاری نہیں رہا، درست نہیں۔ مرزا صاحب تو ایک مولوی سے ترقی کی منازل طے کرتے کرتے ظلی، بروزی اور نئی شریعت کے بغیر نبی بنے لیکن ان کے صاحبزادے نے ظلی، بروزی والی

پنخ بھی اڑادی ۔ انھوں نے والد صاحب کو حقیقی نبی قرار دیا۔ "درحقیقت خدا کی طرف سے خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ اصطلاح کے مطابق قرآن کریم کے بتائے ہوئے معنی کی رو سے جو نبی ہو اور نبی کہلانے کا مستحق ہو تمام کمالاتِ نبوت اس میں اس حد تک پائے جاتے ہوں جس حد تک نبیوں میں پائے جانے ضروری ہیں تو میں کہوں گا کہ ان معنوں میں حضرت مسیح موعود حقیقی نبی تھے۔" [۲۲]

اگرچہ اس انداز میں مرزا صاحب خود "حقیقی نبی" نہیں کہلائے لیکن دبے لفظوں میں وہ یہ ضرور کہتے رہے کہ ان جیسا تو کوئی نبی بھی نہیں تھا۔ ملاحظہ فرمائیے کہتے ہیں: "میں سچ سچ کہتا ہوں کہ جس کثرت اور صفائی سے غیب کا علم حضرت جل شانہ نے اپنے ارادۂ خاص سے مجھے عنایت فرمایا اگر دنیا میں اس کثرتِ تعداد اور انکشافاتِ تام کے لحاظ سے کوئی اور بھی میرے ساتھ شریک ہے تو میں جھوٹا ہوں۔" [۲۳]

(گویا اتنا علمِ غیب تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی نہیں دیا گیا تھا)

ایک طویل نظم " دلائلِ صداقتِ مسیح موعود و تبلیغِ عام" کا ایک بند ملاحظہ ہو، اپنے بارے میں فرماتے ہیں: [۲۴]

ساٹھ سے ہیں کچھ برس میرے زیادہ اس گھڑی	سال ہے اب تیسواں دعویٰ پہ از روئے شمار
تھا برس چالیس کا میں اس مسافر خانہ میں	جبکہ میں نے وحیِ ربانی سے پایا افتخار
اس قدر یہ زندگی کیا افترا میں کٹ گئی	پھر عجب تر یہ کہ نصرت کے ہوئے جاری بحار
ہر قدم میں میرے مولا نے دیئے مجھ کو نشاں	ہر عدو پر حجتِ حق کی پڑی ہے ذوالفقار
نعمتیں وہ دیں مرے مولا نے اپنے فضل سے	جن سے ہیں معنیٰ "اتممت علیکم" آشکار [۲۵]

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مرزا صاحب "نبی" بن بیٹھے تو ان کی بیویاں "امہات المومنین" کیوں نہ ہوتیں، ان کے ساتھی "صحابہ" کیوں نہ کہلواتے اور ان کے گھر والے "اہل بیت" کیسے نہ ہوتے۔ یہ اس بنا پر ہوا کہ مرزا صاحب کوئی ایسے ویسے نبی نہ تھے، عین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے (نعوذ باللہ) ـــــ "کتنی شاندار صداقت ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (؟) کا آنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا ہے اور آپ کے بعد خلیفۂ اوّل یعنی حضرت مولوی نور الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ (؟) کا وجود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد

خلیفۂ اول یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وجود ہے ۔" [۲۶]

"اِسْمُہٗ اَحْمَدُ" کا مصداق کون

مرزا صاحب کا نام "غلام احمد" تھا لیکن ان کے کئی "الہامات" میں انھیں "احمد" کے نام سے پکارا گیا۔ خود انھوں نے اپنے بارے میں کہا:

احمدِ آخر زماں نامِ من است　　آخریں جامے ہمیں جامِ من است [۲۷]

لیکن وہ خود اس حوالے سے "ارتقائی منازل" ہی طے کرتے رہے۔ انھوں نے خود یہ اعلان نہیں کیا کہ "... من بعدی اسمہ احمد" کے مصداق وہی ہیں۔ اس آخری منزل پر انھیں بعد میں پہنچایا گیا۔ ان کے بیٹے اور "خلیفۂ دوم" نے لکھا: "اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون رسول ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آیا اور اس کا نام احمد ہے۔ میرا اپنا دعویٰ ہے اور میں نے یہ دعویٰ یوں ہی نہیں کر دیا، بلکہ حضرت مسیح موعود کی کتابوں میں بھی اسی طرح لکھا ہوا ہے اور حضرت خلیفۃ المسیح اوّل (یعنی حکیم نور الدین بھیروی) نے بھی یہی فرمایا ہے کہ مرزا صاحب احمد ہیں۔ چنانچہ ان کے درسوں کے نوٹوں میں بھی یہی چھپا ہوا ہے۔ اور میرا ایمان ہے کہ اس آیت (اسمہٗ احمد) کے مصداق حضرت مسیح موعود علیہ السلام ہی ہیں۔" [۲۸]

مرزا بشیر الدین محمود احمد نے ۱۹۱۵ کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کھل کر کہا کہ اسمہٗ احمد میں حضور محبوب خدا علیہ التحیۃ والثنا مراد نہیں ہیں۔" احمد کا جو لفظ قرآنِ کریم میں آیا ہے وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے متعلق ہی ہے۔ میں اس کے ثبوت میں اپنے پاس خدا کے فضل سے دلائل رکھتا ہوں ... اگر کوئی میرے دلائل کو غلط ثابت کر دے اور قرآن کریم سے اور احادیث صحیحہ یا تاریخ سے ثابت کر دے کہ احمد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تھا نہ کہ صفت اور یہ کہ جو نشانات احمد کے قرآن میں آتے ہیں، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر چسپاں ہوتے ہیں اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش گوئی اپنے اوپر چسپاں فرمائی ہے تو میں ایسے شخص کو ایک مقرر تاوان، جو فریقین کو منظور ہو دینے کے لیے تیار ہوں۔" [۲۹]

"احمدی" نام کی وجہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ قادیانی یا مرزائی اپنے آپ کو "احمدی" کہلاتے ہیں اور عام طور پر تاثر یہ دیتے ہیں کہ وہ غلام احمد سے نسبت کی وجہ سے احمدی کہلاتے ہیں

کیونکہ قرآن کی آیت "اسمہ احمد" کے مصداق ان کے غلام احمد ہی تھے۔ یہ بات درست نہیں۔
"مورخِ احمدیت" دوست محمد شاہد لکھتے ہیں کہ پنجاب میں لوگ ہمیں "مرزائی" کہتے تھے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں "قادیانی" کے نام سے پکارتے تھے لیکن ۱۹۰۱ کی سرکاری مردم شماری میں یہ فرقہ اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے اندراج کروانا چاہتا تھا، اس لئے مرزا صاحب نے اسے "احمدی" قرار دیا۔" ۳۰

یہ اعلان مرزا صاحب نے ۴ نومبر ۱۹۰۰ء کو "اشتہار واجب الاظہار" کے ذریعے سے کیا۔
"ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دو نام تھے، ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم، دوسرا احمد صلی اللہ علیہ وسلم.... اسم احمد جمالی نام تھا جس سے یہ مطلب تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں آشتی اور صلح پھیلائیں گے۔ سو خدا نے ان دو ناموں کی اس طرح پر تقسیم کی کہ اوّل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں اسم احمد کا ظہور تھا اور ہر طرح سے صبر اور شکیبائی کی تعلیم تھی اور پھر مدینہ کی زندگی میں اسم محمد کا ظہور ہوا اور مخالفوں کی سرکوبی خدا کی حکمت اور مصلحت نے ضروری سمجھی لیکن یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ آخری زمانہ میں پھر اسم احمد ظہور کرے گا اور ایسا شخص ظاہر ہوگا جس کے ذریعہ سے احمدی صفات یعنی جمالی صفات ظہور میں آئیں گی اور تمام لڑائیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پس اسی وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ اس فرقہ کا نام فرقۂ احمدیہ رکھا جائے۔" ۳۱

"۲۵ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ایک اور مولوی صاحب آئے اور انھوں نے سوال کیا کہ خدا نے ہمارا نام مسلمان رکھا ہے، آپ نے اپنے فرقہ کا نام احمدی کیوں رکھا ہے؟ حضور... نے اس سوال کے جواب میں مفصل تقریر فرمائی اور بتایا کہ جو لوگ اسلام کے نام سے انکار کریں یا اس نام کو عار سمجھیں، ان کو تو میں لغتی کہتا ہوں۔ میں کوئی بدعت نہیں لایا جیسا کہ حنبلی شافعی وغیرہ نام تھے، ایسا ہی احمدی بھی نام ہے بلکہ احمدی کے نام میں اسلام اور اسلام کے بانی احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اتصال ہے... آج کل اس قدر طوفان زمانہ میں ہے کہ اوّل آخر کبھی نہیں ہوا۔ اس واسطے کوئی نام ضروری تھا۔ خدا کے نزدیک جو مسلمان ہیں، وہ احمدی ہیں۔" ۳۲

رسول ہی رسول نبوت و رسالت کے بارے میں مرزا غلام احمد کے متبعین کے خیالات اب یہی نہیں کہ ایک ظلی یا بروزی آگیا اور بس۔ یا یہ کہ کچھ اور ظلی بروزی نبی بھی آئیں گے مگر وہ حقیقی

نبی نہیں ہوں گے۔ بلکہ مرزا صاحب کے صاحبزادہ صاحب (خلیفہ دوم) سے ۱۹۲۷ء میں سوال کیا گیا کہ کیا آئندہ بھی نبیوں کا آنا ممکن ہے تو انھوں نے کہا: "ہاں قیامت تک رسول آتے رہیں گے اگر یہ خیال ہے کہ دنیا میں خرابی پیدا ہوتی رہے گی تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ رسول بھی آتے رہیں گے جب تک بیماری ہے تب تک ڈاکٹر کی بھی ضرورت ہے۔" ۳۳؎

"الہامات" اس "رسول ہندی" پر الہامات بھی بہت ہوئے۔ خداوندِ قدوس نے تو فرمایا تھا وما ارسلنا من رسول الا بلسان قومہ (ہم نے ہر رسول پر صرف اس کی قوم کی زبان میں وحی نازل کی)، لیکن مرزا صاحب پر زیادہ تر "وحی" عربی میں نازل ہوئی۔ اگرچہ خود انھوں نے یہ کہا تھا: "یہ بالکل لغو اور بیہودہ امر ہے کہ انسان کی اصل زبان تو کوئی اور ہو اور الہام اس کو کسی اور زبان میں ہو۔" ۳۴؎ بیشتر الہامات اس قسم کے ہیں کہ قرآنی آیات میں کچھ تحریف کرکے مرزا صاحب والا الہام بن گیا۔ کچھ الہامات معنوی لحاظ سے عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً انت منی بمنزلۃ ولدی (تو مجھ سے بیٹے کی بجا ہے)۔ اس سوال کے جواب میں کہ اس الہام کے معنی کیا ہیں، قادیانی حضرات کا موقف ہے: "کسی کو" بیٹے کی بجا "کہنا پیار کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ ورنہ خود مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ خدا بیٹوں سے پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی شریک ہے اور نہ بیٹا ہے لیکن یہ فقرہ اس جگہ قبیل مجاز اور استعارہ میں ہے۔" ۳۵؎

قرآنِ پاک میں تحریف کرتے ہوئے مرزا صاحب کے "خدا" نے بعض جگہوں پر زبان غلط کردی ہے "یاآدم اسکن" تو قرآن نے کہا تھا، مرزا صاحب کے الہام میں مخاطب عورت ہوگئی لیکن فعل مذکر ہی رہا: "یامریم اسکن" ۳۶؎ اور مرزا صاحب کا "خدا" تو کوئی سی زبان بھی صحیح استعمال نہیں کرتا چند الہامات ملاحظہ ہو۔ "بہت سے سلام میرے تیرے پر ہوں۔" ۳۷؎

"WE CAN, WHAT WE WILL DO"
"GOD IS COMING BY HIS ARMY"
"HE IS WITH YOU TO KILL ENEMY" ۳۸؎

ایک الہام یہ تھا:

"چوں دورِ خسروی آغاز کردند مسلمان را مسلمان باز کردند"

مرزا صاحب خود اس کی تشریح میں کہتے ہیں: "دورِ خسروی سے مراد اس عاجز کا عہد

دعوت ہے مگر اس جگہ دنیا کی بادشاہت مراد نہیں بلکہ آسمانی بادشاہت مراد ہے جو مجھ کو دی گئ

مسیح موعود قارئین کرام جانتے ہیں کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے بالاقساط مختلف دعوے کیے یوں اپنی وفات سے کوئی اٹھارہ برس پہلے ان پر یہ انکشاف ہوا کہ جس مسیح مریم کے آنے کی خبر تھی، وہ خود ہیں۔ ان کے سوانح نگار عبدالقادر لکھتے ہیں "۱۸۹۰ء کے اواخر میں اللہ تعالیٰ نے آپ پر اس امر کا انکشاف فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس مسیح ابن مریم کے آنے کی خبر دی تھی، وہ تو ہی ہے۔ پہلا مسیح آسمان پر خاکی جسم کے ساتھ ہرگز زندہ نہیں بلکہ وہ دیگر انبیا کی طرح فوت ہو چکا ہے۔" [۴۰]

۲۵ مئی ۱۹۰۸ء (وفات سے ایک ماہ قبل) مرزا صاحب نے اپنی آخری تقریر کے آخر میں فرمایا "عیسیٰ کو مرنے دو کہ اس میں اسلام کی حیات ہے۔ ایسا ہی عیسیٰ موسوی کے بجائے عیسیٰ محمدی آنے دو کہ اس میں اسلام کی عظمت ہے۔" [۴۱] اس طرح مرزا صاحب "مسیح موعود" بن بیٹھے اور اسے قرآن سے ثابت کرنے کی خاطر لکھا "اور یہ کہنا کہ قرآن شریف میں مسیح موعود کا کہیں ذکر نہیں، یہ سراسر غلطی ہے کیونکہ۔۔ صریح طور پر فرما دیا ہے کہ آخری زمانہ میں جبکہ آسمان اور زمین میں طرح طرح کے خوفناک حوادث ظاہر ہوں گے، وہ عیسیٰ پرستی کی شامت سے ظاہر ہوں گے۔ اور پھر دوسری طرف یہ بھی فرمایا وما کنا معذبین حتیٰ نبعث رسولا۔ پس اس سے مسیح موعود کی نسبت پیشگوئی کھلے کھلے طور پر قرآن شریف میں ثابت ہوتی ہے۔" [۴۲]

مرزا صاحب کیا کیا نہیں مرزا صاحب اپنے دعووں میں بڑے منہ زور واقع ہوئے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو نبی کہا تو پھر کوئی ایسا نبی نہیں چھوڑا جس کا نام انھیں یاد آتا تھا وہ اس کا مثیل خود بنتے جاتے تھے۔

میں کبھی آدم، کبھی عیسیٰ کبھی یعقوب ہوں
نیز ابراہیم ہوں نسلیں ہیں میری بے شمار [۴۳]

"حقیقۃ الوحی" میں مرزا صاحب نے اپنے آپ کو آدم، شیث، نوح، ابراہیم، اسحٰق، اسمٰعیل یعقوب، یوسف اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مظہر اتم کہلایا ہے (ص ۷۲) کہتے ہیں "جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں، مجھے اور نام بھی دیئے گئے ہیں اور ہر ایک نبی کا مجھے نام دیا گیا ہے۔

چنانچہ جو ملک ہند میں کرشن نام ایک نبی گزرا ہے، جس کو رودرگوپال بھی کہتے ہیں، اس کا نام بھی مجھے دیا گیا ہے ۔ ۔ ۔ خدا تعالیٰ نے بار بار میرے پر ظاہر کیا ہے کہ جو کرشن آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والا تھا، وہ تو ہی ہے، آریوں کا بادشاہ۔" [44]

"مہدیِ معہود" مرزا صاحب کے دعوؤں کی زد سے جب کرشن نہ بچ سکا تو وہ مہدی ہونے کا دعویٰ کیوں نہ کرتے چنانچہ وہ "مسیح موعود" کے ساتھ "مہدیِ معہود" بھی بن گئے۔

۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء کو ایک مقدمے کے سلسلے میں جہلم پیش ہوئے تو خدام کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: "مسلمانوں کے تمام فرقے مہدی کے منتظر ہیں مگر مہدی تو بہر حال ایک شخص ہی ہونا تھا اور وہ میں ہوں۔ [45] اگر میں شیعوں سے کہوں کہ میں تمہارا مہدی ہوں، جو کچھ تمہاری روایات میں درج ہے، وہ صحیح ہے۔ اور اسی طرح سنیوں اور وہابیوں کو بھی کہوں تاکہ سب مجھ سے راضی ہو جائیں تو یہ ایک منافقت ہے۔ ان کو اتنا معلوم نہیں کہ مہدی کا نام حکم عدل ہے۔ وہ تو سب فرقوں کا صحیح فیصلہ کرے گا، جس کی غلطی ہوگی، اس کو بتائے گا تب وہ سچا ہوگا۔ بس یہی وجہ ہے کہ سب فرقے ہمارے دشمن ہو گئے ہیں ورنہ ہم نے ان کا اور کیا قصور کیا ہے۔" [46] ۱۹ اپریل ۱۹۰۴ء کو مرزا صاحب نے کہا: "جس مہدی کو لوگ مانتے ہیں، وہ شکی ہے اور اس کی نسبت احادیث میں بہت تعارض ہے لیکن ہمارا دعویٰ اس مہدی کا ہے جس کی نسبت کوئی شک نہیں۔" [47]

کسی شخص نے سوال کیا کہ شیعہ اصحاب کہتے ہیں کہ امام مہدی غار سے نکلیں گے اور وہ محمد بن حسن عسکری ہیں۔ قادیانیوں نے جواب شائع کیا۔ "محمدؒ بن حسن عسکریؒ وفات پا چکے ہیں۔ بزرگوں کی ایک جماعت کی گواہی شیعہ و سنی لٹریچر میں آئی ہے کہ انھوں نے محمد بن حسن عسکری کی وفات پر ان کا جنازہ پڑھا اور انھیں مدینۃ الرسول میں کفنا کر دفن کیا گیا۔ ان کو اور بعض دوسرے ائمہ کو قبل از وقت جلد بازی میں مہدی قرار دیا گیا۔ امام مہدی نے آخر زمانہ میں غلبۂ نصاریٰ کے وقت پیدا ہونا تھا، وہی حضرت بانیٔ سلسلۂ احمدیہ علیہ السلام ہیں جو محمد بن حسن کے بھی بروز ہیں۔" [48]

مسیح و مہدی مرزا غلام احمد صاحب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ مسیح اور مہدی اصل میں ایک ہی شخص ہے اور وہ خود وہی ہیں ۔ حالانکہ اپنے تمام دعووں کے پیش نظر انھیں

یہ کہنا چاہیے تھا کہ ہزار ہا انبیا۔ اور دوسرے مذاہب کے سب اوتار وغیرہ ایک ہی شخصیت تھے) کہتے ہیں
"ان دونوں اندرونی اور بیرونی عظیم الشان فتنوں کی اصلاح کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ
ہی یہ بشارت ملی کہ ایک شخص آپ کی امت میں سے مبعوث کیا جائے گا جو بیرونی فتنہ اور صلیبی مذہب
کی حقیقت کو توڑ دینے والا ہوگا۔ اور اسی لحاظ سے وہ مسیح ابن مریم ہوگا۔ اور اندرونی تفرقوں اور
بے راہیوں کو دور کرکے ہدایت کی سچی راہ پر قائم کرے گا۔ اس لیے مہدی کہلائے گا۔" [۴۹]
"نیکی کے بھی دو بروز ہیں اندرونی لحاظ سے مہدی اور بیرونی لحاظ سے مسیح ابن مریم ... مسیح
اور مہدی دراصل ایک ہی شخص کے دو نام ہیں جو اس کی دو مختلف حیثیتوں کو ظاہر کرتے ہیں جو
دفعِ شر اور افاضۂ خیر ہیں۔ [۵۰]

"مؤرخ احمدیت" دوست محمد شاہد لکھتے ہیں۔ "مرزا صاحب نے ۲۳ مارچ ۱۸۸۹ء کو خدا تعالیٰ کے
حکم سے جماعت احمدیہ کی بنیاد رکھی اور ۱۳۰۷ھ میں خدا کے اذن سے مسیح موعود و مہدی معہود ہونے کا اعلان
کیا۔" [۵۱] ۱۹۰۴ء میں فرقۂ بابیہ بہائیہ کے حکیم مرزا محمود ایرانی لاہور آئے اور مرزا غلام احمد قادیانی سے
بحث و مناظرہ کرنا چاہا تو روزنامہ "پیسہ اخبار" لاہور میں مرزا قادیانی کے بارے میں چھپا۔ "گو آپ نے ساتھ
مسیح موعود کے مہدی معہود ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور خود کو مہدی اصلی ہونے کے ساتھ مسیح کا
صرف مثیل قرار دیا ہے مگر لوگ آپ کے ادعائے مہدویت پر اتنی توجہ نہیں کرتے جتنی کہ مسیحیت پر
کر رہے ہیں، درآنجائیکہ علما کے نزدیک مہدی آخر الزمان کی فضیلت مسیح موعود پر ثابت ہے" [۵۲]

مرزا بشیر الدین محمود احمد کہتے ہیں۔ "حضرت مرزا غلام احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام (؟) کا
دعویٰ تھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے خلق اللہ کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے مبعوث فرمایا ہے اور یہ کہ آپ
وہی مسیح ہیں جن کا ذکر احادیث میں آتا ہے اور وہی مہدی ہیں جن کا وعدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کے ذریعے دیا گیا ہے۔" [۵۳] "اس وقت کا مصلح مسیح موعود اور مہدیِ مسعود کے سوا اور کوئی نہیں اور
یہ کہ چونکہ مسیح موعود ہونے کے مدعی صرف بانیٔ سلسلۂ احمدیہ ہیں، اس لیے ان کے دعویٰ کو رد کرنا
گویا خدا تعالیٰ کی سنت کا ابطال اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کی تک ہے۔" [۵۴]

مہدیِ معہود ہونے کے مدعی مرزا غلام احمد کہتے ہیں۔ "میں یہ پیشگوئی کرتا ہوں کہ میرے
بعد قیامت تک کوئی ایسا مہدی نہیں آئے گا جو جنگ اور خونریزی سے دنیا میں ہنگامہ برپا کرے۔

اور خدا کی طرف سے ہو، اور نہ کوئی ایسا مسیح آئے گا جو کسی وقت آسمان سے اترے گا۔ ان دونوں سے ہاتھ دھو لو۔۔ جو شخص آنا تھا، وہ آچکا۔ وہ میں ہوں جس سے خدا کا وعدہ پورا ہوا۔" [۵۵]

امام حسینؓ سے "افضل"

مرزا صاحب کے ظلی اور بروزی نبی، پھر حقیقی نبی ہونے، مسیح موعود اور مہدی معہود ہونے کا تفصیلی ذکر آچکا۔ اب حضرت امام حسین علیہ السلام پر مرزا صاحب کی "فضیلت" کا احوال بھی سن لیں۔ مرزا صاحب کا مشہور شعر ہے:

کربلائیست سیر ہر آنم
صد حسین است در گریبانم [۵۶]

مسلمانوں کے پیہم تعاقب کے باعث اب قادیانیوں نے اس کی تاویلات کرنا شروع کر دی ہیں: "اس میں بانیٔ سلسلۂ احمدیہ علیہ السلام (؟) نے لطیف پیرایہ میں اپنی مشکلات کا ذکر فرمایا ہے۔۔۔ شعر کا سادہ مفہوم یہ ہے کہ میں ہر آن کربلاؤں سے گزرتا ہوں اور حسین کی طرح سینکڑوں مشکلات میں گھرا ہوا ہوں۔" [۵۷]

آئیے، مرزا کے "ارشادات" کو جانچتے ہیں کہ آیا ان کے نزدیک اس شعر کے یہی معنی ہیں جو ان کے پیرو بیان کر کے مسلمانوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں یا ان کی مراد کچھ اور ہے۔ مرزا کہتے ہیں: "افسوس یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ قرآن نے تو امام حسین کو رتبہ ابنیت کا بھی نہیں دیا بلکہ نام تک مذکور نہیں۔ ان سے تو زید ہی اچھا رہا جس کا نام قرآن شریف میں موجود ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہنا قرآن شریف کی نص صریح کے خلاف ہے جیسا کہ آیت **ما کان محمد ابا احد من رجالکم** سے سمجھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت امام حسین رجال میں سے تھے، عورتوں میں سے تو نہیں تھے۔ حق تو یہ ہے کہ اس آیت نے اس تعلق کو جو امام حسین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بوجہ پسر دختر ہونے کے تھا، نہایت ہی ناچیز کر دیا ہے۔۔۔ خدا نے اور اس کے پاک رسول نے بھی مسیح موعود کا نام نبی اور رسول رکھا ہے اور تمام خدا کے نبیوں نے اس کی تعریف کی ہے اور اس کو تمام انبیا کے صفات کاملہ کا مظہر ٹھہرایا ہے۔ اب سوچنے کے لائق ہے کہ امام حسین کو اس سے کیا نسبت ہے۔" [۵۸]

اس کے بعد قصیدۂ اعجازیہ مرزا صاحب کا خاص الہام ہے [۵۹] اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

وقالوا علی الحسین فضّل نفسہ
اقول نعم واللہ ربّی سیظہر

(اور انھوں نے کہا کہ اس شخص نے امام حسین سے اپنے تئیں اچھا سمجھا۔ میں کہتا ہوں کہ ہاں اچھا سمجھتا ہوں اور میرا خدا عنقریب ظاہر کردے گا۔)

واما حسین فاذکروا دشت کربلا
الی ھذہ الایام تبکون فانظروا

(اور مجھ میں اور تمہارے حسین میں بہت فرق ہے کیونکہ مجھے تو ہر ایک وقت خدا کی تائید اور مدد مل رہی ہے مگر حسین، پس تم دشت کربلا کو یاد کرلو، اب تک تم روتے ہو)

وانی قتیل الحب ولکن حسینکم
قتیل العدو فالفرق اجلی واظہر

(اور میں محبت کا کشتہ ہوں لیکن تمہارا حسین دشمنوں کا کشتہ ہے۔ پس فرق کھلا کھلا اور ظاہر ہے) ۶۰

۸ جنوری ۱۹۰۴ء کو ریاست مالیر کوٹلہ کے مشیر اعلیٰ نے مرزا صاحب سے مختلف سوالات کیے۔ ایک سوال کے جواب میں مرزا صاحب نے کہا "میرے اس دعوے پر کہ میں امام حسین سے افضل ہوں، شور مچایا جاتا ہے لیکن اگر پوچھا جاوے کہ آنے والا مسیح حسین سے افضل ہے یا نہیں تو اس کا کیا جواب ہے" مشیر اعلیٰ نے پوچھا "پھر آپ کے نزدیک کیا ہے" مرزا صاحب نے کہا "خدا تعالیٰ نے تو مجھے یہی بتایا ہے کہ میں افضل ہوں" ۶۱

"کربلائیست سیر ہر آنم" والے شعر کی تشریح میں میاں بشیر الدین محمود احمد لکھتے ہیں "لوگ اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام (؟) نے فرمایا، میں سو حسین کے برابر ہوں لیکن میں کہتا ہوں، اس سے بڑھ کر اس کا مفہوم یہ ہے کہ سو حسین کی قربانی کے برابر میری ہر گھڑی کی قربانی ہے۔" ۶۲

"جماعت احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کا جواب" دینے والے منافقت مآب توجہ فرمائیں کہ خود ان کے "نبی صاحب" کیا کہتے ہیں "وہ لوگ جو میری اس بات سے کہ میں امام حسین سے

افضل ہوں، گھبراتے ہیں، بجائے اس کے کہ مجھ پر اعتراض کریں، صاف طور پر میرے مقابلہ میں آئیں۔ میں ان سے پوچھوں گا کہ جس قسم کے نشانات میں اپنی سچائی اور منجانب اللہ ہونے کے پیش کرتا ہوں، اس قسم کے نشانات تم بھی پیش کرو اور پھر اسی قدر تعداد میں دکھاؤ۔ میں مرثیہ نہیں سنوں گا بلکہ نشانات کا مطالبہ کروں گا۔ جس کو حوصلہ ہے اور جو امام حسین کو سجدے کرتے ہیں، وہ آن کے خوارق اور نشانات کی فہرست پیش کریں اور دکھائیں کہ کس قدر لوگ ان واقعات کے گواہ ہیں۔ اس مقابلہ میں یقیناً یہ ماننا پڑے گا کہ واقعات میں قافیہ تنگ ہے۔ مبالغہ سے ایک بات کو پیش کر دینا اور ہے اور حقیقی طور سے واقعات کی بنا پر اسے ثابت کر دکھانا مشکل ہے۔" ٦٣

حواشی

١ عبدالقادر (سابق سوداگرمل)، حیاتِ طیبہ۔ مسجد احمدیہ لاہور۔ ایڈیشن دوم۔ ١٩٦٠ء ص١

٢ ایضاً۔ ص ١٢

٣ الیاس برنی، پروفیسر محمد۔ قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ۔ شیخ محمد اشرف تاجر کتب لاہور بارششم۔ ١٣٧٠ھ۔ ص ٨٢٢

٤ غلام احمد قادیانی، مرزا۔ حقیقۃ الوحی۔ ص ٢٧

٥ غلام احمد قادیانی، مرزا۔ ملفوظات جلد اوّل۔ ص ٣٤٢

٦ ملفوظات جلد پنجم ص ٢٩٠

٧ اسد اللہ قریشی، محمد (مرتب)، جماعتِ احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کے جوابات نظارتِ اصلاح و ارشاد' ربوہ۔ ١٩٧٣ء۔ ص ٩ [قادیانی اپنے آپ کو احمدی اور اپنی جماعت کو جماعتِ احمدیہ کہتے ہیں۔ وجہ تسمیہ اپنے مقام پر آئے گی]

٨ دوست محمد شاہد۔ تاریخ احمدیت جلد سوم۔ ادارۃ المصنفین ربوہ۔ س ن۔ ص ١٨٩

٩ اشتہار" ایک غلطی کا ازالہ" مشمولہ الحکم قادیان۔ ١٠ نومبر ١٩٠١۔ ص ٥ ۔ ٧

١٠ دوست محمد شاہد۔ تاریخ احمدیت جلد سوم۔ ص ١٩٢ [حاشیے میں یہ وضاحت بھی ہے

کہ پہلے ۱۹۰۰ میں مولوی عبد الکریم اپنے خطبات جمعہ میں اس خیال کا اظہار کرتے رہے
۱۷ اگست ۱۹۰۰ کے خطبے میں مولوی صاحب نے مرزا صاحب کو مرسل ثابت کیا اور لا نفرق بین احد
منہم والی آیت ان پر چسپاں کی جسے مرزا صاحب نے پسند کیا]

۱۱ بشیر الدین محمود احمد میاں حقیقۃ النبوۃ ۔ ص ۱۲۱

۱۲ الوصیۃ ۔ بحوالہ "صداقت حضرت مسیح موعود علیہ السلام" تقریر مولانا جلال الدین شمس ۔ مجلس انصار اللہ مرکزیہ ربوہ ۔ ایڈیشن چہارم ۔ مئی ۱۹۸۳ ۔ ص ۱۰۴، ۱۰۵ ۔

۱۳ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ۔ طبع اول ۔ ص ۱۸۱ ۔

۱۴ غلام احمد قادیانی مرزا ۔ ازالہ اوہام جلد اول ۔ تالیف ۱۸۹۱ ۔ ص ۱۳۸

۱۵ چشمہ معرفت ۔ ص ۳۲۴ (بحوالہ "آیت خاتم النبیین اور جماعت احمدیہ کا مسلک" مجلس انصار اللہ مرکزیہ ربوہ ۔ س ن ۔ ص ۷ ۔

۱۶ الفضل قادیان ۔ ۲۹ اپریل ۱۹۲۷ (جلد ۱۴ ۔ نمبر ۸۵)

۱۷ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ حقیقۃ الوحی ۔ ص ۷۲

۱۸ غلام احمد قادیانی مرزا ۔ کشتی نوح ۔ ص ۲۴

۱۹ غلام احمد قادیانی مرزا ۔ ملفوظات جلد ششم ۔ ص ۱۲۲

۲۰ اخبار الفضل قادیان ۔ ۲۶ جنوری ۱۹۱۶

۲۱ غلام احمد قادیانی مرزا ۔ ضمیمہ چشمہ معرفت ص ۹ ۔

۲۲ بشیر الدین محمود احمد، میاں ۔ القول الفصل ۔ ص ۱۲

۲۳ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ تریاق القلوب ۔ ص ۱۴۷

۲۴ معلوم ہوتا ہے، مرزا صاحب حساب میں بھی کمزور تھے ۔ چالیس برس کے تھے جب ان پر وحی آنا شروع ہوئی ۔ ساٹھ برس سے کچھ زیادہ عمر ہوئے تو "نبی" بننے کی بیسویں سالگرہ کیسے ہو گئی ۔؟

۲۵ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ درثمین (اردو مجموعہ کلام) ص ۹۷ ۔

۲۶ اخبار "الفضل" قادیان ۔ ۱۴ مارچ ۱۹۴۶ (جلد ۳۴ ۔ شمارہ ۶۳)

۲۷ الفضل قادیان ۔ ۷ دسمبر ۱۹۴۴ء

۲۸۔ بشیرالدین محمود احمد میاں ۔ انوارِ خلافت ۔ص ۲۱

۲۹۔ الفضل قادیان ۔ ۱۹/ اگست ۱۹۱۶ (جلد ۴ شمارہ ۲۲)

۳۰۔ دوست محمد شاہد (مولف تاریخِ احمدیت جلد سوم ۔ ادارۃ المصنفین ربوہ ۔ص ۱۶۱

۳۱۔ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ تبلیغِ رسالت جلد نہم ۔ص ۹۱

۳۲۔ بدر، ۳ نومبر ۱۹۰۵ (بحوالہ تاریخِ احمدیت جلد سوم ۔ص ۴۴۱)

۳۳۔ الفضل قادیان ۔ ۲۷ فروری ۱۹۲۷۔ جلد ۱۴ شمارہ ۶۸۔

۳۴۔ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ چشمۂ معرفت ۔ص ۳۰۹۔

۳۵۔ جماعت احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کے جوابات ۔ص ۳۹۔

۳۶۔ غلام جیلانی برق، ڈاکٹر ۔ حرفِ محرمانہ ۔ طابع علمی پرنٹنگ پریس لاہور ۔ بار اول ۱۹۵۴ء
ص ۳۲۴، ۳۲۵ ۔

۳۷۔ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ حقیقۃ الوحی ۔ ص ۱۰۲ ۔

۳۸۔ براہین بحوالہ حقیقۃ الوحی ۔ص ۳۰۳ (حاشیے میں لکھا ہے "چونکہ یہ غیر زبان میں الہام ہے، اور الہام الٰہی میں ایک سرعت ہوتی ہے اس لیے ممکن ہے کہ بعض الفاظ کے ادا کرنے میں کچھ فرق ہو اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جگہ خدا تعالیٰ انسانی محاورات کا پابند نہیں ہوتا۔" حقیقۃ الوحی ص ۳۰۴ ۔

۳۹۔ تجلیاتِ الٰہیہ ص ۲ (بحوالہ ہماری ہجرت اور قیامِ پاکستان ۔ سید زین العابدین ولی اللہ شاہ ربوہ کی سالانہ جلسہ اپریل ۱۹۴۹ میں تقریر ۔ دار التجلید لاہور ۔ص ۴۷ ۔

۴۰۔ عبد القادر (سابق سوداگر مل) حیاتِ طیبہ ۔ص ۹۸

۴۱۔ تاریخِ احمدیت جلد سوم ۔ص ۵۴۶

۴۲۔ غلام احمد قادیانی، مرزا ۔ تتمہ حقیقۃ الوحی ۔ص ۶۴

۴۳۔ اسد اللہ قریشی، محمد ۔ جماعت احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کے جوابات ۔ص ۴۲

۴۴۔ غلام احمد قادیانی، مرزا تتمہ حقیقۃ الوحی ۔ص ۸۵

۴۵۔ مرزا صاحب تو کہہ رہے ہیں کہ مہدی ایک ہی ہونا تھا، وہ خود اُن کی صورت میں "ہو گیا۔"

لیکن "طنبورۂ مرزا" کچھ اور کہتا ہے۔ ان کے بیٹے اور "خلیفہ دوم" "مرزا بشیر الدین محمود احمد" کہتے ہیں۔ "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئیوں سے پتہ چلتا ہے کہ آئندہ بھی کئی تغیرات ہوں گے۔ مہدی کے متعلق جو پیشگوئیاں ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کئی مہدی ہوں گے۔ ان مہدیوں میں سے ایک مہدی تو خود حضرت مرزا صاحب ہیں اور آئندہ بھی کئی مہدی آسکتے ہیں۔" (اخبار الفضل قادیان۔ ۲۷ فروری ۱۹۲۷ء)

۴۶ سیرت المہدی حصہ سوم ص ۱۶۹، ۱۷۰ (بحوالہ تاریخ احمدیت جلد سوم۔ ص ۲۷۶، ۲۷۷)

۴۷ غلام احمد قادیانی، مرزا۔ ملفوظات جلد ششم۔ ص ۴۲۳۔

۴۸ جماعت احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کے جوابات۔ ص ۴۳

۴۹ ملفوظات جلد اوّل۔ ص ۴۴۵

۵۰ ملفوظات جلد اوّل۔ ص ۴۵۱، ۴۵۵

۵۱ دوست محمد شاہد۔ چودھویں صدی کی غیر معمولی اہمیت۔ احمد اکیڈمی ربوہ ۱۹۸۱۔ ص ۷۴، ۷۵۔

۵۲ روزنامہ پیسہ اخبار لاہور۔ ۱۷ راگست ۱۹۰۴ء (بحوالہ جواب لکچر جناب قادیانی بہائی پبلشنگ کمیٹی نیو دہلی۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۴۶۔ ص ۱۳، ۱۴)

۵۳ مرزا بشیر الدین محمود احمد۔ دعوت الامیر۔ الشرکۃ الاسلامیہ رجسٹرڈ۔ ربوہ۔ ص ۴۸

۵۴ دعوت الامیر۔ ص ۹۱

۵۵ غلام احمد قادیانی مرزا۔ مجموعۂ اشتہارات۔ جلد سوم۔ ص ۵۲۰

۵۶ غلام احمد قادیانی مرزا۔ درثمین (مجموعۂ کلام) ص ۲۸۷

۵۷ جماعت احمدیہ سے متعلق بعض سوالات کے جوابات۔ ص ۳۲۔

۵۸ غلام احمد قادیانی مرزا۔ نزول المسیح۔ ص ۴۵ تا ۵۰

۵۹ برنی، پروفیسر محمد الیاس۔ قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ۔ ص ۸۷۹

۶۰ ـه غلام احمد قادیانی، مرزا ـ اعجاز احمدی
ص ۵۲، ۶۹، ۸۱

۶۱ ـه ملفوظات جلد ششم ـ ص ۲۸۳

۶۲ ـه اخبار الفضل قادیان ـ ۲۶ر جنوری ۱۹۲۶ء
(خلیفۂ قادیان کا خطبۂ جمعہ)

۶۳ ـه غلام احمد قادیانی، مرزا ـ ملفوظات جلد ششم ـ ص ۳۰۲

AL-TAWHĪD

TEHRAN—IRAN
IRANSHAHR AVENUE
KOUCHEH HOMA. BLOCK—2

AL-TAWHĪD (English), P.O.Box 41-2959
Tehran, Islamic Republic of Iran
SUBSCRIPTION FORM

Please send my copy of *Al-Tawhid* on the following address. I am enclosing a cheque/bank draft for $ towards a subscription for ( ) years.

MY ADDRESS: (Please write in capitals)

Name...

No. .... St. ....

City/Town. .... State/Area code.. ....

Country.......................................

Signature..............................

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۲۱۹۵

جمہوری اسلامی ایران ـ تہران

فارم ممبری

براہ مہربانی درج ذیل پتے پر مجلۂ توحید اردو ارسال فرمادیا کریں۔

نام .... کوچہ .... روڈ ....

شہر .... صوبہ .... ملک ....

تاریخ .... دستخط

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ	سالانہ
اسلامی جمہوریہ ایران	۱۵۰ ریال	۵۰۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے	۵۰ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم	۳۲ درہم
سعودی عرب	۸ ریال	۳۲ ریال
قطر	۸ ریال	۳۲ ریال
کویت	۶۵۰ فلس	۲½ دینار
افریقہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ	۸ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
کینیڈا	۴½	۱۸ ڈالر

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ



جلد ۲ شمارہ ۲، ذی قعدہ ۔ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ ۔ محرم ۱۴۰۶ھ / اگست تا اکتوبر ۱۹۸۵ء

مقاصد

کلمۃ التوحید
توحید الکلمۃ

- قرآن و سنت و سیرت پر مشتمل اسلام کے بنیادی علمی و عملی پہلوؤں کی تلاش۔
- علمی سطح پر علماء و محققین امت میں اتحاد و ہم آہنگی۔
- اسلامی تعلیمات میں آج کے مسائل کا حل دریافت کرنا۔
- فلسفۂ مشرق و مغرب سے فلسفۂ اسلام کا امتیاز۔
- عالمی سطح پر ابھرتے ہوئے اسلامی تحریکی و سماجی انقلاب و نتائج پر تحقیق۔

ارباب نظر و صاحبان قلم سے تعاون کی آرزو ہے۔

بدل اشتراک

ملک	فی شمارہ
ایران	۱۵۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم
سعودی عرب	۸ ریال
قطر	۸ ریال
کویت	۰.۶۰ فلس
افریقہ	۳ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر
کینیڈا	۴ ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

اکاؤنٹ نمبر ۹۰۰۲۵
سازمان تبلیغات اسلامی
بانک ملی ایران شعبہ خشایار ۵۴۳
خیابان طالقانی نبش فرصت
تہران ۔ جمہوری اسلامی ایران



اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد ۲، شمارہ ۳،

30 JUL 1986

ترتیب

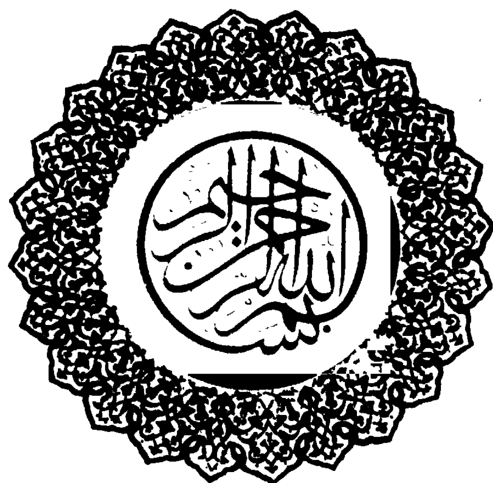




مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۳۱۹۵ ۱۵
تہران، جمہوری اسلامی ایران
فون ۲۵-۲۲۰۵۰ ۸۲

ذی قعدہ۔ ذی الحجہ ۱۴۰۵ھ و محرم سنہ ۱۴۰۶ھ / اگست تا اکتوبر سنہ ۱۹۸۵ء

فکر و فلسفہ



شذرہ

امتحان

قربانی

انسان فطرتاً حقیقتوں کا کھوجی ہے، کریدنا اس کی طبیعت اور ڈھونڈھنا اس کے مزاج میں داخل ہے۔ حقیقتیں عام طور سے پردوں میں رہتی ہیں اور ان تک حواس کے ہاتھ نہیں پہنچتے۔ انھیں ٹٹولنے کے لیے جذب وخلوص، وارفتگی اور خود فراموشی کی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ملے اس کی پرکھ، اس کا درست و نادرست ہونا دوسرا عمل ہے۔ اسی لیے استاد و رہنما، ہادی و قائد کی ضرورت پڑی اور دانا و بینا واقف کار سے رجوع کرنا شرط کمال ٹھہری۔

باقاعدہ تحقیق کا ضابطہ ہوتا ہے، اور ضابطہ کسی بڑے نظام سے وابستہ ہوتا ہے وہ نظام کبھی طبقاتی وگروہی ہوتا ہے کبھی عمومی و آفاقی۔ ہم جس نظام سے وابستہ ہیں وہ ہے اسلام۔ آفاقی نظام، ہمہ جہت حاوی، اور ہمہ وقت نگراں نظام علمی، فکری، اعتقادی، عملی، احتسابی اور جزائی نظام۔ اسے تین جہتوں سے دیکھا

توحید ہ

جاسکتا ہے:

- معاشرتی جہت سے — اخلاق۔
- فکری جہت سے — عقائد۔
- عملی جہت سے — قانون و فقہ۔

اس نظام کی چوتھی جہت ہے۔
ماورائے حیاتِ مادی دنیا۔

مسلمان دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کا دین، زندگی کے تمام مسائل و معاملات کا بہترین ضامن اور فلاح و بہبود بشر کا کفیل ہے۔ یہ دین سب کے لیے آیا ہے۔ یہ دین بیک وقت سماجی بھی ہے۔ اعتقادی بھی ہے، سیاسی اور روحانی بھی، علم اس سے جدا نہیں اور عمل اس سے علیحدہ نہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے پاس بہت دلیلیں ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ جامع و مانع دلیل قرآن کریم اور سنتِ مبارکہ ہے۔

تصور، ادراک، علم اور یقین، انسان کا انفرادی عمل ہے، فکر و دماغ اپنے نامعلوم وسائل سے حرکت و سفر کرتا ہے۔ اسلام اسے پسند کرتا ہے، وہ شہ دیتا ہے، ہمت افزائی و تشویق کے ذریعے ہر شخص کو عموماً اور مسلمان کو خصوصاً علم کی طلب کا گرویدہ بنانا چاہتا ہے۔ قرآن حکیم علم و عقل کا داعی اور تعقل و تفکر کا حامی ہے۔ مگر — عقل عیار ہے۔ سو بھیس بدل لیتی ہے۔ اس لیے عقل کے دائرۂ کار اور اس کی سعی و کوشش پر احتساب ضروری ہے۔ اسی احتساب کو امتحان کہا جاتا ہے۔

امتحان — طالب علم، عالم و باخبر فرد یا افراد کا درجہ معین کرنے، ترقی دینے اور امتیاز حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ پڑھنے یا پڑھنے والے کے علم و یقین کا پیمانہ آزمائش ہے۔ امتحان و آزمائش مبتدی و منتہی دونوں کی قیمت معین کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اربابِ علم و صاحبانِ یقین و عرفان ہمہ وقت راہِ طلب اور حصول مقصد کی خاطر محنت جھیلنے اور امتحان دینے پر کمربستہ رہتے ہیں، امتحان لینے والا، اعزاز دینا

چاہتا ہے، اور اچھا طالب عاجزی و ناکامی کا اظہار کر کے امتحان گاہ میں قدم رکھتا ہے۔ جب اسے کامیابی کی سند ملتی ہے تو کبھی کہتا ہے۔ "پروردگار! مجھے مزید علم عطا فرما"۔ کبھی کہتا ہے ۔ پروردگارا، میں مغلوب ہوں میری مدد کر۔" اسلام کا امتیاز یہ نہیں کہ وہ مسلمان کو بے عمل، آزاد اور غافل از ہمہ کر دے ۔ اسلام ان میں سے ہر بات کا مخالف ہے ۔ اسلام، محنت، عمل، پابندی آداب وضوابط کی تعلیم ہے۔ اس کا اعلان ہے۔

زباں سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل
نگاہ و قلب مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

قرآن مجید نے واضح کر دیا ہے :

أَحَسِبَ النَّاسُ أَن يُتْرَكُوا أَن يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ ۔

کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دعوائے ایمان پر آزاد کر دیئے جائیں گے اور ان کا امتحان نہ ہوگا ۔ حالانکہ اللہ نے ان سے پہلے کی قوموں کو آزمایا ہے اور اس امتحان کا مقصد ہے سچے اور جھوٹے دعویداروں کا جاننا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ . . . .

خوف، بھوک، جان، مال، کھیتوں اور باغوں کے نقصان یا اولاد کے بارے میں امتحان لیا جائے گا، جان پر بنے گی اور دیکھیں گے کہ مومن کون ہے اور غیر مومن کون، کس کی زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کا زمزمہ آتا ہے :

صدائے قطرہ بے ساز انا البحر   ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس امتحان میں چھوٹے بڑے سب برابر ہیں، جب خلیل اللہ ابراہیم علیہ السلام اور حبیب اللہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتحان ہوا تو پھر رہ گیا۔

خلیل خدا، ہجرت و بے وطنی، آگ کے درمیان میں پھینکے جانے اور ذبح فرزند جیسے امتحانوں سے گذرے۔ اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکے والوں کے ظلم اور ناقابل بیان سختیوں، پھر مدینے والوں کے رویّوں اور آخر میں امت کے چند نااہل افراد کے انحراف جیسے مصائب سے دوچار ہوئے۔

ابراہیمؑ نبی آگ میں پھینکے گئے، فرزند کی قربانی پر تیار ہوئے، انعام میں امامت پائی اور ہمارے نبی بے مثال اذیتوں سے دوچار ہوکر امام حسین علیہ السلام کی قربانی تک منازل امتحان سے گذرے تو انعام میں ___ اسلام زندہ ہوگیا بس کربلا کے بعد ___

رمضان المبارک، ذوالحجۃ المکرم۔ محرم الحرام۔ امتحان کے مہینے ہیں ایک میں قوت ارادی، پختگی ایمان اور معیار عمل کا امتحان ہوتا ہے، دوسرے میں، مال، تھکن، بے آرامی اور اطاعت و سرافگنی کی آزمائش ہوتی ہے۔ ایک امتحان کا پرچہ روزہ، دوسرے امتحان کا پرچہ حج ہے تیسرا امتحان عشق محمدؐ و آل محمدؐ اور عرفان حق کربلا سے متعلق ہے اس کا پرچہ "عزاداری" کہلاتا ہے

حج: للّٰہیت کا امتحان ہے، یک صدا، یک راہ، یک منزل، یک کاروان، یک رنگ، یک لباس، یک دین، یک ملت ___ دولت اور قوت، راحت اور اپنی پسند سے دست برداری۔ مسلم برادری میں یک جان و دو قالب ہوکر۔ ایک رب، ایک اللہ، ایک معبود کے حکم پر پستیوں، بلندیوں، بستیوں اور صحراؤں، فضاؤں اور دریاؤں، بلکہ من و تو سے گذر کر کعبہ کے گرد طواف، صفا و مروہ کے مابین سعی، عرفات میں قیام، مشعر میں پڑاؤ اور منیٰ میں قربانی پھر منزل اور نقطۂ آغاز پر واپسی، کعبہ مکرمہ کا طواف، مقام ابراہیمؑ پر نماز اور زمزم سے سیرابی ___ یہ سب فقط اسلام گردن نہادن بطاعت

ربع مسکون سے آئی ہوئی مخلوق خدا سے تجدید اخوت، ایک دوسرے سے مل کر خوشی وغمی کا تبادلہ، دین اسلام کی سر بلندی کا معاہدہ اور دشمنان خدا سے مقابلے کا عزم صمیم بانٹ کر، تقویٰ و ایمان کا ذخیرہ لے کر گھروں کو واپسی حج ہے۔ بامقصد عبادت بانتیجہ سفر۔

(۲)

ہر مقصد، ہر بلند نصب العین، ہر اونچا ہدف، قربانی چاہتا ہے۔ نماز، وقت معین میں کاروبار کی قربانی چاہتی ہے خواہ وہ چند لمحے کیوں نہ ہوں۔ روزہ۔ لذت کام و دہن کی قربانی چاہتا ہے اور ایک ماہ اس کا روزانہ یہی مطالبہ ہے ۔ حج ۔ وقت و دولت وخواہشات کی قربانی کا طلب گار ہے۔ اور کبھی کبھی اسلام۔ جان۔ مال، اولاد، بلکہ عزت تک کی قربانی چاہتا ہے۔

یہ قربانی، اولاد آدمؑ سے شروع ہوئی "آدم کے دونوں بیٹوں نے دو قربانیاں اللہ کے حضور میں پیش کیں، ایک کی قربانی قبول ہوئی ایک کی رد ہوگئی" اور قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے جناب اسماعیل کو زمین پر لٹایا اور چھری گلے پر رکھ دی۔ اسماعیل علی نبینا و علیہ السلام ذبیح اللہ قرار پائے حالانکہ ذبح ہونے سے بچ گئے۔ اب تک ان کے واقعے کی یاد میں کروڑوں جانور ذبح ہوتے اور دس ذی الحجہ کو عید قربان منائی جاتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا دن ہے۔

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چچا اور اہلیہ معظمہ رضؓ ام المومنین خدیجہ نصرتِ دین میں جاں بحق ہوئیں سرور دو عالم نے سال غم منایا۔ حضرت حمزہ شہید ہوئے تو خواتین عبد الاشہل کو ماتم کے لیے بلایا۔ اور جب اسی اسلام پر حسین علیہ السلام نے جان قربان کی تو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ و حضرت ام المومنین ام سلمہؓ گواہ ہیں کہ آنحضرتؐ پریشاں مو، گہربار آنکھیں،

غبار آلود چہرۂ انور، ہاتھ میں شیشہ، شیشے میں خونِ تازہ لیے آئے اور فرمایا:

امام حسین علیہ السلام مع اپنے جاں نثار اصحاب و اعزہ کے اسلام پر قربان ہو گئے۔ ان کے اہلِ بیت اسیر ہو کر احیاءِ اسلام کا پرچم لیے، کوفے سے شام اور شام سے مدینہ گئے اور آج تک وہ پرچم اٹھائے مسلمانانِ عالم حسینؑ حسینؑ کر رہے ہیں۔

اس غم کا مقصد اسلام کی زندگانی و اسلام کا استحکام ہے۔ ہر یزیدِ وقت کو ٹھکرانا اور دینِ محمدیؐ کو عمل میں لانا ہے۔ اس راہ میں امامِ مظلوم کے دو پیام ہیں:

هَيْهَاتُ مِنَّا الذِّلَّة

اور

اِنْ كَانَ دِيْنُ مُحَمَّدٍ لَمْ يَسْتَقِمْ
اِلَّا بِقَتْلِيْ فَيَا سُيُوْفُ خُذِيْنِيْ

والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

●

بسم اللہ الرحمن الرحیم



○— قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔

○— مختصر و سادہ معنی و مطالب۔

○— فرد اور معاشرے کی اصلاح، تعمیر و ترقی

○— اسلام اور قرآن کا پیامِ زندگی۔

○— حدیث کی روشنی میں۔

○— مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِي
كَانُوا عَلَيْهَا قُل لِّلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ
إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً
وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ
عَلَيْكُمْ شَهِيدًا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا
إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَإِن
كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ وَمَا كَانَ اللَّهُ
لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ

ترجمہ:

کچھ بے وقوف لوگ اب یہ کہیں گے: ان (مسلمانوں) کے رخ اس قبلہ سے کس چیز نے موڑ دیے، جس پر وہ تھے۔ آپ یہ کہہ دیں، مشرق و مغرب اللہ کے ہیں، وہ جسے چاہتا ہے راہ مستقیم دکھاتا ہے۔ (۴۲)

اور یوں ہم نے تم لوگوں کو امتِ وسط (معتدل گروہ) بنایا کہ تم لوگوں پر گواہ رہو اور رسول (آخر الزمانؐ) تم پر گواہ رہیں۔

اور جس قبلے (بیت المقدس) پر تم تھے، ہم نے اسے مقرر ہی اس لیے کیا تھا کہ پچھلے پیروں پلٹنے والوں کے مقابلے میں ان کو پہچان لیں جو رسول کی پیروی کریں گے۔ اور اگرچہ یہ بات (تحویلِ قبلہ) گراں (شاق) تھی، مگر ان لوگوں پر (نہیں)، جن کی اللہ نے ہدایت کی (جو مومن تھے)۔ اور اللہ، ایسا نہیں کہ تمہارے

ایمان کو برباد کردے ۔ بے شک اللہ، لوگوں پر بڑا ہی مہربان اور بہت رحم کرنے والا ہے (۱۴۳)

تفسیر :

تیس دن میں ختم قرآن کرنے والوں کی آسانی کے لیے کتاب کریم کے تیس جزء قرار دیے گیے ہیں، پہلا پارہ یا جزو " الٓمٓ " ہے اور دوسرا " سیقول "۔ پہلے پارے میں ایک سو اڑتالیس آیتیں تھیں اس پارے میں ایک سو ساٹھ آیتیں ہیں ۔

سورۃ البقرہ کے گذشتہ آیات میں۔ تقوے کی اہمیت ۔ قرآن کی ہدایت ۔ مؤمنین کی تعریف ۔ آدم علیہ السلام کی خلافت ۔ بنی اسرٰئیل کا قومی کردار اور تاریخی و فکری پس منظر ابراہیم علیہ السلام کا مرتبہ ۔ عرب کے مذہبی رجحانات اور وہاں کے رہنے والوں کی سوچ اور آخر میں ۔ " صِبْغَۃَ اللہ " ۔ اللہ والوں کا رنگ ڈھنگ ۔ کتاب خدا میں تحریف ، احکام خدا میں کٹھ حجتی ۔ انبیا کی مخالفت میں سزا اور اطاعت خدا و رسولؐ میں جزا کا بیان، اس بات پر تمام ہوا ۔ " وہ ماضی کی امت تھی جس کا دور ختم ہوا ، وہ اپنا اعمال نامہ لے کر گذر گئی اس کا کیا اس کے سامنے آئے گا ۔ اب تمہارے عمل و کردار کا مرحلہ ہے جس کے نتائج سے تمہیں دوچار ہونا پڑے گا ۔"

تم امتِ وسطیٰ ہو ۔ تم نئی تاریخ کے موجد ہو ۔ تمہاری سمت گذشتہ امت سے جدا اور تمہارے قانون قاعدے ان کے حوالے سے نہیں بلکہ قرآن کے ذریعے سمجھے اور رسول اللہؐ کے واسطے سے نافذ العمل ہوں گے ۔ لیکن سلسلہ ایک ہے، حضرت آدمؑ سے خاتم علیہم السلام تک ایک دین ۔

۱۴۲ ــ سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ

سورے کا آغاز تھا، عقل و بینش اور راسخ العقیدہ لوگوں کی تعریف سے ۔ اور یہ موڑ عقل دشمن افراد کے طریق فکر کی نشان دہی سے شروع ہو رہا ہے ۔ یعنی اہل عقیدہ و عمل کے دو گروہ ہیں۔

وہ دانش ور جو عمل بھی کرتے ہیں۔ بے وقوف، کج بحث، متشکک اور عمل میں نکمے۔

روایاتِ اہل بیتؑ کے مطابق مکہ میں حکم تھا کہ سمتِ قبلہ ایسی ہو کہ بیت المقدس اور کعبہ دونوں کی طرف رخ ہو سکے (وہاں یہ ممکن تھا کیونکہ کعبہ کی جہتیں چار ہیں) اور جہاں یہ ممکن نہ تھا وہاں صرف بیت المقدس کو قبلہ بنانے کی پابندی تھی۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں اسی طرح نماز پڑھی جاتی رہی، روایات اہل بیتؑ کے مطابق سترہ ماہ اور بعض اقوال کی بنا پر انیس اور ایک رائے میں سات ماہ تک یہی طریقہ رہا۔ شیخ مفید نے مسارّ الشیعہ میں ۱۵ رجب ۲ھ تحویلِ قبلہ کی تاریخ لکھی ہے۔ درمنثور سیوطی کی ایک روایت اس کی مؤید ہے۔

ایک سماجی خلفشار سے پیغمبرؐ کو مطلع فرمایا۔ میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جیسے ہی لوگوں کو تبدیلی قبلہ کی خبر ہو گی، فوراً کج بحث و کم عقل لوگ چہ میگوئیاں شروع کر دیں گے۔ یہ کیا ہوا؟ یہ کیوں ہوا؟ یہودیوں کے قبلے میں کیا خوبی تھی کہ پہلے اسے قبلہ مان لیا اور اب کیا ترجیح نکل آئی کہ بیت اللہ المکرم کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جائے؟ ان سوالوں کا بنیادی جواب ہے کہ اللہ، رب العالمین ہے۔ اس کی نہ کوئی جہت ہے نہ وہ مکان کا پابند ہے "مشرق بھی اس کا مغرب کا بھی" ملک مسئلہ بیت المقدس اور کعبہ کا نہیں، بات ہے حکم اور فرماں برداری کی۔ تم اپنی پسند و ناپسند کو معیارِ بندگی قرار دیتے ہو یا صراطِ مستقیم پر رضاءِ الٰہی کے مطابق گردن جھکا کر چلنے کو دین جانتے ہو؟ صراطِ مستقیم کی رہنمائی اور اس کی جہت بتانا، اللہ کا حق اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری ہے اب صلاح و فلاح کا تقاضہ یہی ہے کہ خانۂ کعبہ ہی نقطۂ آغاز سفرِ عبودیت ہو۔ یہیں کمال تقویٰ کا امتحان ہو۔ نماز و حج اس مقدس قبلے کی عظمت اور ہماری بندگی کے دو مظہر ہیں، دونوں کا تعلق کعبے سے رہیگا

۱۴۳- وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ

عیسائی، مکان ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے ہیں، چونکہ ان کی اکثریت مغرب میں ہے لہذا مجموعی طور پر ان کا قبلہ مشرق ہے۔ یہودی شام و بابل میں زیادہ آباد تھے، ان کے لیے سمتِ بیت المقدس (تقریباً مغرب) سمت قبلہ تھی، چونکہ حکم تحویل قبلہ مدینہ میں آیا اور اہل مدینہ کے واسطے سمت جنوب و وسط مشرق و مغرب، سمت قبلہ قرار پائی۔ لہذا مدینہ کا قبلہ

وسطی ٹہرا۔ یہی قبلہ صراط مستقیم اور اسی کعبہ کو قبلہ ماننے والے امت وسط قرار دیے گئے۔ یہ لوگ عقیدے میں معتدل ہیں، شرک و غلو، جبر و تفویض، تشبیہ و تعطیل سے پاک اور توحید خالص پر قائم ہیں سماجی طور پر معتدل، دنیادار، جیسے یہودی... نہ تارک الدنیا جیسے مسیحی اور بدھ... مسلمان اپنی فکر، اخلاق اور معاملات میں اعتدال کی راہ چلتا ہے، صلح و جنگ حکومت و سیاست عبادت و تجارت، غرض ہر مرحلۂ حیات میں للہیت اور حکم خدا پر سراپا تسلیم و رضا رہتا ہے۔ چونکہ عدل اس کا دستور ہے۔ اس لیے وہ تمام انسانوں کا گواہ عادل ہے، اس کی عدالت و میانہ روی چونکہ زیر قیادت حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اس لئے آنحضرت براہ راست اس امت کے گواہ ہیں۔

ابتدائی آیات میں حضرت آدم علیہ السلام کو "خلیفہ" بنانے کا تذکرہ گذر چکا، آدم علیہ السلام کے بعد ہر مومن باللہ انسان کو خلیفۂ ارضی کہا گیا، کہ اصل و اساس خلافت معیار و نمونہ خلیفۃ اللہ ابوالبشر ہیں، جو بھی جتنا، ان جیسا بنے گا خلافت ارضی میں اتنا ہی حصہ پائے گا۔ اس آیۂ مبارکہ میں امت وسط و شہید کا لقب اصالتاً محمدؐ و آل محمدؐ رسول و ائمہ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے لیے ہے۔ ان کی پیروی اور حسب امکان ان جیسا بننے والے ثانوی درجے میں استحقاق مدارج رکھتے ہیں۔ وہ معصوم ہیں تو یہ عادل بن جائیں۔ وہ شہداء ہیں، یعنی امت و خدا کے درمیان وسیلہ ہیں اور امت شہید و وسط ہے، یعنی امت اسلامیہ عام انسانوں اور ہادی برحق کے درمیان ایک کڑی ہے۔

اس کی ایک توضیح آل عمران کی آیت نمبر ۱۱۰ سے ہوتی ہے "کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر"۔ درس یہ ہے کہ جس طرح رسولؐ اعتدال کامل اور مثال اعلیٰ ہیں اسی طرح امت کو مثال کامل ہونا چاہیے۔

تفسیر عیاشی میں امام جعفر صادق سے روایت ہے: تمہارا خیال ہے کہ اللہ قیامت کے دن تمام امتوں کے سامنے ایسے شخص سے گواہی لے گا جس کی گواہی اس دنیا میں سیر بھر کھجوروں کے مقدمے میں قبول نہیں ہوتی؟

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: ہم امت وسط اور ہم مخلوق پر اللہ کے گواہ ہیں۔ یہی تفسیر امام

جعفر صادق علیہ السلام نے بھی فرمائی ہے۔

۔" وما جعلنا القبلة التی کنت علیها الا لنعلم....."

تبدیلی قبلہ کی وجہ یہ تھی کہ عبادت گذار عقیدہ رکھیں کہ مشرق و مغرب، سمت و جہت کچھ نہیں، اصل اصول اللہ کی رضا ہے اور اللہ دنیا کو دکھا دے کہ جو لوگ بیت المقدس کی طرف رخ کرتے تھے ان میں رسول کے پیرو کون لوگ تھے اور رجعت پسند کون تھے ۔ وان کانت لکبیرۃ الا علی الذین ھدی اللہ ۔ نیا حکم جذباتی وابستگی رکھنے والوں پر گراں تھا، لیکن اہل تقویٰ اور اللہ کی ہدایت حاصل کرنے والوں کے لیے باعث تشکر و حمد تھا۔ انہیں ناگوار محسوس ہونے کا سوال ہی نہ تھا ۔ وما کان اللہ لیضیع ایمانکم ۔ یہ سوال کہ جو لوگ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے رہے، ان کی نمازوں کا کیا ہوگا؟ یاد رہے، اللہ، عقیدہ درست و عمل صحیح (ایمان) کو نظر انداز نہیں کرتا، وہ نیت دیکھتا ہے۔ اگر وہ لوگ اپنی پسند سے نمازیں پڑھتے تھے تو قبلہ اول بحال رہتا جب بھی عبادتیں قبول نہ ہوتیں۔ البتہ جو مومن قربۃً الی اللہ عبادت کرتے تھے ان کا صلہ انہیں ضرور ملے گا۔ اللہ تو رؤف و رحیم ہے۔

لِنَعْلَمَ ۔ تاکہ ہم جان لیں ۔ تحویل قبلہ امتحان تھا۔ امتحان، عموماً اس لیے ہوتا ہے کہ طالب علم کو سند و درجہ دیا جائے ۔ عموماً، استاد کو اپنے شاگرد کی قابلیت معلوم ہوتی ہے۔ مگر استاد یا شاگرد کا جاننا کافی نہیں، علم کسی وجود کا ثبوت نہیں، وجود و ظہور کمال کے لیے ایک راہ سے گذرنا اور ایک عمل ایجاد کرنا ضروری ہے۔ اللہ، کو علم ہے کہ مومن کون ہے۔ کافر کون۔ مگر اس علم کے ظہور اور معلوم کے وجود سے دوسروں کو تشویق اور خود اس شخص پر حجت تمام ہوتی ہے۔ تو ۔ اِلَّا لِنَعْلَمَ ۔ کا مطلب واضح ہے۔ بطور محاورہ، مراد یہ ہے کہ سب جان لیں، خدا جو علم غیب رکھتا ہے، اس کا علم شہود سب کو حاصل ہو جائے کہ متبع رسول ؐ کون ہے اور ہوا و ہوس کا پرستار کون ہے ۔ رہا اللہ، تو وما اللہ بغافل عما تعملون ۔ اس طرح کے استعمال قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ (ابھی اس امتحان و علم کے نتائج و گفتگو کا سلسلہ جاری ہے اور بات مزید واضح ہو رہی ہے)

سمت قبلہ کا تعین مظاہراتی امور میں وحدت کی بنیاد ہے۔ اللہ ایک ہے، پوری امت

مسلمہ کا فکری نقطۂ اتحاد، قرآن حق ہے، نظریاتی نقطۂ اتحاد۔ رسولؐ قائد و امام ہیں اور قبلہ مرکز توجہ دونوں دھڑوں کے لیے عملی اقدامات اور صف بندی ضروری ہے۔ حضورؐ آگے اور سب ان کے پیچھے قدم ملا کر ایک سمت چلیں تو امتِ وسط اپنے گواہ کے ساتھ سب کے سامنے شان و شوکت سے ابھر کر آئے گی۔

قَدْ
نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا
فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ● وَلَئِنْ اَتَيْتَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ وَمَآ
اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ وَلَئِنِ
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ● اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ
يَعْلَمُوْنَ ● اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ●

ترجمہ:

یقیناً ہم تمہارے چہرے کا آسمان کی طرف بار بار اٹھنا دیکھ رہے ہیں، تو ہم تمہیں اس قبلے کی طرف ضرور موڑ دیں گے جس سے تم خوش ہو۔ تو اب اپنا رخ مسجد الحرام کی طرف کر لو ـــ اور جس جگہ بھی تم ہوا کرو، اسی طرف منہ کر لیا کرو۔ اور جن لوگوں کو کتاب ملی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہی

اللہ کی طرف سے بجا و درست (و حق) ہے۔ اور اللہ، ان کاموں سے بے خبر نہیں جو کچھ وہ لوگ کرتے ہیں (۱۴۴) اور اگر (اے رسولؐ) آپ، اہل کتاب کے پاس ساری نشانیاں (دلائل و براہین) لے آئیں (جب بھی) وہ لوگ آپ کے قبلے کو نہ مانیں گے اور نہ آپ ان کے قبلے کو مانیں گے اور نہ ان میں کوئی ایک دوسرے کا قبلہ ماننے والا ہے۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی۔ جب کہ علم (حقائق) آپ کے پاس آچکا ہے۔ تو اس وقت آپ بھی ستم گر ہوں گے (۱۴۵) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اُسے یوں جانتے ہیں جیسے اپنی اولاد کو۔ اور بلاشبہ ایک گروہ ان میں ایسا ہے (جس کے افراد) دیدہ و دانستہ حق بات کو چھپاتے ہیں (۱۴۶) حق آپ کے رب (ہی) کی طرف سے ہے، اس کے بعد آپ شک کرنے والوں میں سے نہ ہوئیے گا (۱۴۷)

تفسیر

۱۴۴۔ قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بیت المقدس کے قبلۂ مؤقّت ہونے کا علم تھا وقت حکم ثانی کی قربت اور انتظار کی گھڑیاں بے چین کیے تھیں۔ وحی کی تمنا اور نزول فرمان کی آرزو میں نگاہیں بلندی کی طرف اٹھ رہی تھیں جب کہ یہ ادا بھا گئی اور انتہائی محبت کے لہجے میں ارشاد ہوا "ہم نے تمھاری نگاہوں کا اٹھنا دیکھا، گھبراؤ نہیں، ہم ایسا قبلہ مقرر کرنے والے ہیں، جس سے تم خوش ہو جاؤ گے۔ تمھارے دادا ابراہیمؑ کا آباد کیا ہوا کعبہ، جہاں انھوں نے تمھارے لیے دعا کی تھی۔ موسیٰؑ سے پہلے کا قبلہ۔

حکم تبدیلی قبلہ: رسول اللہؐ مدینۂ منورہ سے ذرا دور بنی سلمہ کی آبادی میں ظہر کی نماز ادا فرما رہے تھے کہ حکم ہوا۔ "فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ" تیسری رکعت میں حضرت نے سمت مسجد الحرام رخ فرمالیا۔ ابھی تک وہاں یادگاری مسجد موجود ہے، گذشتہ دس

سال پہلے جب پہلے حج سے مشرف ہوا اور مدینۂ منورہ میں حاضری دی، تو مسجد ذو قبلتین میں میں نماز پڑھی، مسجد میں داخل ہوتے ہی زینے والے دروازے کے قریب بائیں ہاتھ محراب کی علامت صدیوں سے چلی آرہی تھی، دوسری مرتبہ گیا تو وہ محراب مٹا دی گئی تھی۔

بہر حال سمت مسجد الحرام رخ کرنا شرطِ اداء نماز ہے۔ جہاں بھی نماز ادا کرنا ہو سمت یہی رکھنا ہوگی۔ اس حکم نے مسلمانوں کو ہیئت و جغرافیہ۔ طول بلد و عرض بلد و اسطرلاب وغیرہ کے علم و فن سے آشنا کیا اور پھر اس میں مسلمانوں نے ایسی مہارت حاصل کی جس نے معاصر قوموں پر برتری پائی۔

اس حکم کے ردِ عمل اور اہل کتاب کی بحث پر دھیان نہ دیں۔ انہیں جس طرح آخری نبی کے اوصاف و احوال کا علم ہے اسی طرح اس قبلے کے برحق ہونے کی اطلاع ہے۔ اس کے بعد جو کر رہے ہیں کریں، اللہ، ان کے کرتوت جانتا ہے۔

حکم مذکور میں "کعبہ" کے بجائے "شطرِ مسجدِ حرام" ایک معجز نما تعبیر ہے۔ اس سے جہت اور اس میں طولِ مسافت۔ اور طول صف میں فائدہ، خطِ سجدہ متعین کرنے میں آسانی اور کعبہ کے گرد حرکت کے دائرے کی عظمت، سب کا بیان آگیا۔

۱۴۵- وَلَئِنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ

میرے رسولؐ، آپ یا مسلمان جتنی دلیلیں دیں، معجزے بھی دکھائیے یہ اس قبلے کو مانیں گے نہیں، یہ مسئلہ مرکزیت کا ہے، خود ان کے رخ الگ الگ ہیں اور آپ بھی ان کا قبلہ کب مانیں گے فکر مند نہ ہوں، ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اے پیغمبر! قرآن آجانے کے بعد ان کی رائے کا وزن ہی کیا رہ جاتا ہے۔ بفرضِ محال اگر آپ ان کے مطالبے مان لیں تو اس قدر محبوب و بلند مرتبہ ہونے کے باوجود حق سے دور ہوجائیں گے۔ منحرف لوگوں کو مقدم سمجھنے اور حکم خدا کو ثانوی درجہ قرار دینے پر یہ تنبیہ دراصل عام مسلمانوں کے لیئے ہے، کہ جب ہم قانون کی بات کرتے ہیں تو اپنے بندۂ خاص اور تمہارے رہبرِ اعظم کو بھی اس کا پابند کرتے ہیں، تا بہ شما چہ رسد۔

نیز دیکھئے آیت ۱۲۰۔

۱۴۶- اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡرِفُوۡنَہٗ

اہلِ کتاب - یہود و نصاری آپ کے حسب نسب، شکل و صورت، بعثت و شریعت کے بارے میں خوب جانتے اور آپ اتنا ہی جانتے پہچانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو، اسی وجہ سے تو ان میں سلیم الطبع مسلمان ہوگئے۔ کج فطرت یہ باتیں چھپاتے ہیں اور چھپاتے رہیں گے۔ مگر آپ کا نام اور کام اونچا ہو کر رہے گا۔

۱۴۷ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکَ

قبلہ کی تبدیلی ہو یا آپ کی رسالت اور قرآن کا نزول، حق وہی ہے جو آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ ہمدردی کی بنا پر حق کے معاملے میں پس و پیش کو راہ نہ دینا چاہیے۔ حق استقامت چاہتا ہے۔ یہاں بھی روئے سخن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے اور بات عام مسلمانوں سے ہو رہی ہے۔ اس طرح بات میں زور اور کلام میں بلندی آگئی ہے اور یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے۔

وَلِکُلٍّ وِّجۡہَۃٌ ہُوَ مُوَلِّیۡہَا فَاسۡتَبِقُوا الۡخَیۡرٰتِ ؕ اَیۡنَ مَا
تَکُوۡنُوۡا یَاۡتِ بِکُمُ اللّٰہُ جَمِیۡعًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ
قَدِیۡرٌ

ترجمہ:

ہر ایک (گروہ) کی ایک جہت ہے، وہ اس کی طرف منہ کرتا ہے۔ تم تو نیکیوں میں آگے بڑھو (مقابلہ کرو)۔ تم جہاں کہیں ہوگے، اللہ تم سب کو (محشر میں) جمع کرے گا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے (جو چاہے کر سکتا ہے) (۱۴۸)

تفسیر

مکے میں بتوں کی مخالفت اور مدینہ میں قبلہ کا مسئلہ پہلا سنگین مسئلہ تھا، وہاں مشرک بھڑک اٹھے تھے، یہاں یہود و نصاری سامنے آگئے۔ قرآن مجید نے سادہ اور ہدایت آفرین لہجے میں سمجھایا کہ ابراہیم علیہ السلام سے موسیٰ علی نبینا وعلیہما السلام تک غور کرو، ان کے ماننے والے آج ایک جہت پر کب متفق ہیں، جو تم مسلمانوں سے الجھ رہے ہو۔ بیت المقدس ایک مگر اس کے ماننے والوں کی جہتیں دو۔ بس یہ بحث چھوڑو۔ خیر و بھلائی کو دیکھو، کدھر ہے۔ کون حق و صداقت، دنیا و آخرت میں فائدہ دینے والی باتیں بتاتا ہے، بس بھلائیوں کو حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ قیامت کے روز (بنا بر روایات اہل بیت علیہم السلام رجعت کے موقع پر) قادر مطلق اللہ تم سب کو یک جا کردے گا اور اس وقت ہر ایک کا عقیدہ درست اور عمل صحیح کام آئے گا۔ نیز دیکھیے آیت ۱۷۷۔

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝

ترجمہ:

جہاں سے باہر جاؤ (شہر ہو یا قریہ، نماز کے لیے) اپنا رخ مسجد الحرام کی

طرف کرلو بے شک تمہارے رب کا یہ حکم برحق ہے، اور جو عمل تم کرتے ہو
اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے (۱۴۹) اور جہاں سے بھی نکلو، اپنا منہ مسجد الحرام
کی طرف کرلو (نماز کے لیے) اور جہاں کہیں (ٹھہرے ہوئے) ہو اپنے
رخ اسی (مسجد الحرام کی) طرف رکھو، تاکہ لوگوں کو تمہارے خلاف کوئی دلیل
ہاتھ نہ آئے۔ رہے وہ لوگ جو بے انصاف ہیں تو ان سے بے خوف رہو،
اور مجھ سے ڈرتے رہو۔ اور اس لیے کہ تم پر اپنی نعمت تمام کروں اور
اس واسطے کہ تم ہدایت پالو (۱۵۰)

تفسیر:

۱۴۹۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ .... عَمَّا تَعْمَلُونَ
۱۵۰۔ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ .... تَهْتَدُونَ

مسجد الحرام کی طرف رخ کرنے کا حکم فقط مدینے ہی کے لیے نہیں، سفر میں جاؤ اور نماز
پڑھنے کھڑے ہو، کہیں پڑاؤ کرو اور نماز پڑھنا ہو تو قبلہ وہی مسجد الحرام کی سمت ہے۔
خواہ سفر (یا نماز) مکے سے مدینے ہو یا مدینے سے شام، راستہ بیت المقدس کی طرف ہو یا مشرق
یا مغرب کی طرف، سمت نماز و قبلہ وہی ہوگا۔
تحویل قبلہ کا حکم بار بار آیا تو اس لیے ہے کہ اس کے اسباب متعدد اور فائدے
الگ الگ تھے۔ (الف) قد نری تقلب وجھك ... رسول اللہؐ کی تکریم و رضا کا
اظہار (ب) ولکل وجھۃ ھو مولیھا ... سنت اللہ یہ ہے کہ صاحبان شریعت کا
قبلہ الگ ہوتا ہے۔ (ج) لئلا یکون للناس علیکم حجۃ۔ دشمن کی دلیلیں توڑنے
کے لیے۔
آیت نمبر ۱۵۰ میں تین فائدے بیان ہوئے ہیں۔ (۱) دشمن الزام نہ لگا سکیں۔
(۲) اللہ اپنی نعمت تمام کرے (۳) مسلمان راہ ہدایت پا جائیں۔
پھر تینوں آیتوں میں استقبال قبلہ کی تین حیثیتیں بیان ہوئی ہیں پہلی حیثیت

نماز پڑھنے کی حالت ہے۔ دوسری حیثیت زمان (سفر) کی اور تیسری حیثیت مکان اور مقام قیام کی ہے۔
مقصود اصل تقویٰ ہے، اس کے لیے خلا ہو یا ملا عمل ایک ہونا اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرنا شرط ہے۔

كَمَآ أَرْسَلْنَا فِيكُمْ
رَسُولًا مِّنكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ۝
فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ ۝
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ
الصَّابِرِينَ ۝

ترجمہ:

جیسے ہم نے تمہیں میں سے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا، وہ تم کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہارے نفس کو پاک کرتا اور تمہیں کتاب و دانش کی تعلیم دیتا ہے اور جو تمہیں معلوم نہ تھا وہ بتاتا ہے (۱۵۱) تو مجھے یاد کرتے رہو، میں بھی تمہارا ذکر (خیر) کیا کروں گا۔ اور میرا شکر ادا کرتے رہو اور ناشکری نہ کرنا (۱۵۲) ایمان لانے والو! صبر اور نماز کے وسیلے سے (خدا سے) مدد مانگو۔ بے شک، اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (۱۵۳)

تفسیر:

۱۵۱۔ کَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْکُمْ رَسُوْلًا

اس سے پہلی آیت میں ولاتم نعمتی ۔ تھتدون ۔ کی بات ہے ۔ بعثت رسول کو اللہ نے نعمت قرار دیا ہے ۔ "منّ اللہ علی المؤمنین اذ بعث" اسی طرح کھلی گمراہی میں مبتلا لوگوں کے لیے آخری پیغمبر کو ہدایت و ہادی بناکر بھیجا ۔ اس آیت میں "کما" "جس طرح، جیسے" کہہ کر سابقہ مسئلے کو معجزانہ طور سے مربوط فرمایا کہ تم لوگوں میں سے ایک شخص کو ہم نے مبعوث کیا، یہ تمہارے معاشرے، تمہارے شہر، تمہارے جانے پہچانے خاندان کا فرد ہے۔ تم اپنا تخلیقی کلام سنتے سناتے رہے ہو۔ یہ ہماری آیتیں پڑھتا اور سناتا ہے۔ تم اخلاق و نفسیات بگاڑتے ہو یہ انھیں پاک و طاہر کرتا ہے۔ تم جہالت و مکاری، خونخواری و عہدشکنی کے درس دیتے رہے، یہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ تم سب بھلائے بیٹھے تھے، یہ روز علم و عقل کو جلا بخشتا ہے۔ (دیکھیے آیت ۱۲۹) ذہنی صلاحیتوں کو ابھار کے لئے تلاوت، نفسیاتی قوتوں کو صالح بنانے کے لیے تزکیہ و تقوی، اس کے بعد دستور و قانون کی تعلیم اور دانش و بینش کی راہیں کھولنے کے لیے حکمت کی تلقین و تربیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا عظیم کارنامہ ہے۔

۱۵۲۔ فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ

تعلیم و تربیت کے شاندار فوائد حاصل کرنے کا فائدہ کم سے کم یہ تو ہو کہ ہر دم اس کی یاد ہو۔ یہ اس کا کرم، جو اس نے فرمایا ۔ مجھے یاد رکھو گے تو میں بھی تمھیں نظر انداز نہ کروں گا ربوبیت کی شان یہی ہے ۔ اب بندگی کا تقاضہ فراموش نہ ہو، ہر لحہ ذکر، ہر آن شکر، کبھی کفران و ناشکری کا تصور قریب نہ آنے پائے ۔

۱۵۳۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ

صبر کا قرآن مجید میں تقریباً ستر مرتبہ ذکر کیا گیا ہے ۔ آدمیت و شخصیت کا سنگِ بنیاد، ایمان و تقوی کی بنیاد پر رکھا جائے تو ایک اندرونی قوت ابھرتی ہے جسے صبر

کہتے ہیں جب اللہ کے سوا کسی کا ڈر نہیں تو مصائب سے کیوں ڈرے اور صراط مستقیم سے کیوں ہٹے۔ ثبات قدم (صبر) کے ساتھ نماز پڑھ کر مزید قوت میں اضافہ چاہو۔ ثابت قدم، راسخ الایمان افراد کا اللہ ساتھ دیتا ہے۔

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام ہر مشکل کے وقت اٹھتے نماز پڑھتے اور اس آیت کی تلاوت فرماتے تھے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ
بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ●

ترجمہ:

جو راہ خدا میں قتل کیے گئے، انہیں مردہ نہ کہو۔ وہ تو زندہ ہیں۔ اور بات یہ ہے کہ تم (ان کی زندگی کا) شعور نہیں رکھتے۔ (۱۵۴)

تفسیر:

شہید زندہ ہے۔ اسے مردہ نہ کہو۔ راہ خدا میں جسے قتل کردیا گیا، اللہ کے لیے جس نے خون کا دریا عبور کرلیا، اس کی توحید پرستی، اللہ پر بھروسہ، مقاصد دین پر زندگی نثار کرنے کا عمل، خالق موت وحیات کی ایسی رضا کا باعث ہے کہ اس نے اپنی قدرت کاملہ سے تار نفس ٹوٹ جانے، جسم کے آثار ختم ہو جانے کے باوجود "زندہ" رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ سوال کہ اس کی زندگی کیا ہے؟ حیٰ ومیت کا ہم ہر لمحہ مشاہدہ کرتے ہیں، اس شہید میں اور عام مرنے والے میں کوئی فرق نہیں ملتا؟ جواب ہے "لا تشعرون" اس زندگی کا تم شعور نہیں رکھتے۔ اسی سورہ بقرہ میں ملائکہ کی بات معجزے کی زبان میں بیان ہوئی ہے۔ سبحانک لاعلم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم (۳۲) پروردگار تو پاک ہے۔ ہمیں تو وہی معلوم ہے جو تو نے ہمیں عطا کیا تو ہر قسم کے علم کا مالک اور تمام حکمتوں سے باخبر ہے۔ اس نے کہا ہم نے موت کو خلق کیا۔ عقل کو تردد ہوا، اس نے فرمایا "غیب" ایک حقیقت ہے۔ عقل کو شک ہوا

اس بارے میں عقل کو یہ بات یاد دلانا چاہیے کہ حکماء و فلاسفہ بلکہ آج کے سائنس داں بھی کہتے ہیں "وعلم کنہ حقائق الاشیا غیر جدا" "چیزوں کی اصل و کنہ کا علم مشکل ترین بات ہے۔"

راہ خدا میں موت زندگی بن جاتی ہے۔ یہ وہ اعلان ہے جس نے مسلمانوں کے لیے حق پر مرنا آسان کر دیا۔ بدر سے کربلا تک اس کے مثالی نمونے اور تاریخ مسلمان عالم اس کے حیرت انگیز آثار سے روشن ہے اور نور افشاں رہے گی۔ (دیکھیے آل عمران ۱۶۹)

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝

ترجمہ:

اور ہم قطعاً تمہیں تھوڑے سے خوف، بھوک اور مال و جان اور پھلوں میں کمی سے آزمائیں گے۔ اور (اے رسولؐ) بشارت دیں۔ ان صبر کرنے والوں کو (۱۵۵) جو مصیبت پڑنے کے وقت کہتے ہیں۔ ہم اللہ ہی کے ہیں اور ہم اسی کے حضور میں پلٹ کر جانے والے ہیں (۱۵۶) یہی وہ (لوگ) ہیں جن پر ان کے رب کی طرف سے صلوٰۃ و رحمت ہے۔ اور یہی وہ ہیں جو ہدایت یافتہ ہیں (۱۵۷)

تفسیر:

۱۵۵۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ . . . .

زندگی جد و جہد، محنت و مشقت، امتحان اور سفر در سفر کا نام ہے۔ ٹھہرنا، ساکن و مطمئن

رہنا، آرام وسکون کا نام موت ہے، فکری تصادم، عملی ٹکراؤ، مقاصد کا تضاد، آگے بڑھنے اور منزل پالینے کی خاطر ٹھوکریں کھانا پڑتی ہیں۔ یہاں دعوے ٹھکرا دیے جاتے ہیں، دلیلیں پرکھی جاتی ہیں۔ جن طلبہ نے گولڈ میڈل لیے ہیں، جن مزدوروں نے تاج محل بنائے ہیں، ان سے پوچھیے، کتنی راتیں جاگ کے کاٹیں، کتنے دن بے حواسی میں گذارے۔ کتنے پتھر ڈھوئے اور کتنی چوٹیں کھائیں تب جاکر داد ملی اور انعام پائے ہیں۔ اللہ کا دستور قدیم ہے کہ دعوت اسلام پر لبیک کہنے والوں کو انعام دیتا ہے۔ ان کے ہاتھ پاک ان کا ظاہر طاہر ان سے معاشرتی زندگی کے رشتے استوار کرنے کا حکم دینے کے بعد۔ امتحان لیتا ہے۔ اَحَسِبَ الناس ان یترکوا ان یقولوا آمنا۔۔۔ کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ اس بنیاد پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ دعوائے ایمان کرتے ہیں۔ حالانکہ ہم نے ان سے پہلے والوں کو آزمایا۔ تاکہ اللہ سچے لوگوں کو الگ دیکھ لے اور جھوٹوں کو الگ دیکھ لے۔" (العنکبوت ۲)۔ اللہ کا امتحان، جان، مال، اولاد، فصل، خوف اور ہزار رنگ سے ہوتا ہے۔ جو جتنا ثابت قدم رہا اسے اتنی ہی بلندی ملی۔ قرآن نے اس کی ضمانت دی ہے۔

۱۵۶- اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ ۔۔۔۔۔۔۔۔

مصیبت میں مبتلا ہونے والے نفسیاتی طور پر تین گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔

(۱) وہ لوگ جو گھبرا کر جائز و ناجائز اخلاقی و غیر اخلاقی تدبیروں سے مدد لے کر بلا کو ٹالنے کی سعی کرتے ہیں۔ (۲) وہ لوگ جو حواس باختہ ہو کر بے دست و پا پڑ جاتے ہیں کہ جو ہونا ہے ہوگا۔ (۳) وہ لوگ جو مصیبت کے وقت بیدار اور بلا میں گرفتار ہو کر خدا سے لو لگاتے، توکل کا دامن تھام کر کہتے ہیں "حسبنا اللہ" وہ تھک کے نہیں بیٹھتے، قانون خدا اور رضا کے آئین کو سامنے رکھ کر سرگرم عمل رہتے ہیں اور کہتے ہیں: "اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن"

عجیب فلسفہ اور زندگی آفریں عقیدہ

عقیدۂ لا الٰہ الا اللہ، بجائے خود ایک قوت ہے۔ ایک قادر و مالک خالق و حکیم کو مان کر ہر قوت و طاقت کو کمزوری سمجھنا ۔۔۔۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ کوئی قوت کوئی طاقت نہیں ہے، مگر اللہ سے۔ اس عزیمت کے سامنے کوئی فرعون و نمرود نہیں ٹھہر سکتا۔ پھر ایک منزل وہ ہے، جہاں عقل و بصیرت کہتی ہے۔ انا للہ۔ ہم اللہ کے ہیں، وہ مالک ہے ہم مملوک، وہ آقا ہے ہم بندے، وہ صاحب اختیار ہم بے اختیار و ناچیز۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس کی تفسیر کا سمندر دو جملوں میں

سمو دیا ہے۔ "انّ قولنا ۔ انا للّٰہ ۔ اقرار علی انفسنا بالملک ۔ ہمارا ۔ انا للّٰہ ۔ کہنا دراصل یہ اقرار ہے کہ ہم اس کی ملکیت میں ہیں ۔ و قولنا ۔ انا الیہ راجعون ۔ اقرار علی انفسنا بالھلک۔" اور انا الیہ راجعون ۔ یہ اقرار ہے کہ ہم فنا ہو جائیں گے ۔ (کلمات قصار نہج البلاغہ) سپردگی کا یہ درجہ تقوے کا انتہائی مقام ہے ۔ یہاں پہنچ کر مصیبت بشارت بن جاتی ہے اور خدا بندے سے اس کی رضا پوچھتا ہے ۔ سرور دو عالم صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اس درجے کی معراج پر فائز تھے ، اور علیؑ و فاطمہؑ ان کے نقش قدم پر ان کے پیچھے پیچھے ۔ ان کی امت میں ہزاروں افراد اس فلسفے پر کاربند رہے اور آج بھی ہیں ۔

ایک خاتون کا درجہ

شیخ عباس قمیؒ نے سفینۃ البحار میں لکھا ہے :

ام عقیل ایک صحرا نشین خاتون کے گھر دو مہمان آگئے ، اس کا فرزند اونٹ چرانے صحرا گیا ہوا تھا ، مہمانوں کے اترتے ہی کسی نے خبر دی ۔ اونٹ بگڑ گیا اور اس نے تمہارے بیٹے کو کنوئیں میں پھینک دیا ، اس کی موت واقع ہو چکی ہے ۔ وہ مومنہ مخبر سے کہنے لگی ۔ ذرا زحمت کرو ، میرے یہاں مہمان آئے ہیں یہ دنبہ لو ، اسے ذبح کرکے گوشت تیار کردو ۔ گوشت تیار ہوا ، اس نے جلدی جلدی کھانا پکا کر مہمانوں کے سامنے لگا دیا ۔ مہمان کھانے سے فارغ ہو چکے تو مومنہ نے کہا ۔ آپ میں سے کوئی عالم قرآن ہے ؟ ایک شخص نے پوچھا کیا بات ہے ؟ اس نے کہا مجھے کوئی ایسی آیت سنائیے کہ بیٹے کی موت سے تسلّی و صبر حاصل ہو ۔ مہمان نے آیت پڑھی ۔ وبشّر الصّابرین الذین اذا اصابتہم مصیبۃ قالوا انّا للّٰہ و انّا الیہ راجعون اولٰئک علیہم صلوٰۃ من ربہم و رحمۃ و اولٰئک ہم المہتدون ۔ عورت خدا حافظ کہہ کر اٹھی اور نمازیں پڑھنے لگی ، نماز کے بعد بارگاہ الٰہی میں عرض کی ۔ یا اللہ ! تو نے جو حکم دیا تھا میں نے اس کی تعمیل کی ۔ اب تو نے جو وعدہ فرمایا ہے ، اسے پورا کر ۔ اگر اس دنیا میں کسی کو کسی کے لیے جینے کا حق ہوتا ...... (ہم لوگ یہ سمجھے کہ یہ خاتون کہے گی کہ میرا فرزند میرے لیے زندہ رہتا ۔ مگر اس نے جملہ یہ کہہ کر پورا کیا ۔ تو پیغمبر اسلامؐ امت کے لیے باقی رہتے (سفینہ مادہ صبر)

اور کربلا کے واقعے میں امام حسین علیہ السلام نے اس آیت کی قولی و فعلی جو تفسیر فرمائی

اس کی مثال قیامت تک کے لیے ایک درس ہے۔ مدینے سے کربلا تک ہر قدم پر یہ آیت پڑھتے اور روکنے اور مشورے دینے والوں کو سمجھاتے رہے کہ جب ہم اللہ کے ہیں اور اسی کے حضور جارہے ہیں تو غم کیا اور خوف کس کا۔

انقلاب اسلامی ایران میں۔ سید جلیل امام روح اللہ خمینی مدظلہ العالی اور ان کے ساتھیوں نے امام حسین علیہ السلام کے اس درس اور قرآن کے اس فلسفے پر عمل کے جو نمونے پیش کیے ہیں وہ حقانیت اسلام و قرآن کا زندہ ثبوت ہیں۔ انقلاب کے ستون، قوم کے سربراہ، امام کے دست و بازو، آیت اللہ محمد حسین بہشتی اپنے ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ بم سے اڑا دیے گئے ہم دور ہوتے کے باوجود لرز گئے۔ مگر امام خمینی مدظلہ نے تقریر کے آغاز ہی میں فرمایا کہ جس قوم کا فلسفہ انا للہ ہو اسے موت سے نہیں ڈرایا جاسکتا۔ عزیز سے عزیز ترین کی موتیں اور بلا پر بلا کی یورشیں ہیں، مگر رہبر اعظم ملت کا چہرہ انا للہ و انا الیہ راجعون کا آئینہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس شخص کو چار عادتیں ہوں گی اسے نور اللہ اعظم میں جگہ ملے گی جس کی ہر کام میں لا الہ الا اللہ و محمد رسول اللہ سے ضمانت لینے کی عادت ہو، اور جس پر مصیبت آئے تو انا للہ و انا الیہ راجعون کہنے کی عادت ہو۔ جسے کوئی خیر ملے تو الحمد للہ اور غلطی کرے تو استغفر اللہ کہنے کی عادت ہو (دیکھئے الصافی بحوالہ عیاشی والخصال)

۱۵۷۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ

وہ صابر و ثابت قدم، وہ انا للہ کے قائل افراد قابل درود و رحمت ہیں۔ اللہ ان پر صلوٰۃ بھیجتا اور رحمت نازل فرماتا ہے۔ کیونکہ "رحمتی وسعت کل شئی فساکتبھا للذین یتقون" (الاعراف ۱۵۶) یہ بات آفرین بھی ہے اور سند رضا بھی۔ نیز مرد مومن کی سب سے بڑی کامیابی کا اعلان ہے۔

اِنَّ الصَّفَا

وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ

عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۗ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ●

ترجمہ:

بلاشبہ صفا اور مروہ (کی پہاڑیاں) اللہ کے شعائر میں ہیں، تو جب بھی کوئی شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ بجالائے تو کوئی حرج نہیں (کوئی گناہ نہیں) کہ ان دونوں میں سعی کرے اور جو شخص دل وجان سے اچھا کام کرے تو اللہ قدرداں اور سب کچھ جاننے والا ہے (۱۵۸)

تفسیر:

جب سے کعبہ ہے اس وقت سے حج ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عمارت کی تجدید کی اور اپنی زوجہ "ہاجرہ" کو مع شیر خوار فرزند اسماعیل علیہ السلام کے یہاں آباد کیا۔ اللہ نے ان کے منصوبے کو پسند فرمایا اور حج میں ان لوگوں کے اعمال کو واجب قرار دے دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے یہاں بتوں کا راج تھا، اور بت شکن خلیل اللہ کے موحدانہ حج میں مہملات ملا کر اسے کچھ سے کچھ کر دیا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکم خدا حج کے مناسک معین کیے تو ان میں طواف خانۂ کعبہ اور صفا و مروہ کی سعی بھی تھی۔ بظاہر روایات اہل مدینہ دستور قدیم کے مطابق سعی نہیں کرتے تھے۔ پھر صفا پر "اساف" اور مروہ پر "نائلہ" نامی مورتیں رکھ کر اور ستم ڈھایا تھا۔ لوگ مسلمان ہوئے اور حضورؐ نے احکام حج بتائے۔ تو کچھ لوگوں نے "سعی" کے بارے میں تردد کیا۔ دونوں بتوں کی طرف آنا جانا ان کے پہاڑوں میں سعی کریں؟ کیا حکم ہے۔ ارشاد باری ہوا۔ حج اور عمرہ دونوں میں سعی کرو، سعی میں کوئی گناہ اور کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر دل وجان سے خدا کے لئے یہ عمل یا کوئی نیک عمل کرو گے تو خدا اس کا بدلہ دے گا، وہ نیت و کردار سے باخبر ہے۔

صفا۔ ایک پتھر کی پہاڑی گوشۂ حجر اسود کے سامنے پندرہ میٹر بلند اور مروہ حجر اسماعیل کے سامنے آٹھ میٹر کی اونچائی رکھتی ہے۔ دونوں سخت پہاڑیوں کے درمیان چار سو انیس میٹر کا فاصلہ ہے۔ جن کے درمیان چلنا اور "ہرولہ" کرنا پڑتا ہے۔

سعی، بندگی کی سخت راہوں اور عاجزی کی پتھریلی گھاٹیوں میں قدم بڑھانے کی تربیت بھی ہے اور للّٰہیت کا امتحان بھی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَ
الْهُدَىٰ مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ
يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا
وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

ترجمہ:

بے شک جو لوگ ان واضح احکام اور ہدایات کو جنھیں ہم نے نازل کیا اس کے بعد چھپاتے ہیں جبکہ ہم لوگوں کے لیے کتاب میں صاف صاف بیان کر چکے، تو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں (۱۵۹) مگر جن لوگوں نے (حق چھپانے سے) توبہ کی اور اپنی اصلاح کرلی اور (کتاب کے احکام) بیان کیے، تو میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہوں (۱۶۰)

تفسیر:

۱۵۹۔ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا ....

تورات میں آخری نبی امیؐ کے صفات اور ہدایت کے اصول، توحید و احکام شریعت اس لیے نازل کیے گئے تھے کہ مستقبل تک لوگوں کو فکری طور پر تیار کیا جائے مگر یہود نے ان تعلیمات کو چھپایا اور لوگوں کو کچھ نہ بتایا، لہٰذا جو لوگ حقائق کو چھپاتے اور عوام کو اندھیرے میں رکھتے ہیں، انھیں لعنت کی سزا ہے۔ ان پر اللہ لعنت کرتا ہے، اور مومن انسان بھی لعنت کرتے ہیں۔ نفرت کا اظہار جس طرح لعنت سے ہوتا ہے کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ لعنت آخرت میں رحمت سے دوری اور دنیا میں پھٹکار اور بیزاری ہے اور یہ سزا اس باخبر کے لیے ہے جو حق چھپائے۔

دینِ خدا ایک مشن ہے، ایک تحریک اس تحریک میں پیام کو چھپانا اصل دین کی ترقی کو روکنا اور اسے انحراف کی طرف ڈھکیلنا ہے۔ ظاہر ہے کہ بامقصد منصوبوں میں ایسے کام بڑے سخت جرم ہیں خدا رحیم ہے اس لیے ایسے مجرموں کو موت کی سزا نہیں دی، مگر ہاں، لعنت کی سزا وہ دی ہے جو ہمیشہ باقی رہے گی۔ دیکھیے آیت ۱۵۹۔

۱۶۰۔ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا ....

ترییت اور ہمت افزائی کا یہ انداز رحمت ـ سبحان اللہ ـ حق چھپانے کا مذموم جرم اور اس کی سزا بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا کہ جو لوگ اپنی اصلاح کریں، توبہ و معافی مانگ لیں اور اللہ کا پیام کماحقہ لوگوں تک پہنچانے لگیں گے وہ دوبارہ مومنوں میں شامل اور اسلام کے حلقے میں داخل مان لیے جائیں گے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ
لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ وَاِلٰهُكُمْ
اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝

ترجمہ:

بے شک جو کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں مر گئے۔ ان لوگوں پر اللہ کی اور ملائکہ کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے (۱۶۱) ہمیشہ اسی لعنت میں رہیں گے نہ ان پر سے عذاب ہلکا ہوگا اور نہ ان کو مہلت دی جائے گی (۱۶۲) اور تمہارا معبود، یکتا معبود ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں وہ رحمن و رحیم ہے (۱۶۳)

تفسیر:

۱۶۱۔ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ ....

۱۶۲۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ ....

اللہ کے تعلیمات اور حق باتوں کے چھپانے پر تنبیہ کے بعد ان افراد و اقوام کے بارے میں قانون بیان ہو رہا ہے کہ منکرین تعلیمات انبیاء کی سزا ابدی عذاب آخرت اور دنیا میں اللہ کی لعنت کے ساتھ ساتھ ملائکہ اور انسانوں کی لعنت و برأت سے بھی دوچار رہیں گے۔ یہ افراد ہمیشہ ان سے بیزاری کا اعلان کرتے رہیں گے۔ تاکہ ان کی طرح دوسرے افراد کفر اختیار نہ کریں۔

۱۶۳۔ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

یہ اعتقاد رکھو اور یہ حقیقت ہے کہ معبود حقیقی تم سب کا ایک ہی ہے اس میں تعدد کا ذرہ برابر احتمال نہیں۔ یہ آقائی نہیں کہ اس سے گھبرائے تو دوسرے کے ہو رہے، یہاں تو اس وحدہ لاشریک سے منہ موڑا تو پھر کوئی والی و وارث نہ ہو سکے گا۔ اس کے سوا کسی کے سامنے سر جھکانا صحیح ہے نہ کسی اور کے لیے تم پیدا ہوئے ہو۔

جسے اس کی یکتائی میں شک ہو وہ کائنات کی تخلیق پر غور کرے، ہر ذرہ اس کی وحدانیت و وجود کی دلیل ہے۔

جناب سید محمد باقر حکیم
ترجمہ: جناب محمد حسن معروفی

نزول قرآن کا مقصد

(آخری قسط)

قرآن اپنے کردار کے ضمن میں اساسی غرض کو ثابت کر دیتا ہے۔

عہد نبوی میں قرآنی کردار کا مطالعہ کرتے وقت نظر آتا ہے کہ اس نے مکمل تبدیلی (نظام و معاشرہ) کا مقصد، ہر بعد میں پورا کر دیا۔ قرآن نے حتی الامکان ہر جہت و سمت میں وسیع ترین پروگرام دیا ہے اور بشریت کو سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ اور بشریت مسلسل قرآن سے بہت کچھ حاصل کر رہی ہے۔ ایران میں امام خمینی کی رہبری میں آنے والے اسلامی انقلاب نے اسلام کو برسرکار لا کر اس حقیقت کو مزید ثبوت بہم پہنچایا۔ متعدد علماء اسلام نے قرآن مجید سے "تمام زندگی پر چھائے ہوئے قرآنی نظریہ حیات کے انکشاف و اعلان" پر جاندار کتابیں لکھی ہیں۔ اور کتاب و سنت سے تفصیلات جمع کی ہیں۔

اس عہد و عصر کی تالیفات کا بہترین نمونہ استاد گرامی حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ شہید محمد باقر الصدرؒ کے رشحات قلم ہیں جن نظریات کا انکشاف انھوں نے کیا ہے اس کی روشنی میں اسلامی فکر کو دوسرے افکار سے آزادی ملتی ہے اور انھیں بڑی عزت کے ساتھ عہد جدید میں سب کے سامنے رکھا جا سکتا ہے۔

درج ذیل نکات میں سے ہر نکتہ تفصیلی بحث چاہتا ہے مگر ہم سرسری نظر ڈال کر آگے بڑھیں گے۔ ناظرین ملاحظہ کرتے چلیں کہ قرآن نے کس قدر گہری تبدیلی اور ہمہ جہت تغیر برپا کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس انقلابی مرکز ــ چھاؤنی ــ سے ہوا جس کو قرآن نے بنایا اور قرآن نے ایجاد کیا۔ پھر قرآنی سعی کے جواب میں تبدیلیوں کا جو مثبت نتیجہ حاصل ہوا

وہ اپنے حجم اور کثرت کے اعتبار سے بتاتا ہے کہ قرآن کا اساسی مقصد و ہدف تھا ہی مکمل تبدیلی لانا ہے اور لاتے رہنا ۔

الف : خدا ریگانہ ویکتا :

جزیرۂ عرب کے باشندے خدا کے عقیدے میں تباہ حال اور گھٹیا خیال اور ادنیٰ درجے کی ذہنی سطح میں تھے اور یہی عقیدہ ان کے تمام معاملات پر حاکم اور ان کے مقدر کو رخ دینے والا بھی تھا۔ وہ خالق، اللہ کو ماننے کے باوجود بت، پتھر، فرشتے، جنات، ستارے کو وسیلہ قرار دیتے تھے اور یہ سب چیزیں ان کے ذہنوں پر اس طرح مسلط ہو گئی تھیں کہ وہ خالق و اللہ اور ان چیزوں کے درمیان فرق کے قائل نہ تھے ۔ اور شرک و بت پرستی تو ایک ایسا اجتماعی حادثہ تھا جو ان کی زندگی کے ہر موڑ، انفرادی، معاشرتی، اقتصادی و سیاسی و شخصی قوانین و آداب میں دخیل تھا صرف عقیدہ و عبادتیں کرنے پر موقوف نہ تھا۔

اس ماحول میں یہودی و نصرانی تھے مگر شرک و انحراف نے انھیں اس قدر تباہ حال کر دیا تھا کہ اب یہودیت و نصرانیت مداوا کرنے سے عاجز تھی۔

«اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أرباباً من دون الله والمسيح ابن مريم وما أمروا إلاّ ليعبدوا إلهاً واحداً لاإله إلاهو سبحانه عمايشركون.»
(توبة/٣١)

ان لوگوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا رب مان لیا اللہ کے علاوہ مسیح ابن مریم کو اپنا خدا جانا. حالانکہ اللہ کی عبادت کے علاوہ کسی عبادت کا حکم نہ دیا گیا تھا ۔ اسی یکتا خدا کی عبادت جس کے علاوہ دوسرا خدا نہیں ہے اور وہ خدا ان تمام چیزوں سے پاک و منزہ ہے جس کی نسبت مشرک اس کی طرف دیتے ہیں ۔

«ان يدعون من دونه إلاّ إناثاً وان يدعون إلاّ شيطاناً مريداً.لعنه الله وقال لأ تخذن من عبادك نصيباً مفروضاً.ولأضلّنهم ولأمنّينّهم ولآمرنّهم فليبتّكُن آذان الانعام ولآمرنّهم فليغيرن خلق الله.ومن يتخذالشيطان وليأمن دون الله فقد خسر خُسراناً مبيناً»
(نساء/١١٧،١١٩)

وہ اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتے ہیں مگر دیویوں کو اور نہیں پکارتے مگر شیطان مردود کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور کہا کہ کچھ تیرے بندوں کو حصہ بناؤں گا، ان کو گمراہ کروں گا اور ان کے دلوں پر آرزو آتاروں گا اور حکم دوں گا کہ چارپایوں کے کان کاٹ کر اللہ کی خلقت کو بدل دیں اور جس کسی نے اللہ کے علاوہ شیطان کو صاحب اختیار جانا اس کے لیے کھلا نقصان ہے۔

«وقالوا اتخذ الرحمن ولداً سبحانه بل عبادٌ مُكرمون.»
(انبياء/۲۶)

لوگوں نے کہا کہ اللہ نے اپنے لیے ایک لڑکا بنالیا ہے۔ اللہ پاک و منزہ ہے وہ تو اس کے اچھے بندے ہیں۔

«ويوم يحشرهم جميعاً ثم يقول للملائكة أهؤلاء إيّاكم كانوا يعبدون. قالوا سبحانك انت ولينا من دونهم بل كانوا يعبدون الجن اكثرهم بهم مؤمنون.» (سبأ /۴۰،۴۱)

جس دن سب کو محشور کرے گا پھر فرشتوں سے سوال کرے گا کہ کیا یہی لوگ تھے جو تمہاری پرستش کرتے تھے۔ فرشتے جواب دیں گے تو پاک و منزہ ہے۔ تو ہمارا ولی ہے، نہیں یہ لوگ جنوں کی پوجا کرتے تھے (جن کی جنس سے شیطان ہے) اور اکثر مشرک افراد اپنے معبودوں پر ایمان رکھتے تھے۔

«ألا لله الدين الخالص والذين اتخذوا من دونه أولياء مانعبدهم الاليقربونا الى الله زلفى ان الله يحكم بينهم فى ماهم فيه يختلفون ان الله لايهدي من هوكاذب كفار» (زمر/۳)

آگاہ رہو کہ سچا دین اللہ کا دین ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے علاوہ ولی بنالیے (وہ کہتے یہ ہیں کہ) ہم ان کی پوجا نہیں کرتے مگر اس لئے کہ وہ ہم کو اللہ سے قریب تر کردیں اللہ ان کے مختلف فیہ مسائل کا فیصلہ کرے گا۔ اللہ بہت زیادہ جھوٹ بولنے والے ناشکرے کی ہدایت نہیں کرے گا۔

«ان الذین تدعون من دون الله عباد أمثالکم فادعوهم فلیستجیبوا لکم ان کنتم صادقین.» (اعراف/۱۹۴)

اللہ کے علاوہ جن لوگوں کو بلاتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے انسان ہیں۔ اگر تم سچے ہو تو انہیں کو پکارو وہ تمہاری دعا قبول کریں۔

اس موضوع سے متعلق قرآن کریم میں بہت سی آیتیں ہیں اور مختلف دلائل و مسائل کے ذریعہ معاشرتی فساد و خرابی کی راہ بتائی ہے۔ ان معاملات میں شرک و بت پرستی کا قصہ تو قرآن کے مرکزی مسائل بحث میں ہے۔ اور قرآن میں یہ بحث اس طرح ہے کہ اس کے جلو میں الوہیت و وحدانیت مطلقہ اپنے کمال و جمال و جلال کے ساتھ یوں جھلکتی ہے کہ انسان شرک کو اس کے ہر رنگ و نقش کے ساتھ ٹھکرا دیتا ہے۔ جہاں ذرا سا شائبۂ شرک دیکھا اور موحد ٹھٹھکا۔ کوہ صفا اور کوہ مروہ میں سعی کرتے ہوئے یہی صورت حال صدر اسلام میں پیش آئی اور قرآن مجید نے اطمینان دلایا کہ سعی شرک نہیں ہے۔

جزیرۃ العرب کے ان شرک و گمراہی کے جس عالم میں سرگرداں تھے۔ ان کا معاشرہ، ان کی ضمیر، ان کا مزاج جس طرح بن چکا تھا اس پر غور کیجئے اور پھر اس بے مثال، عظیم الشان، ہمہ گیر تبدیلی کو دیکھئے جو قرآن لایا تو مسئلہ کی گہرائی اور اثرات و مقاصد قرآن کی تھاہ ملنا مشکل ہو گی۔

«ان الصفا والمروة من شعائر الله فمن حج البیت او اعتمرفلاجناح علیه ان یطوف بهما ومن تطوع خیراً فان الله شاکرعلیم.» (بقره/۱۵۸)

صفا و مروہ شعائر الٰہی میں سے ہیں لہٰذا جو بھی حج و عمرہ بجا لائے اس کے لیے ان دونوں کا طواف کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور جو شخص رغبت کے ساتھ کار خیر کرے تو خداوند عالم اس کا قدرداں ہے اور وہ اس کے کام سے آگاہ و عالم ہے۔ بلکہ قرآن نے مسئلہ شرک خود انسان کے نفس اور اس کے تمام تصرفات میں بھی تلاش کیا ہے اس طرح کہ اسلام سے قبل انسان کی زندگی میں جس توحید کا وجود نہ تھا اس کے لیے مختلف

ابعاد کا قائل ہوا ہے جیسا کہ کمال کے لیے بھی قرآن کریم نے نئے ابعاد کا تصور دیا ہے اور
س وسیع پیمانہ پر کہ یہ سادہ لوح انسان اس کو بخوبی درک کر کے اس کے مطابق راہ اختیار
کر سکے۔

ب۔ انسانی کرامت اور انسانی روابط:

قبائلی تعلقات اور جبر و قوت کی بنیاد پر زندگی گذارنے والے عرب انتہائی تنگ
دنیا اور گھٹے گھٹے ماحول میں جی رہے تھے۔ وہ انسان کو اپنی ذات اور اپنے منافع کے
نقطۂ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ مادی اور روہی جھروکوں سے دیکھنے والے انسانی کرامت
اور اس کے امتیازات سے آنکھیں بند کر کے معاشری روابط پر اپنی چھاپ لگائے زندگی
گذار رہے تھے۔

ان کے تصورات و رسم و رواج میں صرف "نسب" کا سہارا تھا جو معاشرتی ڈھانچہ
بناتا تھا، مگر یہ مرکز بھی کمزور ہو کر چھوٹے سے چھوٹے گروپ بنا دیتا تھا۔ یعنی قبیلہ سے
"عشیرہ" اور عشیرے سے "اسرہ" جنم لیتا تھا۔ عورتوں، غلاموں، یتیموں، کمزوروں
کو مال مفت سمجھتے تھے۔

قرآن مجید اس گم شدہ انسان کو دوبارہ زندہ اور معرکۂ حیات و کرامت انسانی
میں سرگرم عمل کرنے آیا اس نے کھوئی ہوئی عظمت کو پلٹایا۔ انسانی توانائی کی بنیادیں
معاشرتی طبقات میں استوار کیں وہ عورت کی شخصیت اور غلاموں کی انسانیت کو پہچنوانے
کے لئے آیا۔ قرآن نے ضعیف و محکوم افراد کے حقوق کو زندہ کیا۔ علم و تقوی، جہاد
و عمل صالح جیسے معیار کو انسانی روابط کی بنیاد بنایا۔

«یا أیها الناس إنّا خلقناکم من ذکرٍ وأنثیٰ وجعلناکم شعوباً
وقبائل لتعارفوا، إنَّ أکرمکم عندالله أتقاکم، ان الله علیم خبیر.»
(حجرات/۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو زن و مرد سے پیدا کیا اور قوم و قبیلہ کی صورت دی تاکہ تم

پہچانے جاؤ، لیکن تم میں سب سے اچھا اللہ کے نزدیک وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

«وكذلك جعلناكم أمة وسطاً لتكونوا شهداء على الناس ويكون الرسول عليكم شهيداً». (بقره/۱۴۳)

ہم نے تم کو امت وسط قرار دیا ہے تاکہ تم عوام کے لیے گواہ رہو اور رسول تمہارے گواہ ہیں۔

«وجاهدوا في الله حق جهاده، هو اجتباكم وما جعل عليكم في الدين من حرج، ملة أبيكم ابراهيم سمّاكم المسلمين من قبل وفي هذا ليكون الرسول شهيداً عليكم وتكونوا شهداء على الناس، فأقيموا الصلوة وآتوا الزكاة واعتصموا بالله هومولاكم فنعم المولىٰ ونعم النصير» (حج/۷۸)

راہ خدا میں برحق جہاد کرو اس نے تم کو چن لیا اور تمہارے دین میں حرج نہیں رکھا اور تمہارے باپ ابراہیم کی دوستی اختیار کرنے کو کہا ہے۔ اس نے تم کو پہلے سے ہی مسلمانوں میں رکھا اور (اس قرآن میں بھی) تاکہ رسول تمہارا گواہ رہے اور تم لوگوں پر گواہ رہو لہٰذا نماز کو قائم کرو زکوٰۃ ادا کرو اللہ سے متمسک رہو وہی تمہارا ولی ہے اور وہ بہترین ولی اور بہترین مدد گار ہے۔

«واعتصموا بحبل الله جميعاً ولا تفرّقوا، واذكروا نعمة الله عليكم إذْ كنتم أعداءً فالف بين قلوبكم فأصبحتم بنعمته إخواناً. وكنتم على شفا حُفرةٍ من النار فأنقذكم منها كذلك يبين الله لكم آياته لعلكم تهتدون. ولتكن منكم أمة يدعون الى الخير و يأمرون بالمعروف و ينهون عن المنكر وأولئك هم المفلحون.» (آل عمران/۱۰۳،۱۰۴).

اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور متفرق نہ ہو اور اپنے اوپر نازل ہونے والی نعمتوں کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں میں

الفت و محبت پیدا کی، پھر اس کی نعمت سے تم آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور تم جہنم کے کنارے تھے اللہ نے تم کو اس سے نجات دی اور اسی طرح اللہ اپنی نشانیوں کو بیان کرتا ہے شاید ہدایت یافتہ ہو جاؤ تم کو ایسی امت میں ہونا چاہیے کہ لوگ خیر کی طرف بلاتے ہوں اور نیکیوں کا حکم اور برائیوں سے روکتے ہیں اور ایسے ہی لوگ کامیاب ہیں۔

انسانی شخصیت سے مربوط تمام مسائل کی جستجو کے بعد قرآن ایسے روابط کو وجود میں لاتا ہے جن کی بدولت بکھرے اور منتشر عرب ایک امت میں بدل گئے ایسی امت میں جو بشری خیر خواہی کی حامل ہو اور جو عالمی حکومت کی سطح پر پہنچ ہو اور ایک ایسی ہی حکومت کو وجود میں لانے کی فکر کرتی۔ قرآن اجتماعی روابط اور معاشرتی تعلقات کو ایسی منزل پر لایا جہاں عورت کو اس کے حقوق و احترامات ملے۔ حالانکہ وہ طویل تاریخ سے محروم و مظلوم تھی۔ غلاموں کو معاشرتی اعزاز دیا کہ بلند منصب حاصل کر سکیں عورت اور غلام ہی نہیں تمام محرومین کو ان کے حقوق دلوائے اور نئی زندگی سے سرفراز کیا۔

«ولقد كرّمنا بنی آدم وحملناهم فی البرّ والبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلاً (اسراء/۷۰)

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی ہے اور انہیں خشکی و تری پر مسلط کر دیا اور انہیں طیب و طاہر رزق دیتے ہیں اور بہت سی اپنی مخلوقات پر انہیں فضیلت دی ہے۔

زندگی کا جدید مفہوم :

اہل جزیرۃ العرب دنیا کی چند روزہ زندگانی ہی کو اصل حیات سمجھ کر دن گذارتے اور قوت و طاقت، نفس پرستی دو محور تھے جن کے گرد وہ گھومتے تھے اعلیٰ اقدار اور مثالی افکار سے خالی، تنگ نظری کا شکار، زندگی کے بارے میں یہ محدود طرز فکر زندگی میں بہت موثر تھا اور آج تک عربی انسان کی رفتار اور

اس کے وجود میں یہ نظریہ گہرائی کی حد تک موثر ہے۔ قرآن مجید نے ان کو آفاقی تصور حیات دیا جس سے آج وہ بے خبر بن رہے ہیں۔ وہ وجود انسانی کو مادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ جنس اور مادی آسودگی نے انھیں محدود کر رکھا ہے حالانکہ اللہ نے انھیں لا محدود قوتوں اور ذہنی بلندیوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا ہے۔

دور جاہلیت کا انسان اس مسئلہ میں ایک پست انسان ہے۔ اس لیے مادی زندگی میں غرق اور برے اعمال کے مرتکب ہونے کو مختلف شکلوں میں بیان کیا گیا ہے جو اخلاقی و روحانی اقدار سے بہت دور ہے۔

«زيّن للناس حبّ الشهوات من النساء والبنين والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة والخيل المسومة والانعام والحرث ذلك متاع الحياة الدنيا والله عنده حسن المآب.» (آل عمران/۱۴)

دنیا میں لوگوں کو ان کی مرغوب چیزیں (مثلاً) بیویاں اور بیٹوں اور سونے چاندی کے بڑے بڑے لگے ہوئے ڈھیروں اور عمدہ عمدہ گھوڑوں اور مویشیوں اور کھیتی کے ساتھ الفت بھلی کر کے دکھادی گئی ہے۔ یہ سب دنیاوی زندگی کے (چند روزہ) فائدے ہیں اور (ہمیشہ کا) اچھا ٹھکانا تو خدا ہی کے ہاں ہے۔

«اعلموا إنما الحياة الدنيا لعب ولهوٌ وزينة وتفاخر بينكم وتكاثر فى الاموال والاولاد كمثل غيث اعجب الكفار نباته ثم يهيج فتراه مصفراً ثم يكون حطاماً...» (حديد/۲۰)

جان رکھو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت (و آرائش) اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ خواہش ہے (دنیاوی زندگی کی مثال تو) بارش کی سی مثال ہے جس کی وجہ سے کسانوں کی کھیتی لہلہاتی اور ان کو خوش کر دیتی ہے پھر سوکھ جاتی ہے تو تو اس کو دیکھتا ہے کہ زرد ہو جاتی ہے پھر چور چور ہو جاتی ہے۔

«زين للذين كفروا الحياة الدنيا ويسخرون من الذين آمنوا والذين اتقوا فوقهم يوم القيامة.» (بقره/۲۱۲)

کافروں کی اختیار کی زندگی کے لیے دنیا سجائی گئی ہے اور وہ مومنوں کا مذاق

اڑاتے ہیں جو لوگ متقی ہیں قیامت میں وہ بلند ہیں۔

اس طرح ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ متعدد جگہوں پر اس طرح کی مادی زندگی کے تصوّر سے جو انحطاط، انحراف، اختلاف وجود میں آتا ہے ان کی طرف نشاندہی ہوئی ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے سورہ بقرہ کی آیات نمبر ۸۵ ۔ ۸۶ اور سورہ نور اور سورۂ قصص کی آیت ۷۹، سورہ توبہ کی آیت ۳۸ کو دیکھا جا سکتا ہے۔

ماحول اور فضا کی اس صورت حال میں قرآن نے وسیع پیمانے پر تبدیلیوں کا پیغام دیا زندگی کے نئے مفہوم سے مطلع کیا اور بہت سے نئے مسائل پر سوچنے کے قابل بنایا، مثلاً زندگی کا حقیقی تصوّر، زندگی کا اختتام اور مقصد، زندگی میں مختلف اقدار و اشیاء کی اہمیت یوں واضح کی جس کے نتیجے میں بے حد و حساب گرا پڑا، گیا گذرا انسان ثواب تک پہونچنے کے لیے شہادت، ایثار، قربانی، عطا و بخشش کی طرف بڑھنے لگے۔

«یا قوم إنما هذه الحیاة الدنیا متاع وان الاخرة هي دارالقرار»

(غافر/۳۹)

اے قوم یہ زندگی متاعِ ناچیز کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور آخرت دار قرار ہے۔

«بل تؤثرون الحیاة الدنیا والآخره خیرواً بقیٰ (اعلی/۱٦)

بلکہ تم دنیاوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت بہتر اور پائدار ہے۔

«وما هذه الحیاة الدنیا إلاّ لهو ولعب وان الدار الاخرة لهي الحیوان لوکانوا یعلمون» (عنکبوت/٦٤)

دنیاوی زندگی لہو لعب سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور اگر جانتے ہو تو دار آخرت میں حیات ہے

«إنما مثل الحیاة الدنیا کماءٍ آنزلناه من السماء فاختلط به نبات الأرض مما یأکل الناس والأنعام حق إذا أخذت الأرض زخرفها وآزینت وظنّ أهلها أنهم قادرون علیها أتاها أمرنا لیلاً أونهاراً فجعلناها حصیداً کأنْ لم تغن بالأمس کذلک نفصل الآیات لقوم یتفکرون.

(یونس/۲٤)

دنیا کی مثال اس پانی جیسی ہے جو آسمان سے برستا ہے اور زمین کی گھاس

سے مل کر انسانوں اور جانوروں کی خوراک بنتا ہے۔ جب زمین نے اپنی زیبائی و آرائش پالی اور عوام نے اپنے کو اس پر قادر سمجھا تو اچانک رات یا دن میں ہمارا حکم ہوا اور اس کو کاٹنے کے لائق کر دیا اور ایسا خشک کر دیا کہ گویا کل اس میں کچھ نہ تھا اس طرح ہم فکر کرنے والی قوم کے لیے آیات کی تشریح کرتے ہیں۔

«يومئذ يصدرالناس اشتاتاً ليروا اعمالهم فمن يعمل مثقال ذرة خيراً يره ومن يعمل مثقال ذرة شراً يره» (زلزال/٦،٨)
«وما تقدموا لأنفسكم من خير تجدوه عندالله ان الله بما تعملون بصير» (بقره/١١٠)

اس دن جب لوگ قبروں سے ادھر ادھر ہو کر اپنے اعمال کو دیکھنے کے لیے نکلیں گے تو جس شخص نے ذرہ برابر کار خیر انجام دیا اس کو دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر کار بد انجام دیا ہے اس کو دیکھے گا۔

ما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ
عند اللہ ان اللہ بما تعملون بصیر (بقرہ ١١٠)

جس نے اپنے نفس کے لئے کار خیر پہلے سے بھیج دیا ہے اسے اللہ کے پاس پائیگا جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھتا ہے۔

«واقرضوا الله قرضاً حسناً وما تقدموا لأنفسكم من خير تجدوه عندالله هوخيراً وأعظم أجراً واستغفروا الله ان الله غفور رحيم.» (مزمل/٢٠)

اللہ کو قرض حسنہ دو اور جو کچھ نیکیاں اپنے لئے اللہ کے حضور میں پہلے سے بھیج دو گے، اسے اللہ کی بارگاہ سے پاؤ گے وہ خیر ہے اور اجر عظیم ہے۔ اللہ سے مغفرت چاہو اس لئے کہ اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے۔
ان تعلیمات نے اجتماعی زندگی پر اثرات قائم کیے اور حکومت، انتظام،

جہاد، اقتصاد، عمومی وخصوصی روابط جیسے موضوعات ومسائل میں ان لوگوں کو اپنا مستحکم کیا جس کے حسین اور خوبصورت نقشے اور ضمیر انسانی کی روشنی اور گہرائی کی داستان تاریخ کا بہترین حصہ ہیں۔

د۔ انسانی ارادے کی آزادی:

انسان کو بتوں اور طاغوتوں کی پرستش سے آزاد کرانے میں قرآن کو جو کامیابی حاصل ہوئی اسی طرح انسانی ارادے کو غلامی، شہوت، لذت، خوف سے نجات ملی اب وہ دوسروں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ارادے کو آزاد کرا سکتا ہے اور کوئی دباؤ اسے مجبور نہیں کر سکتا۔

آزادیٔ ارادہ واختیار کے مسئلہ کی تحقیق کے نتیجے میں آزادی حاصل ہوئی اور اسی کو انسان کی رفتار وترقی وارتقا کا بنیادی مرکز قرار دیا۔ اللہ نے انسان کو اس دنیا کی زندگی میں پیدا کیا اور اس دنیا کو اختبار وآزمائش کے لئے مختلف طبعی، اجتماعی، شخصی اسباب کا نشانہ قرار دیا تاکہ انسان امتحان دے کر درجۂ کمال حاصل کرکے اپنے اختیار وآزادی سے استفادہ وارتقا حاصل کر سکے۔

«أم حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما يأتكم مثل الذين خلوا من قبلكم مستهم البأساء والضراء وزلزلوا حتى يقول الرسول والذين آمنوا معه متى نصرالله ألآ إنّ نصرالله قريب.» (بقره/٢١٤)

کیا تم نے جنت میں داخل ہونے کا خیال کر رکھا ہے جبکہ ابھی جو چیزیں گذشتہ لوگوں پر آئی تھیں وہ تم پر نہیں آئیں۔ ان لوگوں پر سختیاں اور نقصانات وارد ہوئے اور جھٹکے کھائے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ کے مومنین نے کہا کہ اللہ کی نصرت کب پہونچے گی، آگاہ رہو اللہ کی نصرت قریب ہے۔

«احسب الناس ان يتركوا ان يقولوا آمنا وهم لايفتنون ولقد فتنا الذين من قبلهم فليعلمنّ الله الذين صدقوا وليعلمن

الکاذبین.» (العنکبوت/۲،۳)

کیا لوگ یہ سمجھ بیٹھے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کر کے چھوٹ حاصل کرلیں گے اور اور انھیں آزمایا نہ جائے گا؟ یقیناً ہم نے ان لوگوں کو آزمایا ہے جو تم سے پہلے تھے تاکہ سچے جان لیے اور جھوٹے بھی خوب پہچان لیے جائیں۔

«أم حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یعلم الله الذین جاهدوا منکم ویعلم الصابرین. (آل عمران/۱۴۲)

کیا تم نے جنت میں داخل ہونے کا یقین کرلیا ہے۔ جب تک اللہ جہاد کرنے والوں اور صبر کرنے والوں کو نہ جان لے۔

«لا إکراه فی الدین قدتبین الرشد من الغي» (بقره/۲۵۶)

دین میں جبر نہیں ہے۔ گمراہ کے مقابلے رشد و کمال کی راہ روشن و واضح ہو چکی ہے۔

«إنا هدیناه السبیل اما شاکراً واما کفوراً». (الانسان/۳)

ہم نے انسان کو راستہ کی ہدایت کردی ہے۔ اب وہ شکر گزار ہو یا نا شکر گزار۔ انسان کے ارادہ کے بارے میں اتنا زور اور انسان کی زندگی میں اس کی اہمیت کے بعد قرآن کریم اس ارادے کی رشد و تکمیل اور ہر دباؤ سے آزادی دلانے نیز اسکی صحیح رہبری کے لیے آگے بڑھتا ہے اور نفس انسان میں تقویٰ کے سبب کو رشد دینے عظیم مقاصد و اقدار کو روشن کرنے، زندگی میں انسان سے متعلق حقیقی تصور کو بتلانے اور دنیاوی زندگی کے مقابلے میں آخرت کی پائدار زندگی کو اختیار کرنے پر زور دیکر انسان کے ارادے کو تقویت دی ہے۔

«ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله أمواتاً بل احیاءٌ عندربهم یُرزقون فرحین بما آتهم الله من فضله ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بهم من خلفهم ألاخوف علیهم ولاهم یحزنون.» (آل عمران/۱۶۹،۱۷۰)

راہ خدا میں قتل ہونے والے کے سلسلے میں گمان نہ کرو کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ

زندہ ہیں اور اپنے رب سے روزی پاتے ہیں اور اللہ نے جو انہیں فضیلت دی ہے اس پر خوش ہیں اور اپنے بعد میں آنے والوں کو خوشخبری دیتے ہیں کہ ان کو کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ محزون ہوں گے۔

ارادہ وضمیر انسانی کی آزادی وارتقا کا غالباً اہم ترین لمحہ وہ تھا جب قرآن کریم نے شراب نوشی کو منع کیا اور نشے پر پابندی لگائی۔ جس معاشرے میں شراب روزمرہ کی چیز تھی اس کی تجارت بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ قرآن کے حکم امتناعی کے بعد مسلمانو نے ایک دم سے ہاتھ اٹھالیا۔ بہت بڑا واقعہ ہے ـــ یونائیٹڈ اسٹیٹ آف امریکہ نے تین سال ۱۹۲۸ سے ۱۹۳۲ء تک اپنی پوری طاقت کے ساتھ شراب نوشی روکنا چاہی امریکن کانگریس نے مشروبات پر پابندی سے متعلق بل بھی پاس کیا لیکن کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا بلکہ حکومت اپنا قانون خود واپس لینے پر مجبور ہوگئی۔ اور یہ ملت جسے ڈر تھا کہ اس کا اغوا ہوجائے گا "تخافون ان يتخطفكم الناس" جب وہ اپنے ارادہ کی مالک ہوئی تو پوری دنیا کے پسماندہ انسانوں کی نگہبانی کا بیڑا اٹھا کر آگے بڑھی اور قیصر وکسریٰ جیسے طاغوتوں کے ظلم سے انسانیت کو چھڑانے میں کامیاب ہوگئی۔

۵۔ طلب علم، معرفت اور کردار سازی کی طرف توجہ:

انسان کی زندگی کے دو بڑے میدانوں میں قرآن نے بہت بڑی اور اہم تبدیلیاں نمایاں کیں۔ کائنات اور فطرت کی معرفت حاصل کرنے کی تحریک جس کا سرچشمہ معرفت باری ہے۔ دوسرے ضمیر ووجدان کی صحیح تربیت اور اسے انسانی فطرت سلیمہ کی طرف لانا تاکہ وہ عقل منطقی وعقل عملی ـ مسئلہ معرفت وحقیقت میں ذمہ داریاں پوری کرسکے۔

اس لئے کہ انسان جن مہم ترین مسائل سے اپنی زندگی میں سامنا کرتا ہے وہ دو باتیں ہیں۔

(۱) حقیقت کی شناخت (۲) عدل وظلم

انسان اپنے وجود کے آغاز ہی سے مسلسل ان دو بنیادی ستونوں کو اپنی زندگی میں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور قرآن نے اس کو پوری اہمیت دی ہے اور دنیا کے عوام اور مسلمانوں کو ان کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اس ضمن میں بہت سی آیتیں پیش کی جا سکتی ہیں ۔۔ مثلاً

«يرفع الله الذين آمنوا منكم والذين أوتوا العلم درجات»
(المجادله/۱۱)

اللہ ایمان والوں اور اہل علم کو درجہ بہ درجہ بڑھاتا ہے۔

«الم ترأنَ الله انزل من السماء ماء فأخرجنا به ثمراتٍ مختلفاً ألوانها ومن الجبال جدد بيض وحمر مختلف ألوانها وغرابيب سود * ومن الناس والدواب والأنعام مختلف ألوانه كذلک، إنما يخشى الله من عباده العلماء إنّ الله عزيز غفور.» (فاطر/۲۷،۲۸)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی برسایا اور اس کے ذریعہ مختلف قسم کے میوے پیدا کئے۔ اور پہاڑوں میں سے بہت سے راستے اور مختلف رنگ سیاہ، وسفید و سرخ پیدا کئے اور انسانوں سے اور چلنے والی جنس چوپائے مختلف رنگوں میں پیدا کیے وہ سب بھی مختلف ہیں بندوں میں صرف علماء اللہ سے ڈرتے ہیں البتہ اللہ صاحب قدرت ہے اور بخشنے والا بھی ہے۔

«وما لكم لأتقاتلون فى سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا اخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها واجعل لنا من لدنک ولياً واجعل لنا من لدنک نصيراً» (نساء/۷۵)

تم اللہ کی راہ میں جنگ کیوں نہیں کرتے جبکہ کمزور مستضعف مرد، عورت بچے یہ کہتے ہیں۔ پالنے والے ہم کو اس قریہ سے، جس کے رہنے والے ظالم ہیں، باہر لا اور ہمارے لئے اپنے پاس سے ولی قرار دے اور ہمارے لئے اپنے پاس سے مددگار

«أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وإنّ الله علىٰ نصرهم لقدير»
(حج/۳۹)

قتال کرنے والوں کو اجازت دی گئی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ انکی مدد پر قادر ہے۔

قرآن نے انسان کو زندگی میں پیش آنے والے ان اوہام و خرافات سے آزاد کیا جو اس پر مسلط ہو کر شک و شبہات پیدا کرتے تھے۔

اس کے اندرونی ضمیر کو زندہ کیا اور قلب و ضمیر کی اصلاح و بہتری کے لیے وسیع تبدیلیاں فراہم کیں۔ ان تبدیلیوں کا ردِّ عمل مسلمانوں کی زندگی میں ابھرا، وہ ترقی یافتہ ہوئے، تھوڑی سی مدت میں وہ (آج کے) جدید علوم کے استاد مانے گئے۔ عدل و انصاف کا شعور ان ہی کے لیے بیدار کیا اور ان کی قانونی برتری بھی تسلیم کی گئی۔

و۔ معاشرتی زندگی کی تنظیم:

قرآن جس معاشرے کی اصلاح یا تبدیلی کے لیے آیا تھا اس کا حال عجیب تھا۔ لاقانونیت، سرداری نظام، اختلاف و انتشار، رسم و رواج کی بے جان تقلید، ڈھانچہ اتنا کمزور تھا کہ ہلکی سی لرزش سے گر جاتا اور رنگا رنگ آقائیاں اور غلامیاں قابض ہو جاتیں۔

قرآن مجید نے مختصر سی مدت میں واقعاً معجزہ دکھا دیا۔ خصوصاً، بے قابو اور بگڑے ہوئے بدترین حالات میں نظم و نسق کی بنیاد پر بڑے وسیع پیمانے پر تبدیلیاں پیدا کیں اور عوام کو کنٹرول میں لیا۔

ایک باقاعدہ نظام حکومت قائم کیا اس کے بنیادی اصول بنائے اقتصادی ڈھانچہ، عوامی رابطوں اور بین الاقوامی تعلقات کی نوعیت معین کی۔ تجارت۔ معاہدات۔ عائلی قوانین پھر ہر جگہ عبادات کی..... ہر میدان میں اس قدر مستعد بنا دیا کہ امت ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئی۔

اس نئے معاشرے کو فوری طور پر داخلی اور خارجی جھٹکے کھانا پڑے مگر استقلال

اور ثابت قدمی نے کام دکھایا۔

قرآن مجید، معاشرے میں ہمہ جہت تبدیلیاں لانے کا داعی ہے اور اس طرح کی آیتوں سے اس کا دامن بھرا ہوا ہے۔ تاریخ اسلام اس کی تائید میں بے شمار شواہد رکھتی ہے کہ ان تبدیلیوں کے خوش آیند نتائج برآمد ہوئے، اس کے خصوصیات وامتیازات اور حرکت واقدام، قوت اور جرأت، پیش قدمی اور اقتصادی ترقی بلکہ معاشرتی، فکری وعملی میدانوں میں ہمہ گیر ترقی تاریخ میں سب کے سامنے ہے۔

بہت سے معاملات ونکات تھے جن کے بیان کی گنجائش نہیں ہے مگر ہم نے جو مختصر باتیں پیش کی ہیں ان سے یہ واضح ہوگیا کہ قرآن مجید کا مقصد فلسفہ پیش کرنا نہیں بلکہ اس کا نفاذ وانطباق مقصود ہے۔ تھیوری ہی نہیں پریکٹیکل بھی ہے۔ نظریہ کا عمل سے ہم آہنگ ہونا۔

ہم کو یہ بات جتا دینا چاہیے کہ قرآن زندہ ہے جب تک خود زندگی باقی ہے قرآن باقی رہے گا۔ وہ زمان ومکان کا پابند نہیں ہے۔ اس کا ایک مقصد ہے انقلاب اٹھانا ۔ انقلاب لانا۔ ایک انقلابی مرکز بنانا جہاں سے وقتاً فوقتاً دائمی تبدیلی کا عمل جاری کیا جاسکتا ہو ۔۔۔ قرآن نظریے کا انقلاب، اسلامی اسلوب پر تبدیلیاں۔

تقابلی مطالعہ

جناب شیخ محمد قانصوہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

فصل دوم

کس کا روزہ صحیح ہے؟

ابواب عشرہ:

۱۔ حائض، روزہ افطار کرلے۔ (دو احادیث)

۲۔ مسافر، افطار کرلے۔ (آٹھ احادیث)

۳۔ مجنب کا روزۂ استحبابی صحیح ہے۔ (چار احادیث)

۴۔ مجنب قضا روزہ نہیں رکھ سکتا۔ (تین احادیث)

۵۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی، روزہ نہ رکھے۔ (تین احادیث)

۶۔ بوڑھا آدمی اور بوڑھی عورت روزہ نہ رکھے۔ (دو احادیث)

۷۔ زوجہ، اجازتِ شوہر کے بغیر روزہ نہیں رکھ سکتی۔ (چار احادیث)

۸۔ میزبان کی اجازت کے بغیر مہمان روزہ نہ رکھے۔ (دو احادیث)

۹۔ لڑکا اگر تین دن لگاتار روزے رکھ سکے تو روزہ رکھے۔ (دو احادیث)

۱۰۔ جو رمضان میں مسلمان ہو وہ باقی دنوں کے روزے رکھے۔ (دو احادیث)

باب اوّل
حائض روزہ افطار کرلے

روایات اہل بیتؑ :

۱ ـ عدة من أصحابنا عن ابن زياد، عن الحسن بن محبوب، عن علي بن رئاب، عن سماعة بن مهران، قال: سألت أبا عبدالله(ع) عن المستحاضة، قال: تصوم شهر رمضان إلا الأيام التي كانت تحيض فيهن ثم تقضيها بعده.[1]

۱۔ ہمارے بعض اصحاب سے .... سماعہ ابن مہران کہتے ہیں، میں نے ابوعبد اللہ علیہ السلام سے مستحاضہ کے بارے میں سوال کیا، حضرت نے فرمایا: رمضان کے روزے رکھے گی، صرف ان دنوں کے روزے نہ رکھے جن میں حیض آیا ہے۔

روایات اہل سنّت :

۱ ـ أخبرنا أبوعبد الحافظ، أخبرني أبوالحسن محمد بن عبدالله الجوهري، حدثنا محمد بن اسحاق، حدثنا محمد بن يحيى و زكريا بن يحيى أبي أبان (وفي نسخة يحيى بن أبان) قالا: حدثنا ابن أبي مريم، حدثنا محمد بن جعفر بن أبي كثير، حدثني زيد بن أسلم، عن عياض بن عبدالله، عن أبي سعيد الخدري، قال: خرج رسول الله(ص) في أضحى أو فطر الى المصلى، ثم انصرف، فقام، فوعظ الناس، و أمر الناس بالصدقة، فقال: أيها الناس تصدقوا. ثم انصرف، فمرَّ على النساء، فقال: يا معشر النساء تصدقن فإني أريتكن أكثر أهل النار. فقلن وبم ذلك يا رسول الله؟ قال: تكثرن اللعن، و تكفرن العشير، ومارأيت من ناقصات عقل ودين أذهب بلب الرجل الحازم من إحد اكن يا معشر النساء. فقلن له: ما نقصان ديننا و عقلنا يا رسول الله؟ قال: أليس شهادة المرأة مثل نصف شهادة الرجل؟ قلن بلى. قال: فذلك من نقصان عقلها أوليس اذاحاضت المرأة لم تصل ولم تصم فذلك من نقصان دينها.[2] وأخرجه البخاري عن ابن أبي مريم مثله.[3]

۱۔ ابوعبداللہ حافظ نے ہمیں خبر دی...... ابوسعید خدری کے بقول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عید قربان یا عید فطر میں "مصلّے" تشریف لائے، واپسی میں کھڑے ہوئے اور لوگوں کو نصیحت کی۔ صدقہ دینے کا حکم دیا، فرمایا: "لوگو! صدقہ دیا کرو" واپسی میں خواتین کی طرف سے گذرتے ہوئے فرمایا: خواتین! صدقہ دیا کیجئے۔ مجھے آپ کی اکثریت دوزخی نظر آتی ہے۔ خواتین بولیں! یہ کیوں؟ یا رسول اللہ! فرمایا: تم لعن طعن زیادہ کرتی رہتی ہو، خاندان کو کافر بناتی ہو۔ تم سے زیادہ سمجھدار مرد کی عقل کو نقصان پہنچانے والی ناقص العقل و ناقص الدین کوئی نہیں ۔ وہ بولیں: ہمارے دین اور ہماری عقل میں کیا کمی ہے؟ یا رسول اللہ! آنحضرتؐ نے فرمایا: کیا ایک عورت کی گواہی مرد کے مقابلے میں نصف نہیں ہے؟ خواتین نے اثبات میں جواب دیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ تو کمی عقل کی بات تھی۔ ایام ماہواری میں عورت نماز نہیں پڑھتی روزہ نہیں رکھتی یہی اس کے نقص دین کی بات ہے۔ اس کی تخریج بخاری نے ابن ابی مریم سے کی ہے، بہ ہمین الفاظ ۔

باب دوم

مسافر افطار کرلے

روایاتِ اہل بیتؑ:

١ ــ عن أبي علي الأشعري، عن محمد بن عبدالجبار، عن صفوان بن يحيى، عن عيص بن القاسم، عن أبي عبدالله(ع)، قال: إذا خرج الرجل في شهر رمضان مسافراً، أفطر. وقال: إنّ رسول الله(ص) خرج من المدينة الى مكة في شهر رمضان ومعه الناس وفيهم المشاة، فلمّا انتهى الى كراع الغميم دعا بقدح من ماءفيا بين الظهر والعصر فشربه وأفطرثم أفطر الناس معه وتم ناس على صومهم فسماهم العصاة. وانما يؤخذ بآخر أمر رسول الله(ص). ونحوه ما رواه الكافي أيضاً عن علي ابن ابراهيم، عن أبيه، عن حماد، عن حريز، عن زرارة عن الباقر(ع)[4]. ونحوه ماروا في البحار عن العياشي، عن محمد بن مسلم، عن الصادق(ع). ونحوه أيضاً ما رواه عن دعائم الإسلام[5].

۱۔ ابوعلی اشعری....... امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: ماہ رمضان میں جب سفر

کے لیے کوئی جائے تو افطار کرے۔ اور امام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینے سے
نکلنے کے لیے روانہ ہوئے، رمضان کا مہینہ اور بہت سے لوگ ساتھ، جن میں کچھ حضرات پیدل بھی
تھے۔ جب "کراع غمیم" پر پہنچے تو ظہر و عصر کا درمیانی وقت تھا۔ آپ نے پانی کا پیالہ منگا کر نوش فرمایا،
لوگوں نے بھی حضور کے ساتھ روزے کھول ڈالے۔ کچھ افراد نے کھولنے کے بجائے آخر تک روزے
کو باقی رکھا، یہ لوگ "نافرمان" کہلائے گئے۔ . . . .
(مغازی الواقدی، جنگ بدر کے ابتدائی حالات میں لکھا ہے کہ منادی نے ندا دی کہ پیغمبر فرماتے
ہیں کہ میں روزہ کھول رہا ہوں، تم بھی کھولو۔ جن لوگوں نے روزے نہ کھولے انھیں "العصاۃ"
کہا۔ مرتضیٰ حسین۔)

۲ ــ وباسناده ــ محمد بن الحسن ــ عن الحسين بن سعيد، عن صفوان بن يحيى، عن أبي الحسن(ع) أنه سُئل عن الرجل يسافر في شهر رمضان فيصوم، قال: ليس من البر الصوم في السفر[۶].

۲۔ محمد بن حسن کی سند . . . . ابوالحسن علیہ السلام سے پوچھا
گیا، مسافر آدمی سفر میں روزہ رکھے؟ امام نے فرمایا: سفر میں روزہ "بِر" (نیکی) نہیں ہے۔

۳ ــ كتاب فضائل الأشهر الثلاثة عن أبيه، عن سعد بن عبدالله، عن أحمد بن محمد بن عيسى، عن علي بن عبدالملك، عن اسحاق بن عمار، عن يحيى بن العلا، عن أبي عبدالله(ع) قال: الصائم في شهر رمضان في السفر كالمفطر في الحضر.[۷] وروى في الوسائل عن مجمع البيان، عن أصحابنا، عن أبي عبدالله(ع) مثله. ومثله في صدر حديث عنهم ــ عدة من أصحابنا ــ عن أحمد بن علي بن الحكم، عن عبدالملك بن عتبة، عن اسحاق بن عمار مثله.

۳۔ فضائل اشہر ثلاثہ، نامی کتاب میں . . . .
. . . . امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: رمضان کے سفر میں روزہ رکھنے والا اور حضر
میں روزہ نہ رکھنے والا برابر ہے . . . .

. . . .

٤ ــ وعنهم ــ عدة من أصحابنا ــ عن أحمد، عن علي بن الحكم، عن عبدالملك بن عتبة، عن اسحاق بن عمار، عن يحيى بن أبي العلاء، عن أبي عبدالله(ع) قال: الصائم في السفر في شهر رمضان كالمفطر فيه في الحضر. ثم قال: إنَّ رجلاً أتى النبي(ص) فقال: يا رسول الله أصوم شهر رمضان في السفر؟ فقال: لا. فقال يا رسول الله انه عليّ يسير. فقال: رسول الله(ص): إنّ الله تصدق على مرضى أمتي ومسافريها بالإفطار في شهر رمضان. أيحب أحدكم لوتصدق بصدقة أن تردعليه؟

ورواه الصدوق باسناده عن يحيى بن أبي العلاء، ورواه في العلل عن الحسين بن أحمد بن ادريس، عن أبيه، عن أحمد. (الا أنه ترك صدره) ورواه الشيخ باسناده عن أحمد مثله.[8] ونحوه عن عدة من أصحابنا، عن أحمد، عن ابن أبي عمير، عن بعض أصحابنا، عن الصادق(ع). ونحوه عن الخصال، عن أبي، عن علي، عن أبيه، عن النوفلي، عن السكوني، عن جعفر(ع). وعن العلل، عن سعد، عن هاشم، عن النوفلي كالخصال[9].

۴۔ ان راویوں اور چند دیگر راویوں سے .... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: ماہ رمضان کے مسافر کا روزہ، حضر کے روزہ نہ رکھنے کے برابر ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا، یا رسول اللہ! سفر میں ماہ رمضان کا روزہ رکھ سکتا ہوں! آنحضرتؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس آدمی نے کہا: یارسول اللہؐ! میرے لیے روزہ رکھنا آسان ہے! آنحضرتؐ نے فرمایا: اللہ عزاسمہ نے میری امت کے مریضوں اور مسافروں پر صدقہ کیا ہے کہ وہ رمضان میں افطار کریں۔ کیا تم میں سے کوئی آدمی یہ بات پسند کرے گا کہ جو شخص صدقہ دے وہ اسی کو واپس کر دے! ....

....

روایات اہل سنت:

١ ــ أخبرنا أبو محمد عبدالله بن يوسف الأصبهاني في آخرين قالوا: حدثنا أبوالعباس محمد بن يعقوب، أنبأنا الربيع بن سليمان، أنبأنا الشافعي، أنبأنا عبدالعزيز بن محمد، عن جعفر بن محمد، عن أبيه، عن جابر أن النبي(ص) خرج الى مكة عام الفتح في رمضان، فصام حتى

بلغ كراع الغميم، وصام الناس معه، فقيل له: يا رسول الله ان الناس قدشق عليهم الصيام، فدعا بقدح من ماء بعد العصر، فشرب والناس ينظرون، فأفطر بعض الناس، وصام بعض، فبلغه أن ناساً صاموا، فقال: أولئك العصاة[10]. ورواه الترمذي عن قتيبة، عن عبدالعزيز بن محمد مثله[11] ورواه مسلم مع اختلاف يسير في اللفظ، عن محمدبن المثنى، عن عبدالوهاب بن عبدالمجيد، عن جعفر(ع). مثله[12] ورواه النسائي عن محمدبن عبدالله، عن شعيب، عن الليث، عن ابن الهاد، عن جعفر(ع) مثله[13] ورواه أبوداود الطيالسي، عن وهب، عن جعفر(ع)[14].

۱. ہمیں خبر دی ابو محمد عبد اللہ بن یوسف اصفہانی . . . .

..... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہ رمضان فتح مکہ میں مکے کے لیے چلے ۔ حضرت اور سب ساتھی روزے سے تھے ، جب کراع الغمیم پہنچے تو کہا گیا کہ ، یا رسول اللہ! ان لوگوں پر روزہ سخت ہو رہا ہے ۔ آنحضرتؐ نے عصر کے بعد پانی کا بڑا پیالہ منگوایا اور پانی نوش فرمایا ۔ لوگ دیکھتے رہے ۔ پھر کچھ آدمیوں نے افطار کر لیا اور بعض نے روزہ باقی رکھا ۔ جب آنحضرتؐ کو اطلاع دی گئی تو حضرت نے فرمایا : یہ لوگ "عصاۃ" ۔ نافرمان ۔ ہیں . . . . . .

. . . .

٢ ـ أخبرنا أبوبكر محمدبن الحسن بن فورك ، أنبأنا عبدالله بن جعفر، حدثنا يونس بن حبيب، أنبأنا أبو داود، حدثنا شعبة، عن محمدبن عبدالرحمن يعني ابن سعدبن زرارة الأنصاري، عن محمدبن عمروبن الحسن، عن جابر: ان النبي (ص) كان في سفر، فرأى رجلاً يظلل عليه، فسأل عنه، فقالوا: هو صائم. فقال: ليس من البرالصوم في السفر[15] ورواه البيهقي باختلاف في اللفظ عن أبي بكربن أبي شيبة وابن المثنى وابن بشار، جميعاً عن محمدبن جعفر، قال أبوبكر، عن غندر، عن شعبة مثله. ورواه أيضاً كذلك عن ابن معاذ، عن أبي، عن شعبة مثله[16] ورواه البخاري عن آدم، عن شعبة مثله[17]. وروى ابن ماجة ذيل الحديث عن أبي بكربن أبي شيبة ومحمدبن الصباح، عن سفيان، عن الزهري، عن صفوان بن عبدالله، عن أم الدرداء، عن كعب، وروى

ذيله أيضاً عن محمد بن المصفى الحمصى، عن محمد بن حرب، عن عبيد الله بن عمر، عن نافع عن ابن عمر[١٨]. وروى النسائي عن اسحاق ابن ابراهيم، عن سفيان مثل ابن ماجة أولاً. وروى الحديث بكامله عن عمرو بن علي، عن يحيى بن سعيد وخالد بن الحارث، عن شعبة، مثل البيهقي، و روى الحديث بكامله أو ذيله بأسانيد أخرى فراجع [١٩] وروى الحاكم عن ابن اسحاق الفقيه، عن بشر بن موسى، عن الحميدي، عن سفيان مثل ابن ماجة [٢٠] ونقل الهيثمي ذيل الحديث عن أبي برزة الأسلمي نقلاً عن أحمد والبزار والطبراني في الأوسط. وعن امُّ الدرداء. ونقل عن عبد الواحد قوله: لاأعمله إلاّ عن أبي الدرداء. وقال: أن رجاله رجال الصحيح [٢١]. وروى الحميدي ذيله عن سفيان كابن ماجة [٢٢]. وروى أبو داود الطيالسي أيضاً كالحميدي [٢٣] ورواه الدارمي عن هشام بن القاسم و أبو الوليد، عن شعبة. وروى ذيله عن محمد بن أحمد، عن سفيان كابن ماجة، وعن عثمان بن محمد، عن يونس، عن الزهري [٢٤]. وروى البزار عن محمد بن حرب، عن صلة بن سليمان، عن ابن جريج عن عطاء، عن ابن عباس ذيل الحديث. وكذا عن محمد بن معمر، عن محمد بن خالد، عن ابراهيم بن سعد، عن عبد الله بن عامر، عن محمد، عن رجل من آل أبي برزة عنه ذيل الحديث [٢٥].

۲. ہمیں خبر دی ابوبکر محمد بن حسن فورک ....

.... نبی صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ایک سفر میں تھے۔ اثناء راہ ملاحظہ فرمایا کہ ایک شخص پر سایہ کیا گیا ہے، آپؐ نے پوچھا یہ کیا ہے، کہا گیا روزے دار ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا سفر میں روزہ کوئی نیکی تو نہیں ہے۔ ....

٣ ــ حدثنا عبد الوهاب بن سعيد، قال: حدثنا شعيب، قال حدثنا الاوزاعي، قال: حدثنا يحيى بن أبي كثير، قال: أخبرني محمد بن عبد الرحمن، قال: أخبرني جابر بن عبد الله: ان رسول الله (ص) مرَّ برجل في ظل شجرة يرش عليه الماء قال: ما بال صاحبكم هذا؟ قالوا: يا رسول الله صائم. قال: انه ليس من البّران تصوموا في السفر و عليكم برخصة الله التي رخص لكم فأقلبوها.

وعن محمود بن خالد، عن الفريابي، عن الأوزاعي، عن يحيىٰ، عن ابن عبد الرحمن، عمن سمع جابر عنه نحوه [٢٦]. ونقله الهيثمي عن عمار بن

یاسر نقلاً عن الطبراني في الكبير[٢٧] ونقل أيضاً عن ابن عمر وعمر بن حزم: ان من لم يقبل رخصة الله فعليه من الإثم مثل جبال عرفات آثاماً. نقلاً عن أحمد والطبراني في الأوسط والكبير. ونقل أيضاً في لزوم قبول رخصة الله... فراجع[٢٨]. وأخرج البزار في لزوم قبول رخص الله أسانيد متعددة... فراجع[٢٩].

۳۔ ہم سے حدیث بیان کی عبدالوہاب بن سعید نے ....
.... جابر بن عبداللہ کے بقول: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص کے پاس سے گذر رہے تھے۔ وہ آدمی (جھاڑی) درخت کے نیچے بیٹھا تھا اور درخت پر پانی کے چھینٹے دیے جا رہے تھے، آپ نے دریافت کیا، تمہارے اس آدمی کا کیا حال ہے! ۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! روزہ دار ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: یہ تو کوئی نیکی نہیں ہے کہ سفر میں روزہ رکھو، تمہیں اللہ نے معافی دی ہے تو اس سے فائدہ اٹھاؤ! ....
ابن عمر اور عمر بن حزم سے منقول ہے: جو اللہ کی طرف سے دی ہوئی رخصت (چھوٹ) سے فائدہ نہیں اٹھاتا تو اس پر وہ گناہ ہوگا جو عرفات کی پہاڑیوں کے برابر وزنی ہوں گے...

....

٤ ــ حدثنا ابراهيم بن المنذر الحزامي، حدثنا عبدالله بن موسى التيمي، عن أسامة بن زيد، عن ابن شهاب، عن أبي سلمة بن عبدالرحمن، عن أبيه عبدالرحمن بن عوف، قال: قال رسول الله (ص): «صائم رمضان في السفر كالمفطر في الحضر»[٣٠] وأخرجه النسائي بأسانيد عن عبدالرحمن مقطوعاً[٣١]. ونقله في نصب الراية عن البزار في مسنده، عن عبدالله بن عيسى، عن أسامة بن زيد[٣٢].

۴۔ ہم سے ابراہیم بن منذر حزامی نے حدیث بیان کی ....
.... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: سفر میں روزہ دار ایسا ہے جیسے وطن میں بے روزہ آدمی .... عبدالرحمٰن بن عوف .... کے علاوہ البزار نے، المسند میں عبداللہ ابن عیسیٰ الخولانی نے اسامہ ابن زید سے روایت نقل کی ہے۔

باب سوم

عمداً جنب ہوکر صبح بیدار ہونے والے کا روزہ تطوعی (استحبابی) صحیح ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ـــ محمد بن علي بن الحسين باسناده عن عبدالله بن المغيرة، عن حبيب الخثعمي، قال: قلت لأبي عبدالله(ع) أخبرني عن التطوع وعن (صوم) هذه الأيام الثلاثة اذا أجنبت من أول الليل فأعلم أني أجنبت فأنام متعمداً حتى ينفجر الفجر، أصوم أو لا أصوم؟ قال: صُمْ[٣٣]. ورواه الفقيه باسناده عن عبدالله بن المغيرة، عن حبيب الخثعمي مثله[٣٤].

١۔ محمد بن علی بن حسین .... حبیب ابن خثعمی کہتے ہیں، میں نے ابوعبداللہ علیہ السلام سے پوچھا: یہ فرمایئے کہ تطوّع، یعنی ان تین دنوں کے روزے کا مطلب کیا ہے؟ اگر اول شب جنب ہوں اور علم جنب ہونے کے بعد جان کر سو جاؤں اور صبح کو بیدار ہوں، تو روزہ رکھوں یا نہ رکھوں؟ فرمایا: روزہ رکھو ......

٢ ـــ محمد بن يعقوب عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، عن ابن فضال، عن ابن بكير، قال: سألت أبا عبدالله(ع) عن الرجل، يجنب، ثم ينام حتى يصبح، أيصوم ذلك اليوم تطوعاً؟ فقال: أليس هو بالخيار ما بينه ونصف النهار؟[٣٥].

٢۔ محمد ابن یعقوب .... ابن بکیر کہتے ہیں، میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے پوچھا: ایک شخص مجنب ہوتا ہے، اور صبح تک سوتا بھی ہے، کیا اس دن صوم تطوّع رکھ سکتا ہے؟ حضرت نے فرمایا: کیا اسے آدھے دن تک روزہ رکھنے کا اختیار نہیں ہے؟ ....

روایات اہل سنت:

۱ ــ عبدالرزاق عن ابن جريح، قال: حدثني ابن شهاب، عن أبي بكر بن عبدالرحمن، عن أبيه، عن أم سلمة وعائشة: ان النبي(ص) كان يدركه الفجر وهو جنب من أهله، ثم يغتسل، فيصوم[۳۶]. ونحوه عن مسلم.[۳۷]

۱- عبدالرزاق .... حضرت ام سلمہؓ و عائشہؓ کے بقول: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ازواج سے جنب ہوکر صبح اٹھتے اور غسل فرماتے اور روزہ رکھتے تھے..................

۲ ــ حدثنا عبدالله بن مسلمة، عن مالك، عن سمي مولى أبي بكر بن عبدالرحمن بن الحارث بن هشام بن المغيرة، انه سمع أبابكر بن عبدالرحمن، قال: كنت أنا وأبي حين دخلنا على عائشة وأم سلمة(ح) حدثنا أبواليمان، أخبرنا شعيب عن الزهري، قال: أخبرني أبوبكر بن عبدالرحمن بن الحارث بن هشام، ان أباه عبدالرحمن أخبر مروان أن عائشة وأم سلمة أخبرتاه أن رسول الله(ص) كان يدركه الفجر و هوجنب من أهله ثم يغتسل و يصوم. قال مروان لعبد الرحمن بن الحارث: أقسم بالله لتقرعن بها أبا هريرة ومروان يومئذ على المدنية، فقال أبوبكر فكره ذلك عبدالرحمن، ثم قدرلنا أن نجتمع بذي الحليفة. وكانت لأبي هريرة هنالك أرض فقال عبدالرحمن لأبي هريرة: إني ذاكر لك أمراً، ولولا مروان أقسم عليَّ فيه لم أذكره لك، فذكر قول عائشة وأم سلمة، فقال: كذلك حدثني الفضل بن عباس وهوأعلم. وقال: همام وابن عبدالله بن عمر عن أبي هريرة كان النبي(ص) يأمر بالفطر والأول اسند[۳۸]. وروى عبدالرزاق نحو ذلك عن معمر، عن الزهري، عن أبي بكر، وروى أيضاً نحوه عن ابن جريج عن عبدالملك عن أبيه[۳۹]. وكذا مسلم عن محمد بن حاتم، عن يحيى بن سعيد، عن ابن جريج(ح) وعن محمد بن رافع جميعاً عن عبدالرزاق مثله[۴۰]. ونحو ذلك عن البيهقي بأسانيد متعددة[۴۱]. وروى مالك نحوه عن سمي مولى أبي بكر، عن مولاه[۴۲].

۲- ہم سے حدیث بیان کی عبداللہ بن مسلمہ نے.......... ابوبکر بن عبدالرحمن

حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ .... شعیب نے زہری سے ...... عبدالرحمن نے مروان سے حضرت ام سلمہؓ و عائشہؓ ...... صبح ہوجاتی اور آنحضرت اپنی .... سے جنب ہوتے تھے۔ پھر غسل کرتے اور روزہ رکھتے تھے۔ مروان نے عبدالرحمن ابن حارث سے کہا: خدا کی قسم میں اس بات پر ابوہریرہ کو سزا دوں گا۔ مروان ان دنوں مدینہ کا والی تھا۔ ابوبکر کہتے ہیں کہ عبدالرحمن کو یہ بات ناگوار گذری۔ اتفاق سے ہم سب ذوالحلیفہ میں یکجا ہوگئے ـ وہاں ابوہریرہ کی زمین تھی۔ عبدالرحمن نے ابوہریرہ سے کہا: میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں ـ اور اگر مروان نے قسم نہ کھائی ہوتی تو آپ سے نہ کہتا۔ اس کے بعد حضرت عائشہ و ام سلمہ کی روایت بیان کی۔ ابوہریرہ نے کہا: یہی روایت مجھ سے فضل بن عباس نے بیان کی تھی اور وہ زیادہ علم رکھتے تھے ـ اور روایت کی ہمام اور عبداللہ بن عمر نے ابوہریرہ سے کہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: افطار کا حکم دیتے تھے۔ مگر پہلی روایت سند میں زیادہ قوی ہے۔ ....

باب چہارم

مجنب کا روزۂ قضا صحیح نہیں

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ محمد بن يعقوب، عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، عن الحجال، عن ابن سنان يعني عبدالله، قال: كتب أبي الى أبي عبدالله(ع) وكان يقضي شهر رمضان، وقال: إني أصبحت بالغسل، وأصابتني جنابة فلم أغتسل حتى طلع الفجر فأجابه(ع): لا تصم هذا اليوم، وصم غداً[43].

۱۔ محمد ابن یعقوب .... عبداللہ بن سنان کہتے ہیں۔ ان کے والد نے امام جعفر صادق علیہ السلام کو خط میں لکھا، وہ رمضان کے قضا روزے رکھ رہے تھے، خط میں لکھا ـ "میں صبح کو غسل کے لئے بیدار ہوتا ہوں، مجھے جنابت ہے۔ اور طلوع

صبح تک نہیں نہاتا۔ ؟ امامؑ نے جواب میں لکھا: آج روزہ نہ رکھو، روزہ کل رکھنا۔

۲ ـ محمدبن علي بن الحسين باسناده عن عبدالله بن سنان، ان سأل أبا عبدالله(ع) عن الرجل يقضي شهر رمضان فيجنب من أول الليل ولايغتسل حتى يجيء آخر الليل وهو يرى أن الفجر قد طلع، قال: لايصوم ذلك اليوم ويصوم غيره. ورواه الشيخ باسناده عن الحسين بن سعيد، عن النضر، عن ابن سنان مثله[۴۴].

۲۔ محمد ابن علی ابن حسین نے اپنی سند سے روایت کی ہے۔ عبداللہ بن سنان کے بقول امام جعفر صادق علیہ السلام سے سوال ہوا کہ ایک آدمی، رمضان کے روزوں کی قضا رکھ رہا ہے اول شب مجنب ہو جاتا ہے مگر آخر شب تک غسل نہیں کرتا حالانکہ صبح ہوتے دیکھ رہا ہے۔ حضرت نے فرمایا: اس دن روزہ نہ رکھے دوسرے دن رکھے۔ شیخ طوسیؒ نے اسناد حسین ابن سعید، نضر، ابن سنان سے ایسی ہی روایت کی ہے۔

روایات اہلِ سنت:

۱ ـ حدثنا أبوبكر بن أبي شيبة ومحمدبن الصباح، قالا: حدثنا سفيان بن عيينة عن عمروبن دينار، عن يحيى بن جعدة، عن عبدالله ابن عمرو القاري، قال: سمعت أبا هريرة يقول: لاورب الكعبة ما أنا قلت من أصبح وهو جنب فليفطر. محمد(ص) قاله[۴۵]. وفي البيهقي بسنده الى أبي بكر بن عبدالرحمن ذكر رواية ابي هريرة ورواية عائشة وأن أبا هريرة أخبره مخبر بذلك[۴۶]. وكذا عند مسلم، إلاّ أنه ذكر أن الذي حدثه هوالفضل بن عباس[۴۷]. وكذا عندالبخاري (كمسلم)[۴۸]. وكذا عند عبدالرزاق وأخرج نفس الحديث عن ابن جريج مثله[۴۹]. ورواه الحميدي عن سفيان مثله[۵۰]. أقول ولما اختلفت رواية أبي هريرة مع عائشة، جمعنا بينها بما تقبله العبارة والموافق لما عندنا من حمل رواية عائشة على إرادة الصوم التطوعي ورواية أبي هريرة على ارادة القضاء. نعم هذا الحمل قديتنافى و بعض ما صرحت به الروايات الأخرى، إلاّ أن ذلك لايمنعنا عن هذا الحمل لأننا لانهتم بالروايات المخالفة، بل قد

يرتفع التنافي بملاحظة ما قاله أبو داود من أنه من يقول هذه الكلمة يعني يصبح جنباً في شهر رمضان، وانما الحديث ان النبي (ص) كان يصبح وهو صائم — أبو داود ج ۲ ص ۳۱۲ — وبما أن هذه الروايات ليس مصرحة في كون ذلك في رمضان، حملناها على ما ذكرنا، وانما لم نحمل رواية الإفطار على رمضان لأنه لامعنى للأمر بالإفطار في رمضان إلا أن يكون المراد الأمر بالقضاء وهو بعيد.

۱۔ ہم سے حدیث بیان کی ابوبکر ابن ابی شیبہ نے .... ابوہریرہ کو کہتے سنا: رب کعبہ کی قسم، "جو صبح کرے اور جنب ہو وہ افطار کرے" یہ میں نے نہیں، حضرت محمد مصطفیٰ نے فرمایا ہے۔

اور بیہقی میں اپنی سند سے ابوبکر ابن عبدالرحمٰن کے ذریعے ابوہریرہ اور حضرت عائشہ کی روایت نقل ہے، اور یہ کہ ابوہریرہ نے اس مفہوم کی خبر بیان کی ہے۔ یہی بات مسلم کے نزدیک ہے۔ مگر یہ کہ ان کے بقول یہ حدیث فضل بن عباس نے بیان کی ہے۔ بخاری کے نزدیک بھی وہی ہے جو مسلم کے نزدیک ہے۔ یہی صورت، عبدالرزاق کی ہے، انہوں نے یہی حدیث بعینہ ابن جریج سے نقل کی ہے۔ اور حمیدی نے سفیان سے یہی روایت کی ہے۔

اقول: حضرت عائشہ سے ابوہریرہ کی روایتوں میں اختلاف کی وجہ سے ہم نے جمع کی ایسی صورت نکالی ہے جسے عبارت قبول کرے اور ہمارے مسلک کے مطابق حضرت عائشہ کی روایت صوم تطوعی (روزۂ استحبابی) پر حمل کی جا سکتی ہے اور روایت ابوہریرہ کو قضا روزہ پر حمل کرنا ممکن ہے۔ لیکن یہ حمل بعض اور روایات کے تصریحات سے ہم آہنگ نہیں، البتہ ہمارے لیے جمع بین الروایتین کا یہ نکتہ مجروح نہیں ہوتا کیونکہ ہم مخالف روایات کی بہت زیادہ اہمیت محسوس نہیں کرتے خصوصاً ابوداؤد کے اس بیان کے پیش نظر کہ "یصبح جنبا فی شھر رمضان" میں حدیث کے الفاظ ہیں۔ "کان یصبح وھو صائم" (سنن ابو داؤد ج ۲ ص ۳۱۲) نیز ان روایات رمضان میں روزے کی تصریح نہیں ہے۔ لہذا، ہم نے جو معنی قرار دیئے ہیں (تاکہ جمع روایات ممکن ہو) وہی صحیح ہیں۔ ہم نے افطار والی روایتوں کو ماہ رمضان پر حمل نہیں کیا، اس بنا پر کہ ماہ رمضان میں حکم "افطار" کے معنی نہیں بنتے۔ ہاں، قضاء رمضان مراد ہو سکتی ہے اور وہ دور از کار مفہوم ہے۔

باب پنجم

حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین روزہ رکھیں

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمد بن يعقوب، عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد، عن ابن محبوب، عن العلاء بن رزين، عن محمد بن مسلم، قال: سمعت أبا جعفر(ع) يقول: الحامل المقرب والمرضع القليلة اللبن لاحرج عليها أن تفطرا في شهر رمضان لأنها لا تطيقان الصوم وعليها أن تتصدق كل واحدة منها في كل يوم تفطرفيه بمد من طعام، وعليها قضاء كل يوم أفطرتا فيه تقضيانه بعد. ورواه الكافي أيضاً عن محمد بن يحيى، عن محمد بن الحسين، عن محمد بن عبدالله بن هلال، عن العلاء بن رزين مثله[51]. ورواه الفقيه باسناده عن العلاء عن محمد بن مسلم.[52]

١۔ محمد بن یعقوب .... محمد بن مسلم کہتے ہیں: میں نے امام محمد باقر علیہ السلام کو یہ کہتے ہوئے سنا: ولادت کے قریب حاملہ اور کم دودھ رکھنے والی مرضعہ ماہ مبارک رمضان میں روزہ کھول سکتی ہیں کیونکہ روزے کی طاقت نہیں رکھتیں، ان دونوں پر لازم ہے کہ صدقہ دیں جس دن روزہ نہیں رکھا اس دن ایک "مد" گیہوں لیکن ہر روزے کی بعد میں قضا بھی کرنا ہوگی ــ اسے کافی میں محمد ابن یحیی، محمد بن حسین، محمد بن عبداللہ بن ہلال نے علا بن رزین سے روایت کی ہے۔ اور "من لایحضرہ الفقیہ" میں اپنی سند سے بروایت علا از محمد بن مسلم منقول ہے۔

روایات اہل سنت:

١ ــ حدثنا هشام بن عمار الدمشقي، حدثنا الربيع بن بدر، عن الجريري، عن الحسن، عن أنس بن مالك، قال: رخص رسول الله(ص) للحبلى التي تخاف على نفسها أن تفطر وللمرضع التي تخاف على ولدها[53].

١۔ ہم سے حدیث بیان کی ہشام بن عمار دمشقی نے .... انس بن مالک

کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حاملہ عورت کو چھوٹ دی ہے جسے اپنے اوپر خوف ہو کہ روزہ توڑنے پر مجبور ہو جائے گی اور اس دودھ پلانے والی کو جسے اپنے بچے کے بارے خوف ہو (یہ خواتین روزہ نہ رکھیں)۔

٢ ــ اخبرنا أبو منصور محمد بن محمد بن عبدالله بن نوح النخعي بالكوفة، أنبأنا أبوجعفر محمد بن علي بن دحيم، حدثنا أحمد بن حازم بن أبي غرزة، أنبأنا عبيدالله بن موسى و أبونعيم، عن أبي هلال، عن عبدالله بن سوادة، عن أنس بن مالك، رجل من بني عبدالأشهل أخوة قشير قال: أغارت علينا خيل رسول الله(ص) فأتيته، فوجدته يأكل، فقال: ادن، فكل، فقلت، إني صائم قال: أجلس أحدثك عن الصوم أو عن الصيام. قال: إنَّ الله وضع عن المسافر شطر الصلاة، وعن المسافر والحامل والمرضع الصوم أو الصيام... (الحديث)[٥٤]. أقول: و يدل عليه ما تقدم من حديث افطار الشيخ الكبير والعجوز الكبيرة اللذين لايطيقان الصيام. عن ابن عباس. ولايقال ان الحديث هنا يدل على عدم لزوم التصدق بالإطلاق لعدم كونه في مقام البيان من هذه الناحية. ثم ان هذا الحديث يفيد في باب سقوط الصوم عن المسافر. وروى الترمذي هذا الحديث عن أبي كريب ويوسف بن عيسى، قالا: حدثنا وكيع، حدثنا أبو هلال عن عبدالله بن سوادة مثله مع اختلاف يسير في ترتيب الألفاظ[٥٥]، ورواه عبدالرزاق باختلاف يسير عن معمر، عن أيوب، عن أبي قلابة، عن رجل من بني عامر[٥٦]. وأخرجه ابن ماجة، عن أبي بكر بن أبي شيبة وعلي بن محمد، كلاهما عن وكيع، عن أبي هلال مثله[٥٧]. وأخرج النسائي نحوه ــ مع نواقص واختلافات ــ بأسانيد متعددة... فراجع[٥٨]. وأخرجه أبو داود، عن شيبان بن فروخ، عن أبي هلال الراسبي مثله[٥٩].

٢۔ ہمیں خبر دی ابو منصور محمد بن محمد بن عبداللہ بن نوح نخعی نے کوفے میں...... .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپاہیوں نے ہماری بستی پر دھاوا کیا، تو میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھا، حضور کھانا نوش فرما رہے ہیں۔ فرمایا: قریب آؤ، کھانا کھاؤ۔ میں نے عرض کی: میں روزے سے ہوں

فرمایا: اللہ نے مسافر سے نماز کا ایک حصہ اور مسافر و حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت سے صوم یا صیام کی تکلیف اٹھالی ہے . . . .

اقول: بوڑھے مرد اور ایسی بوڑھی عورت جو روزہ نہ رکھ سکے۔ ان کے روزے کے بارے میں ابن عباس کی زبانی حدیث ہے۔ اس حدیث کو دیکھ کر یہ نہ کہئے گا کہ صدقہ (کفارہ) مطلقاً فرض نہیں ہے۔ کیونکہ حدیث کفارہ/صدقے کے موضوع و بیان سے متعلق نہیں ہے۔ نیز یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ مسافر سے روزہ ساقط ہے۔ . . . .

. . . .

باب ششم

بوڑھا آدمی اور بوڑھی عورت روزہ نہ رکھے

روایات اہل بیتؑ:

١ ـ عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن علي بن الحكم، عن عبدالملك بن عتبة الهاشمي، قال: سألت أباالحسن (ع) عن الشيخ الكبير والعجوز الكبيرة التي تضعف عن الصوم في شهر رمضان، قال: تصدق في كل يوم بمدحنطة. ورواه في الإستبصار عن أحمد بن محمد بن عيسى مثله [٦٠]. ورواه في الفقيه مرسلاً [٦١].

۱۔ ہمارے چند اصحاب نے . . . .

. . . . عبدالملک بن عتبہ ہاشمی کہتے ہیں، میں نے ابوالحسن علیہ السلام سے پوچھا: بہت بوڑھا مرد اور بہت بوڑھی عورت جو رمضان کے روزے سے عاجز ہو؟ (کیا حکم ہے)، فرمایا: ہر دن کے بدلے ایک مُد گیہوں دے . . . . . .

روایات اہل سنت:

١ ـ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ وأبوسعيد بن أبي عمرو قالا: حدثنا

أبو العباس محمد بن يعقوب، حدثنا ابراهيم بن مرزوق، حدثنا روح بن عبادة، حدثنا سعيد بن أبي عروبة (ح وأخبرنا) أبوالحسين بن بشران العدل ببغداد، أنبأنا أبوجعفر محمد بن عمرو الرزاز، حدثنا مكي بن ابراهيم، أخبرني سعيد بن أبي عروبة عن قتادة، عن عزرة، عن سعيد بن جبير، عن ابن عباس أنه قال: رخص للشيخ الكبير و العجوز الكبيرة في ذلك وهما يطيقان الصوم أن يفطرا إن شاءا و يطعما مكان كل يوم مسكيناً. ثم نسخ ذلك في هذه الآية: «فمن شهد منكم الشهر فليصمه». وثبت للشيخ الكبير و العجوز الكبيرة إذا كانا لايطيقان الصوم و الحامل والمرضع إذا خافتا أفطرتا وأطعمتا مكان كل يوم مسكيناً[٤٢]. أقول ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) صريحاً من طرق أهل السنة.

۱- ہمیں خبر دی ابوعبد اللہ الحافظ نے ....
...... ابن عباس نے کہا کہ بہت بوڑھے مرد اور بہت بڑھیا عورت کو طاقت روزہ کے باوجود چھوٹ دی گئی کہ وہ روزہ افطار کریں اور ہر دن کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ پھر یہ حکم قرآن کی آیت سے منسوخ ہوا "فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ" تم میں سے جو شخص اس مہینے میں اپنی جگہ پر (حضر میں) ہو تو چاہیے کہ روزہ رکھے"۔ بہت بوڑھے مرد اور بہت بوڑھی عورت اگر روزہ کی برداشت نہ رکھتے ہوں اور حاملہ نیز دودھ پلانے والی عورتیں بھی اگر خوف (ضرر) محسوس کریں تو افطار کر سکتی ہیں۔ لیکن ہر دن کے بدلے ایک کو پیٹ بھر کر کھانا کھلائیں۔

اقول: اس بات کی کوئی واضح حدیث رسول اللہ ص سے مروی بسلسلۂ روایت اہل سنت مجھے نہیں ملی۔

باب ہفتم
زوجہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ نہیں رکھ سکتی

روایات اہل بیت:

۱ ـــ وعن علي بن محمد بن بندار، عن أحمد بن أبي عبدالله، عن

الجاموراني، عن الحسين بن علي بن أبي حمزة، عن عمرو بن جبير العزرمي، عن أبي عبدالله(ع) قال: جاءت إمرأة الى النبي(ص)، فقالت: يا رسول الله ما حق الزوج على المرأة (الى أن قال) فقال(ص): ليس لها أن تصوم إلاّ بإذنه[63].

۱۔ اور علی ابن محمد ابن بندار نے ....

.... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا، ایک عورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اور پوچھا: عورت پر شوہر کا حق کیا ہے؟ ..... آنحضرتؐ نے فرمایا: اُسے شوہر کی اجازت کے بغیر روزہ رکھنے کا حق نہیں ہے۔

۲ ـ محمد بن يعقوب عن عدة من أصحابنا، عن أحمد بن محمد، عن الحسن بن محبوب، عن مالك بن عطية، عن محمد بن مسلم، عن أبي جعفر(ع) قال: قال النبي(ص): ليس للمرأة أن تصوم تطوعاً إلاّ بإذن زوجها. ونحوه عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن محمد بن خالد، عن القاسم بن عروة، عن بعض أصحابه، عن أبي عبدالله، قال: لايصلح للمرأة... الخ. مثله[64]. ونحوه ما نقله في البحار عن الخصال، عن القطان، عن السكري، عن الجوهري، عن ابن عمارة، عن أبيه، عن جابر، عن أبي جعفر(ع)، قال: لايجوز... الخ[65]. ونحوه في حديث الزهري. أقول: وينفع في هذا الباب حديث الزهري عن السجاد الذي ذكرناه في مواضع متعددة، إذ فيه: (وأما صوم الإذن فان المرأة لا تصوم تطوعاً إلاّ بإذن زوجها).

۲۔ محمد بن یعقوب .... محمد ابن مسلم نے امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا بے اجازتِ شوہر، بیوی کو استحبابی روزہ رکھنے کا حق نہیں ہے ....

....

اقول: اس باب میں، امام زین العابدین علیہ السلام سے زہری کی وہ حدیث بھی مفید ہے، جیسے ہم نے کئی مرتبہ بیان کیا ہے کہ "واما صوم الاذن ...." روزۂ اجازت: بیوی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر استحبابی روزہ نہیں رکھ سکتی۔

روایاتِ اہل سنّت :

۱ ــ أخبرنا أبو طاهر الفقيه، أنبأنا أبوبكر محمدبن الحسين القطان، حدثنا أحمدبن يوسف، حدثنا عبدالرزاق، أنبأنا معمرعن همام بن منبه، قال: هذا ما حدثنا أبوهريرة. قال: وقال رسول الله (ص): لاتصوم المرأة وبعلها شاهد إلاّ بإذنه ۶۶.. وروى الترمذي نحوه عن قتيبة ونصر بن علي، جميعاً عن سفيان بن عيينة، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة ۶۷. ورواه عبدالرزاق عن معمر مثله بالمعنى ۶۸. ورواه أبوداود، عن الحسن بن علي، عن عبدالرزاق مثله ۷۰. وروى الحميدي نحوه عن سفيان، عن أبي الزناد، عن موسى بن أبي عثمان، عن أبيه، عن أبي هريرة ۷۱. ورواه الدارمي نحوه عن محمدبن يوسف، عن سفيان كالحميدي. ونحوه أيضاً عن محمدبن أحمد، عن سفيان مثله ۷۲.

۱۔ ہمیں خبر دی ابوطاہر فقیہ نے .... ابوہریرہ ..... رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا : شوہر کی موجودگی میں بیوی بلا اجازت شوہر روزہ نہ رکھے ....

۲ ــ أخبرنا أبومحمد بن عبدالله الحافظ، حدثني علي بن عيسى، حدثنا مسددبن قطن، حدثنا عثمان بن أبي شيبة، حدثنا جرير، عن الأعمش، عن أبي صالح، عن أبي سعيد (رض) قال: جاءت إمرأة الى النبي (ص) ونحن عنده، فقالت، يا رسول الله ان زوجي صفوان بن المعلل يضربني إذا صليت، ويفطرني إذا صمت (الى أن قال) فقال رسول الله (ص): لا تصوم إمرأة إلاّ بإذن زوجها... (الحديث) ۷۳. ورواه الحاكم عن علي بن حمشاد العدل، عن مسدد مثله ۷۴. ورواه أبو داود، عن عثمان مثله ۷۵.

۲۔ ہمیں خبر دی ابومحمد ابن عبد اللہ حافظ نے .... ابوسعیدؓ نے کہا : نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے حضور ایک خاتون حاضر ہوئی ۔ اس وقت میں بھی حاضر تھا ۔ خاتون نے کہا : میرا شوہر صفوان بن معلّل نماز پڑھنے پر مجھے مارتا ہے ، روزہ رکھتی ہوں تو افطار کرادیتا ہے .... رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا : بیوی ، بے اجازتِ شوہر روزہ نہیں رکھ سکتی ، ....

باب ہشتم

میزبان کی اجازت کے بغیر مہمان روزہ نہ رکھے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمد بن علي بن الحسين باسناده عن الفضيل بن يسار، عن أبي عبدالله (ع) قال: قال رسول الله (ص): إذا دخل رجل بلدة فهوضيف على من بها من أهل دينه حتى يرحل عنهم، ولاينبغي للضيف أن يصوم إلا بإذنهم... (الحديث). ورواه في العلل عن محمد بن موسى عن السعدآبادي، عن البرقي، عن السياري، عن محمد بن عبدالله، عن رجل مثله. ورواه أيضاً عن علي بن بندار، عن ابراهيم بن اسحاق باسناد ذكره عن الفضيل بن يسار مثله، وعن الحسين بن أحمد، عن أحمد بن محمد، عن محمد بن عبدالله الكرخي، عن رجل، عن الفضيل. ورواه الكليني عن علي بن محمد بن بندار وغيره، أي عن ابراهيم بن اسحاق مثله[٧٦]. ونحوه في حديث الزهري.

١۔ محمد ابن علی بن حسین .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آدمی جس شہر میں جاتا ہے، وہاں کے ہم مذہب لوگوں کا مہمان ہوتا ہے، جب تک وہاں سے سفر نہ کرے۔ مہمان کے لئے مناسب نہیں کہ وہ ان لوگوں کی اجازت کے بغیر روزہ رکھے .... اور یہی مضمون زہری کی روایت کا ہے۔

روایات اہل سنت:

١ ــ حدثنا بشر بن معاذ العقدي البصري، حدثنا أيوب بن واقد الكوفي، عن هشام بن عروة، عن أبيه، عن عائشة، قالت: قال رسول الله (ص): من نزل على قوم فلا يصومنّ تطوعاً إلا بإذنهم[٧٧]. ورواه ابن ماجة، عن محمد بن يحيى، عن موسى بن داود وخالد بن أبي يزيد عن أبي بكر المدني، عن هشام مثله[٧٨].

ترجمہ:

۱۔ ہم سے حدیث بیان کی بشر ابن معاذ عقدی بصری نے ۔۔۔۔۔۔ حضرت عائشہ کے بقول، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جو شخص کسی قوم (قبیلہ) کا مہمان ہو، خبردار، میزبان سے پوچھے بغیر استحبابی روزہ نہ رکھے ۔۔۔۔۔

باب نہم

لڑکا اگر تین دن لگاتار روزے رکھ سکے تو روزہ رکھے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ وعنه ــ علي بن ابراهيم ــ عن أبيه، عن النوفلي، عن السكوني، عن أبي عبدالله (ع) قال: إذا أطاق الغلام صوم ثلاثة أيام متتابعة، فقد وجب عليه صوم شهر رمضان. ورواه الصدوق باسناده عن اسماعيل بن مسلم، عن الصادق (ع). ورواه الشيخ باسناده عن الحسين بن سعيد، عن فضالة بن أيوب، عن اسماعيل بن أبي زياد ورواه أيضاً باسناده عن السكوني [٧٩].

۱۔ اور ۔ علی ابن ابراہیم ۔۔۔۔۔۔۔۔ سکونی نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی: جب (نابالغ) لڑکا اس قابل ہو کہ تین دن یکے بعد دیگرے روزہ رکھ سکے تو رمضان کا روزہ اس پر واجب ہے ۔۔۔۔۔۔۔

روایات اہل سنّت:

١ ــ عبدالرزاق عن ابن جريج، عن محمد بن عبدالرحمن بن لبيبة، عن جده، ان النبي (ص) قال: إذا صام الغلام ثلاثة أيام متتابعة، فقد وجب عليه صيام شهر رمضان [٨٠].

۱۔ عبدالرزاق نے ابن جریج سے، انھوں نے محمد ابن عبدالرحمٰن ابن لبیبہ، انھوں نے اپنے دادا سے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر لڑکا پے در پے تین روزہ رکھ سکے تو اس پر ماہ رمضان کا روزہ واجب ہو جاتا ہے۔

باب دہم

جو شخص ماہِ رمضان میں مسلمان ہو، اس پر باقی تاریخوں کے روزے ہیں، گذشتہ دنوں کے روزے قضا نہیں کریگا۔

روایاتِ اہل بیتؑ:

١ ــ محمدبن يعقوب عن أبي الأشعري، عن محمدبن عبدالجبار، عن صفوان بن يحيى، عن عيص بن القاسم، قال: سألت أبا عبدالله (ع) عن قوم أسلموا في شهر رمضان وقدمضى منه أيام، هل عليهم ان يصوموا مامضىٰ منه أويومهم الذي اسلموا فيه؟ فقال: ليس عليهم قضاء، ولايومهم الذي أسلموا فيه، إلاّأن يكونوا اسلموا قبل طلوع الفجر. ورواه الصدوق باسناده عن صفوان والشيخ باسناده عن الحسين بن سعيد عن صفوان مثله[81].

١. محمدابن یعقوب .... عیص ابن قاسم نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا: اگر کچھ لوگ ماہِ رمضان کے چند دن گذرنے کے بعد مسلمان ہوں تو گذشتہ دنوں کے روزے بھی ان کے ذمے ہوں گے یا اسی دن سے جس دن انہوں نے اسلام قبول کیا؟ حضرت نے فرمایا: ان پر قضا واجب نہیں نہ اس دن کا روزہ جس دن وہ مسلمان ہوے، البتہ اگر قبل طلوعِ صبح صادق مسلمان ہوئے (تو روزہ واجب ہے) ......

روایاتِ اہل سنت:

١ ــ أنبأني أبوعبدالرحمن السلمي اجازة، أنبأنا أبوعبدالله العكبري، أنبأنا أبوالقاسم البغوي، حدثنا ابراهيم بن هانيء وعمي وغيرهما، قالوا: حدثنا محمدبن سعيد الأصبهاني، حدثنا ابراهيم بن المختار الرازي عن محمدبن اسحاق، عن عيسى بن عبدالله، عن سفيان بن عطية بن ربيعة الثقفي، قال: قدم وفدنا من ثقيف على النبي (ص) فضرب لهم قبة، وأسلموا في النصف من رمضان فأمرهم رسول

الله (ص) فصاموا منه ما استقبلوا منه ولم يأمرهم بقضاء مافاتهم[82].

وروى ابن ماجة نحوه عن محمد بن يحيى، عن أحمد بن خالد، عن محمد بن اسحاق، عن عيسى، عن عطية بن سفيان بن عبدالله بن ربيعة[83]. ونقله مجمع الزوائد عن الطبراني في الكبير، ونقله عن عطية بن سفيان، عن سفيان بن عطية[84].●

۱۔ ہمیں خبر دی ابو عبد الرحمن سلمی نے از روئے اجازہ .... سفیان بن عطیہ بن ربیعہ ثقفی نے کہا، ہمارا ایک وفد ثقفی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور حاضر ہوا۔ ایک بڑا سا خیمہ ان کے لیے لگا، وہ لوگ پندرہ رمضان کو مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنے والے دنوں میں روزے کا حکم دیا، جو دن گذر چکے تھے ان کی قضا رکھنے کا حکم نہیں دیا ......

حواشی

١ ــ الكافي ج ٤ ص ١٣٥.
٢ ــ البيهقي ج ٤ ص ٣٢٥.
٣ ــ البخاري ج ٣ ص ٤٣ ولم يذكر الحديث كاملاً، بل ذكر قوله (أليس إذا حاضت... الخ) فقط.
٤ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٢٥ والكافي ج ٤ ص ١٢٧.
٥ ــ البحار ج ٩٣ ط ح ٣٢٥.
٦ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٢٥. وأرسل الصدوق هذا الحديث عن الصادق(ع) كما في الوسائل ج ٧ ص ١٢٦. ولكن الموجود في الفقيه ج ٢ ص ١٠٣. ارساله هذا الحديث عنهم(ع) لاعن خصوص الصادق(ع).
٧ ــ البحار ج ٩٣ (ط.ح) ص ٣٢٦.
٨ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٢٤، والكافي ج ٤ ص ١٢٧، والبحار ج ٩٣(ط.ح) ص ٣٢٣.
٩ ــ البحار ج ٩٣ (ط.ح) ص ٣٢٢ وليس فيها الحكاية ولاالصدر بل فيها قول الرسول(ص): «ان الله أهدى... الخ».
١٠ ــ البيهقي ج ٤ ص ٨٤١.
١١ ــ الترمذي ج ٣ ص ٨٩.
١٢ ــ مسلم ج ٣ ص ١٤١.
١٣ ــ النسائي ج ٤ ص ١٧٧.

١٤ ـ منحة ج ١ ص ١٩٠. وفيه اختلاف في اللفظ.
١٥ ـ البيهقي ج ٤ ص ٢٤٢ وأبو داود ج ٢ ص ٣١٧ ومنحة المعبود ج ١ ص ١٨٩.
١٦ ـ مسلم ج ٣ ص ١٤٢ وفيه أنه قد اجتمع عليه الناس.
١٧ ـ البخاري ج ٣ ص ٤٢.
١٨ ـ ابن ماجة ج ١ ص ٥٣٢.
١٩ ـ النسائي ج ٤ ص ١٧٤ و١٧٥ و١٧٦.
٢٠ ـ المستدرك ج ١ ص ٤٣٣.
٢١ ـ مجمع الزوائد ج ٣ ص ١٦١.
٢٢ ـ مسند الحميدي ج ١ ص ٣٨١.
٢٣ ـ منحة المعبود ج ١ ص ١٨٩.
٢٤ ـ الدارمي ج ٢ ص ٩.
٢٥ ـ كشف الأستار ج ١ ص ٤٦٨ و٤٦٩.
٢٦ ـ النسائي ج ٤ ص ١٧٦.
٢٧ ـ مجمع الزوائد ج ٣ ص ١٦١ و١٦٢ و١٦٣.
٢٨ ـ نفس المصدر السابق.
٢٩ ـ كشف الأستار ج ١ ص ٤٦٩.
٣٠ ـ ابن ماجة ج ١ ص ٥٣٢.
٣١ ـ النسائي ج ٤ ص ١٨٣.
٣٢ ـ نصب الراية ج ٢ ص ٤٦٢.
٣٣ ـ الوسائل ج ٧ ص ٤٧.
٣٤ ـ الفقيه ج ٢ ص ٤٩.
٣٥ ـ الوسائل ج ٧ ص ٤٧.
٣٦ ـ مسلم ج ٣ ص ١٣٨.
٣٨ ـ البخاري ج ٣ ص ٣٦.
٣٩ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٣ ص ١٧٩ و ١٨٠ وذكر: رواية أبي هريرة.
٤٠ ـ مسلم ج ٣ ص ١٣٧.
٤١ ـ البيهقي ج ٤ ص ٢١٤.
٤٢ ـ موطأ مالك بشرح تنوير الحوالك ج ١ ص ٢٧٢.
٤٣ ـ الوسائل ج ١ ص ٤٦.
٤٤ ـ الوسائل ج ٧ ص ٤٦ والفقيه ج ٢ ص ٧٥.
٤٥ ـ ابن ماجة ج ١ ص ٥٤٣.
٤٦ ـ البيهقي ج ٤ ص ٢١٤.
٤٧ ـ مسلم ج ٣ ص ١٣٧.
٤٨ ـ البخاري ج ٣ ص ٣٧.
٤٩ ـ مصنف عبدالرزاق ج ٣ ص ١٨٠.

٥٠ ــ مسند الحميدي ج ٢ ص ٤٤٣.
٥١ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٥٣ والكافي ج ٤ ص ١١٧.
٥٢ ــ الفقيه ج ٢ ص ٨٤.
٥٣ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٣٣.
٥٤ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٣١. ورواه البيهقي أيضاً بأسانيد مختلفة وألفاظ متشابهة.
٥٥ ــ الترمذي ج ٣ ص ٩٤.
٥٦ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٢١٧ والإختلاف فيه بالراوي وبترتيب المعاني فقط.
٥٧ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٣٣.
٥٨ ــ النسائي ج ٤ ص ١٧٨ و١٧٩ و١٨٠ و١٨٢ و١٩٠.
٥٩ ــ أبوداود ج ٢ ص ٣١٧. فيه زيادة (عن الصلاة).
٦٠ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٥٠ والكافي ج ٤ ص ١١٦ والإستبصار ج ٢ ص ١٠٣.
٦١ ــ الفقيه ج ٢ ص ٨٥.
٦٢ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٣٠. ونقل البيهقي ج ٤ ص ٢٧١ أقوالاً كثيرة عن ابن عباس وأنس وابن المسيب وابن السائب وابي هريرة كلها أن الشيخ والشيخة لايطيقان الصيام يفطران ويفتديان. ولكنها تختلف في بعض الخصوصيات... فراجع.
٦٣ ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٩٤ والكافي ج ٤ ص ١٥٢ وفي سنده (الحسن بن علي ابن أبي حمزة) لا (الحسين...) كما في المتن.
٦٤ ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٩٣ والكافي ج ٤ ص ١٥١ و١٥٢.
٦٥ ــ البحار ج ٩٣ (ط.ح) ص ٢٦٢.
٦٦ ــ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٣.
٦٧ ــ الترمذي ج ٣ ص ١٥١.
٦٨ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ٣٠٥.
٦٩ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٦٠.
٧٠ ــ أبوداود ج ٢ ص ٢٣٠ وفيه زيادة.
٧١ ــ مسند الحميدي ج ٢ ص ٤٤٣.
٧٢ ــ الدارمي ج ٢ ص ١٢.
٧٣ ــ البيهقي ج ٤ ص ٣٠٣.
٧٤ ــ المستدرك ج ١ ص ٤٣٦.
٧٥ ــ أبوداود ج ٢ ص ٣٣٠.
٧٦ ــ الوسائل ج ٧ ص ٣٩٤ و٣٩٥ والكافي ج ٤ ص ١٥١.
٧٧ ــ الترمذي ج ٣ ص ١٥٦.
٧٨ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٦٠ باختلاف يسير.
٧٩ ــ الوسائل ج ٧ ص ١٦٨، والإستبصار ج ٢ ص ١٢٣، والكافي ج ٤ ص

١٢٥، والفقيه ج ٢ ص ٧٦.

٨٠ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤ ص ١٥٤.

٨١ ــ الوسائل ج ٧ ص ٢٣٨ ، والكافي ج ٤ ص ١٢٥، و روى نحوه بأسانيد أخرى. والإستبصار ج ٢ ص ١٠٧. وفيه نحوه بأسانيد أخرى، والفقيه ج ٢ ص ٨٠. وفيه نحوه مرسلاً عن الصادق(ع).

٨٢ ــ البيهقي ج ٤ ص ٢٦٩.

٨٣ ــ ابن ماجة ج ١ ص ٥٥٩.

٨٤ ــ مجمع الزوائد ج ٣ ص ١٤٩.

جناب احمد جنتی
ترجمہ: جناب محمد ظفر حسینی

اسلامی حکومت اور قانون سازی

اسلامی حکومت میں قانون سازی کا مسئلہ بہت پہلو دار مسئلہ ہے۔اس مسئلہ میں ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ قانون سازی کا حق کسے حاصل ہے؟ اور وہ کون سے قوانین ہیں جو اتنے اہم ہیں کہ معاشرے کو بہرحال ان کا پابند ہونا اور ان کی مخالفت پر سزا دینا چاہیے؟

اس امر میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اسلام اور عقل کے نقطۂ نظر سے تمام افراد بشر خلقت کے اعتبار سے برابر ہیں۔ لہذا، ان میں کسی کو بھی ایک دوسرے پر اولویت و سلطنت کا حق نہیں۔ رنگ و نسل، ملک و قوم اور جغرافیائی و طبقاتی بنیادوں پر بھی انہیں ایک دوسرے پر ولایت و حکومت کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔

درحقیقت عالم اور موجوداتِ عالم کی مالکِ حقیقی بس اللہ کی ذات ہے

تمام مخلوقات اس کی نظر میں برابر ہیں، اس نے باہمی طور پر ایک دوسرے کو پیشوا اور حاکم بنانے سے منع کیا ہے۔

سورۂ آل عمران آیت ۶۴ میں ارشاد ہے:

"ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ"

یعنی ہم میں سے کوئی بھی ایک کو دوسرے پر خدا کے علاوہ حاکم و والی قرار نہیں دے سکتا۔

سورۂ توبہ آیت ۳۲ (یہود و نصاری کی مذمت میں) ارشاد ہے:

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ

یعنی انہوں نے خدا کو چھوڑ کے اپنے مذہبی پیشواؤں اور راہبوں کو اپنا حاکم و والی تصور کر لیا۔

نیز سورۂ اعراف آیت ۵۴ میں ہے:

الا لہ الخلق والامر

یعنی تخلیق اور حکومت (خلق وامر) بس خدا کی ذات سے مخصوص ہے،

لفظ "امر" کا اطلاق قدرت حاکمیت یا اقتدار عمومی پر ہوتا ہے۔ یہ مفہوم بتاتا ہے کہ صاحب اقتدار فرمان جاری کرنے اور پابندیاں عائد کرنے کا مظہر و سرچشمہ ہے۔ کلمۂ امر "صاحب الامر" کی ترکیب میں یہی معنی دیتا ہے۔

ان الامر کلہ للہ (آل عمران/۱۵۴)

یعنی تمام احکام و اوامر بس اللہ کی ذات سے مخصوص ہیں۔

"یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا" (حجرات/۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں اس لیے مرد و عورت کی شکل میں خلق کیا اور مختلف قوموں اور قبیلوں میں قرار دیا ہے کہ ایک دوسرے کے لئے تعارف کا ذریعہ ہو۔

ان آیات کی بنیاد پر، کوئی قانون، خواہ وہ کسی نے بھی وضع کیا ہو اور کہیں پر بھی اس کی تشکیل ہوئی ہو، دوسروں پر لاگو نہیں ہوسکتا۔ اور نہ وہ اس لائق ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اس کے برعکس الٰہی قوانین و احکام خواہ کسی بھی فرد اور شئی سے متعلق ہوں محض اللہ کی حکومت و ولایت کی بنیاد پر ہمہ وقت واجب العمل ہیں اور انکی پابندی ضروری ہے۔ سورۂ یوسف کی آیت ۴۰ میں ہے:

ان الحکم إلاّ للّٰہ امر الا تعبدوا الاّ ایاہ

حکومت بس اللہ سے مخصوص ہے اس کا فرمان ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی بھی عبادت نہ کرنا۔

اسی طرح سورۂ نحل کی آیت ۳۶ ہے:

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً أن اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت

ہم نے ہر امت میں ایک پیغمبر مبعوث کیا تاکہ لوگ اللہ کی عبادت کریں اور طاغوت سے الگ رہیں۔

جمہوری اسلامی ایران کے "قانونِ اساسی" کی دوسری دفعہ میں اس بات کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

"اسلامی جمہوریہ وہ نظام ہے جس کی بنیاد اللہِ واحد پر ایمان ہے لا الہ الا اللہ۔ اور حاکمیت اور حقِ قانون سازی اسی کی ذات سے مخصوص ہے۔ اس کے سامنے سپردگی لازم ہے........"

اب اگر اللہ کسی کو حکومت اور قانون سازی کا حق عطا کرے تو ضمنی طور پر اس کو محدود دائرۂ کار میں احکام جاری کرنے کی اجازت بھی ہوگی، اور اس کی ولایت (حاکمیت)، اللہ کی حاکمیت ہوگی، اس کا حکم اللہ کا حکم ہوگا اور اس کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی۔ سورۂ نساء کی آیت ۵۹ میں اس کی تائید موجود ہے:

من یطع الرسول فقد اطاع الله

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔
اس پس منظر میں انبیاء دستور و قوانینِ الٰہی کے نافذ کرنے والے ہیں اور جن حدود میں ان کو ولایت دی گئی ہے۔ اس کے مطابق ان کی اطاعت بھی واجب ہے، سورۂ احزاب کی آیت ۳۶ ہے:

وما کان لمومنٍ ولا مومنۃ اذا قضیٰ اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم۔

جب اللہ یا اس کا رسول کوئی حکم جاری فرمائے یا کوئی فیصلہ صادر کرے تو پھر کسی بندۂ مومن اور مومنہ کو اپنے مسائل میں خود مختاری حاصل نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ پیغمبر اپنے دور میں حاکم بھی ہوتے ہیں اور قانون ساز بھی اور اس کے بعد اس کا وہ وصی و جانشین اس حق کا مالک ہوتا ہے جسے وہ بنفس نفیس اس منصب پر حاکم و والی، وصی و جانشین اور امت مسلمہ کے امام و ہادی و رہبر کی حیثیت سے نصب فرماتا ہے۔ یہ فرد بھی حفاظتِ کتاب و سنت کے ساتھ، خاص ضابطوں کے مطابق واضح طور پر قانون سازی کا حق رکھتا ہے اور ولایت کی بنیاد پر اس کی اطاعت بھی سب پر فرض ہوتی ہے۔ جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۵۹ سے آشکار ہے:

اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول و صاحبانِ امر کی اطاعت کرو

لہٰذا یہ فرد بھی اللہ کی حاکمیتِ مطلقہ سے استناد رکھتا ہے۔

اب رہا وہ مقام جہاں کوئی فردِ معین نامزد نہ ہو۔ وہاں پیغمبر اکرمؐ اور ان کے جانشینوں کی جانب سے ایک عام عنوان کی نشاندہی کی گئی ہے ایسی صورت میں ہر وہ شخص جس پر یہ عام عنوان منطبق ہوتا ہو۔ منصب ولایت

اسے منتقل ہوگا۔ اور اسی کے ضمن میں قانون سازی کا حق بھی حاصل ہوگا۔ ایسے افراد اگر متعدد ہوں تو ایک یا کئی اشخاص ان میں سے اس کام کے لیے چن لیے جائیں۔ ہمارے نقطۂ نظر سے ائمہ معصومین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی جانب سے ولایت عامہ کا منصب اس فقیہ عادل کو عطا ہوا ہے جو حکومت و قیادت کی تمام شرطوں کا (بدرجہ اتم) حامل ہو۔ چنانچہ "قانون اساسی" کی پانچویں دفعہ اس مسئلہ پر یوں روشنی ڈالتی ہے:

"زمانۂ غیبت حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ میں جمہوری اسلامی ایران کے عوام کی قیادت در رہبری اور ولایت امر، یعنی امور مملکت کی مہار اس فقیہ عادل کے ہاتھ میں ہوگی جو متقی و پرہیزگار ہوگا، عصری مسائل سے مکمل آگاہ ہوگا، شجاع ہوگا اور امور مملکت کے نظم و نسق کو تدبیر و تدبّر کے ساتھ سنبھالنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہوگا، نیز امت مسلمہ کی اکثریت نے اسے تسلیم کیا ہوگا اور جب کوئی فقیہ اتنی بڑی اکثریت نہ رکھتا ہو تو شورائے رہبری اس کا ذمہ لے گی، جس میں مذکورۂ بالا صفات رکھنے والے فقہا ممبر ہوں گے۔ اس کی وضاحت، قانون اساسی کی ایک سو ستاویں دفعہ میں موجود ہے۔"

اس مسئلہ میں ہمارے اور برادرانِ اہل سنّت کے درمیان دو اختلاف ہیں، پہلا اختلاف بارہ اماموں کی ولایتِ خاصہ و امامت کا ہے اور دوسرا فرق، معیّن اوصاف و شرائط رکھنے والے فقہا کی ولایتِ عامہ کے بارے میں ہے لیکن زمانہ غیبت کبریٰ میں، اس آخری مسئلہ میں کچھ شیعہ علماء بھی ولایتِ فقیہ کو نہیں مانتے، اہل سنّت سے ان علما کا اختلاف صرف ولایتِ ائمہ میں ہے۔ ایسی صورتِ حال کہ جب کوئی باشرائط و اوصاف فقیہ موجود نہ ہو تو یہ مسئلہ سوالیہ نشان بن جاتا ہے کہ امّت کی ریاست و سیاست کے بارے میں

ذمہ داری کیا ہے ؟ اور امت مسلمہ کے امور سیاست و ریاست کی باگ ڈور کس کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے ؟ ؟ نیز اسلام نے اس مسئلہ کا کوئی حل بتایا ہے، یا اس نے عوام کو آزادی بخشی ہے ؟ غور طلب ہے کہ ایسا دین جس کے پاس چھوٹے بڑے تمام احکام و فرائض کی تفصیل موجود ہے اور تمام مسائل بتانے کا مدعی ہے۔ وہ ایسے اہم مسئلے کو نظر انداز کرتا ہے جس سے اسلامی معاشرہ کی حیات وابستہ ہے۔

یہ سوال بعینہ برادران اہل سنّت کو وفات رسول اکرمؐ کے فوراً بعد پیش آیا، اور اہل تشیع کو زمانہ غیبت کے دوران ولایت فقیہ پر عقیدے کے باوجود ایسی صورت حال پیش آسکتی ہے جب کوئی جامع الشرائط فقیہ موجود نہ ہو تو ایسے عالم میں کون سا موقف اختیار کیا جائے اور مسئلے کا کیا حل ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مقدمے کے طور پر ایک مختصر سی تمہید ضروری ہے۔ تسلیم شدہ امر ہے کہ کوئی معاشرہ کسی حکومت اور قانون کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا اور اگر کچھ مدت تک باقی رہ بھی جائے تو انسانی مقاصد کی تکمیل سے عاجز معاشرے اور سسکتے ہوئے سماج سے زیادہ نہ ہوگا۔ سب جانتے مانتے ہیں کہ انسانی زندگی کا ضابطہ اور اس کی بہتری کا انتظام مذہب و دین آسمانی کا فریضہ ہے اور ادیان عالم نے اس کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ کسی ایسے معاشرے کی ہدایت جہاں نہ کوئی حکومت ہو اور نہ کوئی نظام حیات، کسی نبی کے بس کی بات نہیں۔ ایسی سرزمین کبھی بھی عبادت الٰہی اور اس کے احکام و قوانین کے نفاذ کے لیے سازگار ثابت نہیں ہو سکتی۔

سورۂ حدید کی آیت ۲۵ ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنات وانزلنا معھم
الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط

یعنی ہم نے پیغمبروں کو روشن دلائل کے ساتھ اس لیے مبعوث

کیا اور ان کے ہمراہ کتاب و قانونِ حیات بھیجا کہ لوگوں میں عدل قائم کریں۔

معاشرے میں حکومت کا وجود اور اس کی ضرورت عقلی اور شرعی دونوں اعتبار سے انتہائی واضح امر ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت علی علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں:

.... وانہ لا بدّ للناس من امیرٍ برٍّ او فاجرٍ
یعنی لوگوں کے لئے صالح یا بدکار، کسی نہ کسی حاکم کا ہونا ضروری ہے۔ (نہج البلاغہ، خطبہ ۴۰)

ہاں، جو بات باعث بحث و اختلاف ہے وہ طرزِ حکومت اور اس کے اوصاف و خصوصیات کی بات ہے اور اسی منزل پر وہ سوال بھی ابھر کے سامنے آتا ہے کہ جب منصوص من اللہ حاکم پردۂ غیبت میں ہو تو اس وقت زمامِ حکومت کس کے ہاتھوں میں ہوگی اور صاحبِ امر کون ہوگا۔

فردِ حاکم کے سلسلے میں قرآن و حدیث اور عقلی دلائل سے جو کچھ مستفاد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جن افراد کو لوگوں پر حکومت کا حق حاصل ہے، وہ ترتیب وار یوں ہیں:

سب سے پہلے نبی اور اس کے بعد اس کا منصوص وصی و جانشین، پھر فقیہ عادل اور اس کے بعد مومن عادل اور پھر آخر میں مومن یا فاسق کو بہ ترتیب ضروری شرائط و اوصاف کے ساتھ کسی ایک شخص کے تعین یا قانونی طور پر منصبِ قیادت سنبھالنے کے بعد حکومت و ولایت کا حق حاصل ہوگا۔ اور اس کی اطاعت (معصیت الٰہی کے علاوہ) ہر امر میں واجب ہوگی۔ چنانچہ انھیں افراد کو حکومت کے اغراض و مقاصد یعنی مادی ضروریات کی تکمیل، دشمنوں سے دفاع قیامِ امن، نفاذِ عدل اور مظلوموں کے حقوق کی حفاظت جیسے فرائض کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محدود قانون سازی کا حق

حاصل ہوگا۔ نہج البلاغہ کے چالیسویں خطبہ میں حضرت امیرالمومنین علیہ الصلاۃ و والسلام ارشاد فرماتے ہیں:

.... وَ اِنّہ لا بد للناس من امیرٍ برٍّ او فاجرٍ یعمل فی امرتہ المؤمن ، و یستمتع فیھا الکافر و یبلّغ اللہ فیھا الاجل و یجمع بہ الفیء و یقاتل بہ العدو و تأمن بہ السبل و یؤخذ بہ للضعیف من القوی۔

یعنی لوگوں کے لیے صالح یا بدکار کسی نہ کسی حاکم کا ہونا ضروری ہے، جس کے دوران حکومت مومن عمل انجام دیتا ہے۔ کافر دنیاوی فائدے حاصل کرتا ہے ، اللہ اس کی حکومت میں ہر شے کو اس کی آخری حدود تک پہنچا دیتا ہے ، اس کے ذریعہ اموال جمع ہوتے ہیں۔ راستے پر امن ہوتے ہیں اور اس کے ذریعہ طاقتور سے کمزوروں کا حق حاصل کیا جاتا ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے:

الواجب فی حکم اللہ و حکم الاسلام علی المسلمین....

"الا یعملوا عملاً و لا یقدموا یداً و لا رجلاً قبل ان یختاروا لانفسھم اماماً عفیفاً عالماً ورعاً عارفاً بالقضاء والسنّۃ یجبی فیئھم و یقیم حجّھم و جُمعتھم و یجبی صدقاتھم"

یعنی حکومت الٰہیہ اور حکومت اسلامیہ کے مسئلے میں مسلمانوں کا فریضہ ہے کہ.... وہ اس وقت تک کوئی عمل بجا نہ لائیں اور کسی قسم کا کوئی اقدام نہ کریں جب تک اپنے لیے ایک ایسا قائد نہ منتخب کریں کہ جو پاکباز ہو ، عالم ہو، متقی و پرہیزگار ہو، فیصلے کرنے کا شعور رکھتا ہو، سنت سے واقف ہو، اموال

جمع کر سکے، حج اور جمعہ کے فرائض سے متعلق ذمہ داریاں سنبھال سکے اور ان کے صدقات یکجا کرے۔ (الحیاۃ، جلد ۲، ص ۴۲۱)

نیز امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

ذلك ان فی ولایة والی العدل وولاته احیاء کل حق وکل عدل واماتة کل ظلم وجور وفساد فلذلك کان الساعی فی تقویة سلطانه والمعین له علی ولایته ساعیا فی طاعة الله ومقویا لدینه۔

یعنی عادل حکمران اور اس کے کارگذاروں کی حکومت میں حقوق کی حفاظت ہوتی ہے عدل وانصاف پنپتے ہیں، ظلم وجور اور فتنہ وفساد کا خاتمہ ہوتا ہے، یہی سبب ہے کہ ایسے حاکم کی سلطنت کی پائداری کے لیے کوشاں رہنے والے اور اس کی حکومت میں معین ومددگار رہنے والے کی حیثیت اس شخص کی ہوتی ہے جو اطاعت الٰہی کی راہ میں جدوجہد کر رہا ہو اور اس کے دین کی بنیادوں کو مستحکم بنانا چاہتا ہو (الحیاۃ، جلد ۲، ص ۴۲۱ و ۴۲۲)

ان ارشادات کی روشنی میں ایک اسلامی معاشرے کے لیے حاکم کی ضرورت کو بلاقید زمان ومکان تسلیم کرنے اور اس کے لیے تشکیل قوانین کے حق کو مان لینے کے بعد دو نکات اور قابل بحث باقی رہے:

(الف) تشکیل قوانین کا مرحلہ کیسے پایۂ تکمیل تک پہنچنا چاہیے:۔
مطلب یہ ہے کہ احکام الٰہیہ اور قوانین شرعیہ کی موجودگی میں مزید کوئی قانون کیسے وضع کیا جائے۔

(ب) وضع قوانین کے مسئلے میں اجتہاد کی کیا اہمیت اور کیا کردار ہے؟
اس مرحلے میں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ اسلامی معاشرے میں "قانون سازی" کے عمل کو اسلامی اصولوں کی روشنی میں انجام پانا چاہیے۔

اور جب قرآن و حدیث کے ذریعہ حکم الٰہی کو معلوم کر لیا جائے تو پھر مزید کسی قانون بنانے کی گنجائش باقی نہیں رہتی اور اس سلسلے میں اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرنا کفر ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت ۴۴ ہے:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون

یعنی حکم الٰہی سے ہٹ کر جدا گانہ حکم لگانے والے کافروں میں سے ہیں۔

کسی قسم کے قانون کو احکام شریعت مقدسہ سے متصادم نہ ہونا چاہیے، نہ حکم شرعی کی نفی کرنے والا۔ لیکن "احکام شریعت" سے مراد اسلام کے وہ ثابت احکام ہیں جو قابل تغیر نہیں ہیں۔

تعبدیات میں عبادات کے مسائل اور احوال شخصی، ولادت، نسب، نکاح، طلاق، میراث، وصیت اور موت۔۔۔ کے احکام۔ اور اجرائی احکام کا ایک حصہ جیسے حدود، دیات اور قصاص ان مقامات میں کسی قانون کے وضع کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

لیکن ان موارد کے علاوہ دیگر مقامات پر جہاں شریعت نے کوئی خاص قانون وضع نہ کیا ہو، یا پھر اس کا فیصلہ عرف عام یا انسانی عادات اور خاص معاشرتی اصولوں پر چھوڑ دیا ہو۔ جیسے "احکام معاملہ" تجارت اور لین دین یا ایسے مقامات جہاں دوسروں کو اختیار دیا ہو۔ جیسے تعزیرات یا حکومت کے معاملات اور دفتری و انتظامی امور نیز فرائض کی تعیین و تقسیم سے مربوط قواعد و ضوابط۔ غیر ملکی حکومتوں سے تعلقات کے اصول نیز سرحدی قوانین جیسے مراحل میں قانون سازی کی گنجائش ہے اور شریعت کے عمومی اصول و قواعد اور اسلام کے بنیادی اغراض و مقاصد کی نگہداشت کے ساتھ عمومی فلاح و بہبود اور معاشرے کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قانون وضع اور احکام جاری کریں۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کے وہ اصول و ضوابط

جو ناقابلِ ترمیم ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی، جیسے مال، جان، آبرو
دین اور عقل کی حفاظت، عدل و انصاف، دوسروں کی ملکیت کا احترام
نیکیوں پر عمل، برائیوں سے اجتناب، مظلوم کی حمایت، فتنہ و فساد کو دفع
کرنا، مال سے ناجائز استفادہ کا ممنوع ہونا، خبائث کا حرام ہونا، طیبّ
چیزوں کا حلال ہونا، عہد و پیمان کی پابندی، عسر و حرج کی نفی، ضرر وضرار
کا انکار، معاشرتی تعاون اور ہر طرح کے ضرر اور نقصانات سے دور رکھنا
معاشرے میں باہمی کفالت و ضمانت امنِ عامہ کا قیام، نیز ایسے ہی دوسرے وہ
احکام جنھیں اسلام نے انھیں بنیادوں پر استوار کیا ہے انکی حیثیت اسلام
کے قانونِ اساسی کی ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے احکام اسی صورت میں کسی اہمیت
اور قدر و قیمت کے مالک ہو سکتے ہیں جب ان میں آئین اسلام کی نگہداشت
کی گئی ہو۔ اور وہ اس کے معیاروں کے مطابق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری اسلامی
کے "قانون اساسی" کی چوتھی دفعہ ہے:

"شہری، تعزیراتی، مالی، اقتصادی، انتظامی، ثقافتی، دفاعی اور
سیاسی اصول اور دیگر جملہ قواعد وضوابط اور احکام و قوانین کی بنیاد اسلامی
معیاروں پر مرتب کرنا ضروری ہے۔ یہ دفعہ "قانونِ اساسی" کی تمام دفعات اور
دوسرے جملہ قواعد وضوابط پر مطلقاً نافذ ہے۔ اور اس امر کی تشخیص کا ذمہ دار
ادارہ "شورائے عالی نگہبان" ہے۔"

دفعہ ایک سو ستر میں ہے:

"عدالتوں کے ججوں پر فرض ہے کہ وہ ایسے سرکاری قوانین وضوابط
کے نافذ کرنے سے اجتناب کریں جو اسلامی اصول و مسلمات کے خلاف
ہوں۔ یا پھر ان کا نفاذ مجریہ کے بس سے باہر ہو۔ اور اگر ایسے قوانین نافذ
ہوں تو ہر شخص کو حق حاصل ہوگا کہ وہ انتظامیہ سے ان کی منسوخی کا مطالبہ کرے"

یہیں پر قانون سازی کے مسئلے میں اجتہاد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے

اور اس کا کردار کھل کر سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی اس نکتے کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ اسلام کے کچھ احکام وہ ہیں جن میں کوئی ترمیم و تنسیخ ممکن نہیں اور ان پر زمانے اور حالتِ زندگی کی تبدیلی، نیز ماحول اور ثقافتوں کا تغیر و تبدل ہرگز اثر انداز نہیں ہوتا۔ اور چند استثنائی مقامات کے علاوہ اور وہ بھی انتہائی ضرورت کی حالت میں۔ ان کی حدود سے تجاوز کرنا بھی درست نہیں۔ ربا، شراب خواری اور قمار کی حرمت اور وہ مسائل جن کی طرف اوپر اشارہ ہو چکا ہے۔ ان کا شمار ایسے احکام میں ہوتا ہے۔ جہاں قانون سازی کے معنی اللہ سے ٹکر لینے کے ہیں۔ ان احکام کے مقابلے میں کچھ ایسے احکام و قوانین ہیں جو زمان و مکان و احوال کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

اسلام کے جاوداں ہونے اور اس کے مختلف حالات میں قابل نفاذ و انطباق قرار پانے کی اہمیت یہیں واضح ہوتی ہے یہ مسائل و نکات شارع مقدس نے قانون ساز افراد کے حوالے کیے ہیں۔ اور انھیں معاشرتی مصلحتوں کے مطابق یا کلیات بتا دیے ہیں جو قانون سازوں کے لیے رہنما اصول ہیں یا پھر محدود اختیار دیا ہے کہ وہ قانون وضع کریں۔ حدیث ہے:

"انّ اللہ افترض علیکم فرائض فلا تضیّعوھا وَحَدَّ لکم حدودا فلا تعتدوھا ونھاکم عن اشیاء فلا تنتھکوھا وسکت لکم عن اشیاء ولم یَدَع عنھا نسیانًا فلا تتکلّفوھا"

یعنی اللہ نے تم پر کچھ امور فرض کیے ہیں انہیں ترک نہ کرو، اور کچھ حدیں معین کی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو، کچھ باتوں سے تمہیں روکا ہے انکی بے حرمتی نہ کرو اور کچھ امور میں خاموشی اختیار کی ہے اور انہیں سہواً نظر انداز نہیں کیا ہے۔ لہٰذا تم اپنے آپ کو زبردستی مکلف نہ بناؤ۔ (نہج البلاغہ، الحکمۃ ۱۰۵)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام نے قانون ساز افراد کو کچھ جگہوں پر

عمداً آزاد چھوڑ دیا ہے کہ حکام خود مناسب بات طے کریں۔ یہی وہ مقامات ہیں جہاں مصلحتِ وقت اور زمانے کی خصوصیات کبھی آزادی مطلق کی متقضی ہوتی ہیں اور کبھی مکمل پابندی کی اور تیسری شکل میں کبھی بعض حد بندیوں اور خصوصی قیود کا اقتضا کرتی ہیں، کچھ آزادیوں کا۔

تعزیرات جیسے وسیع دائرۂ کار کا حاکم پر چھوڑنا اور اسے سزا کی کیفیت حالت اور مقدار کے تعین کا حق دینا، حکومتِ اسلامی میں قانون سازی کے لیے دوسرا میدان ہے۔ اس زاویے میں قاضی، اسلامی عدالت کا جج، یا خود حکومت دونوں برابر ہیں۔ کیونکہ اگر یہ حق قاضی ہی کو ہے تو وہ حکم تیار کرے گا اور۔ بنا بر تحقیق۔ حکومت اس کے تجویز کردہ بعض تعزیرات کو دوسرے قاضیوں تک پہنچا سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کی صلاح ہو۔ یہ قانون اس معاملے میں نافذ بھی ہوگا۔ جیسا کہ فقہا نے تصریح و تفصیل لکھی ہے کہ اس کے فتوے ان معیاروں پر پورے اترتے بھی ہیں یا نہیں۔ یہ بات ہمیں "قانون اساسی" کی دفعہ ۹۱ میں نظر آئے گی:

"شورائے عالیِ نگہبان" کے نام سے ایک کمیٹی تشکیل پائے گی جس کا مقصد یہ ہوگا کہ وہ اسلامی پارلیمنٹ میں پاس ہونے والے قوانین کو اسلام کے بنیادی اصول و ضوابط پر منطبق کرے۔ اس کی تشکیل درج ذیل عنوان سے ہوگی:

۱۔ عادل فقہا کے چھ ایسے ارکان جو عصری تقاضوں اور وقت کے مسائل سے مکمل طور پر آشنا ہوں۔ جنھیں منتخب کرنے کا حق قائد یا مجلس رہبری کو ہوگا۔

۲۔ امت مسلمہ کے چھ ایسے ارکان جو قانون کے مختلف شعبوں میں ماہر ہوں جن کے نام "شورائے عالی قضا" پیش کرے گی اور اسلامی پارلیمنٹ انھیں پاس کرے گی۔"

اور آخر میں چند نکات پر توجہ ضروری ہے:

۱۔ بعض افراد کا نظریہ ہے کہ حق قانون سازی محض اللہ سے مخصوص ہے اور یہ حق اس کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں۔ جن انبیا کو اللہ نے حقوق دیے ہیں وہ بھی قانون نہیں بنا سکتے۔ سنن انبیا کو وہ اللہ کے قانون کے اجراء و نفاذ کی ایک صورت مانتے ہیں۔ یہ نظریہ کسی بحث کے بغیر قابل قبول ہو سکتا ہے اور یہ مان سکتے ہیں کہ انبیا کی سنتیں اور اسی ضمن میں صاحبان امر کی جانب سے وضع کیے جانے والے قوانین ایسے ہی ہیں جیسے "آئین نامے" اور منظور شدہ اجرائی قانون۔ اگرچہ سنن کی تشبیہ، روزمرہ قوانین سے اور قانون وحی کی تشبیہ "آئین" سے دیں تو زیادہ قابل قبول ہوگی۔ اگرچہ کبھی کبھی قانون وحی۔ آئین ۔ میں اندرونی و داخلی قانون کی شکل نظر آتی ہے۔

۲۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے میں ائمہ طاہرین علیہم السلام کے اختیارات کا دائرہ تشکیل قوانین کم ہے۔ کیونکہ ائمہ کے لئے سنت رسول کا اجرا لازم تھا، نیز جہاں نص ہوتی وہاں کبھی بھی اجتہاد نہیں فرماتے بلکہ سنت سے حدیث کے اختلاف کو کذب حدیث کی دلیل مانتے تھے۔ البتہ عین اسی حالت میں بعض ایسی بھی سنتیں تھیں جن میں تبدیلی ممکن تھی۔ یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے۔

۳۔ مجتہد کے فتوے اور قانون میں فرق ہے۔ فتوی وہ ہے جو مسائل فقہیہ میں استنباط کے نتیجہ کے طور پر سامنے آتا ہے، فقہی مآخذ یعنی قرآن، سنت، عقل اور اجماع (جس کی بازگشت سنت ہی کی جانب ہے) تحقیق اور دلائل کی چھان بین پر اس کا دارومدار ہوتا ہے، فقیہ جب اپنی تحقیق کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے تو اعلان کرتا ہے کہ فلاں مسئلے میں شریعت کا یہ حکم ہے یہ مسئلہ خواہ عبادات سے تعلق رکھتا ہو یا سیاسی، دفاعی، اقتصادی اور سماجی امور سے یا احوال شخصیہ جیسے مسائل سے متعلق ہو۔ اب اگر حکومت چاہے تو فقیہ کے اسی فتوی کو قانون کے عنوان سے نافذ کر دے۔

قانون وہ ہے جو عصری ضرورتوں کو محسوس کرنے اور عوامی مصالح کی تشخیص کے بعد اور اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں ضرورتوں کے پیش نظر سیاسی حکام اور شخصیات کی جانب سے وضع کیا جاتا ہے۔ اقتدار حکومت کی بنیاد پر اسے اہمیت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ حکومت اسلامی میں سرکاری طاقت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہوتی ہے۔ اس لیے وہ قانون قابل عمل قرار پاتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ فتوی وہ ہے جو حکم الہی سے باخبر کرتا ہے۔ اور قانون وہ ہے جس میں انشاء، اور نفاذ کا پہلو پایا جاتا ہے۔

۴۔ حکومت اور فتووں کا اختلاف : اسلامی حکومت ہو یا کوئی اور حکومت۔ اس کے ضروریات میں ہے کہ پورے معاشرے پر ایک ہی قانون نافذ کرے۔ قوانین کا اختلاف، حکومت کی گرفت کمزور کرتا اور سلسلہ طوائف الملوکی پر ختم ہوتا ہے۔

جہاں تک فتووں کے اختلاف کا سوال ہے تو انفرادی امور میں اس سے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اب رہے اجتماعی اور عمومی مسائل جن میں بالعموم قانون نافذ ہوتا ہے اور اس کی پابندی کے مسئلے میں تمام شہری برابر ہوتے ہیں تو اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہر گروہ کو ایک علیحدہ فتوے کے مطابق عمل کرنا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت تباہ ہو جائے اور حکومت کے ہاتھوں میں عنان مملکت ڈھیلی پڑ جائے کیونکہ قانون نافذ کرنے والے ادارے سوچیں گے کہ کیا کریں کیا نہ کریں اور عدلیہ معطل ہو کر رہ جائے گی۔

ایسے عالم میں حکومت یعنی قانون ساز مشینری کے لیے (اس کے علاوہ) کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ ان فتووں میں سے ایسے فتاوی کو منتخب کرے جو سب سے زیادہ فقہی استحکام کے حامل ہوں اور معاشرے کی تمام مصالح کے ساتھ ہم آہنگ ہوں اور جب حکومت انہیں عمومی قانون کی شکل میں پیش کرے تو پھر اس کی پابندی ہر فرد پر ضروری قرار پائے۔ کیونکہ صاحب امر کی پیروی

حکم ہے اور نظم و نسق کی حفاظت ایک "ضرورت" ہے ۔

چوں کہ قانون میں اسلامی معیاروں سے مخالفت نہ ہونے سے زیادہ کوئی شرط نہیں ۔ اور اس زاویے کی حفاظت کے لیے ایک فیر نادر، معتبر فتوے کا وجود کافی ہے ۔ اس کے بعد قانون پر کوئی اشکال شرعی واقع نہیں ہو سکتا۔

اب رہا فتوی کے اعتبار سے بھی اس کی مطابقت کا سوال تو اس سلسلے میں جہاں تک میں واقف ہوں، مرحوم سید اسماعیل صدرؒ جو بلا شک و شبہ فقیہ تھے انہوں نے" التشریع الجنائی فی الاسلام" پر اپنے حواشی میں بڑا زور دیا ہے اور بڑی صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔

اس نکتے پر مزید زور دیا جانا ضروری ہے کہ اس طرح کے متعدد فتووں پر عمل کسی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا ۔ کون حکومت برداشت کرے گی کہ کسی ایسے طبقہ کو برداشت کرے جو، فرائض منصبی، یا مال گذاری ۔ یا کاغذ اور رجسٹری کی فیس، یا قانون معاملات یا . . . کو مسترد کر دے ۔ اور اس سلسلے میں اپنے مجتہد کے فتوی کو دلیل کے طور پر پیش کرے ۔ خاص کر ایسا مجتہد کج سلیقہ جو، ہر نئے وقوعہ کو بدعت سمجھے ۔ مثلاً سمگلنگ کے جواز میں "الناس مسلطون علی اموالہم" (یعنی لوگوں کو اپنے اموال پر حق تصرف حاصل ہے) کو دلیل قرار دیتا ہو ۔ حکومت کے لیے ملکیت کا قائل نہ ہو اس کی نظر میں کسی فرد کو بھی قانون سازی کا حق حاصل ہو، یہاں تک کہ وہ حکومت کو غیر قانونی اور طاغوتی حکومت قرار دیتا ہو ۔ کیونکہ وہ اس کے افکار و نظریات سے ہم آہنگی نہیں رکھتی ۔ نتیجے کے طور پر وہ حکومت کے خلاف وہی اقدامات شروع کر دے جو معدوم شاہ ایران کے خلاف ہوا کرتے تھے ۔

(ج) ، قومیت اور شہریت : وطن اور وطنیت کسی ایک فرد اور حکومت یا کسی شے اور مملکت کے درمیان پائے جانے والے ایک قسم کے سیاسی ربط کا نام ہے ۔ جس سے ایک دوسرے کے حقوق اور فرائض جنم لیتے ہیں ۔

قومیت — بین الاقوامی طور پر حقوق میں شمار ہوتی ہے۔ اور اسے عام طور پر ممالک کے شہری آئین و قوانین کے ضمن میں درج کیا جاتا ہے۔ ایران کے "قانون مدنی" میں بھی فرانسیسی قانون کے مطابق اندراجات ہیں اور "قانون مدنی" کی دفعات از ۹۷۶ تا دفعہ ۹۹۱ اسی حق کے قوانین کے لیے مختص ہیں۔ جن کا غیر ملکی افراد سے کوئی تعلق نہیں۔ قومیت اور وطنیت کی بنیاد عام طور پر سرزمین یا خون یعنی جائے پیدائش اور والدین کو قرار دیا جاتا ہے۔ شادی کو بھی حصول قومیت کا ذریعہ فرض کیا گیا ہے۔ قانونِ مدنی نے زمین اور خون دونوں کو خاص خاص صورتوں میں قبول کیا ہے۔ قومیت کا مسئلہ ان مسائل میں ہے جسے حکومتوں نے ملک پر کنٹرول نیز سرحدوں کی حفاظت اور بین الاقوامی تعلقات کی وجہ سے تسلیم کیا ہے۔

اسلام میں اس طرح کی شہریت اور وطنیت کے تصور کا کوئی وجود نہیں، ہم نے بھی مصلحتوں اور ضرورتوں کے پیش نظر اسے تسلیم کیا ہے۔ یہ مسئلہ بھی ایسے مسائل میں سے ہے جہاں اسلامی حکومت کے قانون ساز ادارے کو اسلام کے بنیادی اصولوں کی مراعات کے ساتھ امت مسلمہ کی مصلحتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قانونی شکل دینے کا حق حاصل ہے اور ان کی پابندی صاحبانِ امر کی اطاعت واجب ہونے کے باعث ہر ایک کے لیے ضروری ہے۔

اسلام، ایک عالمی مذہب ہے جو کسی ملک، قوم، قبیلہ، اور گروہ سے مخصوص نہیں۔ پوری زمین اللہ کی ملکیت ہے اور تمام انسان اللہ کے بندے ہیں۔ اسلامی قوانین کو پورے خطۂ ارضی پر یکساں نافذ ہونا چاہیے، نیز اسلام کا خطاب تنہا مسلمانوں سے نہیں ہے بلکہ ہر فرد بشر سے ہے چاہے وہ کسی اسلامی سرزمین پر ہو یا کہیں اور ہو، لیکن اسلام کا عملی نظام صرف حکومت اسلامی ہی کے دائرۂ کار میں نافذ ہو سکتا ہے۔

اسلام میں ایک مسئلہ ہے۔ دار الاسلام۔ اور — دار الکفر۔ بالخصوص۔ دار الحرب۔

دارالاسلام اس خطۂ ارض کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت کے زیرنگین ہو اور مسلمانوں کو اس میں تمام اسلامی رسوم کی بجاآوری کے سلسلے میں مکمل آزادی حاصل ہو۔

"دارالکفر" اس خطۂ ارضی کا نام ہے جہاں کفار کا غلبہ و تسلط ہو اور وہاں مسلمانوں کو اسلامی فرائض کی انجام دہی اور اسلامی قوانین کو عملی جامہ پہنانے کی آزادی حاصل نہ ہو۔ اور جب یہی "دارالکفر" مسلمانوں سے جنگ آزما ہو تو اسے "دارالحرب" کے نام سے یاد کیا جائے گا اور جب اس کا مسلمانوں سے کوئی عہد و پیمان ہو جائے تو اسے "دارالذمہ" اور "دارالامان" کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

"دارالاسلام" کے بجائے خود کچھ احکام ہیں جیسے "دارالاسلام" میں مشکوک الحال افراد کو مسلمان تصور کیا جائے گا۔ ان کے ہاتھ کا ذبیحہ حلال ہوگا۔ اور ایسے ہی دوسرے بہت سے احکام، برخلاف "دارالکفر" کے کہ وہاں مشکوک الحال فرد کو کافر کے حکم میں قرار دیا جائے گا اور ان کے ذبیحے حرام ہوں گے (ان مسائل کی تفصیل کے لئے فقہی کتب سے رجوع کیا جائے)

مسلمان خواہ وہ زمین کے کسی بھی خطے میں ہو اس کی قومیت اسلام ہوگی، اسے وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو دیگر مسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں نیز اس کی وہ تمام ذمہ داریاں ہونگی جو دوسرے مسلمانوں کی ہوتی ہیں۔ چاہے وہ ماسکو (روس) کا باشندہ ہو یا چین اور امریکہ کا یا کسی اور جگہ کا رہنے والا۔ اور ظاہر سی بات ہے کہ اگر وہ کسی "دارالکفر" میں ہو جہاں اسلامی فرائض کی انجام دہی اس کے لئے ممکن نہ ہو اور وہاں سے ہجرت اس کے امکان میں ہو تو پھر اس پر ہجرت واجب ہو جائے گی اور جس طرح اسے بلا تفریق یہ رعایتیں حاصل ہوں گی اسی طرح حدود اور تعزیرات کے اجراء کے مسئلہ میں بھی وہ دوسروں کے برابر ہوگا یعنی "دارالاسلام" میں رہنے والے مجرم اور "دارالکفر" میں زندگی بسر کرنے والے مجرم کے درمیان کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہوگا۔ غیر مسلم افراد تو مسلمان جیسی رعایات اور امتیازات سے بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے اگرچہ عام اسلامی

احکام و قوانین کی پابندی ان پر لازم ہوگی۔

کافر کو ہر حال میں اجنبی تصور کیا جائے گا۔ وہ اسلامی ممالک کا رہنے والا ہو یا غیر اسلامی ممالک کا باشندہ۔ اب اگر وہ کافر ذمی ہوا اور شرائط ذمہ کا پابند رہا تو اسے بہت سی رعایتیں حاصل ہوں گی اور اس کے مال، جان اور آبرو کو لائق احترام تصور کیا جائے گا۔ اور اسے عائد کی گئی پابندیوں کے مقابلے میں کچھ آزادیاں بھی حاصل ہوں گی (جنہیں کتب فقہ میں بیان کر دیا گیا ہے) نیز وہ حکومت اسلامی کی حفاظت میں ہوگا۔ لیکن اگر شرائط ذمہ کو منظور نہ کیا یا منظور کرنے کے بعد اس سے منحرف ہوگیا تو پھر اسے "محارب" (یعنی کافر حربی) شمار کیا جائے گا۔

اسی صورت میں کافر حربی کبھی امان کا خواہاں ہو تو اسے حکومت اسلامی امان بھی دے گی اور اس امان کی مدت عارضی ہوگی۔ حکومت اسلامی کی امان میں آنے کے بعد وہ مسلمانوں کی حفاظت میں ہوگا اور کسی کو اس سے تعارض کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

لیکن اگر وہ مسلمانوں کا دشمن ہو نیز اس کے اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کا معاہدہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے جان و مال دونوں بالکل حلال ہوں گے اور ذرا بھی احترام کے لائق نہ ہوگا۔

حدود اور تعزیرات کے مسئلے میں تحقیق کے مطابق غیر مسلم مجرمین کا حال مسلمان مجرموں کے مانند ہوگا۔ صرف کافر ذمی کا حکم الگ ہوگا۔ وہ بھی ان جرائم کے سلسلے میں جہاں اس کی شریعت میں کوئی جواز موجود ہو۔

خلاصۂ بحث یہ کہ قومیت اور شہریت کی بنیاد اسلام میں محض عقیدہ سے اور عقیدہ کے علاوہ اس کی کوئی حد بندی نہیں، ہر شخص کو اپنے عقیدے کے مطابق اپنی مرضی سے جغرافیائی قومیت اور شہریت کے انتخاب کا حق حاصل ہے یہاں تک کہ شوہر بیوی بھی اس سلسلے میں ایک دوسرے کے تابع نہیں ہیں۔ البتہ اولاد بلوغ سے پہلے والدین کی تابع ضرور ہوگی۔ اگر والدین کافر ہوں گے

تو بچہ بھی کافر شمار کیا جائے گا اور اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مسلمان ہو تو پھر بچہ مسلمان سمجھا جائے گا۔

حواشی

۱۔ یہ نکتہ یاد دلانا ضروری ہے کہ غیر معصوم کی ولایت قبول کرنا، قانونِ ضرورت کے مطابق ایک تنزّل ہے۔ دراصل خلیفۃ اللہ کے طور پر حکومت صرف امامِ معصوم کا حق و منصب ہے۔ اسی کا حکم بلا چون و چرا حکمِ خدا ہے۔ لیکن ان کی غیر موجودگی میں، فتنہ و فساد وخلل کو روکنے کے لیے بہر حال ایک حاکم کا چننا ضروری ہے۔ اس کے شرائط و اوصاف درج ہو چکے۔ اب جیسے جیسے فرد جامع اوصاف کمیاب ہوتا جائے گا اتنا ہی تنزل اختیار کرنا پڑے گا۔ انتخابِ حاکم کی بحث بھی تفصیل طلب ہے، جو اس مقالے کے حدود سے باہر ہے۔

۲۔ شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "قواعد" میں لکھا ہے:
ماجعل علیکم فی الدین من حرج (تمہارے اوپر دین میں کوئی سختی نہیں ہے) یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر (اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور دشواری نہیں چاہتا)، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد: بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ السہلۃ (میں دینِ حنیفِ سہل و آسان کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہوں)۔ اور آپؐ کا فرمان، لاضرر ولاضرار (نقصان و ضرر مطلوب نہیں) ایسے اصول ہیں جن کے تحت بہت سی شرعی "رخصتیں" آجاتی ہیں۔
یہ بھی واضح ہے کہ اس بات میں اس اصول سے کوئی مخالفت نہیں ہوتی

کہ "حلالِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دائمی طور پر قیامت تک کے لیے حلال اور حرام محمدؐ دائمی طور پر قیامت تک حرام ہی ہے۔" یا حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ۔"جو شخص بھی بدعت کرتا ہے وہ اس کی بدولت ایک سنت کو ترک کرتا ہے (الوافی ۱: ۵۹ و ۶۰) کہ یہ کلیات نفیِ بدعات کے لیے ہیں نہ کہ اثبات احکام و تبدیلی قبول کرنے کے بارے میں ۔

۳۔ فقیہ کے نفسیات پر ماحول کا اثر ناگزیر ہے ۔ حوادثِ زمانہ، جنگ، صلح، قحط، خوشحالی، حکومتوں کا عدل و جور، گھریلو تربیت، استادوں اور مربیوں کے اثرات، زندگی میں کامیابی و ناکامی، جیسے متعدد معاملات ہیں جو کسی نہ کسی طرح استنباطِ احکام پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔

ایک فقیہ، جو عرب کے ریگزار میں پلا بڑھا ہو وہ مازندران کے فقیہ سے نجاست و طہارت میں ایک تاثر کے ساتھ نہیں سوچتا۔ خشک، قحط زدہ صحرا کا فقیہ، خوش حال ماحول کے فقیہ کی طرح "اسراف" کے بارے میں ایک طرح کی تشریح و تطبیق نہیں کر سکتا ۔ دونوں کے نزدیک استطاعت حج کی ایک ہی تعبیر نہیں ہوگی ۔ تاجاری دور کے مجتہد اور عہدِ انقلاب کے مجتہد مسائل جہاد، امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں وحدتِ نظر کم رکھتے ہیں ۔

افسوس ہے کہ اس نکتہ پر یا تو بہت کم توجہ دی گئی ہے یا اسے معمولی نظر سے دیکھا گیا ہے ۔ بہت سے فتوؤں میں تجدید نظر کرنا اور خود کو اس کا حقدار جاننا کہ گذشتہ استنباط کا نئے سرے سے جائزہ لیں، اور اگر قابلِ تردید ہو تو نیا فتویٰ جاری کریں، محتاج توجہ ہے ۔

بہر حال، زندہ اجتہاد کی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت و سبب یہی ہے جو بیان ہوا، ہر صدی میں یہ ضرورت رہی ہے ۔ یعنی شرائط و حالات کی تبدیلی سے استنباطِ احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے ۔ آج کا فقیہ، ممکن ہے انھیں مصادرِ شریعت سے آج وہ بات سمجھ سکے جو

کل نہیں سمجھی جا سکتی تھی ۔ نتیجے میں فقہ میں حرکت پیدا ہو گی اور آج مسائل کی بہتر انداز میں جواب دہی ہو سکے گی ۔ یہ بھی واضح اور حقیقت ہے کہ ماحول کا اثر کسی طرح سے حجیت فتویٰ پر اثر نہیں ڈالتا ۔ ورنہ کوئی بات معتبر نہ ٹھہرے گی ۔ ماحول کا ایک مطالبہ ضرور ہوتا ہے اور وہ یہ احساس ہے کہ ہر زمانے میں مسائل کی تحقیق کی جائے اور دوسرے حضرات کی رائے میں تجدید نظر کی جرأت ہو۔

●

شہید مطہری
ترجمہ :۔ جناب سید مرتضیٰ حسین

خاندان اور معاشرے میں حقوق خواتین کا مسئلہ

ہمارے عہد کے تقاضے، بہت سے مسائل پر دوبارہ نظر کرنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ یہ مسائل پرانی قدروں کے بجائے نئی قدروں کے طلب گار ہیں۔ ان بہت سے مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے :

خاندانی ذمہ داریاں اور نظامِ حقوق خواتین

آج فرض کیا جاچکا ہے کہ موجودہ ماحول میں اصل موضوع ہے۔ آزادیِ نسواں اور "قانونی مساوات مرد و زن"۔ باقی مسائل انہیں دونوں کے ضمنی مسائل ہیں۔ اس پر زور دینے کی وجہ اور اس کے اسباب و علل پر گفتگو آگے ہو گی۔

"عائلی قوانین" اور نظامِ حقوق کے ضمن میں ہمارے نقطۂ نظر سے اصل بنیادی ۔ یا بنیادی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ ہے کہ آیا "عائلی نظام" مختلف معاشرتی نظاموں سے کوئی جداگانہ نظام ہے ؟ یا اس کی منطق یا اس کا معیار دوسری منطقوں اور معیاروں

سے کسی خصوصیت کی بنا پر خاص اہمیت رکھتا ہے؟ وہ عقلی دلائل جو معاشرے کے بہت اداروں میں کام آتے ہیں، ان کی حیثیت بدل جاتی ہے؟ یا اس معاشرتی گروپ میں دوسرے گروپوں سے کوئی اختلاف نہیں ہے؟ اس یونٹ میں وہی منطق اور وہی معیار کام آتے ہیں جو دوسرے معاشرتی اداروں (یونٹوں) میں بروئے کار ہیں؟

اس پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کے ادارے "دورکنی" "دو جنسی" ہیں۔ دوسری طرف والدین اور اولاد کا نسلی تسلسل ہے۔ کارخانۂ قدرت نے اس یونٹ کی وضع "باہمی مشابہت کے فقدان" اور "عدمِ یکسانیت" پر رکھی ہے۔ ان دونوں کے کیفیات میں اختلاف موجود ہے۔

خاندانی معاشرہ "طبیعی ۔ باہمی مفاہمت" کا معاشرہ ہے۔ اور دو معاشرتی یونٹوں کی درمیانی کڑی ہے۔ جیسے شہد کی مکھی "مماکھی" اور "چیونٹی" جن کے تمام قانون قاعدے طبیعت وجبلت کی جہت سے معین ہیں۔ ان سے سرتابی ممکن نہیں۔ اور ایک مفاہمتی معاشرتی یونٹ جیسے انسانی مدنی معاشرہ کہ اس میں طبیعی وجبلی پہلو کا دخل کم ہے سب جانتے ہیں ۔ ماضی بعید کے فلاسفہ، خاندانی فلسفۂ حیات کو "حکمت عملی" کا ایک مستقل باب مانتے تھے۔ افلاطون نے "رسالۂ جمہوریت" اور ارسطو نے کتاب "سیاست" اور بوعلی سینا نے کتاب "الشفا" میں موضوع کو اسی زاویے سے دیکھا ہے۔

معاشرے اور "حقوق زن" پر گفتگو میں بھی طبعی طور پر یہ بحث ہے کہ طبیعی و انسانی جہت سے مرد و زن کے حقوق یکساں وہم آہنگ ہیں؟ یا ایک دوسرے سے الگ الگ اور ہم آہنگی سے دور ہیں؟ یعنی، خلقت و فطرت نے جو حقوق انسان کو عطا کیے ہیں؟ وہ خلقتاً یک جنسی ہیں یا دو جنسی؟ آیا حقوق و فرائض معاشرہ میں "مردانگی" اور "نسوانیت" کا عمل دخل ہے؟ یا تکوین و تخلیق کی منطق میں دونوں طبیعی زاویے سے ایک جنس ہیں؟

مغربی دنیا نے سترھویں صدی عیسوی کے بعد علمی و فلسفی تحریکیں شروع کیں جس کے نتیجے میں "حقوق بشر" کے نام سے معاشرتی میدان میں بھی ایک تحریک

نے جنم لیا۔ سترھویں، اٹھارویں صدی میں مفکروں اور ادیبوں نے اپنا فکری اثاثہ عوام میں تقسیم کر کے انسان کے ناقابل سلب و انتقال فطری حقوق کی بحث عام کر دی اور قابل تعریف محنت کی۔

جان جوک روسو ۔ والٹیر ۔ مان ٹسکو ۔ اسی گروپ کے مفکر و ادیب تھے۔ ان لوگوں کا انسانی معاشرے کی تعلیم و تربیت بر حق بھی ہے۔ یہ دعویٰ کرنا بے جا نہیں کہ انسانی معاشرے پر ان کا حق اسی قسم کا ہے جیسا اور جتنا ان لوگوں کا ہے جنہوں نے دنیا میں اہم ایجادات و انکشافات کیے ہیں۔

ان لوگوں کا مرکز خیال یہ نکتہ بن گیا کہ انسان فطرتاً، اور خلقت و طبیعت کی بنیاد پر کچھ حقوق اور کچھ آزادیاں لے کر آیا ہے یہ آزادیاں اور یہ حقوق کوئی فرد یا جماعت یا قوم نہ چھین سکتی ہے نہ یہ شخص خود کسی کو دے سکتا ہے۔ تمام انسان: حاکم و محکوم سفید و سیاہ، سرمایہ دار و غریب، سب کی آزادی اور حقوق انسانی "مساوی" ہیں۔

یہ فکری و معاشرتی تحریک ابھری اور اس کے نتائج پہلے انگلستان پھر امریکہ، اس کے بعد فرانس میں انقلاب کی صورت میں برآمد ہوئے۔ انقلاب آئے، نظام بدلے بالشویک منشور تیار ہوا، اور دوسرے فکری راستے پر اس کا اثر پڑنے لگا۔

انسانی حقوق کے فلسفے نے انیسویں صدی میں کچھ نئے فکری زاویے پیدا کیے ان کا تعلق اقتصادی، اجتماعی اور سیاسی مسائل سے تھا، ان افکار نے حالات میں مزید تبدیلی پیدا کی جس کی ایک شکل ہے، سوشلزم ۔ مزدور طبقہ کا نفع پر استحقاق سرمایہ داروں سے مزدوروں کے حامیوں کو حکومت کا انتقال ۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں "انسانی حقوق" پر جو بحث یا عملی اقدامات ہوئے تھے ۔ ان میں سے اکثر، حکومت کے مقابلے میں قوم یا مالک و کارخانہ دار کے مقابلے میں محنت کش طبقے سے مربوط تھی۔ بیسویں صدی میں "مردوں کے حقوق" اور ان کے مقابلے میں "عورتوں کے حقوق" کا مسئلہ اٹھا۔ ۱۹۴۸ء میں جنگ عظیم دوم کے بعد جب "ادارۂ اقوام متحدہ" قائم ہوا تو اس نے مساوات حقوق

مردوزن کا کھلا منشور شایع کر دیا۔

یورپ کے تمام معاشرتی انقلابوں میں سترھویں صدی سے موجودہ صدی تک اصلی محور دو تھے؛

آزادی — مساوات — اور بس بات اس سے آگے نہیں بڑھی۔

انقلابی رہنماؤں نے یہ طے کر لیا کہ آزادیِ نسواں اور اس کے حقوق کی مردوں سے یکسانیت، جس کا چرچا سترھویں صدی سے شروع ہوا تھا اسی نکتہ پر ختم ہو گیا۔ انھوں نے کہا جب تک عورت کی آزادی اور اس کے حقوق مرد کے برابر نہیں مانے جاتے — آزادی اور حقوق انسانی — پر بحث بے معنی ہے۔ تمام خاندانی مشکلات صرف اس لیئے ہیں کہ عورت نہ آزاد ہے نہ اس کے حقوق مرد کے حقوق کے برابر ہیں۔ اس پہلو کو روشن کر دیا جائے خاندانی مشکلات حل ہو جائیں گے۔

اس تحریک میں جب ہم کہتے ہیں" نظام حقوق خاندان کا بنیادی مسئلہ۔" تو اس کا مطلب ہے۔ آیا فطری طور پر یہ نظام کوئی مستقل نظام ہے؟ کیا اس کی منطق اور اس کے معیار دوسرے سماجی اداروں سے جدا ہیں؟ یہ سوال فکر فلاسفہ سے دور رہے۔ فکر و نظر کا رخ ایک طرف زیادہ ہے "اصل آزادی" اور "اصل مساواتِ" زن و مرد۔

دوسری لفظوں میں: حقوقِ نسواں کے موضوع بحث کا زاویہ یہ کلیہ رہا۔" طبیعی و فطری حقوق جو چھینے نہیں جا سکتے۔" اسی مرکز پر سارے دائرے بنتے رہے انسانیت میں عورت مرد کی شریک ہے۔ عورت ایک مکمل اور معیاری انسان ہے اس لیے اسے مرد کی طرح ان حقوق سے بہرہ در ہونا چاہیے جو" فطرت نے انسان کو دیے ہیں اور چھینے نہیں جا سکتے۔"

" طبیعی حقوق" کی دریافت کن مصادر سے ہوتی ہے؟ ہم نے اس کتاب کے ابواب و فصول میں نسبتاً کافی و مکتفی بحث کی ہے۔ ہم نے ثابت کیا کہ خود طبیعت "طبیعی و فطری حقوق" کا سرچشمہ و ماخذ ہے۔ یعنی اگر انسان کو ایسے حقوق حاصل ہیں جو گھوڑے اور بکری یا مرغ و ماہی کو حاصل نہیں تو اس کی تہہ میں طبیعت و

خلقت کا ہاتھ ہے۔ اور اگر تمام آدم زاد "طبیعی حقوق" میں مساوی ہیں اور سب کو آزاد زندگی حاصل ہے تو یہ فرمان متنِ خلقت سے صادر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری دلیل موجود نہیں ہے۔ مساوات و آزادی کو فطری حق ماننے والے دانشوروں کے پاس بھی صرف یہی دلیل ہے۔ نظام خاندان کے بنیادی مسئلہ میں بھی "طبیعت" کے علاوہ کوئی ماخذ و مصدر نہیں۔

"نظام حقوق خاندان" میں ہم جسے بنیادی مسئلہ مانتے ہیں، اس پر مفکرین کی توجہ نہ ہونے کا سبب کیا ہے؟ آیا موجودہ علوم نے ثابت کر دیا ہے کہ زن و مرد کا اختلاف چند اعضا کا معمولی سا اختلاف ہے، اس سے جسمانی ڈھانچے اور ان نفسیات میں کوئی فرق نہیں پڑتا جن سے حقوق کا تعلق ہے؟ اور اس سے ذمہ داریاں قبول کرنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ موجودہ معاشرتی فلسفے میں اسی وجہ سے کوئی نیا گوشوارۂ حساب نہیں کھلتا؟

اتفاقاً معاملہ برعکس ہے۔ حیاتیاتی و نفسیاتی علوم کی ترقی نے جو انکشافات کیے ہیں ان سے دونوں جنسوں کے فرق نمایاں اور بہت زیادہ روشن ہوئے ہیں ماہرین حیاتیات، فیزیالوجی، اور سائیکالوجی جاننے والوں کے تحقیقات کا حوالہ آگے دیا جائے گا۔ حیرت ہے کہ ان باتوں کے باوجود ایک بنیادی مسئلہ زینتِ طاقِ نسیاں کر دیا گیا۔

اس غفلت و بے توجہی کا شاید یہ سبب ہو کہ تحریک تیزی سے ابھری لہٰذا جہاں اس نے عورتوں کی بہت سی بدبختیوں کو دور کیا وہاں کچھ مجبوریاں اور بدنصیبیاں اس کو تحفہ میں دیں اور انسانی معاشرے کو بھی اس لپیٹ میں لے لیا۔ آئندہ ابواب میں ملاحظہ کیجئے گا کہ یورپ کی عورت، بیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک معمولی اور روزمرہ کے حقوق سے بھی محروم تھی۔ اسی زمانے میں اہل مغرب کو تلافیِ مافات کا خیال آیا۔

مساوات و آزادی کے نام سے متعدد تحریکیں وجود میں آچکی تھیں انھیں

میں مسئلہ زیر بحث بھی تھا۔ "آزادی و مساوات" دو لفظوں سے معجزہ آفرینی کی امید لگانے والے سب مسائل انھیں سے حل کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بھول گئے کہ مساوات و آزادی کا رشتہ خود "انسان کے بحیثیت انسان" کے زاویے سے پیدا ہونے والے تعلقات کا پابند ہے ۔ منطقی زبان میں ۔ "مساوات و آزادی انسانی حق ہے اس حیثیت سے کہ وہ انسان ہے" ۔ عورت چونکہ ایک حیثیت سے انسان ہے، لہذا ہر انسان کی طرح آزاد پیدا ہوئی ہے اور مساوی حقوق کی مالک ہے ۔ لیکن عورت چند مخصوص کیفیات کی حامل انسان ہے ۔ اور مرد دوسرے کیفیات کا حامل انسان ہے ۔ عورت و مرد انسانیت میں "برابر" ہیں، لیکن یہ دو طرح کے انسان ہیں ۔ ان کی خصلتیں دو الگ الگ طرح کی ہیں ۔ ان کے نفسیات دو قسم کے ہیں اور یہ دوئی جغرافیائی، تاریخی یا معاشرتی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کی اساس عین تخلیق کے اندر رکھی گئی ہے ۔ اس دوئی سے طبیعت کا ایک مقصد وابستہ ہے اور جو عمل طبیعت و فطرت کے خلاف ہوگا اس کے عوارض ناپسندیدہ رونما ہوں گے ۔ جس طرح ہم نے آزادی اور انسانوں میں مساوات ۔ ان میں سے عورت مرد کا مسئلہ ۔ طبیعت کے سرچشمے سے حاصل کیا ہے ۔ اسی طرح کیفیتوں کی اکائی یا دوئی میں عورت مرد کے حقوق کا سبق حاصل کرنا ہوگا ۔ یونہی خاندانی معاشرہ ۔ کم از کم ایک نیم طبعی چیز ہے یا نہیں ؟ اس کا جواب بھی طبیعت و فطرت سے لینا چاہیے ۔ کم از کم یہ مسئلہ بھی قابل بحث ہے کہ حیوانات کی "دو جنسی" جن میں سے ایک جنس انسان ہے ۔ اتفاقی عمل ہے یا تخلیقی منصوبے کا حصہ ہے ؟ آیا دونو جنسوں کا اختلاف سادہ عضوی اختلاف ہے یا بقول الکسیس کارل انسانی جسم کے ہر خلیے میں اس کی جنسیت کے علامات موجود ہیں ؟ کیا منطق و زبان فطرت میں مرد و زن دونوں کے الگ الگ فرائض ہیں یا نہیں ؟ کیا حقوق و قانون بھی یک جنسی ہیں یا دو جنسی ؟ اخلاق و تربیت دو جنسی ہے یا ایک جنسی ؟ سزاؤں کے بارے میں کیا رویہ ہے ؟ اور ذمہ داریوں اور فرائض کی صورت کیا ہے ۔

اس تحریک میں یہ نکتہ نظر انداز ہو گیا کہ مساوات و آزادی کے علاوہ بھی کچھ

مسائل ہیں۔ مساوات و آزادی ایک لازمی شرط ضرور ہے مگر فقط یہی کافی نہیں۔ قانون و حقوق کی مساوات اپنی جگہ اور دونوں میں مشابہت بھی تو کوئی حقیقت ہے۔ عورت مرد کے حقوق میں برابری مادی و روحانی طور پر ایک بات ہے اور دونوں میں مماثلت اور صورت میں مشابہت دوسری بات ہے۔ اس تحریک میں عمداً یا سہواً "مشابہت" کی جگہ "مساوات" اور "مماثلت" کی جگہ "برابری" کو مان کر ایک بنا دیا گیا۔ "کیفیت" "کمیت" کے تحت الشعاع میں آگئی۔ عورت کا "انسان" ہونا اس کے "عورت" ہونے کو نظرانداز کرنے کا سبب بن گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس بے توجہی کو فقط ایک ایسی فلسفی غفلت کا نام نہیں دینا چاہیے جو عجلت کی بنا پر ہوئی۔ اس میں دوسرے عوامل بھی تھے جو "آزادی" اور "مساواتِ زن" کے ذیل میں قابل استفادہ تھے۔

اس مہم کے پس پردہ سرمایہ داروں کے منافع بھی کام کر رہے تھے۔ کارخانہ دار جو عورت کو گھر سے کارخانے میں لانا چاہتے تھے۔ وہ اس سے اقتصادی فائدے اٹھانے کی فکر میں تھے۔ ان لوگوں نے نعرہ لگایا۔ عورت کے حقوق۔ عورت کی اقتصادی آزادی، عورت کی آزادی، مرد و عورت کے حقوق مساوی ہیں۔ ان لوگوں کی بدولت مطالبات نے قانونی صورت اختیار کی۔

ویل ڈیورانٹ "لذتِ فلسفہ" نویں فصل میں۔ ارسطو۔ نطشے۔ شوپن ہاور اور یہودیوں کی مقدس کتابوں سے عورت کے بارے میں حقارت آمیز رائے نقل کرتا اور کہتا ہے۔ انقلاب فرانس میں عورت کی آزادی کا مسئلہ موجود تھا لیکن کوئی عملی تبدیلی نہیں ہوئی۔ سنہ انیس سو ۱۹۰۰ء میں عورت کو بشکل ایک قانون ملا جس کی رو سے مرد کو عورت کے احترام کا پابند ہونا پڑا۔ اس کے بعد بیسویں صدی میں عورت کے حالات میں تبدیلی آنے کے اسباب و علل سے بحث کرتے ہوئے کہتا ہے۔

> عورت کی آزادی۔ صنعتی انقلاب کی بدولت ہے۔۔۔۔۔ عورتیں، سستی مزدور تھیں، کارخانہ دار سرکش اور گراں قیمت مزدوروں پر

انھیں ترجیح دیتے تھے۔ ایک صدی پہلے انگلستان میں مردوں کو کام ملنا مشکل تھا۔ لیکن مردوں سے اشتہاروں میں درخواست ہوتی تھی کہ بچوں اور عورتوں کو کارخانوں میں بھیجیں۔ آزادیِ خواتین کے لیے پہلا قدم ۱۸۸۲ء کا قانون تھا جس نے ۔ عظیم برطانیہ ۔ کی عورت کو وہ اعزاز دیا جس کی مثال پہلے موجود نہ تھی۔ یعنی، عورت جو روپیہ کمائے گی وہ اسے اپنے لیے محفوظ رکھنے کا حق رکھتی ہے [1]۔

مشینی دور کی روزافزوں ترقی، صنعتی پیداوار میں اضافہ افرادی قوت کا طلب گار تھا، پھر مصنوعات استعمال کرنے اور خریدنے والوں کو ہزار افسون و نیرنگ سے مائل کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کی خاطر، سمعی بصری، فکری و جذباتی ذوق و ھنر، فن اور آرٹ حتیٰ کہ جنسی عوامل درکار تھے جو گاہکوں کو بلا ارادہ چیزیں خریدنے پر مجبور کریں۔ یہ نئی ضرورت مجبور کر رہی تھی کہ سرمایہ دار عورت کے وجود سے فائدہ اٹھائے۔ اس مرحلے میں عورت کو استعمال کرنے کا انداز کچھ اور تھا۔ اب عورت، جسمانی قوت، کام کرنے کی صلاحیت، معمولی کاریگر، یا پیداوار میں مرد کی شریک مساوی کی حیثیت سے نہیں دیکھی جا رہی تھی۔ اب کی جاذبیت ـــ

---

[1] ڈاکٹر علی شایگان، شرح قانون مدنی ایران صفحہ ۳۶۶ میں ہے:

عورت اپنی ملکیت پر جو حق رکھتی ہے اور شیعہ فقہ نے اسے شروع ہی میں تسلیم کیا وہ کچھ عرصہ پہلے اکثر قوانین ممالک میں تسلیم نہیں کیا گیا تھا اس میں یونان۔ روم۔ جرمن۔ بھی داخل ہیں کہیں اس حق کا نام و نشان نہ تھا۔ یعنی نابالغ، دیوانے اور مجبور (جس کی املاک زیر تحویل حکومت ہو) کی طرح اپنی دولت خرچ کرنے کا حق نہ رکھتی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے عورت کی شخصیت، شوہر کی ذات میں فنا تھی ـــ ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۲ء میں "ملکیت زن" کے نام سے دو قانون بنے اور عورت کی ملکیت سے کسٹوڈین شپ ختم ہوئی۔

مقناطیسی کشش، فکر و خیال کو قابو میں لانے کی قوت، ارادے بدل دینے کی طاقت اور کرامت رہن رکھنے، آبرو بیچ ڈالنے کے امکانات سے فائدہ اٹھانے کا زاویہ سامنے آیا، اب پیداوار، صارف کے سر تھوپنے کی بات تھی۔ موٹی سی بات ہے اس کاروبار کے لیے۔ آزادی اور مساوات مردوزن۔ کارآمد مہم تھی۔

سیاست بھی اس عامل کو استعمال کرنے سے غافل نہ تھی۔ اخبارات میں روزانہ ایسے قصے آپ بھی پڑھتے اور دیکھتے ہوں گے۔ یہ سب عورت کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی مہم ہے۔ اور مرد اپنے مختلف مقاصد کے لیے اسے استعمال کر رہا ہے مگر آزادی و مساوات کے پردے میں۔

ظاہر ہے۔ بیسویں صدی کا جوان اس قیمتی لمحے سے غافل نہیں۔ شادی کے بارے میں وہ خاندانی رسم و رواج سے تنگ آچکا ہے۔ مفت، کم قیمت شکار ہاتھ آئے تو اسے خسارہ کیا ہے۔ جوانوں نے عورتوں کی آزادی و مساوات کی خاطر اس کی مظلومیت اور حقوق تلفی پر سب سے زیادہ مگرمچھ کے آنسو بہائے۔ وہ اس جہادِ مقدس میں آگے تھا، اس نے اس کام کے لیے اپنی شادی کو چالیس سال پیچھے دھکیل دیا کبھی کبھی تو اس نے "مجرّد" زندگی گذارنے کی ٹھان لی۔

بے شک ہماری صدی نے عورت سے بدنصیبیوں کا ایک طومار واپس لے لیا۔ لیکن یہ بات بھی ضرور ہوئی کہ اسے نئی بدبختیوں کا تحفہ پیش کیا۔ کیوں؟ آیا عورت پابند ہے، اسے دو میں سے ایک بات ماننا ہوگی یا وہ کسی کی پابند نہیں، اسے اختیار ہے، وہ اپنی پرانی بدنصیبیاں بھی دور کر سکتی ہے اور نئی بدبختیوں کو بھی روندنے کا اختیار رکھتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ عورت پر کوئی جبر نہیں ہے۔ پرانی بدنصیبیاں تو اس علّت سے پیدا ہوئیں کہ عورت کا انسان ہونا بھلا دیا گیا تھا اور نئی بدبختیاں اس سبب سے پیدا ہوئیں کہ عمداً یا سہواً۔ اس کا عورت ہونا، اس کی طبعی، فطری ذمہ دارانہ حیثیت، مرکزیت، اندرونی تقاضے، خصوصی صلاحیتیں طاق نسیاں پر رکھ دی گئیں۔

عجیب بات ہے، جب مرد و عورت کے فطری اور طبیعی اختلاف کی بات چھڑتی ہے تو ایک گروپ اسے عورت کے نقائص اور مرد کے امتیازات کا قصہ لے بیٹھتا ہے، آخر کار عورت کی محرومیوں اور مرد کی کامرانیوں پر تان ٹوٹتی ہے۔

محرومی و کامیابی، نقص و کمال کا مسئلہ نہیں، کارخانۂ قدرت نے ایک کو ناقص دوسرے کو کامل، ایک کو کامیاب و کامران دوسرے کو محروم و ناکام نہیں پیدا کیا۔

یہی گروپ اس منطقی و فلسفی مفروضے کے بعد کہتا ہے۔ اچھا، فطرت نے تو عورت پر یہ ظلم ڈھا دیا، وہ ناقص و کمزور پیدا ہوئی، تو کیا ہم بھی ایک نیا سبب بنیں اور ظلم پر ظلم کا اضافہ کریں؟ اگر عورت کی طبیعی حالت کو بھلا دیں تو کیا زیادہ انسانی عمل نہیں ہوگا؟

اتفاقاً معاملہ برعکس ہے۔ عورت کی فطری و طبیعی وضع سے بے توجہی اس کے حقوق پائمال ہونے کا بڑا سبب بنی۔ اگر مرد محاذ لگائے اور عورت سے کہے: ہم تم برابر۔ کام کاج ذمہ داریاں، فائدے، نتائج، سزائیں سب ملتی جلتی ہوں گی بھاری اور مشکل کاموں میں شریک ہو، برابر کھڑی ہو۔ اپنی طاقت کے مطابق کام کر اور اسی کی بنیاد پر مزدوری۔ ہم سے احترام و نگہداشت کی توقع نہ رکھنا۔ اپنے روزمرہ اخراجات خود مہیا کرو۔ اولاد کے اخراجات میں اپنا حصہ دو۔ خطرے میں اپنی حفاظت خود کرو۔ ہم تم پر خرچ کرتے ہیں تم ہم پر اپنے پیسے خرچ کرو۔۔۔۔۔ عورت، معرکے میں پھنس جائے گی اس کی قوت کارکردگی طبیعی طور پر کم اور روپے کا خرچ زیادہ ہے۔ ماہواری روگ، زمانۂ حمل کی بے چینی، وضع حمل کی سختی، شیرخوار کی دیکھ بھال، عورت کو ایسی صورت حال سے دوچار کرنے والی چیزیں ہیں جہاں اسے مرد کی سربراہی درکار ہوتی ہے، ذمہ داریاں کم اور آمدنی زیادہ چاہیے ۔ یہ سب کچھ انسان ہی نہیں، جوڑے جوڑے زندگی بسر کرنے والے ہر جاندار کا معاملہ یہی ہے۔ تمام حیوانات میں غریزہ و فطرت کے زیر اثر مادہ

کی حمایت نر کا فریضہ ہے وہ مادہ کی حفاظت پر کمربستہ و حملہ آور رہتا ہے۔

مرد و زن کی طبیعی و فطری ساخت کو سامنے رکھا جائے۔ انسان ہونے میں مساوی سمجھا جائے۔ انسانی حقوق کو مشترک مانا جائے، تو "عورت" کو نہایت مناسب مقام مل سکتا ہے۔ ایسا مرتبہ جہاں نہ اس کی ذات کچلی جائے نہ اس کی شخصیت کو نقصان پہنچے۔

زن و مرد کی فطری و طبیعی حیثیت کو فراموش کرنے، اور صرف آزادی و مساوات پر اکتفا کرنے کے نتائج سے آگاہی کے لیے کچھ اخباری جائزہ لیتے ہیں اور جائزہ بھی ان کا جو ہم سے پہلے اس راستے سے گذرے بلکہ منزل تک پہنچ چکے ہیں۔ دیکھیے وہ کیا کہتے اور کیا لکھتے ہیں۔

رسالۂ "خواندنیہا" شمارہ ۷۹، سنہ ۱۳۳۴ ش ۴ تیر ماہ ۵۳ شمسی (مطابق جولائی ۷۴ ۱۹ء) ماہ نامہ "شہربانی" کا مقالہ ہے۔ "سرگذشتہای از زنانِ کارگر در جامعۂ امریکا" ۔ امریکی معاشرے میں محنت کش عورتوں کی سرگذشت ——— رسالۂ "کرنٹ" کے مضمون کا ترجمہ۔

مقالہ پڑھنے کے قابل ہے۔ شروع میں ایک خاتون کا درد دل نقل ہے، نیز زن و مرد کی مساوات کا تذکرہ اور ان رعایتوں کا بیان جو گذشتہ زمانے میں مزدور عورتوں کو دی جاتی تھیں۔ مثلاً

۲۵ پونڈ سے زیادہ وزن نہ اٹھائیں، جبکہ مردوں کو یہ رعایت حاصل نہ تھی۔

آج عورت اس رعایت سے محروم ہے۔ صوبہ اہایو کی ورکشاپ "جنرل موٹر" کو عورتوں کی سزا کا مرکز کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ ڈھائی ہزار خواتین یہاں کام کرتی ہیں..... یہ خاتون ایک بڑے گیس پلانٹ کی دیکھ بھال پر متعین ہیں اور کبھی انہیں ایک بھٹی کی صفائی کرنا پڑتی ہے۔ یہ فولادی بھٹی ۲۵ پاونڈ کی ہے، جسے قوی ہیکل مردنے سیٹ کیا ہے۔ خاتون زیر لب کہتی ہیں۔ میں اندر سے چور چور اور باہر سے زخمی ہو چکی ہوں۔..... میرا کام تھا کہ ہر لمحہ ایک ہتھوڑا اٹھاؤں جس کا طول

پچیس سے پچاس انچ تک اور وزن پینتیس پاؤنڈ یہ تھوڑا ایک کانٹے میں لٹکانا پڑتا تھا۔ میرے ہاتھوں پر ہمیشہ ورم اور ہڈیوں میں درد رہنے لگا۔"

مضمون میں ایک اور خاتون کا درد دل، پریشانی و بے چینی کی داستان ہے اس کا شوہر بحریہ میں قلی تھا۔ ایک مرتبہ بحریہ کے افسر اعلیٰ نے مردانہ جہاز میں کچھ عورتوں کی بھرتی کا اعلان کیا۔۔۔ لکھتی ہے، ان دنوں بحریہ کے ایک جہاز میں چالیس عورتیں اور چار سو اسی مرد ڈیوٹی پر بھیجے گئے۔ جب یہ جہاز اپنے پہلے مخلوط سفر سے واپس آیا تو قلیوں کی بیویاں خوف و ہراس زدہ تھیں۔ انھیں تھوڑی ہی دیر میں محسوس ہونے لگا تھا کہ یہاں خالی خولی عشق کی داستانیں ہی نہیں بلکہ ہر عورت کو کئی کئی اشخاص کی جنسی پیاس بجھانا پڑے گی۔"

مقالہ نگار لکھتا ہے ـــ فلو رائیڈ میں آزادی کے بعد بیوہ عورتوں کو عجیب پریشانی کا سامنا ہے۔ یہاں قانون کے مطابق ہر بیوہ کو پانچ سو ڈالر تک ٹیکس معاف تھا۔ ایک جج "تامس ٹشاؤ" نے اس قانون کے خلاف فیصلہ دے دیا۔ اور کہا کہ یہ قانون مردوں کے حق میں مداخلت کرتا ہے (اور صرف عورتوں کو رعایت دیتا ہے)

آگے لکھتا ہے: "مسز میک ڈانلڈ کے ہاتھوں میں سوزش (جلن) تھی مسز اسٹون (جن کے شوہر قلی تھے) ایک مصیبت سے دوچار ہوئیں، صوبہ فلوراڈ میں بیوہ عورتوں پر نقد جرمانہ ہوا ہے۔ اب ہر ایک آزادی کا مزہ چکھے گی۔ بہت لوگوں کے ذھن میں یہ سوال آرہا ہے کہ خواتین نے جن حقوق سے فائدہ اٹھایا تھا کیا اس سے زیادہ اب نقصان برداشت نہیں کر رہی ہیں؟ خیر یہ بحث بے فائدہ ہے کیونکہ کھیل شروع ہو چکا، تماشائی اپنی اپنی کرسیاں حاصل کر کے بیٹھ چکے ابھی سال طے ہوا ہے کہ امریکہ کے آئین کا ستائیسواں" ترمیم شدہ پیراگراف" منظور ہو، جس کے مطابق جنسی اختلافات کی برتری خلاف قانون قرار پائے۔۔ ۔۔۔۔اور یوں ان بیانات کی تصدیق ہو جائے جو ھارورڈ یونیورسٹی کے استاد

قانون رسکو پاؤنڈ نے دیے تھے ۔" امریکہ میں عورتوں کی آزادی عورت کے قانونی خصوصیات کی بنا پر افسوسناک نتائج کا باعث ہے ....

کیرولین شمالی کے سینیٹر" جی ایروین" نے امریکہ کے معاشرتی مطالعے کے بعد تجویز رکھی تھی ...... خاندان سے متعلق قوانین مکمل طور پر بدل دیے جائیں ۔ اب مرد کو قانونی طور پر خاندان کے اخراجات کا ذمہ دار نہ ہونا چاہیے ۔

یہ رسالہ لکھتا ہے ۔" خانم میکڈانلڈ" کے بقول، ایک خاتون بھاری بوجھ اٹھانے کی وجہ سے سیلان خون کی شکایت میں مبتلا ہیں ۔ ہم اپنی پرانی صورت حال میں واپس جانا چاہتے ہیں ۔ ہم چاہتے ہیں کہ مرد عورتوں سے عورتوں کا سلوک کریں مزدور جیسا نہیں ۔ آزادی نسواں کے حامیوں کی نظر میں یہ بات بہت معمولی ہوگی کہ اپنے شاندار ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کہیں ۔ عورت مرد برابر ہیں ۔ ان حضرات نے اب تک کارخانوں کی صورت نہیں دیکھی ہے ۔ انھیں خبر نہیں کہ اس ملک کی اکثر مزدور خواتین کارخانوں میں کام کرتے کرتے جان پر کھیل رہی ہیں ۔ ہمیں یہ برابری نہیں چاہیے ہم سے مردوں کے کام نہیں ہوتے ۔ مرد، جسمانی لحاظ سے ہم سے زیادہ مضبوط ہیں ۔ اگر یہ طے ہو جائے کہ ہم ان کے مقابلے میں کام کریں اور ہمارے کام کا ان کے کام سے موازنہ ہو تو ہم اپنی حد تک مستعفی ہیں ۔"صوبۂ اعایو" میں مزدوروں کے قانون تحفظ حقوق سے جو کچھ پایا ہے، اس سے زیادہ کھویا ہے ۔ ہم نے اپنی نسوانی شخصیت ضائع کر دی ہمیں آزادی کے بعد نہیں معلوم کہ فائدہ کیا ہوا ۔ ہو سکتا ہے، گنتی کی چند عورتوں نے بہتر حالات دیکھے ہوں لیکن ہم بہرحال ان میں نہیں ہیں ۔"

یہ تھا اس مقالہ کا خلاصہ ۔ مضمون کے اندراجات سے صاف نظر آتا ہے کہ خواتین "آزادی و مساوات" کے نام سے جن مشکلوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوئیں اس کے نتیجے میں انھیں ان دونوں لفظوں سے چڑھ ہو گئی ۔ وہ بھول میں ہیں ان دونوں لفظوں کا گناہ کوئی نہیں ۔ زن و مرد، دو الگ الگ مداروں کے دو ستارے ہیں ۔ دونوں کو اپنے اپنے مدار اور اپنے اپنے دائروں میں گردش

کرنا چاہیے "لا الشمس ینبغی لها ان تدرك القمر ....." سورج کو حق نہیں کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن سے آگے جا سکتی ہے ہر ایک اپنے اپنے فلک میں گردش کر رہا ہے" مرد و زن کی اصل سعادت اسی میں ہے کہ وہ انسانی معاشرے میں دو جنس رہ کر اپنے اپنے دائرۂ کار میں سفر جاری رکھے۔ آزادی و برابری کا فائدہ اسی وقت حاصل ہوگا، جب ہر ایک اپنی فطری و طبعی راہ سے بے راہ نہ ہو۔ معاشرے میں خلفشار پیدا ہونے کا سبب فطرت و طبیعت کے فرمان سے سرتابی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بات نہیں۔

"نظامِ حقوقِ خواتین، خاندان اور معاشرے میں" ہم مدعی ہیں کہ یہ مسئلہ اساسی مسئلہ ہے اور اس پر نئے سرے سے نظر کرنا چاہیے۔ گذشتہ اقدار پر اکتفا نہ کی جائے، از سرِ نو اقدار دریافت ہوں۔ اس بارے میں سب سے پہلے طبیعت و فطرت کو رہنما اصول بنائیں۔ دوسرے مرحلے میں گذشتہ اور موجودہ صدیوں کے تلخ و شیرین تجربے سامنے اور ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اس وقت تحریک حقوقِ خواتین صحیح معنی میں کامیاب طور پر بڑھ سکے گی۔

●

جناب منتظر عباس نقوی
، پاکستان ،

اخلاقی نصب العین

گذشتہ سطور میں یہ بنیادی امر طے کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کے اخلاقی نظام میں ایک عادل خدا اور حیات بعد الممات کا تصور ناگزیر ہے۔ تصورِ خدا اخلاقیات کے لیے مرکز اور محور ہے اور حیات بعد الممات یا آخرت کا تصور انسانی نصب العین کے حقیقی مقصود کی نشاندہی کرتا ہے۔ اب ہم اخلاقی معیار کے مسئلہ کے سب سے اہم پہلو یعنی اخلاقی نصب العین کی نوعیت پر غور کرنے کے مرحلے میں ہیں۔

اخلاقی افعال کا حتمی اور آخری مقصود کون سی قدر ہے؟ یا وہ کون سی منزل ہے جس کے حصول کے لیے اخلاقی احکام کی تعمیل کی جائے؟ ان سوالات کے جواب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اخلاقی نصب العین کے لیے کون سی شرائط لازمی ہیں۔

حضرت علی علیہ السلام کے نظریۂ اخلاق کے تفصیلی مطالعے سے یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ دنیا کا کوئی انسان کسی لمحے اخلاقی ذمہ داری سے آزاد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اخلاقیات وہ نظام ہے جس کا اطلاق ہر فرد پر ہر جگہ اور ہر وقت اس طرح ہونا چاہیے جس طرح قوانین فطرت اپنے دائرۂ کار میں بلا استثنا نافذ ہوتے ہیں۔ دوسری طرف انسان ہمہ وقت تغیرات و حوادث سے دوچار ہے۔ کائنات اپنے لمحات کی تکرار نہیں کرتی جو تھا وہ نہیں ہے اور جو ہے وہ نہیں رہے گا۔ ان تغیرات میں ارتقا کے مراحل بھی ہیں اور شاید زوال کے بھی۔ اب اخلاقی نظام کے لیے ضروری

ہے کہ وہ زندگی کے تنوّع کو اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ اس سلسلہ کا تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ اخلاقیات کا بنیادی مسلمہ۔ خدا ایک ازلی وابدی اور عالمگیر وجود ہے۔ اس لیے خدا کی بنیاد پر استوار ہونے والی اخلاقیات کے لیے بھی محرک و ابدی وجود ہونا چاہیے۔ ان تینوں نکات کو ایک جگہ جمع کرنے سے جو صورت حال سامنے آتی ہے اس کے مطابق اخلاقی نصب العین کے لیے بیک وقت عالمگیری لچک اور دوام کی ضرورت ہے یعنی ایک ایسا نصب العین جو ہمہ وقت قابل حصول ہو نہ جغرافیائی حدود اس پر اثرانداز ہوں نہ زمانی فاصلے اور نہ افراد کی تعداد۔ وہ ایک پورے معاشرے کے لیے اجتماعی طور پر بھی اسی طرح قابل حصول ہو جیسا کہ ایک فرد کے لیے۔ ان شرائط کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات انتہائی واضح ہے کہ مادی صورت میں پیش کیا جانے والا کوئی بھی اخلاقی مقصود نصب العین بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اخلاقی نصب العین کے لیے ضروری ہے کہ وہ صوری ہو کیونکہ کوئی صوری اصول ہی زمان و مکان کے تغیرات اور تقاضوں کو قبول اور برداشت کرنے کی صلاحیت رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ اخلاقی نصب العین کے لیے پہلی شرط یہ ہو گی کہ وہ صوری ہو لیکن یہ صوریت ایسی بنجر اور شور زدہ زمین کی طرح نہیں ہونی چاہیے جس سے کسی ٹھوس طریق عمل کا اخراج ہی نہ ہو سکے کیونکہ اخلاقیات کا تعلق عمل سے ہے، اگر کسی اخلاقیات کا مرکزی خیال ہی عمل سے قطعاً لاتعلق ہو تو ایسے اخلاقی نظام سے کسی قسم کی مثبت توقع قائم نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ نصب العین کے لیے صوریت ناگزیر ہے۔ لیکن مثبت صوریت جو یہ بتا سکے کہ انسان کا عملی ضابطۂ حیات کس قسم اور کس نوعیت کا ہونا چاہیے۔

اوپر کی سطور میں اشارتاً ذکر کیا گیا ہے کہ اخلاقی نصب العین پر افراد کی تعداد کا اثر نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی نصب العین ایسا ہونا چاہیے جو انفرادی طور پر بھی قابل حصول ہو اور اجتماعی طور پر بھی یہ شرط اسی لیے ضروری

ہے کہ اخلاقی ضابطہ کی پابندی بنیادی طور پر فرد کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اخلاقیات کی معروضیت اور تصور عدل کے مسلکے کی موجودگی میں افراد کی اخلاقی ذمہ داریاں مختلف نہیں ہو سکتیں تو ان سب کا نصب العین ایک ہونا اس لیے ضروری ہے کہ اگر نوع انسانی مکمل طور پر یا اس کی کوئی جماعت جزوی طور پر اس اخلاقی نصب العین کے حصول کی اجتماعی کوشش کرے تو نصب العین قابل حصول ہو سکتا ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں ایک درست اخلاقی نصب العین کے لیے ضروری ہے کہ وہ پوری نوع انسانی کا مقصود ہو۔ لیکن اگر کرۂ ارض پر معاشروں کا خاتمہ ہو جائے یا کوئی فرد معاشرتی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے تب بھی اخلاقی نظام اس کے لیے اسی طرح واجب العمل اور قابل عمل ہو جس طرح اجتماعی یا معاشرتی زندگی میں تھا۔ چنانچہ اخلاقیات کے درست نصب العین کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ بیک وقت انفرادی اور اجتماعی نصب العین ہو۔

اخلاقی نصب العین کے لیے ایک اور شرط ۔ دوام ۔ قرار دی گئی ہے۔ نصب العین کے دوامی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ نصب العین ایک جامد صداقت ہے جس کے حصول سے ایک مُسَلّمہ یا معینہ قاعدے سے سرمو انحراف غیر اخلاقی ہوگا۔ جامد یا غیر متحرک نصب العین کا تصور اس لیے بھی قابل قبول نہیں کہ خیر اپنی اصل کے اعتبار سے تعمیری اور تخلیقی ہے۔ جمود تعمیر و تخلیق کی ضد ہے اسلیے خیر الٰہی کا جامد اور غیر تخلیقی ہونا ناممکن ہے۔ اس مقام پر نصب العین کے دوام کا مفہوم یہ ہے کہ ہر لمحہ اس کے حصول کا ایک نیا مرحلہ ہو۔ یہ نکتہ کافی اہم ہے اس لیے کہ اگر نصب العین اس قسم کا ہے کہ ایک فرد یا ایک جماعت کا اسے حاصل کرنا دوسرے افراد اور دوسری جماعت کے لئے اس کے حصول کو ناممکن یا غیر ضروری بنا دیتا ہے ، یا یہ کہ ایک فرد کی طرف سے نصب العین کا زندگی میں ایک مرتبہ حصول زندگی میں جدوجہد سے اس کو بے نیاز کر دیتا ہے تو ایسا نصب العین دائمی نہیں کہا جا سکتا۔ منطقی طور پر ہم یہ بات یوں بھی کہہ سکتے

ہیں کہ کوئی نصب العین یا مقصود اسی وقت تک نصب العین یا مقصود رہتا ہے جب تک کہ وہ قابل حصول ہو اگر وہ اپنے قابل حصول ہونے کی صلاحیت ختم کر دے تو وہ نصب العین یا مقصود ہونے کے بجائے ملکیت بن جاتا ہے چنانچہ نصب العین کے دوام کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہمیشہ قابل حصول ہو لیکن یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ نصب العین کے دوامی قابل حصول ہونے کا یہ مطلب ہے کہ وہ کبھی حاصل نہیں ہوتا۔ یا وہ ایسا تخیلی پیکر ہے جس کے پیچھے ہمہ وقت بھاگنے کے باوجود کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اس قسم کا نصب العین یقیناً مقصود نہیں ہو سکتا کیونکہ جو چیز کبھی حاصل ہی نہ ہو سکے اس کی جستجو بے سود ہے اور عقیدہ عدل کا تقاضہ ہے کہ بے سود عمل نہ کیا جائے۔ درحقیقت نصب العین کو لامحدود اور غیر معینہ امکانات کا حامل ہونا چاہیے، ایک امکان کے حصول کے بعد دوسرا امکان اور دوسرے کے بعد تیسرا امکان سامنے آتا رہے، اس طرح فرد کے اخلاقی ارتقاء کا سلسلہ ہمہ وقت جاری و ساری رہے گا۔ چنانچہ اخلاقی نصب العین کی ایک شرط اسکا دوام ہے یعنی ایسے لامحدود امکانات کا حامل ہونا جو اسے ہمیشہ تر و تازہ رکھیں اور ایسے لمحات سے مرکب ہونا جو ایک دوسرے سے مختلف اور متنوع ہوں۔

اخلاقی نصب العین کے دائمی ہونے کی طرح اس کا عالمگیر ہونا بھی ضروری ہے چونکہ اخلاقی نظام کا انحصار ایک واحد حقیقت مطلقہ پر ہے جس نے کائنات کو ایک مقصد کے تحت خلق کیا ہے یا کائنات کی علت اولی چونکہ واحد ہے اس لیے اس علت کا معلول یعنی وہ مقصود جس کے لیے کائنات خلق ہوئی ہے اسے بھی واحد ہونا چاہیے۔ حضرت ؑ کے مابعد الطبیعاتی مسلمات کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تمام نوع انسانی کے سامنے صرف ایک ہی قسم کا مقصد ہے جس کی تکمیل انفرادی اور اجتماعی طور پر پوری نوع انسانی کو کرنا چاہیے، اس لیے اس نظام میں غریبوں اور امیروں طاقتوروں اور کمزوروں کا لون

اور گوروں کا اخلاقی نصب العین الگ الگ نہیں ہوسکتا۔ اور نہ ہی ماضی حال اور مستقبل کے انسان الگ الگ مقصود کے حصول کی کوشش کرسکتے ہیں ان سب کا نصب العین ایک ہونا چاہیے۔

مسلمہ عدل کے نتیجہ میں اخلاقی نصب العین کی ایک اور خصوصیت اس کا عادلانہ ہونا ہے یعنی دوسرے الفاظ میں اخلاقی نصب العین ایسا ہونا چاہیے کہ عقل اس کی توجیہ کرسکے۔ غیر عقلی نصب العین اس لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا کہ اس طرح خدا کے عادلانہ اور انسان کے غیر عادلانہ مقاصد میں تصادم ناگزیر ہے اور اس تصادم کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مقصد تخلیق انسانیت کی تکمیل نہیں ہوسکے گی چنانچہ ضروری ہے کہ اخلاقی نصب العین عقل کے دائرہ کار میں ہو اور اس نصب العین کے تحت ہونے والے خیر و شر کے فیصلے معیار عقلی پر پورے اتر سکیں۔

چنانچہ ان خصوصیات کے پیش نظر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کے پیش کردہ مابعد الطبیعاتی مسلمات کے تحت اخلاقی نصب العین کے لیے ضروری انفرادی و اجتماعی دائمی عالمگیر اور عقلی ہونا ضروری ہے ان نکات کے ساتھ ساتھ اصل مسئلہ پر گفتگو کرنے سے پہلے دو اور امور کی نشاندہی ضروری ہے۔

پہلی بات۔ ضروری نہیں کہ انسان کا اخلاقی نصب العین اور خدا کا نصب العین بعینہ ایک ہی ہوں اور یہ بھی ضروری نہیں کہ انسان اپنے اخلاقی نصب العین سے آگاہی کے ساتھ ساتھ خدا کے مقصد تخلیق کائنات سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ اس لیے کہ خدا کا مقصود صرف انسان ہی سے نہیں بلکہ پوری کائنات سے وابستہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ صرف کسی خاص دور کے انسانوں کے لیے نہیں بلکہ مکمل نوع انسانی کے لیے ہے اور پھر خدا کے مقاصد صرف طبعی دنیا سے ہی وابستہ نہیں بلکہ چونکہ وہ لازمانی اور لامکانی ہے اس لیے اس کے مقصود کا تعلق بھی صرف زمان و مکان سے نہیں ہوسکتا۔

زمان و مکان یا طبعی کائنات تو اس کے مقصد عظیم کی ایک حقیر فرد ہے۔ اس انتہا
عظیم الشان مقصد کے سامنے انسان اس قدر حقیر اور بے وقعت ہے کہ نہ تو وہ مقصد
خدا کو سمجھنے کا مدعی ہو سکتا ہے نہ اہل۔ اس کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ اس عظیم کار
میں اپنا مقام جانے اور اپنے نصب العین کے حصول کی کوشش کرے بالکل اس
سپاہی کی طرح جو چوک پر کھڑا ہو کر آنے جانے والی گاڑیوں پر قابو رکھتا ہے
اس کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ گاڑیوں کو راستہ کس طرح دکھایا جاتا ہے یہ جانن
ضروری نہیں کہ حکومت اس کی وساطت سے اپنے کسی حتمی مقصد کی تکمیل کر رہی
یہاں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خدا اور انسان کے مقاصد مختلف ہیں۔ درحقیقت انسان
اپنے مقصد حیات سے آگاہ ہونا کافی ہے یہ مقصد حیات خدا کا مقصد تو نہیں ہوتا
اسی سمت میں ہوتا ہے جس سمت میں خدا کے مقاصد کی تکمیل ہو رہی ہے انسان کے
یہ جان لینا کافی ہے کہ انسان کا نصب العین خدا کے مقصد اعلیٰ سے متصادم نہیں ہے
اس طرح وہ اخلاقی زندگی کی تکمیل کے لیے ضروری علم حاصل کر لیتا ہے۔

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ اخلاقی نصب العین کو مابعد الطبیعاتی مسلمات کا منطقی
نتیجہ ہونا چاہیے یعنی اخلاقیات کا نظام محض مفروضات کا مجموعہ نہیں، بلکہ کسی ایک
مسلمہ کو تسلیم کر لینے کے بعد نظام کے باقی تمام مسائل اسی مسلمے پر مبنی ہونا چاہئیں حضرت علی
نے تصور خدا کو اخلاقیات کی اساس قرار دیا، اس تصور سے صفات خدا اور بعدازا
حیات بعد الممات کے مقدمات خود بخود اخذ ہوتے گئے۔ اخلاقی نصب العین کے
ضروری ہے کہ وہ مسلمات سے منطقی طور پر حاصل شدہ نتائج ہوں، یہ نہ کرنا
کہ نصب العین کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ایک مفروضہ در مفروضہ کا سلسلہ
ہو جائے مفروضات کے طویل سلسلے کے بعد اس نصب العین اور اخلاقی نظام
عقلی قرار دینا مشکل ہو گا۔ کیونکہ عقل تصورات کے مربوط اور منطقی سلسلے ہی افکا
و تصورات کے مجموعہ کا چنانچہ نصب العین کے لئے ضروری ہے کہ وہ انھیں مسلمات
سے اخذ ہو جو گذشتہ سطور میں بیان کیے جا چکے ہیں۔

اب تک ہم اخلاقی نصب العین کی بنیادی شرائط کا تعین کر رہے تھے اور اس نتیجہ پر پہنچ چکے کہ اخلاقی اعمال کا محور ایک ایسا لامحدود امکانات کا حامل صوری نصب العین ہونا ضروری ہے۔ جو بیک وقت انفرادی اور اجتماعی دوامی عالمگیر اور عقلی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے مابعد الطبیعاتی مسلمات کا منطقی نتیجہ بھی ہونا چاہیے۔ اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ حضرت علی علیہ السلام کے مسلمات سے کون سا نصب العین اخذ کیا جا سکتا ہے۔

عادل خدا نے بامقصد کائنات خلق کی ہے اور اس کائنات میں شعور و ارادہ کی صلاحیت رکھنے والے انسان کو اس لیے پیدا کیا تاکہ وہ خدا کے مقاصد کی تکمیل میں اپنا حصہ ادا کرے۔ اس سارے نظام میں نہ تو کائنات غیر ضروری ہے نہ انسان اور نہ وقت کا کوئی لمحہ جو کائنات اور انسان کے درمیان ربط کا کام دیتا ہے اس لیے انسان کا ہر لمحہ اس مقصد کی خاطر ہونا چاہیے جس کے لیے وہ پیدا ہوا اس کے سامنے صرف وہی لائحہ عمل ہونا چاہیے جو خدا نے اس کے لیے بنایا اور اسے اس نظام کی پابندی فرض ہوگی جو خدا کے مصالح اور مقاصد پر مشتمل ہو اس طرح انسان کا فرض صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ ہمہ وقت خدا کے مقاصد کا تابع یا دوسرے الفاظ میں خدا کا مطیع و فرمانبردار رہے۔ وہ مقاصد الٰہی کا امین ہو۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے وہ بندے جو علم الٰہی کے امانت دار ہیں وہ محفوظ چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے چشموں کو (تشنگان علم و معارف) تک لے جاتے ہیں۔" اب ان امانتداران مقاصد کا فرض ہے کہ وہ اس امانت کا پورا احترام کریں انکے افعال خدا کے لیے ہوں۔ "میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اللہ سے ڈرتے رہنا اس کے احکام کی پابندی کرنا اس کے ذکر سے قلب کو آباد رکھنا اور اس کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہنا تمہارے اور اللہ کے درمیان جو رشتہ ہے اس سے زیادہ مضبوط رشتہ ہو بھی کیا سکتا ہے بشرطیکہ مضبوطی سے اسے تھامے رہو۔" اگر انسان نے اطاعت و فرمانبرداری کا یہ راستہ اختیار کیا اور اس رشتے کی اہمیت کو برقرار

دکھا جو خدا اور اس کی مخلوق میں ہے تو خدا کے مقاصد کا حامی ہوگا اور خدا کی تائید اسے حاصل ہوگی اس صورت میں خالق اور مخلوق اپنے اپنے مقام پر ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہوں گے اور جب انسان اپنے کو مقصد الٰہی کے لیے وقف کرے گا تو تمام الوہی قوتیں اس کی مددگار ہوں گی۔ اللہ نے بھلائی کی غرض سے اہل حق کے لیے ستون اور اطاعت کے لیے سامان حفاظت مہیا کیا۔ ہر اطاعت کے موقع پر تمہارے لیے اللہ کی طرف سے نصرت و تائید دستگیری کے لیے موجود ہے۔"

چنانچہ انسان کا اخلاقی نصب العین اطاعتِ الٰہی میں چھپا ہوا ہے اور یہ اطاعت بھی کسی خاص لمحے یا دور کی پابند نہیں بلکہ ہمہ وقتی ہے اور اس انداز سے ہوتی ہے کہ "اللہ نے ان کے پاکیزہ اخلاق کو ان کی طینت و فطرت میں سمو دیا ہے۔" اور جب اخلاقی کردار فطرت بن جائے تو صاحبانِ اخلاق یقین کے ایسے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ انہیں اپنے کسی عمل پر شک و شبہ نہیں ہوتا وہ ہر فعل اطاعتِ الٰہی میں کرتے ہیں اور ان کا ہر لمحہ مقاصدِ الٰہی کی حمایت اور تائید میں گزرتا ہے۔

یہاں اطاعتِ الٰہی کا مفہوم یہ نہیں کہ انسان احکام خداوندی کی پیروی کر کے خدا کی "انا" کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ بلکہ اطاعتِ الٰہی درحقیقت رضائے الٰہی کا نام اور اس کا حصول ہے۔ اس نصب العین کی تکمیل یا جو مقصودِ تخلیق کائنات ہے۔ (یا جسے مذہب کی اصطلاح میں مشیت الٰہی کہا جاتا ہے)۔ دوسرے الفاظ میں اخلاق کا مقصد انسان کو غلامانہ اطاعت پر مجبور کرنا نہیں بلکہ رضائے الٰہی یا قضا و قدر میں شریک کرنا ہے۔ اخلاق کے نقطۂ کمال پر پہنچا ہوا انسان وہی کچھ خواہش کرتا ہے جو خدا کی رضا اور اس کے ارادے اسی سمت میں ہوتے ہیں جس سمت میں خدا کے ارادے ہیں۔ چنانچہ اخلاقیات کا نصب العین یہ ہے کہ انسان کائنات پر وہ اختیار حاصل کرے جس کے تحت اس کی فکر و عمل کائنات کی تقدیر بن جائے۔ ساری کائنات اس کے دائرہ اختیار میں ہو اور خدا کی مرضی

کی طرح اس کی رضا جو عین رضاء الٰہی ہوگی فطرت کا اٹل قانون بن جائے۔
اختیار ہی انسان کا اخلاقی نصب العین اور یہی خیر برتر ہے۔ اختیار اور اطاعت الٰہی ہم معنی ہیں کیونکہ اختیار بغیر اطاعت الٰہی کے ممکن نہیں کیوں کہ اگر رضائے الٰہی یا مشیئت کے خلاف کسی اختیار کے مظاہرے کی کوشش کی جائے تو مشیت الٰہی چونکہ قادر مطلق کی مشیت ہے اس لیے قانون قدرت اختیار کے اس مظاہرہ پر حاوی ہوگا۔ اور انسان کے لیے اس سے انحراف ناممکن ہوگا۔ چنانچہ رضاء الٰہی کا حصول عین اختیار ہے اور اس سے انحراف جبر۔ عملی خیر کی خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ اختیار کے فروغ کا ذریعہ ہوگا اور عمل شر انسان کو مجبور بناتا چلا جائے گا۔
"معلوم ہونا چاہیے کہ گناہ ان سرکش گھوڑوں کی مانند ہیں جن پر ان کے سواروں کو سوار کر دیا گیا ہو اور باگیں بھی ان کی اتار دی گئی ہوں۔ اور وہ لے جا کر انھیں دوزخ میں پھاند پڑیں اور تقویٰ رام کی ہوئی سواریوں کے مانند ہے جن پر ان کے سواروں کو سوار کیا گیا ہو اس طرح کہ باگیں ان کے ہاتھ میں دے دی گئی ہوں اور وہ انھیں (بہ اطمینان) لے جا کر جنت میں اتار دیں۔[۵] اللہ کے بندو! یاد رکھو کہ تقویٰ ایک مضبوط قلعہ اور فسق و فجور ایک (کمزور) چار دیواری ہے جو نہ اپنے رہنے والوں سے تباہیوں کو روک سکتی ہے، نہ ان کی حفاظت کر سکتی ہے۔[۶]" چنانچہ خیر کے علمبردار کا یہ حال ہے کہ وہ ارادے اور اختیار کی ٹھوس چٹان ہے اس کا عالم یہ ہے کہ "وہ صرف اللہ کی خاطر سب سے اونچے مقصد کو پورا کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ ہر مشکل کو جو اس کے سامنے آئے مناسب طور پر حل کرے اور ہر فرع کو اس کے ماخذ کی طرف پلٹا سکے، وہ تاریکیوں میں روشنی پھیلانے والا مشتبہ باتوں کو حل کرنے والا الجھے ہوئے مسئلوں کو سلجھانے والا گنجلکوں کو دور کرنے والا اور لق و دق صحراؤں میں راہ دکھانے والا ہے وہ بولتا ہے تو پوری طرح سمجھا دیتا ہے اور کبھی چپ ہو جاتا ہے اس وقت جب چپ رہنا ہی سلامتی کا ذریعہ ہوتا ہے اس نے ہر کام اللہ کے لیے کیا تو اللہ نے بھی اسے اپنا

لیا ہے۔ وہ دین خدا کا معدن اور اس کی زمین میں گڑی ہوئی میخ کی طرح ہے۔"
اس طرح اس کا ہر عمل اس کے تابع ہے وہ کوئی قدم بے مقصد نہیں اٹھاتا اور نہ کوئی کام خدا کے علاوہ کسی اور قوت کے زیر اثر کرتا ہے حتیٰ کہ اس کو اپنی خواہشات آرزوؤں پر پورا قابو حاصل رہتا ہے اور طبعی دنیا کو کوئی چیز اسے سیدھے راستے سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتی" اس نے اپنے لئے عدل کو لازم کر لیا ہے چنانچہ اس کے عدل کا پہلا قدم خواہشوں کو اپنے نفس سے دور رکھنا ہے۔"

دوسری طرف شر کے راستے پر گامزن یا نصب العین سے بیگانہ انسان درجہ بدرجہ اختیار کی قوت سے محروم ہوتا جاتا ہے۔ "صورت تو اس کی انسانوں کی سی ہے اور جوانوں کا سا، نہ اسے ہدایت کا دروازہ معلوم ہے کہ وہاں تک آسکے اور نہ گمراہی کا دروازہ پہچانتا ہے کہ اس سے اپنا رخ موڑ سکے یہ تو زندوں میں دچلتی پھرتی، لاش ہے۔"

خلاصہ یہ کہ خود حاصل کردہ اختیار عین خیر اور خود ساختہ جبر عین شر ہے اختیار و جبر کی یہ کیفیت اس مقام تک پہنچ جاتی ہے کہ یا تو انسان کلی طور پر اختیار حاصل کر لیتا ہے جہاں اس کی مرضی اور خدا کی مرضی میں فرق ہی نہیں رہ جاتا۔ اس کا کوئی ارادہ خدا سے متصادم نہیں ہوتا اور کوئی خواہش مشیت کے خلاف نہیں ہوتی۔ اخلاق اس کی فطرت بن چکا ہوتا ہے اس مقام تک انسان حیات طبعی میں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو انعام میں اسے جنت ملتی ہے جس کی منفرد خصوصیت اختیار کی کیفیت ہے یہاں پہنچا ہوا انسان جو کچھ چاہے گا وہی ہوگا کیونکہ اس مقام پر اس کی خواہش خدا کی خواہش سے ہم آہنگ رہتی ہے۔

دوسری طرف اس عظیم نصب العین سے پہلو بچا کر نکلنے والا اور کسی دوسرے نصب العین کی خاطر جد و جہد کرنے والا مشیت الٰہی سے تصادم کی بنا پر

بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے اسے نہ اپنی ذات پر اختیار رہتا ہے ، نہ کائنات کی
دوسری موجودات پر آخر کار وہ اسی مجبوری اور بے بسی کی حالت میں موت
کی منزل سے گذرتا ہوا جہنم کے مقام پر پہنچتا ہے جہاں کوئی چیز اس کے اختیار
میں نہیں رہ جاتی اگر وہ ماضی کی طرف پلٹنا چاہتا ہے تو یہ ممکن نہیں ہوتا اگر
اصلاح کی خواہش رکھتا ہے تو اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے یہ مجبوری اس کا مقدر
بن جاتی ہے اور ابدی طور پر ہر اختیار سے محروم ہو جاتا ہے۔

اختیار کا نصب العین منفی صورت کا حامل نصب العین نہیں بلکہ اثباتی
صورت ہے، یعنی یہ ایک ایسا اصول ہے جو اپنے دامن میں لامحدود امکانات
رکھتا ہے کیونکہ ارادۂ انسانی اور مشیت الٰہی کا ایک ہو جانا انسانی ارادے کو
مشیّت کی طرح ایک مسلسل حرکی عمل بنا دیتا ہے جو ازل سے جاری ہے اور
ابد تک جاری رہے گا۔ خدا کا تخلیقی عمل ہر لمحہ آگے بڑھ رہا ہے اور اس عمل
تخلیق کا حامی بھی ہمہ وقت ارتقا کی طرف گامزن رہے گا۔ دوسری طرف
اصول اختیار کا جب مادی اطلاق ہوگا تو انسان کے سامنے اپنی ذات کائنات
اور ان دونوں کے ہمہ وقتی تغیرات ایک مسلسل امتحان کی حیثیت رکھیں گے
اس کی زندگی کا وہ لمحہ اس کے لئے ایک نیا سوال اور نئی صورت حال بن کر
سامنے آئے گا ، اس طرح یہ صوری اصول زندگی کا ایک عملی اصول بھی ہوگا۔

دوسری طرف یہ اصول جہاں فرد کے لئے قابل حصول ہے وہاں اجتماعی
طور پر بھی اس کا حصول ممکن ہے ، کیونکہ خیر واحد ہے اور خدا کا مقصد تخلیق
واحد ہے، اس کی مشیّت سے اگر ایک فرد اتفاق کرے تو اس مرضیِ الٰہی سے
کسی دوسرے فرد کا اتفاق پہلے فرد کے عمل میں مزاحم نہ ہوگا۔ اس تصورِ اختیار
میں فرد کا اختیار جماعت کے اختیار سے متصادم نہیں ہو سکتا کیونکہ اس اختیار
کا تعلق مختلف افراد سے نہیں بلکہ ایک خدا سے ہے چنانچہ اخلاقی نصب العین
کی حیثیت سے اختیار انفرادی بھی ہے اور اجتماعی بھی۔

یہ نصب العین دوامی بھی ہے اور عالمگیر بھی، دوامی اس لیے کہ مشیت ایزدی ایک جبر کی عمل ہے اور اس کے مقصد کا حصول زمان و مکان کا پابند نہیں اس لیے اس عمل کی تقلید ہر لمحہ تازہ بہ تازہ اور نو بہ نو ہے اور عالمگیر اس لیے کہ اس کا تعلق بنیادی طور پر انسان کی فطرت اور ذات سے ہے لہذا جغرافیائی حدود اور زمانی فاصلوں کا اس نصب العین پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اختیار کا عقلی ہونا واضح ہے کیونکہ یہ اختیار مبنی ہے اطاعت الٰہی پر اطاعت الٰہی درحقیقت مشیت الٰہی ہے اور مشیت الٰہی عدل پر مبنی ہے، عدل عقلی ہے اس لیے اخلاقیات کا یہ نصب العین خالصتاً عقل کا موضوع ہے۔

ان سطور میں سب سے پہلے ان شرائط کو طے کیا گیا ہے جو حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے مابعد الطبیعاتی مسلمات کی روشنی میں اخلاقی نصب العین میں ہونا ضروری ہیں، اس بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ادنیٰ اخلاقی نصب العین ــ اولاً ــ لامحدود امکانات کا حامل ہے۔ صوری اصول ہونا چاہیے ــ ثانیاً ــ اس کا بیک وقت انفرادی اور اجتماعی بھی ہونا ضروری ہے۔ ــ ثالثاً ــ اسے دوامی ہونا چاہیے یعنی وہ ہر لمحہ بدستور تازہ رہے ــ رابعاً۔ اس کا عالمگیر ہونا ضروری ہے تاکہ وہ زمان و مکان کی حدود سے بالاتر ہو۔ ـخامساً۔ اس کا عقلی ہونا بھی ناگزیر ہے کیونکہ خدا کی عدل کے پیش نظر اخلاقی نظام عادلانہ ہی ہو سکتا ہے۔ ان شرائط کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ انسان کے لیے مقصد تخلیق کائنات سے کلیتاً آگاہ ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ البتہ اسے اس سے باخبر ہونا چاہیے کہ اس کا نصب العین اسی سمت میں ہو جس سمت میں خدا کا مقصد تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ نصب العین بنیادی مابعد الطبیعاتی مسلمات کا منطقی نتیجہ ہو اسے ایک نئے مفروضہ کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جا سکتا۔

ان شرائط کے تعین کے بعد نصب العین کی نشان دہی کرتے ہوئے

ہم نے دیکھا تھا کہ کائنات کے با مقصد تخلیق کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اعمال اسی مقصد کی تائید میں ہونے چاہئیں جس کے لیے کائنات کی تخلیق ہے ۔ اس مقصد کے لیے خالق کی اطاعت ضروری ہے ۔ یہ اطاعت اس طرح ہو کہ خدا کے بنائے ہوئے عادلانہ قوانین انسانی عادت بن جائیں ۔ اطاعت کا مطلب رضاء الٰہی کی ہمنوائی ہے اس طرح انسان خدا کا ہمنوا بن جاتا ہے ۔ مشیت الٰہی میں ہمنوائی کا یہ مطلب ہے کہ انسان کا ارادہ اور خواہش بھی اتنی ہی با اختیار رہے جتنی خدا کی کیونکہ ایسا انسان جو کچھ چاہے گا وہی خدا بھی چاہتا ہوگا اور جو چیز خدا چاہتا ہوگا وہ لازمی طور پر خدا کے ارادے کے مطابق ہوگی ۔ اس طرح انسان الٰہی قضا و قدر کا ایک مضبوط ستون بن جائے گا ۔ اسی اختیار کا حصول جو انسان اور خدا کی مرضی کو ایک کر دے اخلاقی نصب العین ہے ۔ خیر وہ ہے جو فروغ اختیار کا سبب ہو اور شر وہ عمل ہے جو انسان کو مجبور تر بناتا جائے ۔ جنت مکمل اختیار کا مقام ہے جہاں انسان اور خدا کی رضا کبھی متصادم نہیں ہوتی اور جہنم جبر کا نام ہے جہاں خدا اور انسان کے ارادے کبھی متفق نہیں ہوتے اختیار کا یہ نصب العین ان تمام شرائط کو بھی پورا کرتا ہے جنھیں اخلاقی نصب العین کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے ۔ اس طرح حضرت علی علیہ السلام کے نظام اخلاق میں رضاء الٰہی یا اختیار کاملہ انسان کا اخلاقی نصب العین ہے ۔

حواشی

۱۔ نہج البلاغہ	جلد ۲	خطبہ ۲۱۲	صفحہ ۲۶۴
۲۔ نہج البلاغہ	جلد ۳	وصیت ۳۱	صفحہ ۶۳

توحید ۲۵)

۳- نہج البلاغہ	جلد ۲	خطبہ ۲۱۲	صفحہ ۲۶۴
۴- نہج البلاغہ	جلد ۲	خطبہ ۲۱۲	صفحہ ۲۶۵
۵- نہج البلاغہ	جلد ۱	خطبہ ۱۶	صفحہ ۱۳۰
۶- نہج البلاغہ	جلد ۲	خطبہ ۱۵۵	صفحہ ۸۶
۷- نہج البلاغہ	جلد ۱	خطبہ ۸۵	صفحہ ۲۴۰
۸- نہج البلاغہ	جلد ۱	خطبہ ۸۵	صفحہ ۲۴۰
۹- نہج البلاغہ	جلد ۱	خطبہ ۸۵	صفحہ ۲۴۱

●

جناب مفتی سید طیب آغا جزائری، قم،

امام حسین علیہ السلام کے ارشادات

کے آئینہ میں

حکومت اسلامی کے خدوخال

اس کرۂ زمین ہی کی حکومت نہیں ـــ بلکہ سارے جہان کی حکومت و ملکیت صرف اللہ کے لیے ہے ـــ و للہ ملک السموات والارض (آل عمران/۱۸۹)
یوں تو اللہ کا ارادۂ تشریعی یہی ہے کہ یہ حکومت ہمیشہ " امام معصومؑ " کے ہاتھوں میں رہے، اور اس نے ایسا کر کے دکھا بھی دیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ مردانِ خدا ہی صحیح معنوں میں حکومت کرنا جانتے ہیں اور گرگ و انساں، شیر و بکری کو ایک گھاٹ میں پانی پلا سکتے ہیں، چنانچہ اس نے بطور نمونہ حضرت نوحؑ (بعد طوفان)، حضرت طالوتؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ و حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ریاست و حکومت دینی کے ساتھ ساتھ دنیوی حکومتیں بھی عطا کیں ـــ لیکن
چونکہ ابلیس سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ اس کو بھی اپنی شیطنت کے رنگ و روپ دکھانے کا موقعہ دے گا تاکہ اس ضمن میں اس کی سابقہ عبادت کا عوض بھی ادا ہو جائے اور اللہ کے مخلص بندوں کی شناخت بھی ہو جائے

اس لیے ان "الٰہی حکومتوں" کے روکنے کو شیطانی حکومتیں آڑے آتی رہیں، انہوں نے بنی نوع انسان کے خون سے خوب ہولی کھیلی اور دل کھول کر ظلم و ستم کے بیج بوئے خدا بھی کچھ نہ بولا — اس نے بندہ کو مختار جو پیدا کیا ہے "لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی" اب جبکہ لوگوں نے ظالموں ہی کو اپنی گردن پر سوار کرلیا ہے تو وہ ہی سہی — آخر کسی نہ کسی کو تو اس دنیا کا نظام چلانا ہے (لا بد للناس من حاکم برّ او فاجر)

اگر لوگ نیک بندوں کی حکومت کو قبول نہ کریں گے تو بدکاروں کا تخت حکومت پر آجانا لازمی نتیجہ ہے، یہ نظام قدرت بھی ہے اور قانون فطرت بھی۔ پھر خدا کو کوئی جلدی بھی نہیں ہے — "والی اللہ عاقبۃ الامور" (لقمان/۲۲)

جب ہر طرح کی اہریمنی و ابلیسی و طاغوتی نظام فیل ہو جائیں گے، اور ساری دنیا فیل مچانے لگے گی تو آخر میں خدا اس زمین کے وارثان حقیقی کو تخت حکومت سونپ دے گا؛

«ولقد كتبنا فى الزبور من بعد الذكر أن الارض يرثها عبادى الصالحون» (انبياء/ ١٠٥)

ہم نے قرآن کے علاوہ زبور میں بھی یہ لکھ دیا تھا کہ (آخر میں) زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔

لیکن یہاں پر ایک اہم سوال یہ ہوتا ہے کہ:

"ظالم اور طاغوتی حکومتیں کیا چاہتی ہیں، اور عادل و لاہوتی حکومتوں کا کیا منشا ہے؟"

اس مقالہ میں ہم ارشادات امام عالی مقام حضرت حسین علیہ الصلوٰۃ و السلام کی روشنی میں اس سوال کو حل کرنے کی کوشش کریں گے۔

کون حسینؑ؟ وہ حسینؑ جن کی نہضت سے بڑھ کر دنیا میں کسی کی نہضت نہ تھی۔

یہ نہ کہئے گا کہ ـــ تم نے نہضت حسینی کو نہضت محمدی سے بھی آگے بڑھا دیا نہیں، بڑھایا نہیں ہے، بڑھنے کا سوال وہاں ہوتا ہے جہاں دو چیزیں ایک دوسرے سے الگ ہوں، جبکہ واقعہ یہ ہے کہ "نہضت حسینی" تتمہ ہے "نہضت محمدیؐ" کا اور مقدمہ ہے "نہضت قائمی" کا "نہضت محمدی" ـــ "نہضت حسینی" ـــ "نہضت قائمی" ایک "حکومت اسلامی" کا صحیح تصور پیش کرتی ہیں۔

پیغمبر اسلامؐ کس طرح کی حکومت چاہتے تھے؟

"حسنِ عقیدہ" ـــ اور ـــ "حسن عمل" انہی دونوں چیزوں کے لیے سارے رسول آئے اور آخری رسول بھی اسی غرض کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ـــ یہی خلاصہ ہے اس دینِ الٰہی کا جس کے لیے ارشاد ہوتا ہے: انّ الدّین عند اللّٰہ الاسلام (آل عمران/۱۹)

"حسن عقیدہ" اور "حسنِ عمل" ان دونوں کا اگر تجزیہ کیجئے تو یہ پانچ اصول برآمد ہوتے ہیں:

۱۔ اس خدا کو مانیں جو واقعی خدا ہے۔
۲۔ اس نبی کو تسلیم کریں جو واقعی نبی ہے۔
۳۔ اس امام (نائب نبی) کو قبول کریں جو واقعی امام ہے۔
۴۔ اس عبادت کو بجالائیں جو واقعی عبادت ہے۔
۵۔ ان معاملات پر عمل کریں جو واقعی معاملات ہیں۔

یہ پانچ اصول نہیں ہیں ـــ بلکہ پانچ سمندر ہیں، انکو اگر ایک کوزہ میں بند کرنا چاہتے ہیں تو ایک جامع لفظ میں سمیٹ لیجئے، وہ لفظ ہے "حق" اس لفظ کے اندر سارے محاسن سمٹ کر آگئے ہیں۔

قرآن نازل ہوا ہے تو اسی لئے: نزل علیک الکتاب بالحق (آل عمران/۲)

سارے رسول آئے تو اسی لیے : لقد جاءت رسل ربنا بالحق (اعراف/ ۴۳)
ہمارا رسول آیا تو اسی لیے: قد جاء کم الرسول بالحق (نساء/ ۱۶۹)
ملائکہ نازل ہوتے ہیں تو اسی لیے : ما ننزل الملائکۃ الا بالحق (حج/ ۸)
بلکہ ذات واجب الوجود کی بھی ایک تعبیر قرآنی ہے حق: ذلک بأن اللہ هوالحق (حج/ ۶)۔
وہ جو کچھ کہتا ہے وہ بھی حق ہوتا ہے: واللہ یقول الحق (احزاب/ ۴)
پھر یہ کہ حکومت الٰہی اور ولایت حقیقی بھی خدائے برحق کے لئے ہے : هنالک الولایۃ للہ الحق (کہف/ ۴۵)
پیغمبر اسلامؐ نے بھی ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی تھی جس میں ہر طرف حق کا بول بالا تھا، یعنی انسانی اقدار کی قیمت تھی، مظلوموں کی حمایت اور ظالموں کی سرکوبی تھی، معروف کی ترغیب، منکر سے بچنے کی تعلیم تھی، طاعت خالق محبت مخلوق کی طرف ہدایت تھی، غرور و تمکنت کی وجہ سے کوئی سرفراز نہ تھا، امیر و فقیر کا امتیاز نہ تھا، ایک ہی لشکر میں سارے غازی، اور ایک ہی صف میں سارے نمازی دکھلائی دیتے تھے۔ یعنی خالق و مخلوق دونوں کا حق ادا ہو رہا تھا۔
یہی وہ حسین نقوش ہیں جو حسینؑ کے خطاب اور ارشادات میں جواہر آبدار کی طرح بکھرے نظر آتے ہیں۔

دربارِ ولید میں امام حسینؑ کا اظہارِ حق ۔

امام حسین علیہ السلام کی باطل سے سب سے پہلی مڈبھیڑ دربار ولید بن عتبہ میں ہوئی جہاں اس نے آپ سے یہ خواہش کی کہ آپ یزید کی بیعت کریں، آپ نے اس کا جو جواب دیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت الٰہی کے لیے وہ افراد مناسب ہیں جن کا رابطہ اللہ سے ہو نہ کہ وہ جو ابلیس سے مرتبط ہوں ، آپ نے فرمایا :

«ایہا الامیر إنا أهل بیت النبوة، ومعدن الرسالة، ومختلف الملائكة، ومحل الرحمة، بنا فتح الله، وبنا ختم، ویزید رجل فاسق، شارب خمر، قاتل النفس المحرمة، معلن بالفسق، ومثلی لا یبایع مثله، ولكن نصبح وتصبحون وننظر وتنظرون أینا أحق بالخلافة والبیعة»*

اے امیر! یقیناً ہم اہل بیت نبوت ہیں، اور رسالت کی کان ہیں ملائکہ کی آماجگاہ، رحمت الٰہی کا ٹھکانا ہیں، ہم سے اللہ نے اس کائنات کا آغاز کیا، اور ہم پر ہی اس کا خاتمہ کرے گا، اور یزید ایک فاسق و شرابی ونفس محترمہ کا قاتل شخص ہے جو علی الاعلان فسق و فجور کرتا ہے اور مجھ جیسا کبھی اس جیسے کی بیعت نہیں کرسکتا، لیکن ہم بھی صبح کریں اور تم بھی صبح کرو، ہم بھی نظر کریں اور تم بھی نظر کرو کہ ہم میں سے کون خلافت اور بیعت کا سزاوار ہے۔

حضرت کی اس گفتگو سے واضح ہوتا ہے کہ بعد رسولؐ سزاوار حکومت صرف اہل بیت رسولؐ ہیں، اگر یزید فاسق و فاجر نہ بھی ہوتا تب بھی خلافت کی اہلیت نہیں رکھتا تھا چہ جائیکہ وہ ان خرابیوں میں بھی مبتلا تھا۔

امام حسین علیہ السلام کی وصیت

انسان کا حقیقی کردار، اور اس کے اصلی افکار اس کی وصیت میں نمایاں ہوتے ہیں، مدینہ سے چلتے وقت آپ نے جو وصیت اپنے بھائی حضرت محمد حنفیہ کو لکھ کر دی اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ کیسی حکومت چاہتے تھے، آپ حق کی حکومت چاہتے، ایسی حکومت جس میں ہر طرف حق کی روشنی ہو:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هذا ما اوصىٰ به الحسین بن علی بن ابی طالب الی اخیه محمد المعروف بابن الحنفیه ان الحسین (ع) یشهد ان لا اله الا الله وحده لا شریك له و

---

* مثیر الاحزان ابن نما حلی (چھٹی صدی ہجری)، تاریخ اعثم کوفی ۵/۱۸

أن محمدا صلى الله عليه واله عبده ورسوله جاء بالحق من عند الحق وأن الجنة والنار حق وأن الساعة آتية لا ريب فيها وأن الله يبعث من في القبور وإني لم أخرج أشرا ولا بطراً ولا مفسداً ولا ظالماً وانما خرجت لطلب الاصلاح في امة جدي(ص) اريد أن آمره بالمعروف وانهى عن المنكر واسير بسيرة جدّي(ص) وأبي علي بن ابي طالب (ع) فمن قبلني بقبول الحق فالله اولى بالحق ومن رد علي هذا اصبر حتى يقضي الله بيني وبين القوم بالحق وهو خير الحاكمين وهذه وصيتي يا اخي اليك و ما توفيقي الا بالله عليه توكلت واليه انيب.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ وہ امر ہے جس کی وصیت کی حسین بن علی بن ابی طالب نے اپنے برادر محمد عرف ابن حنفیہ کی جانب کہ حسین گواہی دیتا ہے کہ خدائے وحدہ لا شریک کے سوا کوئی خدا نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں جو حق کی طرف سے حق لے کر آئے اور یہ کہ جنت و دوزخ برحق ہیں، قیامت آکے رہے گی، اس میں کوئی شک نہیں ہے، اور خدا قبر والوں کو اٹھائے گا، اور یہ کہ میں نے جو قدم اٹھایا ہے کسی نادانی اور طغیانی کی وجہ سے نہیں، نہ میں مفسد ہوں نہ ظالم، میں نے محض اپنے جد کی امت کی اصلاح کی غرض سے یہ پیش قدمی کی ہے میں چاہتا ہوں کہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کروں اور اپنے جد اور باپ کی سیرت پر چلوں، پس جس نے بھی اس کو قبول کیا حق کے قبول کرنے کے ساتھ تو اللہ حق کے لیے زیادہ سزاوار ہے اور بہترین حاکم ہے، اور یہ میری وصیت ہے تم سے اے بھائی! اور اللہ ہی سے توفیق چاہتا ہوں، اسی پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

یہ لکھ کر آپ نے وہ نوشتہ لپٹیا اور اس پر اپنی مہر لگادی اور اپنے بھائی محمد کو

دیدیا اور پھر ان سے رخصت ہو کر آدھی رات کو روانہ ہو گئے۔[1]

نیز یہی الفاظ "انی لم اُخرج اشراً ولا بطراً ۔۔۔ وانما خرجت اطلب الصلاح فی امۃ جدی محمدؐ" آنحضرت نے ابن عباس کے جواب میں بھی فرمائے تھے۔[2]

امام علیہ السلام کے مذکورہ الفاظ سے دو باتیں واضح ہوئیں:

۱۔ "اشر و بطر" کے معنی ہیں زیادتی نعمت کی وجہ سے اپنے آپ سے باہر ہو جانا۔ مقصد یہ ہے کہ میں رسول اللہؐ کا نواسہ یا علیؑ و فاطمہؑ کا فرزند ہونے کی وجہ سے کسی غرور و تمکنت میں مبتلا نہیں ہوں کہ اپنی خاندانی وجاہت بچانے کے لیے بغیر سوچے سمجھے اتنا بڑا اقدام کر بیٹھوں۔ نہیں، میرا قیام عاقلانہ و حکیمانہ ہے۔

۲۔ حکومت اسلامی وہ حکومت ہے جس میں حق کا بول بالا ہو، سنت محمدی اور سیرت حیدری پر مو بہ مو عمل کیا جائے۔

اہل کوفہ کے خطوط کا جواب

اہل کوفہ کے ہزاروں خطوط کے جواب میں آپ نے اپنا آخری خط ہانی بن ہانی اور سعید بن عبداللہ کے ہاتھ جو بھیجا تو اس کے الفاظ یہ تھے:

...... اما بعد فان ھانیا و سعیداً قدما علیّ بکتبکم
...... فلعمری ما الامام الا الحاکم بالکتاب القائم بالقسط
الدائن بدین الحق الحابس نفسہ علیٰ ذات اللّٰہ
والسلام۔[3]

ہانی اور سعید کے ذریعہ جو خط تم (اہل کوفہ) نے مجھ کو بھیجے میں ان کے مضمون سے آگاہ ہوا ۔۔۔ اپنی جان کی قسم امام نہیں ہو سکتا مگر وہ شخص جو کتاب خدا کے مطابق حکم کرے، انصاف پر قائم رہے، دین حق کا پابند ہو، اپنے نفس کو ذات خداوندی کا اسیر کر دے، والسلام۔

(۱) مقتل عوالم ص ۵۴، مقتل خوارزمی ۱/۱۸۸ (۲) مناقب ابن شہر آشوب (چھٹی صدی) ۲۴۱/۲ (۳) نفس المہموم ص ۵۰ روایت از شیخ مفیدؒ

لشکرِ حُر کے سامنے حضرتؑ کا پہلا خطبہ۔

امام حسین علیہ السلام نے حُر بن یزید ریاحی کے لشکر کے سامنے تین خطبے دیئے جن سے پتہ چلتا ہے کہ "حکومت اسلامی" کا خاکہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں امام کیا چاہتے تھے، پہلا خطبہ نماز ظہر سے پہلے ارشاد کیا، اس میں آپ نے فرمایا:

ایھا الناس! انھا معذرة الی اللہ عزوجل والیکم، انی لم آتکم حتی اتتنی کتبکم وقدمت بھا الی رسلکم أن أقدم علینا فانه لیس لنا امام ولعل اللہ أن یجمعنا بك علی الھدیٰ ـ فان کنتم علی ذلك فقد جئتکم فاعطونی ما اطمئن به من عھودکم ومواثیقکم ـ وان کنتم لمقدمی کارھین، انصرفت عنکم الی المکان الذی جئت منه الیکم[1]

اے لوگو! یہ میرا عذر ہے اللہ کے سامنے اور تمہارے سامنے، میں تمہارے پاس اس وقت تک نہیں آیا جب تک کہ تمہارے خطوط نہ آئے اور تمہارے فرستادہ نمایندے نہ آئے، انہوں نے کہا کہ آپ ہماری طرف آجائیے، ہمارا کوئی امام نہیں ہے۔ شاید اللہ آپ کی وجہ سے ہم کو ہدایت پر اکٹھا کردے، پس اگر تم اپنے اس قول پر باقی ہو تو لو میں تمہارے پاس آگیا ہوں۔ اپنے عہدوں کو پورا کرو، اور اگر تم کو میرا آنا ناگوار ہے تو میں وہیں پلٹا جاتا ہوں جدھر سے آیا ہوں۔

حضرت کے اس کلام سے دو چیزیں معلوم ہوئیں:

۱۔ حضرت خود نہیں آئے بلکہ لوگوں کے اصرار پر آئے، انہوں نے کہا کہ ہم بغیر امام کے ہیں کوئی ہماری ہدایت کرنے والا نہیں ہے، ظاہر ہے اس صورت میں ہر رہبر کا فریضہ ہے کہ اپنی امت کی رہبری کرے ورنہ بروز قیامت خدا کو کیا جواب دے گا۔ امام حسین علیہ السلام اسلامی سیاست اور قانونی حیثیت کے روبرو تھے۔ سیاسی نقطۂ نظر سے عوام کا واقعی ایک بڑا گروہ یزید سے بیزار تھا اور وہ احتجاج

[1] تاریخ ابن اثیر ۳/۲۸۰۔ بحوالہ حیات امام حسینؑ تالیف باقر شریف ۳/۷۸

کے لیے باہر نکلنے کو تیار تھا۔ اسے ایک رہنما چاہیے تھا۔ مذہبی لحاظ سے امام حسینؑ سلسلہ وار ایک بہت بڑی سیاسی تاریخ اور دینی پس منظر کی روایت رکھتے تھے اور اب وقت آچکا تھا کہ انحراف و منحرفین پر سخت چوٹ لگائیں۔

یہ کہنا کہ چونکہ اہل کوفہ نے ان کے بابا اور بھائی کے ساتھ بے وفائی کی تھی لہٰذا امام حسین علیہ السلام کو ان کی بات نہ ماننا چاہیے تھی، عوام الناس کے لئے تو شاید درست ہو، مگر امام حسین علیہ السلام جیسا عظیم رہنما اس بات کو قاعدۂ کلیہ کیسے سمجھ سکتا تھا! جبکہ اہل کوفہ میں میثم تمار، رشید ہجری، مسلم بن عوسجہ، حبیب بن مظاہر جیسے عاشقانِ خدا و فدائیانِ حسینؑ موجود تھے۔

۲۔ آپ کی قانونی اور سیاسی ذمے داری و منصب امامت کا تقاضا تھا کہ حالات کے بارے میں موثر کردار ادا کریں اور اندھیروں میں روشنی کی ایک ایسی لکیر ڈال دیں جو آہستہ آہستہ شعلہ اور مینارِ نور بن جائے۔ امام حسین علیہ السلام نے قدم بڑھایا اور کربلا کا رخ کیا۔ وقت اتنا نازک اور اقدام اتنا اہم تھا کہ سب ہکا بکا رہ گئے۔ یزید کی شہنشاہی کا طنطنہ، عوام کی دعوت، امام حسین علیہ السلام کی للکار نے، حکومت دوستوں کو لرزا دیا۔ ان کی منطق لاجواب تھی۔

لشکر حُر کے سامنے امام حسینؑ کا دوسرا خطبہ

امام حسین علیہ السلام نے پہلا خطبہ دے کر نماز ظہر ادا کی۔ آپ کے اصحاب اور لشکر حر دونوں نے آپ کی اقتداء میں نماز پڑھی، نماز کے بعد کھانا کھایا گیا تھوڑی دیر کے بعد نماز عصر کا وقت آگیا، نماز عصر بھی دونوں لشکروں نے آپ کے پیچھے پڑھی جب پورا مجمع نماز و تعقیبات سے فارغ ہو گیا تو حضرت دوبارہ کھڑے ہوئے اور خدا کی حمد و ثنا و نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد یہ تقریر کی :

«ایها الناس! ان تتقوا الله وتعرفوا الحق لاهله یکن ارضیٰ لله، ونحن اهل البیت اولی بولایة هذا الامر من هؤلاء المدّعین ما لیس لهم؛ والسّائرین فیکم بالجور والعدوان؛ فان انتم کرهتمونا وجهلتم حقنا وکان رأیکم الآن علی غیر ما اتتنی به کتبکم؟ انصرفت عنکم.[1]

اے لوگو! اگر تم اللہ سے ڈرو اور اہل حق کے حق کو پہچانو تو یہ اللہ کی رضامندی کا زیادہ باعث ہوگا، اور ہم ہیں اہلبیت رسول اللہ جو اس امر (حکومت اسلامی) کے لیے اولیٰ ہیں ان سے جو اس کے جھوٹے دعویدار ہیں اور تم پر ہر طرح کا ظلم و جور کر رہے ہیں، پس اگر تم ہم کو ناپسند کرتے ہو اور ہمارے حق کے منکر ہو گئے ہو اور اب تمہاری رائے تمہارے خطوط کے مضمون سے مختلف ہو گئی ہے تو میں تم سے قطع نظر کرتا ہوں۔

اس خطبہ میں بھی حضرت نے اس بدقسمت قوم کو جن امور کی طرف توجہ دلائی وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ حکومت اسلامی کے جائز حقدار اہل بیت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

۲۔ یزید اور اس جیسے افراد جھوٹے دعویدار ہیں۔

۳۔ ان کے اس دعوے کے بطلان کی دلیل ان کا ظلم و عدوان ہے کیونکہ حاکم عادل حکومت اسلامی کبھی رعایا پر ظلم نہیں کرتا۔

۴۔ اگر تم اپنے خطوط میں لکھے ہوئے مطالبے سے منحرف ہو گئے ہو ہمارے حق کو فراموش کر رہے ہو اور ہمارا آنا پسند نہیں کرتے تو ہم بھی تم سے کوئی مطلب نہیں رکھتے، ہم جو راستہ اپنے لیے طے کر چکے ہیں اس پر آگے بڑھتے رہیں گے۔ تم سے ہمیں نہ پہلے امید تھی نہ اب ہے۔ ہم تو اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

لشکر حُر کے سامنے حضرت کا تیسرا خطبہ

جب امام حسین علیہ السلام مقام "بیضہ" میں پہنچے، لشکر حر بھی آپ کے ساتھ

(۱) تاریخ ابن اثیر ۳/۲۸۰ بحوالہ حیات امام حسین ۳/۸۰۔ ارشاد مفید بحوالہ مقتل سید مقدم ص ۲۱۶

ساتھ چل رہا تھا، اس مقام پر حضرت نے منزل کی اور ایک ایسا خطبہ ارشاد کیا جس میں "حکومت اسلامی" اور "حکومت باطل" کے نقوش و حدود اچھی طرح واضح کر دیے ۔ حضرت اپنی شمشیر پر سہارا دے کے کھڑے ہوئے اور خدائے متعال کی حمد و ثنا اور صلوات بر رسول خدا کے بعد یوں ارشاد فرمایا :

«ایها الناس إن رسول الله (ص) قال: «من رأى سلطانا جائرا مستحلاً لحرم الله، ناكثاً لعهدالله، مخالفاً لسنة رسول الله (ص) يعمل فى عبادالله بالاثم والعدوان؛ فلم يغير ما عليه بفعل ولاقول كان حقاً على الله أن يدخله مدخله الخ»[1]

لوگو! حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ظالم بادشاہ کو دیکھے کہ وہ محرمات الٰہی کو حلال کرنے والا ہو، اور اللہ کے عہد کو توڑنے والا ہو، رسول اللہ کی سنت کا مخالف ہو اللہ کے بندوں میں گناہ اور سرکشی کا برتاؤ کرے، اور اس کو اپنے فعل سے بدلنے کی کوشش نہ کرے اور نہ اس پر اپنے قول سے اعتراض کرے تو اللہ کو اس کا حق ہے کہ وہ اس شخص کو جہنم میں داخل کرے جس جگہ ظالم بادشاہ کو داخل کرے گا ۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا :

"آگاہ ہو جاؤ! کہ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت کو اختیار کیا ہے، اور رحمان کی اطاعت کو ترک کر دیا ہے ۔ فتنہ و فساد کو آشکار کیا ہے، اور حدود الٰہی کو معطل کر دیا ہے اور مالِ خدا پر قبضہ کر لیا ہے، اور میں اپنے غیر سے اس حکومت الٰہی کے لیے اولیٰ ہوں ۔ میرے پاس تمہارے خطوط آئے، اور نمایندے بھی آئے اور انہوں نے کہا کہ تم نے میری بیعت کی ہے اور اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ آخر

[1] طبری ۶/ ۲۲۹

وقت تک اس بیعت پر باقی رہو گے اور مجھ کو تنہا نہ چھوڑو گے،
پس اگر تم اپنی بیعت پر باقی ہو تو راہ ہدایت پاؤ گے کیونکہ میں حسینؑ
بن علیؑ اور پسر فاطمہ زہراؑ بنت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں،
میری جان تمہاری جان کے ساتھ ہے اور میرے متعلقین تمہارے
متعلقین کے ساتھ ہیں (یعنی جو تم پر گذرے گی وہ مجھ پر بھی گذرے
گی اور دونوں کا ایک انجام ہوگا)

اور اگر تم نے ایسا نہ کیا اور میری بیعت کو توڑ دیا اور اپنے وعدے
سے پھر گئے تو اپنی جان کی قسم یہ تم سے کوئی بعید نہیں ہے کیونکہ تم نے
یہی سلوک میرے باپ، بھائی اور ابن عم مسلم کے ساتھ بھی کیا تھا اب
اگر کوئی تم سے دھوکا کھائے گا تو وہ بڑا دھوکا اٹھانے والا ہوگا
تم نے (میرا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ) اپنا ہی نقصان کیا ہے، کیونکہ جو
بیعت توڑتا ہے وہ اپنے کو نقصان پہنچاتا ہے اور مجھ کو عن قریب
تم لوگوں سے اللہ بے نیاز کر دے گا۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ہمارے موضوع "خطبات امام حسینؑ میں حکومت اسلامی کے نقوش" سے مربوط
یہ آخری خطبہ ہے، کیونکہ اس کے بعد کے خطبات وارشادات میں زیادہ تر موعظہ
وارشاد کا پہلو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

بہرحال مذکورہ بالا خطبہ سے حسب ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے:

۱۔ "سلطان جائر" چاہے بادشاہ کے لباس میں ہو یا خلافت کا روحانی
لبادہ اوڑھے اس کے مظالم کے سامنے سکوت حرام ہے، اگر شرائط "اقدام"
موجود ہوں تو اس کے خلاف اقدام کرنا چاہیے ورنہ اپنے قول سے اس کے اعمال
بد سے بیزاری کا اظہار کرنا چاہیے، یہ بھی اس وقت ہے جبکہ منافی حکم تقیہ نہ ہو،
ورنہ بعض اوقات ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک حرف حق کہنے کی وجہ سے اپنی یا کسی
دوسرے مومن کی جان بھی چلی جاتی ہے اور دین کے لیے کوئی نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا۔

کہاں اقدام و قیام کرنا چاہیے، اور کہاں خاموشی اختیار کرنا چاہیے؟ یہ سمجھنا عام اشخاص کا کام نہیں ہے، اس کو تو صرف "فقیہ جامع الشرایط" ہی سمجھ سکتا ہے کیونکہ ہمارے سامنے امام حسین علیہ السلام اور امام حسن علیہ السلام دونوں اماموں کی سیرتیں موجود ہیں، تشخیصِ فعلِ امام، نائب امام برحق کا کام ہے۔

۲۔ اس خطبہ میں امام عالی مقام نے یہ بتلا دیا کہ جس حکومت کی بنیاد شیطان کی پیروی پر ہو، اور اس میں خدائی فرامین کی مخالفت کی جائے، ظلم و فساد کا رواج ہو، حدود الٰہی میں تحریف کی جائے، حلال کو حرام، حرام کو حلال کر دیا جائے وہ باطل حکومت ہے، خلافت الٰہیہ اور "حکومت اسلامی" سے اس کو دور کا لگاؤ نہیں ــــ اور یزیدی حکومت اس کا بہت واضح نمونہ ہے۔

۳۔ "حکومت الٰہی" کی ذمہ داری کا جائز وارث امام وقت ہے، اس کی موجودگی میں یزید جیسوں کو کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔

۴۔ ناواقفِ حقائق عوام کی مخالفت سے امام وقت کے فیصلے اور اقدام کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ امام براہ راست فیصلہ کرتا ہے۔ امام ان لوگوں کا ہرگز پابند نہیں جو آئے دن رائے بدلتے اور ہر ہوا کے ساتھ جگہ بدلتے ہوں۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم تمہارے پابند ہیں۔ اگر تم کہو تو میں یہاں سے چلا جاؤں، کوفہ نہ سہی کربلا، کربلا نہ سہی نجف و بغداد۔ مجھے کرنا تو وہی ہے جو میری ذمہ داری ہے۔ تم کو تکلیف دینا ہمارا مقصد نہیں ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت نے کسی قسم کی کمزوری یا خوف کا اظہار فرمایا تھا، اس وہم کو آپ نے اس وقت دور کر دیا جب اس خطبہ کے بعد حر نے کہا:

«انی اذکرك الله فی نفسك فانی اشهد لئن قاتلت لتقتلنّ»

میں آپ کی جان کے بارے میں آپ کو خدا یاد دلاتا ہوں، کیوں کہ مجھ کو یقین ہے کہ اگر آپ نے جنگ کی تو آپ ضرور قتل کیے جائیں گے۔

آپ نے فرمایا "أبالموت تخوفني" "کیا تو مجھ کو موت سے ڈراتا ہے؟ اس کے جواب میں میں تجھ سے کیا کہوں سوائے اس کے کہ میں وہی اشعار پڑھے دیتا ہوں جو مرد" اوسی" نے اپنے چچا زاد بھائی کے سامنے اس وقت پڑھے تھے جب اس نے اس کو رسول اللہ کی مدد کرنے سے روکا تھا اور یہ کہا تھا کہ ــ "این تذهب فانك مقتول" "تو کہاں جاتا ہے؟ تو مار دیا جائے گا۔ اس کے بعد آپ نے یہ اشعار پڑھے:

سأمضي وما بالموت عار على الفتى	اذا ما نوى خيرا وجاهد مسلما
وآسى الرجال الصالحين بنفسه	وخالف مثبورا وفارق مجرما
فان عشت لم أندم وان مت لم ألم	كفى بك ذلاً أن تعيش وترغما[1]

میں اپنے اسی راستہ پر چلوں گا، اور مرد آزاد کے لیے مرنے میں کوئی ذلت نہیں ہے جبکہ اس کی نیت خیر ہو، اور مسلمان ہونے کی حالت میں جہاد کرے۔

اور اپنی جان کو نیکو کار لوگوں پر فدا کر دے اور ملعون و مجرم لوگوں سے مخالفت کرے۔

پس اگر میں زندہ رہا تو مجھ کو ندامت نہ ہوگی، اور اگر مارا گیا تو ملامت نہ ہوگی۔ بہر حال تیرے لیے یہ ذلت بہت بڑی ہے کہ ذرا سی زندگی حاصل کرنے کے لیے تیری ناک رگڑ دی جائے۔

مصادر

○ ـــ قرآن مجید

○ ـــ مثیر الاحزان؛ ابن نما حلی

○ ـــ تاریخ، اعثم کوفی

○ ـــ مقتل عوالم۔

○ ـــ المقتل؛ خوارزمی

○ ـــ المناقب: ابن شہر آشوب

○ ـــ نفس المهموم: شیخ عباس قمی

○ ـــ التاریخ: ابن اثیر

○ ـــ الامام الحسین: باقر شریف

○ ـــ المقتل: عبدالرزاق المقرم

(۱) تاریخ طبری، تاریخ ابن اثیر ۲۸۱/۳

جناب ڈاکٹر نبی بخش قاضی
پاکستان

ذکر و فکر
مشرق اور مغرب

ذکر و فکر ایک فلسفی و عملی مسئلہ بھی ہے اور مشرق و مغرب میں علمی بحث و نظر کا موضوع بھی۔ ہم اس گفتگو کا آغاز دنیا کی سب سے عظیم فکری کتاب قرآن حکیم کے حوالے سے کرنا چاہتے ہیں، قرآن مجید میں اس موضوع پر بڑی روشنی ہے:

> وللّٰه مُلك السمٰوٰت والارض ـ والله على كل شيء قدير ـ انّ فی خَلْق السمٰوٰت والارض واختلاف الّيل والنهار لآيٰتٍ لاولی الالباب ـ الّذين يذ كرون الله قياماً وقعوداً وعلىٰ جنوبهم و يتفكّرون فی خلق السمٰوٰت والارض ربّنا ما خلقت هذا باطلا سبحنك فقنا عذاب النار.
>
> (آل عمران: آيات ۱۸۹ تا ۱۹۱)

آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے ـ اور اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی خلقت (بنانے) میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہل عقل کے لیے آیات (یا نشانیاں یا دلائل) ہیں۔ (وہ اہل عقل) جو رب تعالیٰ کو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں (اور کہتے ہیں) اے

ہمارے پروردگار! تو نے اس (آسمانوں اور زمین) کو لایعنی یا بغیر کسی مقصد کے پیدا نہیں کیا۔ تو سب چیزے اعلیٰ اور ہر عیب سے منزہ ہے۔ سو ہم کو عذاب آتش (دوزخ) سے بچا یا پناہ میں رکھ۔

اوپر لکھی ہوئی قرآنی آیات میں اور دیگر خدائی الفاظ کے ساتھ دو فقرے قابلِ غور ہیں **یذکرون** اور **یتفکرون**۔ اور اہلِ عقل کی عملی صفات بتائی گئی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم الفاظ "ذکر" اور "فکر" [جو "یذکرون" اور یتفکرون کے اصل مادّے (ROOT) ہیں] کی عالمی یا بین الاقوامی تاریخی تشریح کریں اور پھر قرآن کریم کی روشنی میں ان دونوں عملی صفات کا "اولی الالباب" میں باہم جمع ہونے کی اہمیت بیان کریں، چاہیے کہ ان دونوں الفاظ کا مفہوم سمجھیں۔

"ذکر" اور "فکر" کے لغوی معنی:

ذکر: معروف فقیہ اور مفسر الحسین بن محمّد الدامغانی (ولادت ۴۰۰ھ) اپنی تألیف "الوجوہ والنظائر" میں "ذکر" کے ۱۸ معنی ذکر کرتے ہیں جن میں "الذکر باللسان" اور "الذکر بالقلب" شامل ہیں[1]۔ اور راغب اصفہانی (وفات ۵۰۲ھ) نے بھی "ذکر" کے معنی زبان اور دل سے یاد کرنے کے دیئے ہیں۔[2] قرآن میں یہ لفظ

۱ ــ ذلك ر: على ثمانية عشروجهاً: العمل الصالح ــ الذكر باللسان ــ الذكر بالقلب ــ الذكر على الأمر والقصة ــ الحفظ ــ العظة ــ الشرف ــ الخبر ــ الوحى ــ القرآن ــ التوراة ــ اللوح المحفوظ ــ البيان ــ التفكر ــ الصلوات الخمس ــ صلاة واحدة ــ التوحيد ــ الرسول ــ «فاذكروا الله» يعنى باللسان «قياماً وقعوداً و على جنوبكم» الخ (قاموس القرآن او اصلاح الوجوه والنظائر فى القرآن الكريم لحسين بن محمّد الدامغانى حققه ورتبه واكمله واصلحه عبدالعزيز سيّد الاهل دارالعلم للملايين بيروت ــ الطبعة الثانية ۱۹۷۷ ص ۱۸۰).

۲ ــ و «الذكر» يقال اعتباراً باستحضاره وتارةً يقال لحضور الشيء القلب او القول ولذلك قيل الذكر ذكران: ذكرٌ بالقلب وذكر باللسان (معجم مفردات الفاظ القرآن للعلامة الراغب الاصفهانى تحقيق نديم مرعشلى ــ دارالكاتب العربى ۱۳۹۲ ھ ص ۱۸۱).

متعدد آیات میں دونوں معنوں میں آیا ہے۔ جن میں سے ہم صرف دو جگہ کا ذکر کرتے ہیں:

وَاذْكُرْ رَبَّكَ كثيراً وَسَبِّحْ بِالعَشيِّ والابكار (سوره آل عمران: ۴۱)

اور: واذكر ربك فى نفسك تضرعاً وخيفة (سوره الاعراف: ۲۰۵)

فکر: عربی لغت "اقرب الموارد" کے مؤلف کے مطابق "فکر" کے معنی قلب کا نظر و تدبر کے ساتھ بار بار معانی یا حقائق کی تلاش (تحقیق اور کھوج) کرنا ہے۔[1] قرآنی لغت "معجم مفردات الفاظ القرآن" کے مؤلف الراغب الاصفہانی "فکر" کے معنی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ (انسان کی) اندرونی یا قلبی قوت ہے جو (انسان کو) علم یا جاننے کے ذریعے "جانی ہوئی چیز" (معلوم) تک پہنچاتی ہے اور "تفکر" اس قوت کا جولان (مشق یا گردش) ہے۔ انھوں نے لفظ "فکر" کو لفظ "فرک" کا الٹا (مقلوب) بتایا ہے اور لکھا ہے کہ حقائق (IDEAS) پر فکر کرنے کے معنی ہیں ان باتوں (اشیاء اور امور) کی حقیقت جاننے کے لیے کھوج لگانا، تفتیش کرنا، تفحص اور تلاش کرنا جو صرف انسان کرسکتا ہے اور حیوان کے لیے نہیں ہے۔[2]

اولی الالباب (اولوا الالباب) "الباب" "لبّ" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: خالص سمجھ بوجھ۔ عقل خالص (PURE REASON)۔ ادراکی قوت عقل اور سمجھ کا پاک

---

۱ ــ الفِكر: تردّد القلب بالنظر والتدّبر بالطلب المعانى (اقرب الموارد فى فصح العربية والشوارد ــ الجزء الثانى تأليف سعيد الخورى الشرتونى اللبنانى ــ من منشورات مؤسسة النصر ــ طهران ص ۹۳۹)

۲ ــ فكر: الفِكرة قوةٌ مُطْرِقَةٌ للعلم الى المعلوم ــ والتفكّر جولان تلك القوة بحسب نظر العقل وذلك للانسان دون الحيوان ولا يقال الاّ فيما يمكن ان يَحْصُلَ له صورةٌ فى القلب ولهذا روِيَ: تفكروا فى آلاء اللّه ولا تفكروا فى اللّه اذ كان اللّهُ مُنزّهاً ان يُوصَف بصورةٍ.... «يبيّن اللّه لكم الآيات لعلكم تتفكرون فى الدنيا والآخرة».... قال بعض الأدباء: الفِكْرُ مقلوب عن الفَرك لكن يستعمل الفكر فى المعانى وهو فرك الامور وبحثها طلباً للوصول الى حقيقتها (معجم مفردات الفاظ القرآن ص ۳۹۸ ــ ۳۹۹).

ہونا۔ صاف ہونا ۔ اور اولوالالباب ۔ اولی الالباب" اس عقل خالص کے پلنے والوں کو یا صاحب عقل یا اہل عقل کو کہا جاتا ہے[1]۔ فاضل لغوی احمد ابن فارس (وفات ۳۹۵ھ ق) اپنی کتاب "مقاییس اللغۃ" میں "لب" کے معنی میں پایداری ۔ ثبات خالص ہونا اور فضیلت برتری ۔ اقامت شامل کرتے ہیں[2]۔

اوپر کے الفاظ کے مفہوم سے معلوم ہوا کہ اولی الالباب وہ لوگ ہیں جو اس چیز کے مالک ہیں جو انسان (بحیثیت نوع انسانی) میں خالص اور اعلی درجہ پر پائی جاتی ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جو دل (محل جذبات اور احساسات) اور دماغ (محل عقل وادراک) دونوں کی اصلی (خاص) صفت اور عملی خاصیت ہے۔

ان لغوی معنوں کے بعد اب آیئے آیات مذکورہ پر غور کریں۔

ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اولی الالباب کے لیئے آیات" ہیں ۔ رب تعالی کی نشانیاں ہیں ۔ جو خدائے بزرگ کی طرف راستہ دکھاتی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرواتی ہیں جس طرح قرآن حکیم کی آیات دلیل راہ ہیں اسی طرح کائنات کی آیات ۔ آسمان اور زمین کی خلقت کی آیات چراغ راہ ہیں جو منزل ومقصود، محبوب حقیقی کی طرف لے جاتی ہیں ۔ لیکن ان لوگوں (اولی الالباب)

---

۱ ـ «اَللُّبّ» العقل الخالص من الشوائب وسُمّی بذلك لكونه خالصُ ماف الانسان من معانیه كاللباب واللُّبُّ من الشیءِ وقیل ما هوزكی من العقل فكلّ لبّ عقل ولَیس كلّ عقل لباً ولهذا علّق اللّه تعالى الأحكامَ الق لایُدرِكُها الاالعقولُ الزكیة باولی الالباب (الراغب الاصفهانی: معجم مفردات الفاظ القرآن ص ٤٦٦).

۲ ـ لب: اللام والباء ـ أصلٌ صحیح یدلُّ علی لزوم وثبات وعلی خلوص وجودة فالاوّل ألبّ بالمكان اذا أقام به یلبُّ إلبابا ـ ورجل لبٌّ بهذا الأمر اذا لازمه وحكی الفرّاء: امرأة لبةٌ: مُحِبّةٌ لزوجها ومعناه أنّها ثابتة علی وُدّه ابدا... والمعنی الآخر اللّب معروف، من كل شیء وهو خالصه وما یُنتقَی منه ولذلك سمّی العقل لُبّاً ورجل لبیب أی عاقل (معجم مقاییس اللغة لابی حسین احمد بن فارس بن زكریا بتحقیق عبدالسلام محمّد هارون مطبعة مكتب الاعلام الاسلامی ۱٤۰٤ ـ الجزء الخامس ص ۱۹۹ ـ ۲۰۰).

کی عملی صفات کیا ہیں : اٹھتے ، بیٹھتے ۔ لیٹے ہوئے رب تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی خلقت پر فکر و تفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے رب تعالیٰ! ان سب چیزوں کو تو نے بیکار ۔ باطل ۔ بے معنی پیدا نہیں کیا تو جو ہر عیب سے منزہ۔ ہر نقص سے پاک ــ اعلیٰ و اعظم ہے ، ہمیں آتش دوزخ سے بچا اور پناہ میں رکھ۔

دنیا کی انسانی (تہذیبی ۔ ثقافتی ۔ مذہبی) تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ قدیم زمانے (قبل از اسلام) میں دو شخصیتیں یا یہ کہیے کہ انسانی شخصیت کے دو پہلو خدا اور کائینات کے تعلق کا مظہر بنیں ۔ مشرق میں (چین ۔ ہند ۔ ایران) زیادہ تر لوگوں نے دل کی طرف توجہ کی جو احساسات اور جذبات کا منبع ہے ۔ اندر میں نظر ڈالی (IN-TUITION) آنکھیں بند کیں تاکہ دل کی آنکھ کھلے ۔ یوگا اور سنیاس ۔ تاؤ مذہب (TAOISM) بدھ مت اور ویدانت ، نور اور ظلمت کی باتیں ، یہ سب "ذکر" کی طرف جا رہی تھیں۔

دوسری طرف مغرب (یونان ۔ روما ۔ مصر) نے دماغ کی صلاحیتوں پر توجہ دی۔ "فکر" ان کا اساس تعلیم و تعلم تھا ۔ منطق سے لے کر فلسفہ تک دماغی مشق اور تمرین تھی ۔ اگر فلوطین (PLOTINUS) نے مظاہر نور پر تاسوعات (ENNEADS) لکھیں تو وہ گاردن (GORDON) کے ساتھ ایران آیا تھا اور یہاں سے فلسفۂ نور و ظلمت لے گیا ۔ ورنہ سقراط۔ افلاطون اور ارسطو "فکر (THINKING REASON) کے حامی اور ترجمان تھے ۔

تاریخی تفصیل میں جائے بغیر مختصراً عرض کیا جائے کہ مشرق اور مغرب کے مالک (ربّ المشرق والمغرب) کا ارشاد ہے کہ خالص صفات والے لوگ وہ ہیں جو مشرق اور مغرب میں پانے والی بہترین انسانی عملی صفات کا مجمع ۔ آمیزش (SYNTHESIS) ہیں۔ جو دل اور دماغ ، جو ذکر اور فکر کے مالک ہیں ۔ جو نہ صرف رب تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہیں بلکہ کائنات کی چیزوں پر تفکر و تدبر بھی کرتے ہیں۔

«سَنُرِيهِمْ آيٰتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ــ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (حم سجدة: ٥٤).

انسانی "انفس" کی آیات "ذکر" کے دائرے میں آتی ہیں اور "آفاق" کی آیات "فکر"

کے دائرے میں ۔ ذکر اور فکر کے بعد ہی انسان حقیقت تک پہنچتا ہے ۔ یہی تکمیل دین ہے یہی ایک مؤمن کی معراج ہے ۔ یہ لقاء اللہ کی طرف لے جاتی ہے :

الآ انہم فی مِریۃٍ من لِقاء ربّہم آلآ اِنّہ بکلّ شیءٍ محیط (حم سجدۃ ــ ۵۵)

ہم نے اوپر "دل" اور "دماغ" کا ذکر کیا ۔ لیکن ان سے ہماری مراد جسمانی اعضاء نہیں بلکہ ہم نے ان الفاظ کو اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے ۔ "دل" سے ہماری مراد "محلِ جذبات' احساسات ، محبّت ، ہمدردی"

(SOURCE AND PLACE OF FEELINGS AND EMOTIONS) ہے ۔ ورنہ خود قرآن حکیم میں لفظ "قلب" کو (دل ، گوشت کا لوتھڑا جس کے ذریعہ جسم میں خون دوڑتا ہے) "فکر" "THINKING" اور "فقہ" (UNDERSTANDING) کی جگہ کہا گیا ہے : «لَھُم قلوبٌ لا یفقھون بھا» (الاعراف: ۱۷۹) اور نیز "ذکر" کے سلسلہ میں "جائے اطمینان" : «آلا بذکر اللّٰہِ تطمئن القلوبُ (الرعد: ۲۸) اور خوف کے جذبہ کی جگہ : «یخافون یوماً تتقلّب فیہ القلوب والابصار» (النور: ۳۷) نیز "تدبّر" «افلا یتدبرون القرآن ام علیٰ قلوب اقفالھا» (محمد ص: ۲٤) اور "عقل" «افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا (الحج: ٤٦) اور "رأفۃً" ، "رحمۃً" اور "سکینۃ" «وجعلنا فی قلوب الذین اتبعوہ رأفۃ ورحمۃ» (الحدید: ۲۷) «ھوالذی أنزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایمانا» (الفتح: ٤)

اب ہمارے لئے "دماغ" (MIND) کا اصطلاحی مفہوم ہے فکر ، عقل ، تدبر ، تفقہ ، تعقّل (THINKING, REASON, RATIONALITY, UNDERSTANDING) ہے جس کو جرمن فلسفی اِمانیوئیل کانٹ (IMMANUEL KANT: 1724—1804) اپنی کتاب میں "عقلِ محض یا عقلِ خالص" (REINE VERNUNFT) اور "عقلِ عملی" (PRAKTISCHE VERNUNFT) کی اصطلاحوں سے بیان کرتا ہے ۔ اور "دل" کا تعلق ہمارے عرف میں تسکین قلبی ، اطمینان ، رأفت' رحمت ، مہربانی ، خوف و رجاء (امید) کے جذبات سے

ہے ۔ قرآن نے دل کے لئے ایک اور لفظ استعمال کیا ہے : "فؤاد" اور اس کی جمع "افئدۃ" جو ایک طرف تو احساس کی جگہ ، "واصبح فؤاد ام موسیٰ فارغا" (القصص : ۱۰) سچ اور جھوٹ پرکھنے کا آلہ ؛ "ما کذب الفؤاد ما رأی" (النجم : ۱۱) اور دوسری طرف حواس خمسہ (FIVE SENSES) کی طرح ایک حسیاتی یا حسی عضو (SENSORY ORGAN) سے موسوم کیا گیا ہے :

«ان السمع والبصر والفؤاد كل اولئك كان عنه مسئولا (الاسراء: ۳۶)

«وجعل لكم السمع والابصار والافئدة لعلكم تشكرون (النحل: ۷۸)

«قل هو الذى أنشأكم وجعل لكم السمع والابصار والافئدة (الملك: ۲۳)

دوسری طرف "فواد" ایمان اور یقین کی جگہ کہا گیا ہے :

«ولتصغىٰ إليه افئدة الذين لا يؤمنون بالآخرة» (الانعام: ۱۱۳)

«وكلاً نقصّ عليك من انباء الرسل ما نثبّت به فؤادك » (هود: ۱۲۰)

«كذلك لنثبت به فؤادك ورتلناه ترتيلا (الفرقان: ۳۲)

اوپر کی مذکورہ آیات سے معلوم ہوگا کہ اگر "فؤاد" کو حس ، احساس اور جذبہ کی جگہ بیان کیا گیا ہے تو "قلب" کو جذبات، احساسات اور فکر و تفکر کے مجموعے کی جگہ لایا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن "ذکر" اور "فکر" کی آمیزش کی جگہ کا انسانی "قلب" سے موسوم کرتا ہے ۔ یہ وہی آمیزش (SYNTHESIS) ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ یہ وہی "ثنویت" (DUALISM) کو مل اور جمع کر کے "اتحاد" (UNIFICATION) کا نقطہ ہے جو توحید (UNITY) کے مظہر کا مقصد ہے ۔

ہم نے اس سے قبل کہا کہ مشرق "ذکر" کی طرف مائل ہوا اور مغرب "فکر" کی طرف ۔ علامہ اقبال اس ضمن میں فرماتے ہیں :

غربیان را زیرکی ساز حیات ۔۔۔ شرقیان را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس ۔۔۔ کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چو با زیرکی ہمسر شود ۔۔۔ نقشبند عالم دیگر شود
خیز و نقش عالم دیگر بنہ ۔۔۔ عشق را با زیرکی آمیز دہ

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ ایست | چشم شان صاحب نظر دل مردہ ایست
زخمہا خوردند از شمشیر خویش | بسمل افتادند چون نخچیر خویش
سوز و مستی را مجو از تاک شان | عصر دیگر نیست در افلاک شان
زندگی را سوز و ساز از نار تست | عالم نو آفریدن کار تست

(اقبال، جاوید نامہ: سعید حلیم پاشا: شرق و غرب ص ۶۵-۶۶
کلیات اقبال مطبوعہ شیخ غلام علی لاہور ۷۳ ۱۹ء)

یہاں "زیرکی" سے مراد "فکر" اور "عشق" سے مراد "ذکر" ہے۔ "صاحب نظر" سے مراد "مفکر" اور "سوز و مستی" سے مراد احساس و جذبہ "ذکر" ہے۔

اگرچہ "مشرق" اور "مغرب" جغرافیائی لحاظ سے نسبتی (RELATIVE) الفاظ ہیں لیکن ہم ان کو اصطلاحی معنی (CONVENTIONAL CONNOTATION) میں لیتے ہیں یعنی "مشرق" سے مراد چین، جاپان، ہند (قدیم ہند و سندھ)، ایران اور مغرب سے مراد یونان روما (ROMAN EMPIRE) یورپی ممالک اور بعد کا براعظم امریکا۔ قدیم زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ چین میں کنفیوشس (CONFUCIUS 550-478 B.C) اور منشس (MENCIUS 372 - 289 B.C) جیسے اخلاقی اور مذہبی رہنماؤں کے ساتھ لاؤ تسو (LAU-DSE ۶۰۴ - ۵۳۱ ق.م (LAO TZU) چینی زبان میں "استاد قدیم" اور چوانگ تسو (قرن سوم قبل مسیح) (CHUANG TZU) پیدا ہوئے جنہوں نے "طریقت" (TAOISM) کے طریقے سے لوگوں کو ہستی اعلیٰ کی طرف متوجہ کیا۔ ان کا طریقہ "دل" کا طریقہ تھا۔ لاؤ تسو اپنی کتاب تاؤ تے چنگ (TAO TEH CHING) میں کہتا ہے:

"نامکمل یا غیر کامل (شخص) کیسے کامل ہو سکتا ہے؟ کج کیسے سیدھا ہو سکتا ہے؟ خالی کیسے پُر ہو سکتا ہے؟ کہنہ کیسے نیا یا تازہ ہو سکتا ہے؟ جس کی تمنائیں کم ہیں وہ اس درجہ کو پا سکتا ہے، جس کی تمنائیں زیادہ ہیں وہ گمراہ ہو جاتا ہے۔

اس لیے سمجھدار وہ شخص ہے جو انکسار اور تواضع کو اپناتا ہے اور
ہر جگہ ان کا اظہار کرتا ہے۔ وہ خود نمائی سے مبرا ہے جس کے نتیجہ میں وہ
چمکتا ہے۔ وہ زور سے اپنی بات نہیں منواتا اس لیے دوسروں میں ممتاز
ہوتا ہے، اس میں لاف و گزاف نہیں اس لیے اس کی لیاقت اور قابلیت
مانی جاتی ہے۔ وہ خود سے راضی نہیں ہے اس لیے دوسروں پر امتیاز
حاصل کرتا ہے[1]"

چوانگ تسو لکھتا ہے:

"کائنات بہت خوبصورت ہے لیکن وہ بات نہیں کرتی۔ چار موسم
ایک قانون کے مطابق ہیں لیکن ان کو کوئی سن نہیں سکتا۔ ساری خلقت
قوانین مطلق پر مبنی ہے لیکن وہ قوانین بولتے نہیں۔ حقیقی عارف وہ ہے
جو کائنات کے جمال کے ذریعہ تخلیق کے اصولوں کو پالیتا ہے۔ حقیقی
عارف کائنات کو شوق اور محویت سے دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔
کیونکہ انسانی ذہن یا عقل کتنی ہی عمیق ہو، کتنا ہی اشیاء کے بے شمار
تدریجی تکامل کا ادراک کرے، موت اور پیدائش کو سمجھے، (چیزوں کی)
مربعیت (SQUARENESS) اور گولائی (ROUNDNESS) کو سمجھے
لیکن پھر بھی عقل کے ذریعے ("زیرکی" کے ذریعے) اصل کو نہیں پا سکتا[2]"

دوسری جگہ چوانگ تسو کہتا ہے:

"اس زمین پر ہر ذی حیات چیز خاک سے پیدا ہوئی ہے اور خاک
خاک کی طرف لوٹتی ہے۔ لیکن میں تمہیں حیات ابدی کے دروازوں سے

---

1. CHINESE MYSTICS EDITED AND WITH AN INTRODUCTION BY RAYMOND VAN OVER, HARPER AND ROW, PUBLISHERS, NEWYORK, 1973, PAGE 14.
2. مذکور کتاب ص ۵۹ CHINESE MYSICS, PAGE 59

(اندر) لے جاؤں گا تاکہ تم ابدیت کے وسیع ہالوں میں گھومتے پھرتے رہو۔ میرا نور سورج اور چاند کا نور ہے۔ میری زندگی آسمان اور زمین کی زندگی ہے۔ میرے آگے ہر چیز تاریکی میں ہے اور میرے پیچھے ہر چیز نامعلوم ہے۔ لوگ مرسکتے ہیں، میں ہمیشہ کی زندگی بسر کرتا ہوں۔[1]

جب بدھ مت (BUDDHISM) چین اور جاپان پہنچا تو وہاں "زین" (ZEN) طریقہ شروع ہوا۔[2] اس طریقہ کے مطابق بدھ مت جس سے انسان یا انسانی ہستی منور ہوتی ہے اس کی تعلیمات مرشد سے مرید کی طرف دل کے ذریعے منتقل ہوتی ہیں تاکہ ہر شخص میں بودھا (BUDDHA) جیسی طبیعت (ریت) پیدا ہو۔ اس طریقہ سے انسانی قلب میں اطمینان، بے خوفی اور ایک قسم کی بلاارادگی (SPON - TANEITY) پیدا ہوتی ہے جو ایک روشن یا منور دل کی صفات ہیں۔ طریقہ "زین" کا بعد میں جاپان کی ثقافتی زندگی پر بڑا اثر ہوا۔ یہ طریقہ ۱۱۹۱ء میں آئسائی (EISAI) نامی شخص نے چین سے جاپان لا کر متعارف کرایا۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: دائسیٹز تائتارو سوزوکی (۱۸۷۰ - ۱۹۶۶ مسیحی)، جو "زین" طریقہ کا ایک بڑا جاپانی رہنما گذرا ہے، اس کی کتاب کا جرمن ترجمہ (جاپانی زبان سے):

DAISETZ TEITARO SUZÜKI:
DIE GROSSE BEFREIUNG
(EINFÜHRUNG IN DEN ZEN - BUDDHISMUS)
MIT EINEM GELEITWORT RON
C. G. JUNG,
FISCHER TASCHENBUCH VERLAG,
FRANKFURT AM MAIN, 1973

---

[1] دیکھیے جرمن زبان میں کتاب: SCHLÖTERMANN, H.: MYSTIK IN DER RELIGIONEN DER VÖLKER ERNST REINHARDT VERLAG, MÜNCHEN, 1958, SEITE 37.

[2] زین، چینی لفظ "ڈیئن" ۔ چین (CHAN) کو جاپانی لہجہ میں "زین" کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے۔ "ڈیئن" اصل میں سنسکرت لفظ "دھیان" سے نکلا ہے جس کی معنی ہماری عرف میں "مراقبہ" ہے۔ دیکھیے: انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا - مائکروپیڈیا جلد دہم ص ۸۷۲
THE NEW ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA IN 30 VOLUMES, MICROPAEDIA, VOL X P. 872, WILLIAM BENTON, PUBLISHER, CHICAGO 1974

ڈاکٹر وحید اختر
پروفیسر فلسفہ، مسلم یونیورسٹی
علی گڈھ (ہندوستان)

کربلا ــــ تاریخ اسلامی کا انقلاب آفرین موڑ

انسانی تہذیب کے بے کراں سیلِ رواں میں ان گنت واقعات، حادثات حبابوں کی طرح رونما ہوئے، ایک دو نفس کے لیے سر اٹھایا، پھر وقت کی موجوں میں اس طرح گم ہو گئے کہ ان کا سراغ بھی نہ ملا۔ ہاں، چند واقعات نے ایسی لہریں پیدا کیں جن کا سلسلہ برسوں اور کبھی کبھی صدیوں پانی میں تموّج پیدا کرتا رہا۔ ان واقعات کے پس پشت کبھی کبھی لاکھوں کے لشکر کارفرما ہوئے، کبھی چند افراد۔ سکندر کا سیلِ لشکر کشی ہندوستان کی سرحدوں سے ٹکرا کر پلٹ گیا۔ تاریخ نے اسے بڑے فاتح کا نام دیا۔ چنگیز اور ہلاکو کی فوجوں نے پورے ایشیا کو چین سے ترکی تک اور اطراف کے یورپی ممالک سے ایران و عرب و مصر تک بار بار تہ و بالا کیا۔ تیمور کی فوجیں یورپ کے قلب تک در آئیں، ماسکو میں پرچم لہرائے۔ تاریخ نے ان فاتحین کو تباہ کار کہا۔ افراد، جنھوں نے اپنی فکر و نظر سے سیلِ تاریخ کا رخ موڑا ان عظیم فاتحوں اور تباہ کاروں سے کہیں زیادہ عرصے تک تاریخ کے سینے میں دھڑکتے رہے۔ سقراط، گوتم بدھ، کنفیوشس، افلاطون، ارسطو،

اور تمام فلسفی، سائنسداں، شعرا، ادیب اور فنکار تاریکی کے اتھاہ سمندر میں روشنی کے مینار بن کر ابھرے۔ سیل وقت نے احترام کے ساتھ ان کے سامنے سر جھکایا اور ان کی آواز کی لہروں کو اپنے سینے میں جذب کر کے آنے والی نسلوں تک منتقل کیا لیکن روشنی کے ان سلسلوں میں ایک سلسلہ وہ ہے جس کا نور ذہن انسانی کے بجائے الوہی سرچشمے کا فیضان تھا۔ یہ سلسلہ انبیائے کرام کا شجر نور ہے۔ ان کے انفاس سے روشنی کی وہ شعاعیں پھیلیں جن سے دلوں میں چراغ جگمگائے، ذہنوں میں صبحیں اتریں، راستے روشن ہوئے، اخلاق کا تزکیہ ہوا، نفوس کا تصفیہ ہوا۔ ان کے سینوں میں اترنے والی وحی بعد میں آنے والی نسلوں کے اخلاق و کردار کے فانوسوں میں جگمگاتی شمع سے شمع جلتی رہی۔ یہ سلسلہ انبیائے ماقبل سے ابراہیمؑ تک پہنچا، کعبہ کی بنا پڑی، ایثار اسمٰعیلؑ نے قربانی کی ایک اٹوٹ روایت قایم کی، وادی بے زراعت میں چشمۂ زرخیزی پھوٹا۔ دعائے خلیل نے باب اجابت وا کیا تو ابراہیمؑ کے شجر آرزو میں وہ برگ و بار پیدا ہوئے کہ ذریت ابراہیم نے اسحٰقؑ و اسمٰعیلؑ کے وسیلے سے ہزاروں سال مستضعفین عالم کی رہنمائی کی، گمراہی کی ظلمات سے نکال کر ہدایت کی روشنی کا راستہ دکھایا۔ موسیٰؑ کے عصا نے فرعون کا زعم خدائی توڑا ید بیضا نے پسماندگان کو پیش رفتگی کی منزل تک پہنچایا۔ عیسیٰؑ نے اخلاق کا وہ درس دیا کہ مردہ ضمیروں میں نئی اخلاقی زندگی کسمسائی، دنیا کے ٹھکرائے ہوؤں کو دنیا سر کرنے کا حوصلہ ملا۔ یہ سلسلہ نور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل ہوا۔ ارض کعبہ سے اذان حق کی صدا بلند ہوئی۔ حرا کی خلوت میں "اقرأ باسم ربک" کی آواز یوں گونجی کہ اس کی لہروں نے بہت جلد پورے جزیرہ نمائے عرب کو اپنے سایے میں لے لیا۔ ہجرت نے مدینہ بسایا، یثرب کا ستارا چمکا کہ آفتاب رسالت نے اسے اپنا مامن و مرکز بنایا۔ عرب کے خانہ بدوش بدو، آپس میں صدیوں سے دست و گریباں قبایل، نسل و نسب کے گزیدہ اسیر اسلام کے حصار میں آکر خدائے واحد کے حضور سر بسجدہ ہوئے تو توحید نے ان کے ہاتھوں میں

وہ عالم شکار تلوار دی کہ قیصر کا قصر لرزا، کسریٰ کا محل گرا، آتش خانوں کی آگ بجھی، رحمۃ للعالمین کے دامانِ کرم سے وابستہ دریدہ دامنوں اور بوسیدہ عبا ؤں نے قبائے شاہاں اور تخت و تاجِ سلاطین پر اپنے قدم رکھے۔ طلوعِ اسلام کا واقعہ ایک نئی تاریخ کا آغاز ہے۔ محمدؐ کا پیغام ابدی ہے۔ ان کی رسالت تمام عالموں اور کل زمانوں کی ہدایت ہے۔ یہ سیل لشکر کشی نہیں، فتوحات کا اٹوٹ سلسلہ نہیں، سیاست کی آدم کشی نہیں، جاہ طلبی کی کشمکش نہیں، استحصال و استثمار کی قلعہ کشائی نہیں۔ یہ ہدایت ہے صلابتِ کردار کی اساس۔ یہ رسالت ہے حرّیتِ انسان و انسانیت کی ضمانت۔ اگر اس ہدایت و رسالت پر ہوسِ لشکر کشی غالب آئی، فتوحات نے اس کی قلبِ ماہیت کی سیاست نے اسے مکر و مصلحت کی آماجگاہ بنایا، جاہ طلبی نے اسے دنیاکوشی و حاکم پرستی میں بدلا، استحصال و استثمار نے اس کے اسلحوں سے زر و مال کے قلعے غریبوں کی لاشوں پر تعمیر کیے تو نور کا یہ لاثانی سرچشمہ خشک ہو سکتا تھا۔ مستضعفین جہاں کی امیدیں ہمیشہ کے لیے مر سکتی تھیں، حرّیت کا جذبہ دلوں میں دفن ہو سکتا تھا، صلابتِ کردار غلامی کی خوگر ہو سکتی تھی۔ کذب صدق پر، باطل حق پر، اندھیرا نور پر فتح پا نہ سکا تو اس کا سبب یہ تھا کہ رسالت نے اپنے پیغام کی حفاظت کے لیے ایسے افراد کی تربیت کر دی تھی جو نامساعد حالات اور امتیوں کی گمراہیوں میں بھی دعائے ابراہیم کے ثمرات کی حفاظت کر سکیں۔ اس پیغام کی ابدی بقا کو ذبحِ عظیم کی ضرورت تھی۔ آغوشِ رسالت کے کسی پروردہ کو کل پر ملتوی قربانیِ اسمٰعیلؑ کا قرض ادا کرنا تھا۔ حسینؑ نے یہ قرض اپنے اور اپنے اعزا و اصحاب کے خون سے ادا کیا۔ سلسلۂ انوارِ انبیا کو اپنی بقا کے لیے امامت کی شہادت درکار تھی۔ اس ادائے قرض اور اس شہادت کا نام کربلا ہے۔ اگر کربلا تاریخ انسانیت کے سیل تباہ کار میں نہ ابھرتی اور اس کا رخ نہ موڑتی تو اس کا وہ دھارا، جس کا نام اسلام ہے، اپنے کلمہ گویوں کی دنیا پرستی و جاہ طلبی، مستضعفین کشی و استحصال

پسندی، اور توحید کے نام پر جابر و ظالم حاکموں کی سجدہ گزاری کے ہاتھوں تاریخ کے سینے سے محو ہو جاتا۔

ظاہر بیں آنکھوں سے تاریخ پڑھیے تو کربلا چند ساعات کی مختصر سی لڑائی ہے جس میں ۷۲ یا زیادہ سے زیادہ ایک سو کچھ افراد اپنی بے سرو سامانی کے ساتھ ہزاروں کے لشکر سے ٹکرائے اور موت کی آغوش میں جا سوئے۔ ان میں وہ بوڑھے بھی تھے۔ جنھیں سہارا دے کر گھوڑے پر بٹھایا گیا، وہ جوان بھی تھے جن کی تلواروں نے ذوالفقار سے شجاعت و عدالت کا درس لیا تھا، وہ کم سن بھی تھے جو جنگ کو بچوں کا کھیل سمجھ کر ماؤں کی گودوں سے مچلتے ہوئے میدان میں آگئے تھے۔ اور ان کے پس پشت عورتوں اور معصوم بچوں کا ایک قافلہ تھا جس کی نگہبانی و سالاری کے لیے ایک بیمار رہ گیا تھا یا شیخ علیؑ کی وارثہ دار زبان زینبؑ۔ اس جنگ کا موازنہ اگر یونان و ایران کی معرکہ آرائیوں اور عظیم فاتحین کی لشکر کشیوں سے کیجیے تو شہید ہونے والے کسی شمار میں نہیں۔ جنگ کی مدت کو پیمانۂ ماہ و سال سے ناپیے تو برسوں اور مدتوں چلنے والی جنگوں کے مقابل میں نمازِ صبح سے عصر تک جاری ہونے والی لڑائی کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے؟ خود صفین کی جنگ میں دونوں جانب ہزار ہا مسلمانوں کے لشکرِ جرار نبرد آزما ہوئے تھے اور مہینوں معرکہ آرائی نے طول کھینچا تھا۔ پھر آخر چند گھنٹوں کی اسی مختصر لڑائی کو آج تک کیوں یاد کیا جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس جنگ نے لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد مضبوط کر دی، رسولِ اکرمؐ کے سارے غزووں اور سریوں کی فتحوں پر مہرِ توثیق ثبت کی، جمل و صفین و نہروان کا آخری فیصلہ کیا، صلحِ حسنؑ کے معاہدے کے ساتھ معاویہ کی ملوکیت کی پیمان شکن سیاست کا پردہ چاک کیا۔ نفاق کے چہرے سے نقاب اٹھائی اور ایمان کا چہرہ روشن کر دیا۔ اگر کربلا کی جنگ وقوع پذیر نہ ہوتی تو اسلام کی رسالت و امامت ملوکیت کے تخت تلے دب کر سنہ ۶۱ھ

یں ختم ہو گئی ہوتی ۔ اس جنگ میں ظالم کے لشکروں کے گھوڑوں کی ٹاپوں تلے پامال ہو جانے والی لاشوں نے اسلام کو نئی زندگی بخشی، اس جنگ کے شہیدوں کی بے کفنی نے چادر تطہیر کا سایہ انسانیت کے سر نہ اٹھنے دیا۔ اس جنگ کے اسیروں کی مظلومی وجرأت نے مسلمانوں کو بے باکی وحق گوئی کا درس دیا، آنے والے زمانے کے آشفتہ سروں کو بتایا کہ اسیری آزادی کی تمہید ہے ۔ گرفتاری، طوق وسلاسل عزت اور تخت نشینی وخون آشامی ابدی ذلت ۔ کسی جنگ کی تاریخی اہمیت کا اندازہ اس میں شرکت کرنے والے افراد کی تعداد، اس میں قتل ہونے والوں کی قلت اور اس کے جاری رہنے کی مدت سے نہیں لگایا جاسکتا بلکہ اس کے فوری اور دور رس اثرات سے لگایا جاتا ہے ۔ جنگ کی قاطعیت وعظمت کا یہ معیار بھی کربلا نے قائم کیا ۔

اسلامی تاریخ میں کربلا کی انقلاب آفریں اہمیت کو سمجھنے کے لیے ابوالاعلیٰ مودودی کی "خلافت وملوکیت" اور طٰہٰ حسین کی "علیؑ اور ان کے فرزند" پڑھنا کافی ہے ۔ صفین میں "لاحکم الا اللہ" کے نعرے نے ناگزیر شکست سے بچنے کے لیے جس طرح قرآن کو نیزوں پر بلند کیا وہ تمہید تھی اس بات کی کہ آج اگر قرآن صامت نیزے پر ہے تو کل قرآن ناطق بھی نیزے پر بلند کیا جاسکتا ہے ۔

معاویہ کی وفات کے بعد صلح حسنؑ کے مطابق مسلمانوں کو اپنا خلیفہ منتخب کرنے کا حق تھا، اور اس وقت مسلمانوں کی نظر رسول اسلام کے فرزند پر تھی اسی سے وہ ہدایت کے طالب ہوئے اور اسی کو یزید کے خلاف نبرد آزما ہونے کی دعوت دی ۔ اگر اس وقت فاطمہؑ کا لال گوشہ نشین رہتا، مصلحتاً بیعت کر لیتا تو خود کو اور اپنے خاندان کو ہلاکت سے بچا لیتا ۔ مگر اسلام اور اس کی اقدار کو ہلاکت سے نہ بچا سکتا تھا ۔ حسین علیہ السلام نے شہادت کو لبیک کہا، مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک کا راستہ پیغام اسلام کی اشاعت اور ظلم کے خلاف جنگ کا سفر تھا ۔ یہ جنگ عاشور کے دن بظاہر اختتام کو پہنچی ۔ لیکن دراصل

جاری رہی۔ کربلا کے بعد یہ جنگ کوفہ اور دمشق کے بازاروں اور درباروں میں بے کسی کے مظاہرے اور مظلومیت کی زبان سے لڑی گئی۔ حسینؑ نے تو سر دے کر جنگ کا آغاز کیا تھا۔ کربلا کی آواز کوفے میں زینبؑ کی زبان بن گئی۔ بعد حمد و نعت مجمع عام کو یوں مخاطب کیا:

"اے اہل کوفہ! کیا تم ہم پر رو رہے ہو؟ تمہارے آنسو کبھی خشک نہ ہوں اور تمہارے نالے کبھی بند نہ ہوں۔ تمہاری مثال اس عورت کی سی ہے جو مضبوط دھاگا کاتتی ہے اور پھر خود اسے توڑ دیتی ہے۔ تم نے اپنے ایمانوں کو خود دھوکا دیا خود اپنے ساتھ خیانت کی، خود ہی ایک عہد باندھا اور اسے پھر توڑ دیا۔ تم میں کوئی ہنر ہے تو یہ کہ تم خود ستائی گزاف و فساد اور کینہ توزی جانتے ہو۔ کنیزوں کی طرح خوشامد و تملق تمہارا شیوہ ہے، اور دشمنوں کی غمازی تمہارا وطیرہ۔ تم گندگی میں اگی ہوئی گھاس ہو جو کھائے جانے کے لائق نہیں۔ تم اس چاندی کی طرح ہو جو صرف قبر پر منڈھی جا سکتی ہے۔ تم نے دوسری دنیا کے لیے کتنا بڑا توشہ تیار کیا ہے۔ وہ توشہ جو غضب خداوندی کو دعوت دیتا اور اور بھڑکاتا ہے اور عذاب جاودانی کو خود تمہارے لیے فراہم کرتا ہے۔

تم ہمیں قتل کرنے کے بعد ہم پر روتے ہو اور خود پر لعنت کرتے ہو؟ ہاں بخدا! بعد میں تم اس سے زیادہ روؤ گے اور شاید ہی کبھی ہنس سکو کیونکہ تم نے اپنے لیے ننگ اور بدنامی و شرم کی خریداری کی ہے......"

اس خطبے میں علیؑ ابن ابی طالب کی اس سرزنش کی گونج ہے، جو آپ نے اہل کوفہ

کی جنگ و جہاد میں سستی پر انہیں فہمائش فرمائی تھی اور مستقبل کی پیش بینی کرتے ہوئے کہا تھا کہ "تم آج میرے ساتھ دشمن کے خلاف جنگ نہ کرو گے تو کل تمہیں دشمن کے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑے گا۔ تمہارے گھر تاراج، تمہاری کھیتیاں برباد اور تمہاری اولاد قتل ہوگی... اس وقت تم پچھتاؤ گے اور کہو گے کہ کاش ہم نے علیؑ کی بات سنی ہوتی اور ان کا ساتھ دیا ہوتا" اور واقعی ایسا ہی ہوا، علیؑ کی شہادت کے بعد اپنے ساتھیوں کی سستی اور مخالفت دیکھ کر امام حسنؑ کو صلح کرنی پڑی معاویہ نے کوفہ میں داخلے کے بعد جب تک امام حسن وہاں سے عازم مدینہ نہ ہوئے مدارات کا مظاہرہ کیا۔ لیکن اس کے بعد اہل کوفہ پر ظلم و تعدی کا دور شروع ہوا اور لوگوں نے علیؑ کو یاد کرنا شروع کیا۔ یہی پشیمانی تھی جس نے حسین ابن علیؑ کو مدینے آنے کی دعوت دی تاکہ گذشتہ سستیوں کی تلافی ہو اور ظلم سے نجات ملے۔ لیکن اموی سیاست نے ابن زیاد سے وہی کام لیا جو اس سے قبل اس کے باپ سے لے چکی تھی۔ وہ جو واقعی دوستان حسینؑ تھے، قید کیے گیے۔ قتل ہوئے اور وہ جن کے ایمان سست، وعدے کچے تھے، گھروں میں بیٹھ رہے اور پھر گوشوں سے نکال کر حسین کے خلاف لڑنے کے لئے بھیجے گئے۔ جناب زینبؑ کے مختصر سے خطبے نے اہل کوفہ کو اپنے حال پر روتا دیکھ کر معاویہ و یزید کی سیاست کے نتیجے میں خود ان کی ذلت یاد دلائی اور اپنے باپ کے لفظوں میں مستقبل کی بربادی کا نقشہ پیش کیا۔ زینبؑ کے ملامت آمیز لفظوں میں اپنا نوحہ نہیں بلکہ خود امت کی گمراہی و گرفتاری کا مرثیہ ہے۔ اسلامی اصولوں سے منحرف سیاست و انتظام ملک کی تنقید ہے۔ یہ آواز تاریخ کے سینے سے نکلی ہے۔

ابو منصور طبرسی نے احتجاج میں خدام اسدی سے روایت کی ہے اس مختصر خطبے نے مجمع میں تلاطم پیدا کر دیا۔ امام زین العابدین، علی ابن الحسینؑ نے آگے بڑھ کر مجمع کو سکوت کا اشارہ کیا، قاتلوں کے خانوادوں کو ان کے ظلم یاد

دلائے۔ کربلا میں شہید ہونے والوں کی مظلومیت بیان کی، پیمان شکنی اور مہمان کشی کے عواقب سے آگاہ کیا اور انھیں عبرت دلائی کہ تم نے رسولِ خدا کے دل کو زخمی کیا ہے، کیا اسی منہ سے ان کے سامنے جاؤ گے؟

یزید کے دربار میں زینبؑ کی شمشیر براں پھر چلی، جس نے یزید کے نشہ آفریدہ لاف و گزاف کی زبان قطع کر دی۔ ثانیِ زہراؑ کا مخاطب خلیفہ وقت ہونے کا دعویٰ دار ہے:

"خدائے جہانیاں کی تعریف اور پیمبرؐ اور ان کی آل پر درود۔ خدائے پاک و منزّہ نے سچ فرمایا ہے کہ "وہ لوگ جو بدی کرتے ہیں اور جرم و عصیاں سے اپنے دامن آلودہ کرتے ہیں انجام کار بدی ہی کو پہنچتے ہیں۔" تو اس حال کو پہنچ گیا کہ آیاتِ خدا کی تکذیب کی اور ان کا مذاق اڑانے لگا۔ اے یزید! تو نے یہ گمان کیا کہ گویا ہم پر دنیا کی وسعت اور فضا کی پہنائی تنگ کر دی گئی ہے۔ ہمیں تو نے اسیر کر کے شہروں اور ملکوں میں پھرایا اور یہ خیال کیا کہ ہم خدا کے نزدیک بھی خوار و رسوا ہوئے اور تیری بزرگی میں اضافہ ہوا۔ کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ واقعی اس طرح تجھے عظمت حاصل ہو گئی ہے جو اپنے آپ پر اس طرح ناز کر رہا ہے، اس بات پر تو خوش ہے کہ تیری دنیا آباد ہے تیرا کام مراد کو پہنچا اور تیری بادشاہی محکم ہو گئی؟ ٹھہر جا، سوچ! کیا خدا کے سخن کو تو نے فراموش کر دیا "جو کفر کے راستے پر چلتے ہیں گمان نہ کریں کہ انھیں دی گئی یہ چند روزہ مہلت ان کے لیے سودمند ہو گی۔ نہیں، یہ مہلت اس لیے ہے کہ وہ اپنے گناہوں میں اضافہ کریں۔ بے شک ان کے لیے عذاب و ذلت مقدر ہو چکے ہیں" اے اسلام کے احسان سے آزادی پانے والے (طلیق) کے بیٹے!

کیا تو اسے انصاف سمجھتا ہے کہ تیری عورتیں اور کنیزیں پردہ نشین ہوں اور پیمبرؐ کی بیٹیاں اسیر کر کے شہر بہ شہر پھرائی جائیں .... اگرچہ انقلاب زمانہ نے مجھے تیرے سامنے تقریر کرنے کے لیے لا کھڑا کیا ہے، مگر میں تجھے اس قابل نہیں سمجھتی کہ تجھ سے بات کروں اور تجھے سرزنش کروں۔ تو اس سے کہیں زیادہ پست و ادنیٰ ہے (یعنی میرے سخن کا شایاں نہیں)۔ لیکن کیا کروں کہ ہماری آنکھوں سے آنسوں کی بارش ہو رہی ہے اور ہمارے سینے آتش غم سے بھڑک رہے ہیں آہ! کتنا عبرت ناک و عجیب ہے یہ واقعہ کہ حزب خدا کے بزرگ و سزاوار حزب شیطان اور طلقا کے ہاتھوں قتل ہو گئے .... شکر ہے خدا کا کہ اس نے ہمارا آغاز سعادت و آمرزش سے کیا، اور ہماری انتہا شہادت اور اپنی رحمت پر فرمائی۔

ان لفظوں کے ایجاز و ایمائیت میں اسلام کی تاریخ کا ماضی و مستقبل سمٹ آیا ہے۔ یہ احتجاج کا درس ہے، مرثیہ خوانی کا اسلوب ہے، موعظت و پند کی تہدید آمیز زبان ہے، تاریخ کے شعور کی ترجمانی ہے۔ ان خطبات کے ساتھ زینبؑ، ام کلثومؑ، فاطمہ بنت الحسینؑ اور سب سے بڑھ کر امام علیؑ ابن الحسینؑ کی دوسری تقریروں نے کربلا کی مظلومیت و حقانیت کی تبلیغ کا کام شروع کیا۔ ندامت کے آنسوؤں کے ساتھ سینوں میں ظلم کے خلاف نفرت و بغاوت کی آگ بھڑکائی اہلبیت اطہارؑ تو اسیری سے آزادی کے بعد مدینۂ رسولؐ میں سرد جنگ میں مصروف ہو گئے۔ لیکن ان کے حیرت آفرین صبر اور شہیدوں کے خونِ بے گناہ نے بہت سے جوانوں اور اسلام دوست دلاوروں کو شمشیر بکف کر دیا۔ چنانچہ ایک قابل توجہ گروہ کے بعد دوسرا گروہ میدان میں آتا رہا۔ مختارِ ثقفی نے خروج کیا اور قاتلان انصار و اقربا و امام کو انتقامِ خدا کے قہر سے دنیا ہی میں روشناس کیا۔ یزید کی ناگہانی موت کے بعد خود اس کے بیٹے معاویہ ثانی نے اس

تخت پر قدم رکھنے سے انکار کر دیا جس کے پائے خونِ حسینؑ میں ڈوبے ہوئے تھے، اسی طرح خلافت معاویہ و یزید کی نسل سے نکل کر مروان اور اس کی آل کو ملی۔ پوری تاریخ میں ان ظالموں کو حق پرستوں نے روکا بھی اور رسوا بھی کیا۔ شاعروں کی زبانیں اور عوام کے دلوں میں آلِ رسول کے لیے جذبۂ عقیدت و احترام انھیں اپنی بے مائگی و ذلت کا احساس دلاتا رہا۔

کربلا کے تذکرہ خوان شعرا کی زبانیں حق کی منوّر شمعیں بنی رہیں۔ دعبل خزاعی نے کہا:

"چالیس برس سے میں اپنی دار کی لکڑی اپنے کاندھوں پر اٹھائے گھوم رہا ہوں۔ لیکن اب تک وہ شخص دکھائی نہیں دیا جو مجھے اس دار پر کھینچ دے۔"

ادب و شعر سے قطع نظر کر کے اگر مابعدِ کربلا تاریخ اسلام میں فکر و فلسفہ اور ذکر و فکر کے آغاز و ارتقا پر غور کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ ان کی فکری سمت زندگی آفریں انداز میں قرآن و حدیث اور نہج البلاغہ میں ہے اور کربلا میں عملی صورت کی نقش بندی ہے سرکاری اداروں کا پروپیگنڈا اور اہل بیتؑ کی طرف سے حقائق کی نقاب کشائی، جبر و قدر اور حکمرانی کی مذہبی حیثیت کی نفی و اثبات، قرآن مجید کی تاویل و تفسیر، اسلام و زھد، اسلام و سیاست۔ غیر جانبدار ہو کر گوشہ نشینی شیوہ مسلمان ہے، یا مسجد و میدان دونوں جگہ تکبیر و تہلیل و جہاد کے فریضے کو انجام دیا جاسکتا ہے۔ یہی یک جائی اور ہم آہنگی مرثیہ گو اور مجلس خوان خطیبوں کی گرج کچھ عرصے کے بعد مزار سید الشہداؑ کربلا، یعنی حسینیوں سے نمایاں ہوئی۔

اموی حکمرانوں کی اسلام کے نام سے لبادہ پوشی کے باوجود کافرانہ فعلوں کے

تضاد نے اہل عقل و ہوش کو نئے تضاد سے دوچار کر دیا۔ وظیفہ خواران دربار و طرفداران سرکار نے اس تضاد میں تاویل کا عمل شروع کیا اور آزاد فکر اہل نظر نے استدلال و عقل کا بازو تھاما۔ کہتے ہیں کہ کلام و مباحث عقائد نے کربلا کے بعد واضح طور پر دو خط حاصل کر لیے۔

تصوف، عرفان اور للّٰہیت ملتے جلتے اصطلاحات ہیں۔ ان میں سے کون سا نام پرانا ہے کون سا نیا؟ بحث طلب بات ہے۔ کربلا کے بعد صفہ نشینی کو خانقاہی نظام کی شکل دینے کے خلاف جمود و سکوت و ترکِ دنیا کے بدلے ـ رجوع الی اللہ، ذکر الٰہی، اور صرف اللہ سے ربط رکھنے کی ایک نمایاں سمت وہ ہے جو صحیفۂ کاملہ میں نظر آتی ہے۔ صحیفۂ کاملہ۔ صرف اور فقط وظائف و تعقیبات کا مجموعہ نہیں، اس میں توجہ الی اللہ اور فکر دین اللہ، دونوں کے روشن چراغ موجود ہیں ـ فرد۔ معاشرہ۔ حقوق خدا اور رسول ضوابط امر و نہی، طریق موت و آدابِ زندگی سب کا فلسفہ اور نفسیاتی ابلاغ موجود ہے۔

کربلا سیاست و سماج کی سطح پر ادب، عرفان اور فلسفہ کے وسیلے سے ہمیشہ کارفرما رہی، بنی امیہ کا زوال اور بنی عباس کا عروج کربلا کے سہارے ممکن ہوا علویین کی بغاوتیں اور فاطمیین کی شاندار حکومت کے قیام کا سرچشمہ کربلا ہی تھی۔ صدیوں بعد صفویوں کا ایران میں قیام و استحکام کربلا ہی کے فیض کا ایک کرشمہ ہے۔ تقیہ اور انتظار کے طویل دور کے بعد پھر کربلا ہی نے ایران میں شاہی جبر کے خلاف مسلمانوں کی بغاوت کو کامیاب کیا، کربلا کا عطا کیا ہوا جذبۂ شہادت ایران کی مسلسل جنگ دفاعی سے لے کر لبنان کے کمزور اور ستم رسیدہ لبنانی عاشقان حسینؑ تک یوں بروئے کار آیا کہ ایک طرف تو امریکہ ایسی طاقت کو شکست کھانی پڑی، دوسری طرف اسرائیل ایسی جابر طاقت کو جو جدید ترین اسلحوں سے لیس تھی، لبنان کے نہتے عاشقانِ کربلا

کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اقبال کو شکوہ تھا کہ لاکھوں یزید ایک طرف صف آرا ہیں، مگر دوسری طرف "قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں" کون عنوانِ نجات کی سطر لکھے گا۔ ۱۹۷۹ء میں حسینیوں نے جواب دیا کہ کربلا کا معجزہ آج بھی سامراجی یزیدیت اور اموی انداز کی ملوکیت کا خاتمہ کر سکتا ہے۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں پہلا اسلامی انقلاب کربلا ہی کو مقصود نظر بنا کر کامیاب ہو سکا۔ اس طرح کربلا میں حسینؑ اور ان کے رفقا کی شہادت، جس نے ۱۰۰ سال کے اندر اموی ملوکیت کو خون کے سیلاب میں غرق کر دیا تھا ایک بار پھر عصر حاضر کی یزیدیت یعنی سامراجیت کے ایشیا میں اثر و نفوذ کی موت کا دیباچہ بن گئی۔ ایران کے انقلاب اور لبنان میں کمزور مسلمانوں کی فتح کو کربلا کے حوالے کے بغیر سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

کربلا نے ایک طرف سچے اسلام اور اس کی اقدار کا تحفظ کیا اور خونِ حسینؑ نے ان اقدار کی بقا کی ضمانت لی، دوسری طرف کربلا نے فکر و نظر کے جادے روشن کر کے عالمِ اسلام کی ذہنی و علمی ترقی کا اثاثہ فراہم کیا، تیسری طرف ایسے جذبۂ آزادی کو فروغ دیا جو ہر دور میں انقلابی رجحانات و تحریکات کو اسلحے فراہم کرتا رہا۔ کربلا کا تیسرا فیضان عالمِ اسلام ہی سے مخصوص نہیں، تاریخ انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ کربلا کے کثیر الجہات اثرات کو دیکھا جائے تو کربلا تاریخ اسلامی ہی کا انقلاب آفریں موڑ نہیں، تاریخ انسانیت کا وہ روشن سنگِ میل بن کر ابھرتا ہے جس نے تمام انقلابوں، آزادی کی تحریکوں اور عدل و مساوات کے نظریات کے لیے راستے کھول دیے۔

کربلا ہے قوتِ دورِ زماں روحِ حیات — زیست کا عرفان ہے، اور معرفت گاہِ ممات
کربلا عقدہ کشائے عقدۂ دشوارِ ذات — کربلا کا نقطہ نقطہ صد ہزاراں کائنات

کربلا پیمانۂ ظرفِ جہاں ہے آج بھی
تشنگی کا ایک دریائے رواں ہے آج بھی

کربلا ہے صدقِ احمدؐ، نطقِ وحیِ کردگار
کربلا ہے چادرِ تطہیرِ زہراؑ کا وقار
کربلا ہے فقرِ حیدرؓ، عدلِ چشمِ ذوالفقار
کربلا صلحِ حسنؑ، عدلِ سمِ آلودہ کا وار

کربلا پیمانۂ حق، عدل کی میزان ہے
کربلا تفسیرِ صلح و جنگ کا عرفان ہے

کربلا ہے مجمع البحرین بطحا و نجف
کربلا ہے شہرِ علم و جادۂ بیت الشرف
کربلا بحرِ رضائے حق کا تابندہ صدف
کربلا ہر ظلم کے آگے ہے اب بھی سربکف

ماہِ برجِ یثرب و درِّ نجف ہے کربلا
جس طرف عدل و رضا ہیں اس طرف ہے کربلا

کربلا خاکِ شفا پر ہے شہیدوں کی نماز
کربلا شامِ غریباں کے چراغوں کا گداز
کربلا رہبر مناروں کی قطارِ ضو طراز
کربلا نیزوں پہ روشن آفتابوں کا فراز

خونِ حق سے روشنی کے سلسلے قائم ہوئے
کربلا بن کر ہی طیبہ اور نجف دائم ہوئے

کربلا شوقِ سفر بھی، کربلا منزل بھی ہے
کربلا طوفان بھی ہے، کربلا ساحل بھی ہے
کربلا پیکان بھی، حلقوم بھی اور دل بھی ہے
ماورا ہر عہد سے ہر عہد میں شامل بھی ہے

کربلا کے قافلے کے ساتھ چلتی ہے حیات
پیچھے رہ جائے تو صدیوں ہاتھ ملتی ہے حیات

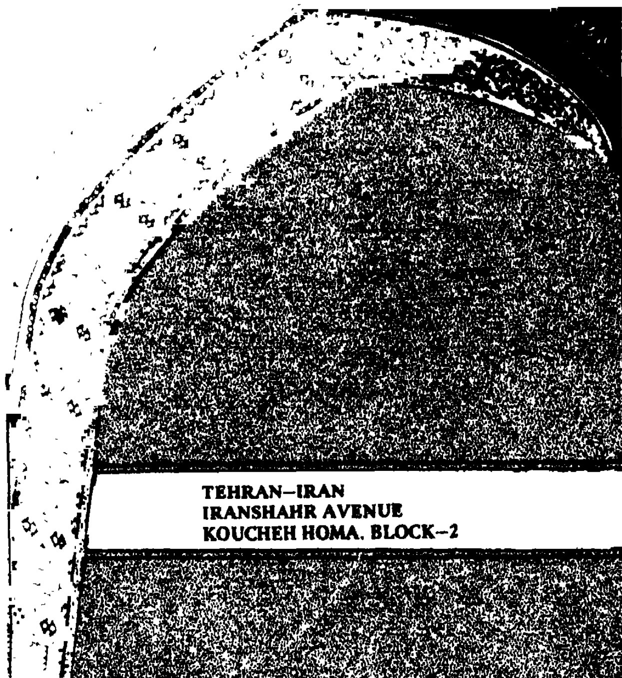
کربلا تک آ کے پلٹو بھی تو جاؤ گے کہاں　　جس طرف جاؤ گے ہوگا کربلا موجود واں

کربلا تیار ہے گا ہر قدم پر امتحاں　　حشر تک ہوگا حسابِ دوستان و دشمناں

کربلا ہے زندگی اور زندگی ہے لازوال

کربلا خود آگہی اور آگہی ہے لازوال

AL-TAWḤĪD



AL-TAWḤĪD (English), P.O.Box 41-2959
Tehran, Islamic Republic of Iran

SUBSCRIPTION FORM

Please send my copy of *Al-Tawhid* on the following address. I am enclosing a cheque/bank draft for $ towards a subscription for ( ) years.

MY ADDRESS: (Please write in capitals)

Name..

No.......................St.......................

City/Town.......................State/Area code.......................

Country..

Signature..................................

التوحيد

باللغة العربية

مجلــة

اسلاميــة ـ فكريــة ـ جامعــة

تُعنى بالفكر الإسلامي المحقّق،

والكلمة الهادفة الصادقة،

وكل مايهمُّ الأمة من رؤى وسلوك بنّاء.

وتفتح صدرها؛

لكل المفكرين الإسلاميين،

خدمةً لقضية التوحيد الكبرى،

وتـركـيزاً لخـصـائص الأمة الاسلاميـة الواحدة،

ونشـراً لأضـواء الثـورة الاسلامية في كل أرجاء الوجود.

بعيداً عن؛

كل تعصب ذميم،

وتفريق بين المسلمين لاتحمد عقباه،

ولغو من القول لا طائل تحته .

الثمـن

■ ايران ١٠٠ ريال ■ لبنـان ٤٠٠ قرش ■ سوريا ٤٠٠ قرش ■ الاردن ٤٠٠ فلـس ■ الـكـويـت ٤٠٠ فلـس ■ عـمـان ٥٠٠ فلس ■ البـحـرين ٥٠٠ فلـس ■ الامارات ٧ دراهم ■ السـعـودية ٨ ريالات ■ قطر ٨ ريالات ■ مصر ١٥٠ مليما ■ ليبيا ٥٠٠ درهم ■ السودان ٤٠٠ مليم ■ الجزائر ٥ دنانير ■ المغرب ٦ دراهم.

● وفي باقي دول آسيا وأفريقيا وفي امـيركا واستراليا وأوروبا ٤ دولارات أو مايعادلها.

طريقة الاشتراك

● تسدد قيمة الاشتراك في بانك ملي شعبه خشايار على رقم الحساب التالي (١٠٠٢٥) سازمان تبليغات اسلامي ـ مطبوعات خارجي

● يرجى ارسال الحوالات الى ادارة المجلة.

المراسلات على العنوان التالي:

الجمهورية الاسلامية في ايران ـ طهران

ص.ب (٣١٩٥ ـ ١٥٨١٥)

شہید مرتضیٰ مطہری

سچی کہانیاں

آج کا انسان

اجتماعی مشکلات

شہید مرتضیٰ مطہری

ختم نبوت

اسلامی تحریک کا آغاز

بعثت سے ہجرت تک

اسلامی جمہوریہ

نہج البلاغہ

آئین زندگی

توضیح المسائل

(اردو)

امام خمینی

تقلید

کیا ہے؟

اہلبیت اطہار

کی

مختصر سوانح حیات

۱۵ خرداد

اسلامی انقلاب

کا

خونین آغاز

اقتصادیات

مغربی تمدن

ایک جھلک

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۲۱۹۵/ ۱۵۸۱۵

جمہوری اسلامی ایران ۔ تہران

فارم ممبری

براہ مہربانی درج ذیل پتے پر مجلۂ توحید اردو ارسال فرمادیا کریں۔

نام .... کوچہ .... روڈ ....

شہر .... صوبہ .... ملک ....

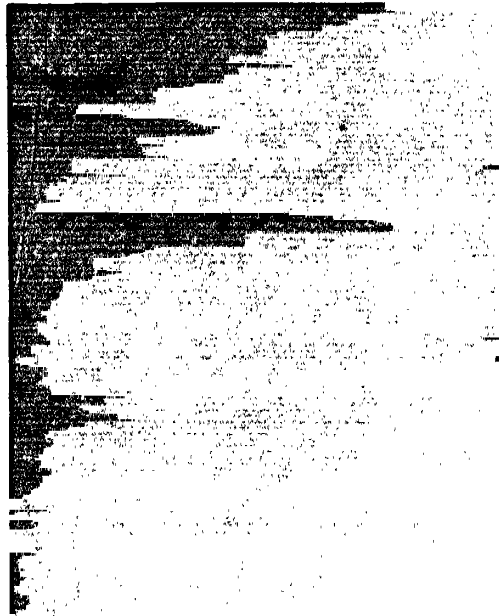
تاریخ .... دستخط

بدل اشتراک

ملک	فی مجلۂ	سالانہ
اسلامی جمہوریہ ایران	۱۵۰ ریال	۵۰۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے	۵۰ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم	۳۲ درہم
سعودی عرب	۸ ریال	۳۲ ریال
قطر	۸ ریال	۳۲ ریال
کویت	۶۵۰ فلس	۲½ دینار
افریقہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ	۸ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
کینیڈا	۴½	۱۸ ڈالر

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ





توحید

اسلامی، علمی، فکری سہ ماہی رسالہ

جلد (۲)، شمارہ (۴)

ترتیب

داریہ

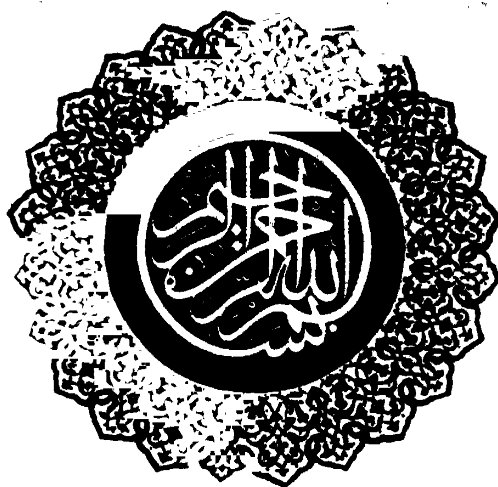
قرآن

مجلہ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۱۵۸۱۵/۳۱۹۵
تہران، جمہوری اسلامی ایران
فون: ۲۵-۸۲۵۰۲۲

صفر تا ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۶ھ / نومبر، دسمبر سنہ ۱۹۸۵ء، جنوری سنہ ۱۹۸۶ء

حدیث

فکر و فلسفہ



شذرہ

پیغامِ توحید

مجلہ توحید نے آج ایسے عالم میں کامیابی کے ساتھ اپنی دو منزلیں طے کرلی ہیں جب کہ آسمان صحافت پر ہر ملک اور زبان میں چھوٹے بڑے ہزاروں اخبار و جرائد ماہ و انجم کی طرح چمک دمک رہے ہیں ـــــ بامقصد بھی، بے مقصد بھی، سچے بھی جھوٹے بھی، مہذب بھی غیر مہذب بھی، باادب بھی، بے ادب بھی لاکھوں کی تعداد میں چھپنے والے بھی، آفس کاپی مرتب رکھنے والے بھی، مذہبی اور ادبی بھی، سیاسی اور تفریحی بھی۔ اس گرماگرم بازار میں قدم رکھنا اور وہ بھی کسی مقصد و ارادہ کے ساتھ نپے تلے انداز میں قدم رکھنا۔ اگر توحید کے لیے ممکن ہوا ہے تو یہ صرف ہمارا اور آپ کا اسلامی جذبۂ اخوت و محبت دین و مذہب کی اطاعت و خدمت اور "اسلامی وحدت" کی ترویج و اشاعت کا ثمرہ ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ "توحید" ایک ایسا مذہبی جریدہ ہے جس کو برادران شیعہ و اہل سنت ہر دو فریق خود اپنا ترجمان خیال کرتے ہیں اعلیٰ علمی و تحقیقی مضامین کے ساتھ ساتھ اسلامی وحدت کی نشر و اشاعت ہمارا بنیادی نصب العین ہے۔ اور ہمیں اپنے ہدف و مقصد کے حصول پر مکمل اطمینان و یقین ہے اس لیے کہ آج سے چودہ سو سال قبل ماہ ربیع الاول میں آمنہ کا چاند جس وقت طلوع ہوا تھا، تین سو ساٹھ خداؤں کے ماننے والی قوم کے درمیان شمع "توحید" روشن کرنا بظاہر آسان نہ تھا، مگر رحمۃ للعالمینؐ نے اپنی صداقت و دیانت اور اخلاص و محبت کے تحت اس ناممکن کو ممکن بنادیا۔ ہم نے بھی اسی شمع توحید سے لو لگا رکھی ہے لہٰذا تمام ملت اسلامیہ کو پرچم لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے سائے میں جمع کرنے کی تحریک انشاء اللہ ضرور بارآور ہوگی۔



یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ سینکڑوں سال قبل ایک وادی غیر ذی زرع میں "وحدت" کا بیج

پڑتے ہی غرور وکبر و نخوت کی زمین سے محبت واخلاص و وفا کی کونپلیں پھوٹیں اور صفحۂ گیتی پر ایک ایسا شجر صدابہار "اسلام" کی شکل میں ابھر کر سامنے آیا جو عداوت و نفرت کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں زندگی بسر کرنے والوں کے لیے اخوت و مساوات کا شجر سایہ دار بن گیا جس نے اپنے پیلوگزینوں کے سامنے استقامت و اولوالعزمی اور ایثار و فداکاری کے شیریں پھل پیش کئے جس کی شاخوں کی ہم آہنگی نے دوستی و اتحاد کی داغ بیل ڈالی، بلند و بالا ٹہنیوں نے لچک کر تواضع و انکساری کا طریقہ سکھایا اور خزاں رسیدہ پتوں نے درخت سے ٹوٹ کر آواز دی کہ جو بھی اس "شجر وحدت" سے علیحدگی اختیار کرے گا اسے ہوائے عالم بکھیر کر فضاؤں میں منتشر کر دے گی اور لوگ اپنے قدموں تلے روند ڈالیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک مسلمان اس شجر وحدت کے سایہ تلے اتحاد و اتفاق کے ساتھ زندگی گذارتے رہے بڑے سے بڑا طوفان ان کے پائے استقامت کو متزلزل نہ کرسکا۔

حق و آگہی کے متلاشی رنگ و نسل و قوم و زبان کی تعریف کئے بغیر اپنے تھکے ماندہ ذہنوں کے ساتھ اس شجر وحدت کی گھنی چھاؤں میں آکر سکون و اطمینان حاصل کرتے رہے۔ یہ درخت اتنا بارآور ہوا کہ اس کی شاخیں خط عرب سے عبور کر کے ایران و روم اور پھر رفتہ رفتہ پوری دنیا میں پھیلتی چلی گئیں۔ شرق سے غرب اور جنوب سے شمال تک ثمر وحدت کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس نے ایک وحشت خیز جہالت انگیز غیر مہذب سنگلاخ مقام پر نشو ونما پائی تھی مگر ایک اولوالعزم پیغمبر اور اس کے اہل بیت اور اصحاب باوفا نے اس کی کچھ اس طرح سے آبیاری کی چند ہی دنوں میں خداوند وحدہٗ لاشریک کی مدد سے ایسی وسعت پیدا ہوئی کہ اس نے اسپین (ہسپانیہ) اور جبرالٹر (جبل الطارق) کی اونچی اونچی چوٹیوں کو سر کر لیا اور یہ دین وحدت لیظہرہ علی الدین کلہ کی تفسیر بن گیا۔

مگر افسوس گلشن اسلام میں بہت جلد ہی ذاتی اغراض و مقاصد کی ایسی فاسد ہوا چلی کہ یہ شیرازۂ وحدت سوکھے پتوں کی صورت میں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگا۔ مسلمان آپسی اختلاف و انتشار میں مبتلا ہو کر اپنی قوت و طاقت کو ضایع کرنے لگے۔ ریاست و حکومت کی چاہ میں چھوٹے چھوٹے حصوں میں بکھر کر یہ مسلمان اتنا کمزور ہو گیا کہ استعماری طاقتوں نے کھلونا سمجھ کر اس کی قسمت کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔

لیکن ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خدائے قادر نے تو اس بات کا وعدہ کیا تھا کہ:

ذالک بان اللہ لم یک مغیر النعمۃ انعمہا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسہم (انفال/۵۳)

خدا ہرگز کسی قوم کو نعمت دیکر نہیں چھینا کرتا مگر ہاں جبکہ وہ لوگ خود اپنے نفس کو بدل ڈالیں؛ یقیناً خود مسلمانوں نے قلعہ لا الہ الا اللہ کی دیواروں سے پھلانگنا شروع کر دیا اور اسلام کے نام لیوا خود شجر وحدت کی جڑوں میں گرم پانی ڈالنے لگے، اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹنا اسی کو کہتے ہیں۔ جس اسلام نے اونٹوں کے چرانے والوں کے ہاتھ میں نکیل کے بدلے حکومت کی باگ ڈور دی تھی، اب وہی اسلام بظاہر شتر بے مہار کی طرح دشت غربت میں آوارہ پھر رہا ہے، جس اسلام نے یورپ و افریقہ کی وحشی قوم کو تہذیب و تمدن کی روشنی دکھائی تھی اسی اسلام کے ماننے والے آج نام نہاد ترقی یافتہ قوموں کے درمیان وحشی عیاش اور غیر مہذب کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں وہ اسلام جس کے ذریعہ رحمتہ للعالمینؐ نے ہزار صعوبتیں اٹھا کر دنیا کو صلح و آشتی محبت و الفت اور وحدت و یگانگت کا پیغام دیا تھا آج اسی اسلام کا کلمہ پڑھنے والے چھوٹی چھوٹی جزئی اور فروعی باتوں کو بنیاد بنا کر آپس میں لڑنے مرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔



مسلمانو! اب بھی وقت ہے آج اگرچہ پیغمبر اسلامؐ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن احادیث و سیرت کی صورت میں نقوش حیات باقی ہیں، اہلبیت اطہارؑ کا کوئی فرد ظاہر بظاہر موجود نہیں ہے لیکن اقوال و کردار کی صورت میں خطوط زندگی واضح ہیں، اصحاب فدا کار نہیں ہے مگر ان کے حالات و شعار آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔

قرآن آج بھی پکار پکار کر کہہ رہا ہے:۔

اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصابرین (انفال/۴۶)

خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری جرأت مردانہ کمزور پڑ جائے گی۔ صبر کرو۔ خدا صبر کرنے والوں کا ساتھی ہے۔

مگر افسوس مسلمان استعماری طاقتوں کا آلۂ کار بنا ہوا ہے، اشتراکیت کے کھوکھلے نعرے نے اس کے دل ودماغ کو تسخیر کر رکھا ہے خود اپنے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی دولت کا اسے علم نہیں اور دوسروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے کاش اسے اپنی عظمت و اہمیت کا احساس ہوتا تو غیروں کا دستِ نگر بننے کے بجائے خود آپس میں اتحادِ عمل کے ذریعہ اپنے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا۔ آخر اس نے قرآن کے اس اعلان کو کیوں فراموش کر دیا ہے کہ کنتم خیر امة اخرجت للناس (تم بہترین امت ہو جس کا کام لوگوں کی ہدایت کرنا ہے)

مسلمان جب تک احساس کمتری میں مبتلا رہے گا اور خود اعتمادی اور خودداری سے کام نہ لے گا دوست نما دشمن اس کو آپس میں لڑا کر اس کی طاقت کا استحصال کر کے اپنا آلۂ کار بنایا کرتے رہیں گے۔ ہمیں اپنے دوست اور دشمن کو پہچاننے کا سلیقہ پیدا کرنا چاہئے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک دین، ایک قرآن، ایک قبلہ رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں اپنے مسلمان بھائیوں پر اعتماد و اعتبار کرنا تو دور کی بات ہے ایک دوسرے کی کھلے طور پر مخالفت و منقصت کرنا اپنا فرض عین تصور کرتے ہیں اس کے برخلاف خدا و رسولؐ کے دشمن، مذہب و قرآن کا کھلے طور پر مذاق اڑانے والے نہ صرف ہمارے دوست بلکہ ہمارے سرپرست و آقا بنے ہوئے ہیں۔ آخر یہ دوستی کا کون سا معیار ہے؟!!

کیا مسلمانوں سے بیت المقدس چھین لینے والے صیہونیوں یا ان کے مربی و سرپرست امریکہ سے دوستی کی امید کی جاسکتی ہے؟ کیا وہ زہریلے سانپ جنھوں نے افغانی مسلمانوں کے گھروں میں گھس کر اجتماعی طور پر تباہی و بربادی مچا رکھی ہے انہیں مسلمانوں کا دوست تسلیم کیا جاسکتا ہے؟؟ کیا لاکھوں مسلمان بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کو رفیوجی کیمپوں میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دینے والی طاقتیں اسلام اور مسلمانوں کی دوست تصور کی جاسکتی ہیں؟؟؟ اگر نہیں تو پھر ان شر سے نجات پانے کا کیا راستہ ہے؟ شیعہ سنی تفرقہ آرائی؟ عرب و غیر عرب گروہ بندی؟ یا قومی نسلی اور لسانی تفریق؟

نہیں ہرگز نہیں! اگر ہم اسلام کو سربلند دیکھنا چاہتے ہیں، اور اپنی عظمت دیرینہ کو واپس لینا چاہتے ہیں تو ہمیں دوبارہ اس "شجر وحدت" کی آبیاری کرنی ہوگی جس کے لیے ہمیں بڑی سے بڑی

قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے اعلیٰ کے لیے ادنیٰ کو قربان کرنا عین اسلام ہے۔ دشمنان اسلام کی سازشوں کو ناکام بنانے کے لیے اپنے ذاتی مفادات کو نظر انداز کر کے مسلمانوں کا متحد ہو جانا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ ہمیں قرآن کے اس اعلان کو پیش نظر رکھنا چاہیئے :

ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون (سورہ انبیاء/۹۲)

بے شک ہم نے تمہارے دین (اسلام) کے ماننے والوں کو امت واحدہ قرار دیا ہے،
میں تم سب کا پروردگار ہوں تم میری ہی عبادت کیا کرو۔

ورنہ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے خداوند متعال اپنے حبیب ص سے پہلے ہی ارشاد فرما چکا ہے :۔

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شئی انما امرھم الی اللہ ثم ینبئھم بما کانوا یفعلون (انعام ۱۵۹)

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی فرقے بن گئے تمہیں ان سے کچھ سروکار نہیں ان کا معاملہ تو خدا کے حوالے ہے جو کچھ انہوں نے کیا ہے خدا اس کا انہیں مزا چکھا دے گا۔

مسلمانوں کے درمیان اختلافات ان کی تنگ نظری اور وسائل اتحاد کی کمی کے علاوہ بڑی طاقتوں کی ان مسلسل کوششوں کے مرہون منت ہیں جو وہ اپنی چودھراہٹ کو باقی رکھنے کے لیے کرتے رہتے ہیں۔ لہذا ہمیں وسعت قلب کا مظاہرہ کرتے ہوئے وقت سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ آج خدا کا شکر ہے کہ تمام وسائل اتحاد مہیا ہیں، مسلمان بیدار ہو چکے ہیں، استعماری طاقتوں کی حقیقت واضح ہو چکی ہے اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کو امام خمینی مدظلہ العالی جیسا اسلام دوست، حق پسند، غیر متعصب قائد مل گیا ہے جس نے اسلامیان عالم کے سامنے اسلامی اتحاد کی بے نظیر مثال قائم کر دی ہے، جس نے اپنے تدبر و رہنمائی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسلام ایک زندہ اور زندگی دہندہ دین ہے۔ آپ کا یہ واضح اعلان ہے کہ :۔

"مسلمانوں کے درمیان بھائی چارگی اجتماعی مشکلات کے دور کرنے کا سبب ہوگی شیعہ سنی برادران پر لازم ہے کہ وہ ہر طرح کے اختلافات سے دور رہیں کیونکہ آپسی اختلاف ان لوگوں کے مفاد میں ہے جو نہ مذہب شیعہ پر اعتقاد رکھتے ہیں نہ مذہب اہل سنت سے ان کا واسطہ ہے۔ ہم پر واجب ہے کہ اس بات کا خیال رکھیں کہ ہم سب مسلمان ہیں اور قرآن و توحید کے پیرو ہیں"

یہ صرف زبانی باتیں نہیں بلکہ امام ہی کے قول کے مطابق :۔

"جمہوری اسلامی ایران میں شیعہ و سنی پہلو بہ پہلو کھڑے ہیں وہ آپس میں بھائی بھائی اور حقوق میں برابر ہیں جو اس کے خلاف عمل کرے وہ اسلام اور ایران کا دشمن ہے"



آیئے امام امت کی قیادت میں نقیب وحدت اسلامی آیۃ اللہ العظمیٰ منتظری مدظلہ کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہر طرح کے نسلی، قومی اور لسانی فرق کو مٹا کر اسلامی بنیادوں پر اتحاد قائم کریں اور سرور کائنات رحمۃ للعالمین، خاتم الانبیاء، احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز محافظ دین و شریعت ہمارے ہادی اہلبیت اطہار امام جعفر صادق علیہ السلام کی ولادت باسعادت کے موقع پر ہر ملک اور ہر شہر میں پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ "ہفتہ وحدت" کا جشن منائیں تاکہ ہمارا اتحاد، دشمنان اسلام کی ہر کوشش کو ناکام بنا دے۔ یہی وہ امر ہے جو اسلامی ثقافت اور اسلامی وحدت و عظمت کو دوبارہ واپس کرا سکتا ہے۔ آج جزئی اختلافات کو مٹا کر مشترکہ بنیادوں پر اتحاد کی ضرورت ہے۔ ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ تمام مسلمان ایک مسلک پر متحد ہو جائیں اور اسی کی پیروی کریں یا شیعہ سنی اپنے خاص عقائد سے دست بردار ہو کر صرف متفق علیہ مسائل پر عمل پیرا ہو جائیں، اس لئے کہ یہ دونوں تصورات غلط ہیں، اولاً وحدت اسلامی سے مراد یہ نہیں ہے کہ تمام اسلامی فرقے اپنا وجہ امتیاز ختم کر کے ایک اعتقاد اور ایک نظریہ کو اپنا لیں دوسرے یہ کہ عملی طور پر بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام اہل مذاہب اس کو قبول کر لیں۔ اصل میں اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام مسلمان ان مصالح کو اختیار کریں جو نفس اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمیں دشمنوں کے مقابلہ میں اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے لیے متحد ہو جانا چاہیئے چاہے یہ مسلمان کسی فرقہ، قوم اور قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ تمام مسلمان اپنے عقائد و نظریات کی حفاظت کے لیے ایک جسم کے اعضا کی حیثیت اختیار کر لیں جس طرح ہر جزو بدن اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے متحدہ طور پر پورے جسم کا دفاع کرتا رہتا ہے اور دشمن کو اس بات کا موقع نہیں دیتا کہ وہ جسم کے کسی ایک حصہ کو بھی نقصان پہنچائے۔ اگرچہ ہر عضو بدن الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا ہے، اسی طرح تمام اسلامی فرقوں کو بھی چاہیئے کہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے مشترکہ محاذ پر اسلام کی حفاظت کے لیے دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اسلامی وحدت کا ثبوت پیش کریں۔ تمام اجتماعی مسائل کو اتحاد و نظم کے ساتھ طے کریں، مسلمانوں کے درمیان تہذیبی، ثقافتی، سیاسی، اقتصادی، عسکری اور عدالتی میدانوں میں بڑی آسانی سے اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے، صرف شرط ہے خلوص نیت کی۔ اگر تمام مسلمان متحد ہو کر اس نہج پر کام کریں تو انشاء اللہ کامیابی یقینی ہے۔





- قرآن مجید کے رہنما اشاروں کا بیان۔
- مختصر و سادہ معنی و مطالب۔
- فرد اور معاشرہ کی اصلاح، تعمیر و ترقی۔
- اسلام اور قرآن کا پیام زندگی۔
- حدیث کی روشنی میں۔
- مناظرے اور مباحثے سے احتیاط۔

مرتضیٰ حسین

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ:

بے شک، آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات دن کے ادل بدل، اور سمندر میں کشتیوں کے چلنے میں جو لوگوں کے لیے کارآمد سامان لے کر چلتی ہیں اور پانی میں جو اللہ نے آسمان سے برسایا، پھر اس سے زندہ کیا۔ زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد اور زمین میں سب طرح کے جانور پھیلائے اور ہواؤں کے آنے جانے میں اور بادل میں جو اس کے حکم کا پابند ہے زمین و آسمان کے درمیان۔ یقیناً یہ نشانیاں ہیں عقل مندوں کے لیے (۱۶۴)

تفسیر:

علم کا ابتدائی مرحلہ مشاہدہ و مطالعہ ہے، دوسرا ذریعہ تعقل و ادراک۔ قرآن مجید نے دونوں علمی ذرائع استعمال کرنے پر زور دیا، مطالعہ، تحریر، تقریر، ریاضت، سفر برائے طلب علم، مشاہدہ تجربہ اور سب سے بڑی بات مقصد تحصیل علم، استاد اور مدارس کا تعین۔ قرآن مجید میں اس موضوع پر متعدد آیات ہیں۔ ہم انشاء اللہ آگے انھیں پیش کرتے رہیں گے۔ یہاں صرف یہ نکتہ عرض ہے کہ مکی آیات میں وجود باری اور اس کے ثبوت میں آثار و تخلیق پر بہت زور رہے۔ اب تک جو آیتیں

آئی ہیں ان میں یہ آیت اس سلسلے کی پہلی اور ذرا مفصل آیت ہے۔

اللہ ۔ واحد قادر و حکیم ہے۔ اس کی دلیل، اہل عقل کے لیے کائنات کی گواہی ہے۔ ذرا گردن اٹھا کر نظر دوڑاؤ۔ کتنی بڑی فضا اور کتنا اونچا آسمان ہے، غور کرو، آدم زاد کہاں تک پہنچا اور ابھی تک آسمان کا سرا نہیں ملا۔ اسی طرح زمین۔ اس کا عجیب و غریب طول و عرض، روشنی اور اس کا اتار چڑھاؤ، دن ہوا، رات گئی، رات آئی اور نقشہ بدل گیا۔ یہ سمندر اور دریا، پانی اور اس کے فوائد، ریگستان میں اونٹ، سمندر میں جہاز، ہوائیں اور ان کے اثرات سب ایک طرف اور بارش اپنی جگہ، زمین کو ٹیوب ویل سے سیراب کر کے، نہروں سے سینچ کر دیکھ لیا جو زندگی و توانائی بارش سے زمین اور پیداوار، ارضی مخلوق اور جانداروں کو ملتی ہے۔ وہ دوسری آب رسانی میں نہیں تم یہ سب چیزیں دیکھ کر خالق یکتا کا تصور کر سکتے ہو، اور اہل نظر غور کر کے اس کی تصدیق حاصل کر سکتے ہیں۔ عارف کے لیے مطالعہ و فکر، عالم کے لیے تعقل و تدبر کی راہیں کھلی ہیں۔ کفر و انکار کی گنجائش نہیں ہے۔

اس آیت میں سائنس اور مطالعۂ کائنات کے کم از کم آٹھ موضوع بیان ہوئے ہیں:

۱ ۔ آسمان و زمین کی تخلیق۔

۲ ۔ رات دن کی آمد و رفت۔

۳ ۔ کشتیوں اور جہازوں کی سمندر میں آمد و رفت۔

۴ ۔ بارش۔

۵ ۔ بارش سے زمین کا زندہ ہونا۔

۶ ۔ زمین میں جاندار مخلوق۔

۷ ۔ ہوا اور اس کا چلنا۔

۸ ۔ بادل۔

قرآن مجید کا معجزہ ہے۔ چھوٹی سی آیت میں، سائنس کے مختلف شعبوں کی نشاندہی کرنے کے ساتھ فکرِ بشر کو مہمیز اور طلب علم کی دعوت بھی دے دی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ

وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ● اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ

اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ● وَقَالَ

الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ

كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ

بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ●

ترجمہ:

اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے علاوہ اوروں کو اللہ کا مقابل (ہمسر) بناتے ہیں اور ان سے اللہ کی طرح محبت کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ایمان لاچکے وہ ان سے کہیں زیادہ الفت اللہ سے رکھتے ہیں۔ اور کاش، ظالموں کو وہ (حقیقت) اب سوجھائی دے جاتی جو عذاب دیکھ کر سوجھے گی کہ بے شک ہر طرح کی ساری قوت اللہ ہی کی ہے اور بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے (۱۶۶) (اور کس قدر سخت مرحلہ ہوگا) جب پیشوایانِ باطل اپنے پیروں سے تبرّا کریں گے (پیچھا چھڑائیں) اور عذاب کو دیکھیں گے اور ان سب کے تعلقات ٹوٹ جائیں گے (۱۶۶) اور پیروکار کہیں گے اگر کہیں دوبارہ ہمیں دنیا میں واپس جانا ملے تو ہم بھی ان سے (اسی طرح تبرّا) بیزاری کریں جیسے انھوں نے ہم سے بیزاری کی۔ یوں، اللہ تعالیٰ ان کے اعمال ان کو حسرت آفرین بنا کر انھیں دکھائے گا اور وہ جہنم سے نکلنے نہ پائیں گے (۱۶۷)

تفسیر :

۱۶۵ - وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ....

قرآن مجید کی تعلیم تو ہے" الٰھکم الٰہ واحد ...." مگر بر خود غلط لوگوں نے بلا وجہ، بلا دلیل کچھ "اللہ جیسے" بنا لیے ہیں۔ ان سے وہ عشق و محبت ہے کہ خدا کو بھلا دیا۔ ان سے آس لگاتے، اگر یہ بوتے ہیں تو ان کے اشاروں پر چلتے ہیں، ان کے غضب سے ڈرتے ہیں۔ ان بتوں اور شیطانوں سے عقیدت اس وقت ہوا ہو جائے گی جب حشر کا میدان پھر عذاب کا سامنا ہوگا۔ اس وقت نہ وہ محبت کام آئے گی، نہ ان کی آقائی رنگ دکھائے گی عذاب خدا دیکھ کر اس وحدہ لاشریک کی قوت و قدرت کا اقرار کرنا بے سود ہے، ماننا ہے تو آج اسے مالک و معبود مانو۔

نجات اس کی ہے جو، اللہ کے مثل و ند سے بیزار ہو۔ حضرت علی علیہ السلام نے تعلیم دی ہے۔ اوّل دین اس کی معرفت، اور معرفت کا کمال اس کی توحید کا عقیدہ ہے اور کمال عقیدۂ توحید۔ اخلاص کہ ہر طرح کے میل اور مثال سے اسے پاک و بلند جاننا ہے۔ بھئی جب سب اس کے پیدا کیے ہوئے ہیں تو اس کے ساتھ انہیں کیوں ملاؤ۔ وہ بات نہ کرو جو خلاف تقوی ہو۔ مومن و متقی آج بھی سب سے زیادہ محبت اللہ ہی سے رکھتے ہیں وہ قدرت و قوت کا مالک اسی کو سمجھتے ہیں۔

۱۶۶- اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا ....

خود ساختہ آقاؤں کا حشر یہ ہوگا کہ قیامت کے دن، عذاب خدا دیکھتے ہی یہ معبود، یہ سلاطین، یہ بت اور یہ شیاطین جن کے اوپر لوگ جان دیتے تھے یوں الگ ہو جائیں گے جیسے ان سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ سب عقیدت و محبت کے رشتے ٹوٹ جائیں گے۔

۱۶۷- وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا ....

عذاب کا سامنا، اور آسروں کا ٹوٹنا اور آقاؤں کا روٹھنا دیکھ کر یہ مرید و فدوی و غلام باوفا کہیں گے کہ دنیا میں دوبارہ جانا مل جائے تو ان شیطانوں سے اسی طرح اظہار بیزاری کریں گے جیسے یہ لوگ اس وقت ہم سے تبرا کر رہے ہیں۔ مگر اب حسرت کے سوا کچھ حاصل نہیں، انبیاءؑ کو نہ ماننے ائمہؑ کے فرمان ٹھکرانے کے نتائج اور عذاب کا سامنا ہے اور اسی عذاب میں رہنا ہے۔ اللہ۔ تیری پناہ۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ

حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ

عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا

عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

ترجمہ:

لوگو! زمین کی چیزوں میں حلال پاک چیزیں کھاؤ، اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو بے شک وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے (۱۶۸) وہ تمہیں بدی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے اور یہ تم اللہ کے خلاف (وہ باتیں) کہو جو تم نہیں جانتے (مانتے) (۱۶۹)

تفسیر:

شیطان کے اقدامات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خدا کے احکام پر عمل کرے، ان احکام میں سے ایک حکم کلی یہ ہے کہ زمین پر جو حلال و طیّب ہے اس کا کھانا مباح ہے۔ حرام و خبیث چیزوں کا بیان الگ آئے گا۔ اس حکم کے بعد بتوں کے نام پر آزاد چھوڑے ہوئے اونٹ، گائے، بکری یا بطور خود حرام کردہ اشیاء پر اصرار شیطانی راہ اور شرک ہے، شیطان تمہارا دشمن ہے وہ صراط مستقیم سے ہٹائے گا، وہ بری باتوں اور برے کاموں کا مشورہ دے گا، وسوسہ وہ ڈالے گا، غلط فیصلے تم کرو گے اور اس کو وزنی بنانے کے لیے منسوب اللہ کی طرف کرو گے۔ شرک کی ایک قسم یہ بھی ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ

قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ

لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ۝ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا

كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً صُمٌّ بُكْمٌ
عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ۝

ترجمہ:

اور جب ان سے کہا گیا کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آیا ہے اسے مانو۔ ان لوگوں نے (جواب میں) کہا۔ بلکہ ہم نے تو اپنے آباء و اجداد کو جس طریقے پر پایا، اسی راہ پر چلتے ہیں۔ اگرچہ ان کے آباء و اجداد نہ تو کچھ سمجھتے ہوں نہ ہدایت یافتہ ہوں (۱۷۰) اور کافروں کی مثال یوں ہے جیسے کوئی شخص اس (جانور) کو پکارے جو پکار اور چلانے کے سوا کچھ نہ سنے۔ بہرے، گونگے، اندھے ہیں، وہ تو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں (۱۷۱)

تفسیر:

دعوت حق کے جواب میں منکروں کا ایک انداز جواب آیت ۱۶۸ میں بیان ہوا کہ من مانے احکام اللہ سے منسوب کریں گے ہمارے نبی کی بات نہ مانیں گے۔ دوسرا طریقہ ان کافر و مشرک و منکر افراد کا یہ ہے کہ ہماری دعوت کے مقابلے میں باپ دادا کا دستور اور پرانے رسم و رواج کا حوالہ دیتے ہیں، اور عقل کے دشمن یہ جانتے ہوئے انجان بنتے ہیں کہ وہ لوگ بے شعور و منحرف ہیں۔

اے میرے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ہر ذمہ دار (امام و داعی) ان اندھی تقلید کرنے والوں کی مثال اس گلے کی ہے جسے خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے چرواہا اشاروں اور دانائی سے سمجھانا چاہے مگر ان پر اثر نہ ہو۔ کیونکہ وہ جانور عقل و ادراک میں صرف اتنا حصہ رکھتے ہیں کہ چرواہے کی چیخ سن لیں اور بس۔ اس بنا پر انسان نما جانوروں پر قوت ضائع نہ کرو۔

ان کے پاس عقل و قلب ہے مگر ادراک و وجدان سے خالی، آنکھیں ہیں مگر روشنی نہیں کہ دیکھ سکیں، کان ہیں مگر قوت سماعت سے بے بہرہ جیسے جانور، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ (الاعراف ۱۷۹)

امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ان کو دعوت اسلام و ایمان دینا ایسا ہے جیسے جانوروں سے باتیں کرنا وہ آواز تو سنتے ہیں مگر بات نہیں سمجھتے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن
طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۝
إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ
بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ
اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

ترجمہ:

ایمان لانے والو! پاکیزہ نعمتیں جو تمھیں روزی میں ہم نے دی ہیں انھیں کھاؤ پیو اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم اس کی ہی عبادت کرتے ہو (۱۷۲) اس نے تم پر مردار اور خون اور سور کا گوشت اور جس ذبیحہ پر غیر اللہ کا نام (وقت ذبح) لیا گیا ہو وہ حرام کیا ہے۔ پھر جو شخص ناچار ہو (بشرطیکہ) نافرمان نہ ہو، حد (شرع) سے آگے بڑھنے والا نہ ہو تو اس پر گناہ نہیں ہے۔ بے شک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے (۱۷۳)

تفسیر:

۱۷۲۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا ....

اللہ نے حلال وطیب ومباح چیزوں کے استعمال اور کھانے پینے کی اجازت کے ساتھ یہ بھی سمجھایا کہ چونکہ تم شرک سے دور رہو اس لیے شانِ بندگی یہ ہے کہ نعمت پر شکر بھی بجالاؤ، شرک شیطان کی راہ چلتے ہیں تم ہر لمحے اللہ کی یاد کرتے رہوگے تو ہوس کا غلبہ اور لذت طلبی کا زور ٹوٹ جائے گا۔

۱۷۳۔ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ ....

حصرِ اضافی کے ساتھ یہاں چار چیزوں کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ مردار، خواہ وہ اپنی موت سے مرا ہو یا غیر شرعی طور پر مارا گیا ہو۔ اصل میں حلال جانوروں کو روبہ قبلہ لٹاکر خود روبقبلہ

ہوکر، "اللہ اکبر بسم اللہ اللہ اکبر" کہتے ہوئے حلقوم کی نچلی دونوں طرف کی دو رگوں کا کاٹنا حلقوم سمیت کہ ان سے خونِ جہندہ نکلے۔ ذبیحہ ہے۔ اور اسی کے بعد وہ گوشت پوست مباح ہوتا ہے۔ کسی بت، پیر فقیر یا محترم شخص کے نام سے ذبح کرنا حرام اور ایسے ذبیحہ کا کھانا ناجائز ہے۔

خون نجس ہے اور اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ لیکن وقت ذبح عادت و معمول کے مطابق ذبیحہ کا خون نکل جائے تو ان رگوں اور حلقوم پر پانی ڈالنے اور نکلے ہوئے خون کو پاک کرنے کے بعد اندر کا خون پاک ہو جاتا ہے اور گوشت میں لگا ہوا خون کھانا مطابق حکم سنت جائز ہے۔ اسی طرح خون چڑھانے کا حکم بھی مستثنیٰ مانا گیا ہے۔

سور، نجس العین ہے ۔ فَإِنَّهُ رِجْسٌ ۔ اس کا گوشت کھانا حرام ہے، اس کی چربی اور سب کچھ ناپاک و حرام ہے۔

أُهِلَّ : اہلال، ذبح کے وقت بآواز بلند نام لینا۔ مُحْرِم کا صدائے تکبیر بلند کرنا، چاند دیکھ کر اعلان کرنا اور دوسروں کو چاند دکھانا۔

آیت میں چوتھا حکم کلی ہے کہ جس ذبیحہ پر وقت ذبح اللہ کا نام نہ لیا جائے کسی بت، بادشاہ یا پیر فقیر.... کا نام لیا جائے وہ ذبیحہ حرام ہے اس کا گوشت کھانا جائز نہیں۔ تفصیلات کے لیے کتبِ فقہ دیکھیے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ذبیحہ قربۃً الی اللہ ہونا چاہیے۔

رعایت یہ ہے کہ مجبور انسان، بھوک سے قریبِ مرگ آدمی، بقدرِ ضرورت و بقائے زندگی ان چیزوں کو کھا سکتا ہے۔ مگر یہ اجازت مسلمان اور مومن و پابند احکام کے لیے ہے۔ باغی ۔ و ۔ عاد ۔ سرکش و باغی از اسلام اور خارج از حدود شرع کے لیے نہیں۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا : "باغی" : امام کے خلاف بغاوت کرنے والا اور "عادی" : راستوں میں قافلے لوٹنے والا۔ (الکافی)

ان چاروں چیزوں کی حرمت دو مکی سورتوں میں ہے ۔ الانعام/۱۴۵ و النحل/۱۱۵ دو مدنی سورتوں میں البقرہ، زیر نظر آیت اور المائدہ/۳۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ اول بعثت، اواخر قیام مکہ ۔ اوائل ہجرت اور اواخر عمر مبارک آنحضرتؐ میں اس حکم کا نزول شدت و اہتمام کے طور پر تھا۔ اس لیے اس قانون کو تاکیدی سمجھا گیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ
مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا
يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ
اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ فَمَا
أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ
وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝

ترجمہ :

بے شک جو لوگ ان باتوں کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے کتاب میں نازل کی ہیں اور (اس کے بدلے ، وہ تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے پیٹ میں صرف آگ بھرتے ہیں۔ اور اللہ قیامت کے دن ان سے بات (تک) نہ کرے گا۔ اور نہ انھیں پاکیزگی دے گا۔ اور ان کے لیے (تو) بڑا دردناک عذاب ہے (۱۷۴) یہی ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت (بخشش) کے عوض عذاب خرید لیا۔ تو یہ (جہنم کی) آگ پر کس قدر زیادہ تیار ہیں (۱۷۵) یہ اس لیے کہ یقیناً اللہ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا، اور جن لوگوں نے (اس) کتاب میں (حق چھپا کر) اختلاف پیدا کیا وہ بڑی نافرمانی پر (تیار) ہیں (۱۷۶)

تفسیر :

۱۷۴۔ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ . . . .

۱۷۵۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ . . . .

آیت ایک سو انسٹھ میں بھی حق کو چھپانے کی بات ہوئی ہے اس کے ساتھ اس آیت کو ملایئے

تو بار بار توجہ دہانی اور تنبیہ ملے گی کہ اللہ کی تعلیم کو لوگوں تک نہ پہنچانا یا پیٹ کی خاطر، مال دنیا کے لالچ میں حلال و حرام غذا کی بات نہ کرنا ناقابل معافی جرم ہے۔ دنیا اور ظاہری نظر میں وہ لذیذ اور عمدہ غذائیں کھاتے ہیں مگر اصل میں وہ آگ کھا رہے ہیں، جیسے زہر ملا ہوا مرغن کھانا کہ دیکھنے میں خوش رنگ اور ٹھنڈا مگر پیٹ میں پہنچا اور گرمی سے بدن پھنکا اور آدمی اپنے شکم کی آگ میں جل مرا۔ اس کے علاوہ اس نفسانفسی کے عالم میں یہ لوگ اس کلام و توجہ خدا سے بھی محروم رہیں گے جو لطف و مرحمت، بخشش و مغفرت کی نوید ہوگی جس سے اہل تقویٰ اور حبیب خدا فیضیاب و مخاطب ہوں گے۔ وَلَا يُزَكِّيهِمْ یہ لوگ عذاب کی مدت معین کے بعد معافی پا کر جنت میں نہ جا سکیں گے، جب کہ بہت سے گنہ گار سزا کی ایک مدت گذار کر معاف کر دیے جائیں گے۔

معاشرے میں یہ لوگ بڑے دیدہ دلیر ہیں، کفر و گمراہی کی سزا جاننے کے باوجود، ہدایت و مغفرت کی راہیں پہچاننے کے بعد، بے دینی و عذاب کے راستے پر چلتے ہیں۔ کل کے لوگ ہوں یا آج کے، آیت کی تعلیم قیامت تک سب کے لیے یکساں ہے۔ فما اصبرھم علی النار۔ کیا کلام اعجاز ہے، سبحان اللہ ما، تعجب و نفرین کے طور پر اور "اصبر" اسم تفضیل بھی ان لوگوں کی غلط اندیشی کی ایک حیرت انگیز تعبیر ہے بھلا، جہنم کی آگ اور صبر و استقامت؟ دو متضاد باتیں ہیں۔ پورا فقرہ عجیب معانی کو دامن میں لیے ہے۔

۱۷۶۔ ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ . . . .

یہ سنگین سزا، اس بنیاد پر ہے کہ اللہ نے حجت تمام کر دی، حق و ہدایت بشر کی راہیں کتاب محکم کے ذریعے کھول دیں۔ اب کتاب میں اختلاف پیدا کرنا اور حق چھپانا، کچھ ماننا کچھ نہ ماننا حق سے اختلاف ہے۔ اس سے فرد و معاشرہ، ظاہری و باطنی نظام کو بگاڑنا ہے۔ دوسری لفظوں میں، کتاب حق کے ساتھ اتری۔ لہٰذا کتاب یا معانی و مطالب کتاب کو چھپانا حق کو چھپانا ہے اور حق کو چھپانا اختلاف پیدا کرنے اور فساد پھیلانے کا عمل ہے جس کی سزا دردناک عذاب ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ●

ترجمہ:

نیکی یہی نہیں ہے کہ (نماز میں) مشرق کی طرف رخ کرلو یا مغرب کی طرف۔ نیکی کرنے والا وہ ہے جو اللہ اور قیامت، ملائکہ اور کتاب اور انبیا پر ایمان لائے۔ اور اس کی محبت میں قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مانگنے والوں اور غلام آزاد کرنے کے لیے مال خرچ کرے اور نماز قائم رکھے اور زکات دیتا رہے۔ اور (وہ لوگ) جب عہد کریں تو اس پر پورے اترنے والے ہیں، سختی اور تکلیف اور جنگ کے لمحے ثابت قدم رہنے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو سچے اور یہی وہ لوگ ہیں جو متقی ہیں ⦿١٧٧

تفسیر:

بِرّ: نیکی۔ بھلائی۔ عمل خیر۔ مراد صاحب بر۔ آفرین و مدح کے طور پر صفت سے یہاں موصوف مراد ہے۔ نیز دیکھیے آل عمران آیت بانوے۔

یہ بحث ختم کرو کہ مشرق کی سمت جو نماز پڑھتا ہے وہ صاحب خیر ہے یا مغرب کی طرف رخ کرنے والا، بات بیت المقدس و کعبۂ مکرمہ کی جہت و سمت سے آگے بھی ہے۔ بر اور صاحب بر۔ نیکی اور نیک عمل کون؟ یہ دیکھو!

توحید و قیامت۔ ملائکہ اور اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب (قرآن) اور انبیا، خصوصاً

حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کس کو اعتقاد ہے۔ یہود و نصاریٰ اس معیار پر پورے نہیں اتریں گے ان میں کوئی اسے باپ مانتا ہے کوئی اس کا شریک گردانتا ہے۔ یوم آخرت کے معنی انھوں نے بدل دیے ہیں، ملائکہ سے انھیں دشمنی ہے، تورات و انجیل میں تحریف کر چکے ہیں ان کے مقابلے میں مسلمانوں کو دیکھو ان کے اعتقاد صحیح اور عمل استوار ہیں۔ مثلاً :

(الف) حصول زر اور حب مال کے باوجود۔ توحید و قیامت پر اعتقاد اور فرمان خدا اور رسول کے مطابق معاشرے کے نادار افراد پر بخوشی مال و دولت خرچ کرتے ہیں۔ رشتے داروں اور لاوارث یتیم بچوں، دست نگر اور غریب افراد۔ اپنے ہی نہیں دوسرے شہروں اور ملکوں کے مستضعفین و مسافر لوگوں کو۔ ضرورت مند لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ غلاموں (مکاتب) کو روپیہ دے کر آزاد کراتے ہیں (دیکھیے کتب فقہ) دراصل تقسیم دولت کی تشویق اور پسماندہ افراد کی اہمیت پر زور دینے کا معجزانہ اسلوب ہے۔

(ب) معاملات عبد و معبود کے مرحلے میں دیکھو۔ شرائط و آداب علم احکام کے ساتھ کما حقہ نماز کا پابند ہے؟۔ قانون و شریعت کے مطابق زکات ادا کرتا ہے؟ اگر جواب مثبت ہے تو بھلائی کرنے والا آدمی ہے۔

(ج) ضمیر و نیت کے اعتبار سے جانچو، وہ عہد و پیماں، قول و قرار میں سچے ثابت ہوتے ہیں؟ تنگ دستی و پریشان حالی (مرض و بیماری کے وقت ضمیر و اعتقاد اور صبر و استقامت میں "انا للہ" کے فلسفے پر استوار نکلتے ہیں؟ اگر ایسے ہیں تو "بر" و خیر میں وہ دوسروں سے بہتر ہیں۔

(د) جان فروشی، پھر آخری مرحلے میں جب دین و ایمان اور مال و جان کی بات آپڑے تو راہ خدا میں سر بکف میدان میں سیسہ پلائی دیوار بنتے ہیں یا راہ فرار اختیار کرتے ہیں؟ اگر جاں فروش ہیں تو بھلائیاں ان کی ہیں صلہ ان کے ہیں وہی بلند مقامات پر فائز ہیں ان کا کسی سے مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

صحت اعتقاد، حسن معاشرت (سوسائٹی کے حقوق و فرائض کی بجا آوری) اور تعمیر ذات و کردار سازی کے جامع اصول آیت میں جمع ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا، جس نے آیت پر عمل کیا اس نے ایمان کامل کر لیا۔ (الصافی)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

ترجمہ:

اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں تم کو قصاص کا حکم دیا گیا (قصاص تم پر لکھا گیا) آزاد کے بدلے آزاد اور غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت، اس کے بعد جس (قاتل) کو اس (مومن) بھائی کی طرف سے کچھ (یعنی قصاص) معاف کیا جائے تو اسے بھی (یعنی قاتل کو) اسی کے قدم بقدم حسن سلوک اور خوش معاملگی سے خوں بہا ادا کرنا چاہیے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی و مہربانی (رحم) ہے پھر اس کے بعد جو زیادتی کرے، اس کے لیے دردناک عذاب ہے (۱۷۸) اور اے صاحبان عقل! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، تاکہ تم بچتے رہو (۱۷۹)

تفسیر:

۱۷۸۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ ......

جرم و سزا، انسانی معاشرے کا اہم ترین مسئلہ ہے جس کے لیے، حقوق شناسی و قانون سازی شروع ہوئی۔ مگر انسان اور وہ بھی ترقی یافتہ انسان، حدود کا احترام نہیں کرتا، اس بے احترامی سے بچانے کے لیے اسلام نے تین اہتمام کیے آدمی ایمان لائے، تقویٰ اختیار کرے

اور اخلاق سے آراستہ ہو۔ اور تربیت و نگہداشت کے لیے امر بمعروف و نہی عن المنکر کی مہم جاری رہے اس کی تفصیل گذر چکی۔

دوسرا متبادل انتظام ہے سزا اور رحم۔ زیر نظر آیت اسی شعبہ سے متعلق ہے۔ قرآن مجید چونکہ آیئنی درجہ کی خاص کتاب ہے اس لیے اس کے قانونی نکات پر بحث فقہ و سنّت رسول (صلی اللہ علیہ و آلہ) اور تعلیمات ائمہ (علیہم السلام) کے بغیر مفید و نتیجہ خیز نہیں ہے۔

قصاص۔ قاتل مقتول میں مساوات پھر عفو و رحم ایسا قانون تھا جس نے طاقت آزماؤں کے سر جھکا دیے۔ قتل عمد کی سزا قتل اور آزاد مقتول کا آزاد قاتل مارا جائے گا۔ اس کے بدلے دو بے گناہ غریب یا غلام نہیں مارے جاسکتے، اسی طرح غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے قاتل عورت کو قتل کیا جائے گا، قوت و اقتدار کی خاطر کسی کو آدم زاد کا محترم خون بہانے کا حق نہیں ہے معاشرے سے درندہ انسان کا خالی ہونا ایک ضرورت ہے۔ اس کے بعد مقتول کے غم نصیب وارثوں کا حق تسلیم کرتے ہوئے انھیں خون کے بدلے خون اور رحم و عفو کی تجویز دی ہے تاکہ حق، ضرورت اور مصلحت، سزا اور درگذر کے منطقی و سماجی، جذباتی اور دینی تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ اب صورت یہ ہے:

۱۔ قصاص، خون کے بدلے خون۔

۲۔ معافی، بلا شرط خون بہا۔

۳۔ معافی، بشرط خون بہا اس میں قاتل کی رضا بھی ضروری ہے۔

قانون کا اجرا ہر آدمی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ حاکم شرع ہی اس کا مجاز ہے، وہ قاتل کے لیے قتل کا حکم جاری کرے گا، اور وارثوں نے اگر بھائی (رشتۂ ایمان سے) سمجھ کر معاف کر دیا تو جو "دِیَت" طلب کی جائے قاتل کو اس میں خوش اخلاقی اور نیکی کا جذبہ دکھانا چاہیے۔ قاتلانہ و ظالمانہ رویّہ پر ندامت کا یہ پہلا امتحان ہے۔ رحم کے اس موقع کے بعد دنیا کے علاوہ آخرت میں عذاب جہنم ہے۔

۱۷۹۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ ....

اعجاز قرآن کا ایک گوشہ اس کی قانون سازی اور قانون کی بالادستی کا قیام اور مضبوط قانونی

زبان کا حیرت انگیز استعمال ہے۔ قانونی سائنس اور منطق کا بلند ترین بیان ہے۔ یہ آیت بجائے خود زبان و بیان کا معجزہ مانی گئی ہے۔ "ولکم فی القصاص حیاۃ" قصاص میں زندگی ہے۔ حروف کی ترکیب جملے کی بناوٹ، معانی کا ابلاغ، ہر پہلو معجزہ ہے۔

دونوں آیتوں میں "کتب علیکم" تم پر لکھ دیا، فرض کر دیا گیا ہے۔ "فاتباع بالمعروف" تابعداری دستور کے ساتھ مطالبۂ دیت میں ذرا نرمی۔ "واداء الیہ باحسان" قاتل بھی دیت دینے میں احسان مندی اور اچھے برتاؤ سے پیش آئے، یہ سب "تخفیف من ربکم ورحمۃ" آتنی ڈھیل اور سفارش رحم و تخفیف کی بات ہے۔ وارث یا قاتل بلکہ حاکم اور عدالت یا معاشرہ جو بھی غلط چال چلے گا، عذاب سے امان نہ پائے گا۔ اس سیاق وسباق میں۔ اولوا الالباب ۔ عقل و ادراک کے مالک انسانوں سے خطاب فرمایا گیا۔ قصاص تمہارے لیے زندگی ہے۔

دیکھیے: بقرہ/۱۹۴ و مائدہ/۴۵ ۔ اسراء/۳۳ اور آلآء الرحمٰن: بلاغی

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا
حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِن تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ
وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ فَمَن بَدَّلَهُ
بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ إِنَّ اللَّهَ
سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ فَمَنْ خَافَ مِن مُّوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ
بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

ترجمہ:

تم لوگوں پر فرض کر دیا گیا۔ جب تم میں سے کسی کی موت (کا وقت) آئے۔ بشرطیکہ وہ کچھ مال چھوڑے۔ وصیت کرنا۔ ماں باپ اور قرابت داروں کے لیے دستور

(انصاف) کے مطابق متقی لوگوں پر یہ (بھی) ایک حق ہے (۱۸۰) پھر جو شخص اس (وصیت) کو سننے کے بعد بدل دے تو اس کا گناہ ان لوگوں کے ذمے ہوگا جو اسے بدلیں گے بے شک اللہ سب کچھ سننے، سب کچھ جاننے والا ہے (۱۸۱) پھر جس شخص کو وصیت کرنے والے کی طرف سے حق تلفی یا خلاف شرع بات کا اندیشہ ہو اور وہ ان (وارثوں) میں صلح کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ بہت بخشنے اور بہت رحم والا ہے (۱۸۲)

تفسیر:

۱۸۰۔ کُتِبَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ ....

جان کے بعد مال کے بارے میں "وصیت" کی ہدایت ہے۔ آخر وقت، جب بھی آدمی محسوس کرے کہ موت آنے والی ہے، تو مال کو لوٹنے والوں کے لیے نہ چھوڑے اور اس کو ضیاع سے بچانے اور معقول مصارف میں صرف کرنے کے لیے وصیت ضرور کرے۔ یہ وصیت قانونی تفصیلات کے ساتھ کی جائے اور ماں باپ اور قرابت داروں کو اولیت دی جائے، یعنی تہائی مال چونکہ قابل وصیت ہے اس لیے اگر میراث کا حصہ پانے کے بعد یا کفر کی وجہ سے محروم رہنے والے والدین ہوں تو وہ، ورنہ وہ رشتے دار جن تک وراثت نہیں پہنچتی اور ہیں وہ قابل رحم تو اہل تقویٰ پر فرض ہے کہ وہ ایسے عزیزوں کو یاد رکھیں۔

خیر۔ سے مراد، مال وافر ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کسی دوست کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اس نے اپنے پاس موجود چھ سو درہم میں وصیت کے بارے میں پوچھا حضرت نے فرمایا، تمہارے پاس مال زائد تو نہیں ہے۔ (مجمع البیان)

۱۸۱۔ فَمَنۡۢ بَدَّلَہٗ بَعۡدَ مَا سَمِعَہٗ ....

ایک شخص فی سبیل اللہ نیک کام انجام دیتا ہے، وصیت یا وقف کرتا ہے اصولاً وصی یا وکیل و متولی کو وہ مال موصی کی خواہش کے مطابق صرف کرنا چاہیے، مگر دنیا دار سمجھتے ہیں، مردے کا مال ہے

جو چاہو کرو، اس عمل سے نیک کام کرنے والوں کی ہمت شکنی ہوتی ہے لوگ کار خیر میں ہچکچانے لگتے ہیں اس کے سدباب کے لیے آیت کے ذریعے وصیت میں تبدیلی کو جرم اور تبدیلی کرنے والوں کو گناہ گار قرار دیا گیا ہے۔ اور نیکی کرنے والوں کی ہمت افزائی کے طور پر فرمایا۔ اللہ سمیع و علیم ہے۔ جو نیکی کرے گا صلہ پائے گا، بدی کرنے والے سزا کے مستحق ہیں اللہ بات سنتا اور علم رکھتا ہے۔ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ۔

۱۸۲۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا ....

وصیت "متقین" کے لیے تاکیدی حکم ہے۔ وراثت سے مال چند معین افراد کو محفوظ طریقے سے ملتا ہے۔ لیکن کبھی یہ وارث محتاج نہیں ہوتے، کبھی خاندان کے غیر وارث یا مرنے والے کے پاس پڑوسی دوست محتاج ہوتے ہیں، لہٰذا وراثت کے قانون کو چھیڑے بغیر اہل تقویٰ پر وصیت فرض کر دی ہے تاکہ دوسرے بھی ان آداب و قواعد کو سامنے رکھیں۔ یہ طریقہ کہ وصیت قانون و انصاف کے خلاف کر دی جائے (جنف) یا حرام و معصیت (اثم) ہو۔ مثلاً (الف) ثلث مال سے زیادہ کے بارے میں وصیت ہو۔ جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ و ائمہ علیہم السلام نے ایک تہائی مال سے زیادہ کے لیے وصیت حرام کی ہے۔ (وسائل الشیعہ۔ احکام الوصایا) لہٰذا وصی پر لازم ہے کہ تمام مال یا زائد از ثلث مال سے متعلق وصیت کی اصلاح کرے (ب) کوئی شخص فساد انگیز اشیاء، سینما، کلب وغیرہ یا ترک واجب کے بارے میں وصیت کرے (ج) لڑائی جھگڑے کی بنیاد پر مبنی وصیت ہو۔ ان جیسی صورتوں میں حاکم شرع دخل دے اور شریعت کے مطابق کام انجام دے۔

وصیت کو سابقہ کوتاہیوں کا مداوا اور آخرت کے لیے ذخیرہ بننا چاہیے۔ معاشرتی فلاح و بہبود اور اسلامی شریعت کے مطابق رکھنا چاہیے۔ وصیت کے بارے میں شریعت کے احکام اور اہل شرع سے رجوع ضروری ہے۔ حاکم شرع یا واقف احکام پر لازم ہے کہ وصیت کی شرعی خامیوں کی اصلاح کر دے، آیت نے سب کو بتا دیا ہے کہ اصلاح گناہ نہیں ہے۔ حاکم شرع کرے یا وصی یا خود وصیت کرنے والا جسے زندگی میں حق تبدیلی حاصل ہے۔

اللہ غفور رحیم ہے، وہ گنہ گاروں کو بخشنے والا ہے تو جس نے اصلاح کی غرض سے وصیت

میں تبدیلی کی وہ مغفرت و رحمت سے کیوں محروم رہے گا؟ یا یہ کہ اللہ اس وصیت کرنے والے کو مغفرت و رحمت سے نوازے گا جس نے اپنی غیر شرعی وصیت کو اپنی زندگی ہی میں بدل دیا۔

وصیت کے بارے میں یہ حدیثیں زیر نظر رہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے فرمایا: "ماینبغی لامرءٍ مسلم ان یبیت لیلۃ الا و وصیتہ تحت راسہ" کسی مسلمان کے لیے زیب نہیں کہ وہ سوئے اور اس کا وصیت نامہ اس کے سرہانے نہ ہو۔ اور امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: جس نے اپنی وصیت میں انصاف کو ملحوظ رکھا گویا اس نے زندگی میں صدقہ دیا اور جس نے ناانصافی برتی، قیامت کے دن اللہ اس سے نگاہ کرم پھیر لے گا۔ (وسائل الشیعہ)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

ترجمہ:

اے ایمان لانے والو! تم پر روزہ رکھنا اسی طرح واجب کیا گیا ہے جس طرح تم سے پہلے والوں پر واجب کیا گیا تھا تاکہ تم متقی بن سکو (۱۸۳) گنتی کے دن، اس پر بھی تم میں سے جو بیمار ہو یا سفر میں ہو، تو وہ اور دنوں میں گنتی پوری کر دے۔ اور ان لوگوں کے ذمے جو بزحمت روزہ رکھ سکتے ہوں (اور نہ رکھیں) بدلہ ہے ایک فقیر کی خوراک (پیٹ بھر کھانا کھلانا)۔ اس کے بعد جو شخص بھلائی کرے وہ اس کے لیے اچھا ہے اور تم روزہ رکھو، تمھارے لیے اچھا ہی ہے، بشرطیکہ تم سمجھدار ہو (۱۸۴) ماہِ رمضان ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا، جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور راہِ حق کی روشن دلیلیں اور حق و باطل کی تمیز دے ہے، لہٰذا تم میں سے جو شخص بھی اس مہینے اپنی جگہ پر ہو تو اسے چاہیے کہ اس کے روزے رکھے، اور جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ اور دنوں میں تعداد پوری کر دے۔ اللہ تمھارے حق میں آسانی چاہتا ہے اور سختی نہیں چاہتا۔ اور یہ چاہتا ہے کہ (روزوں کی) تعداد پوری کر دو اور جو راہِ مستقیم تمھیں بتائی ہے اس پر اللہ کی کبریائی بیان کرو، اور تاکہ تم شکر ادا کرو (۱۸۵)

تفسیر:

۱۸۳۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ ....

روزہ ایسی عبادت ہے جو اللہ نے سابقہ امتوں پر بھی واجب کیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسان نفس کشی، ترکِ لذات اور اصلاح و تعمیرِ نفس و ضمیر کے ذریعے متقی بن سکتا ہے اور تقویٰ ہی کمالِ ذات ہے۔

۱۸۴۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ....

نماز دن رات کی عبادت و ریاضت ہے، ضمیر و نفس کی طہارت انفرادی و اجتماعی معاملات میں حضوری باری تعالیٰ کا خیال اور اس کا رچاؤ مقصود ہے۔ وہ فحشاء و منکر و بغاوت سے روکتی ہے۔ روزہ، ایک ماہ کا تربیتی نصاب ہے۔ آنکھ، کان، زبان، ہاتھ، پاؤں اور ارادہ

وجذبات وخواہشات طلب آب ونان، خواہش لذت شب وروز کو محدود کرنے کی عادت ڈالنا اور بے چون وچرا حکم خدا کو ماننے کا امتحان دینا ہے۔ اس تربیتی مدت میں مرد عورت برابر ہیں جو لوگ بلا شرط مستثنیٰ ہیں وہ ہیں بیمار ومسافر یہ لوگ رمضان میں جتنے روزے قضا کریں وہ بعد رمضان ایک ہی ساتھ یا متفرق دنوں میں گنتی پوری کردیں، انتیس کا رمضان ہو تو انتیس پورے ہونا چاہیے اور تیس کا چاند ہوا ہو تو تیس۔

وعلى الذين يطيقونه...... جو لوگ دیکھنے میں طاقت رکھتے ہوں لیکن مشقت وزحمت شدید کا خطرہ ہو۔ مثلاً پیاس ناقابل برداشت ہو۔ حاملہ خاتون یا بچے کو دودھ پلانے والی عورت، انہیں روزے اور فدیہ میں مختار کیا جاتا ہے، گویا ایک دن کا کھانا کسی کو دینا ایسا ہے جیسے ایک خوراک سے باز رہا، یوں روزے دار سے مشابہت ہوگئی۔ یہ آیت فقہا کے استنباط احکام کی ہے، فقہا نے جو کچھ کیے بغیر بطور خود کوئی حکم نہ مراد لے لیا جائے۔

ایک صاع (تین کیلو گرام) گیہوں یا جو دینے کا حکم اس لیے نہیں کہ بس، زیادہ نہ دیا جائے، نہیں جو شخص باحیثیت ہو اور رضا خدا وحقوق برادر ایمانی کے طور پر زیادہ دینا چاہے تو اس کا ثواب زیادہ ہوگا۔ مگر اس کا مطلب چھوٹ نہیں ہے۔ "ان تصوموا خیر لکم"۔ علم ودانش وبصیرت کا تقاضا اور خدا کی رضا اسی میں ہے کہ روزہ رکھو، روزے کو فدیہ پر ترجیح دو۔

۱۸۵۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ........

گنتی کے دن "ماہ رمضان ہے۔ ماہ رمضان میں قرآن نازل ہوا، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے موقع بموقع آیت یا سورۃ وجزء اس کی نشان دہی یا تکرار نزول کی صورت میں وحی آتی رہی۔ قرآن انسانوں کے لیے ہدایت ہے۔ اس میں ہدایت کی روشن وواضح نشانیاں ہیں۔ حق وباطل کو نمایاں کرنے کی قوت ہے۔

نماز کی مرکزیت مکان وجہت میں اور روزے کی خصوصیت زمان ووقت۔ وہاں کعبہ محترم یہاں رمضان مکرم ہے، اس کی آبادی سجدے اور اس کی بہار تلاوت قرآن ہے۔

— فمن شهد منكم الشهر فليصمه — امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: کس قدر توضیح وبیان ہے کہ جو شخص حاضر ہو وہ روزہ رکھے اور جو مسافر ہو وہ روزہ نہ رکھے۔

بیمار اور مسافر، دوران مرض و سفر کے چھوٹے ہوئے روزے، مریض کو شفا اور مسافر کو سفر کے بعد ماہ رمضان تمام ہونے پر رکھنا ہوں گے۔ اللہ نے رحم و آسانی کی بنیاد پر یہ اجازت دی کیونکہ وہ جبر و سختی نہیں فرماتا۔ ولتکملوا العدۃ۔ بہرحال مہینے کے دنوں کی تعداد بھر روزے ضرور رکھنا ہوں گے۔ ولتکبروا اللہ علی ما ھداکم۔ اور اللہ نے تمہاری جو ہدایت فرمائی ہے اس پر اس کی کبریائی بیان کرو۔ من لایحضرہ الفقیہ میں امام رضا علیہ السلام کی بیان کردہ تفسیر یہ ہے کہ نماز عید میں دوسری نمازوں کے مقابلے میں ایک تکبیر کا اضافہ اللہ کی تعظیم و تمجید کے اس زاویے سے ہے کہ اس نے معاف بھی کیا اور ھدایت بھی فرمائی، اس کا حکم ہے، لتکبروا.... امام جعفر صادق علیہ السلام سے الکافی میں ایک حدیث ہے جس میں شب عید الفطر مغرب و عشا اور صبح عید یہ کہنے کی فرمائش ہے اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ و اللہ اکبر و للہ الحمد اللہ اکبر علی ما ھدانا..... ولتکملوا العدّۃ کے معنی روزہ رکھنا ہے اور ولتکبّروا اللہ کا مفہوم مذکورہ تکبیرات ہیں۔

ولعلکم تشکرون۔ شیخ جواد بلاغیؒ کے بقول "لعلکم" لام تعلیل ہے یعنی یہ اس لیے ہے کہ تم شکر ادا کرو، اس نے دین حق عطا کیا، روزے جیسے عمل کی رہنمائی فرمائی جس میں رحمت و مغفرت، بھوک پیاس، پھر افطار کی لذت بخشی۔



جناب شیخ جوادی آملی

ترجمہ جناب سید حسین مرتضیٰ ایم اے۔ پاکستان۔

قرآن کی روشنی میں اسلام کا نظام عدلیہ

قرآن مجید پڑھتے اور آیاتِ کلام اللہ پر غور کرتے ہوئے ہم ایسی آیتوں تک پہنچتے ہیں جو "نظامِ قضا" یعنی عدالتی ڈھانچے کے سمجھنے سمجھانے میں مکمل مدد دیتی ہیں۔ ان آیات پر تحقیقی نظر اور گہرا مطالعہ کرنے اور نتائج حاصل کرنے کی خاطر پانچ جزو یا پانچ فصلیں بنانا ہوں گی:

۱۔ قضا / عدالت کی ضرورت ـــ جس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور ممکن نہیں۔

۲۔ معیار عدالت ـــ معیار قضا۔

۳۔ ادب القاضی ۔ یعنی قاضی میں کن اوصاف و خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ اس کے حقوق کیا ہیں۔ اس کے خصوصی فرائض کیا ہیں۔

۴۔ مدعی و مدعی علیہ پر فرض ہے۔ دونوں صرف ان معیاروں کی طرف رجوع کریں جنہیں وحی نے منضبط کیا ہے۔ ان سے روگردانی ممنوع ہے۔ سرچشمۂ قضا سے جو فیصلہ صادر ہو اس پر اعتراض نہ کریں۔

۵۔ قضا سے متعلق مختلف امور و معاملات، جیسے گواہی / شہادت اور گواہوں کی ذمہ داریاں۔

مذکورہ عناوین کے ذیل میں بعض بہت اہم معاملات زیر بحث آجائیں گے اور قرآنی مطالعہ

کا فیضان بھی وسیع ہوگا۔
— تو فصول ملاحظہ ہوں۔

پہلی فصل

قضاء کی ضرورت

انسان ایک ایسی سماجی مخلوق ہے جو دوسروں سے بالکل الگ تھلگ ہو کر تنہائی کی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ نہ وہ اپنے غیر کے ساتھ ہر پہلو سے متحد ہو سکتا ہے، کیونکہ ہر انسان کچھ نہ کچھ ایسے افکار وصفات کا حامل ہوتا ہے جو اسی میں پائے جاتے ہیں اسی کے رجحانات و اعمال ہوتے ہیں جن کی طرف وہ اپنی فطرت کی وجہ سے مائل ہوتا ہے اور ان میں وہ منفرد بھی ہوتا ہے نیز ان میں یا تو دوسرے سے کسی کو شریک نہیں کرتا یا ان کے کسی نہ کسی حصہ میں خاص امتیاز پیدا کر لیتا ہے۔

جب انسان نہ پوری طرح الگ تھلگ رہ کر جی سکتا ہے نہ سب میں مل کر ایک بن سکتا ہے تو پھر افراد و اشخاص میں باہمی اختلاف، لڑائی جھگڑا اور بڑے مفادات کے لیے بڑی لڑائیوں کا ہونا ضروری ہے۔

— "ہر روٹی پکانے والا، تنور کی آگ اپنی طرف کھینچتا ہے"۔

اس صورت حال میں قانون کا ہونا ضروری ہے، کیونکہ اگر ضابطے نہ ہوں تو لوگ رجوع کس سے کریں؟ اور اگر معیار و اصول نہ ہوں تو نظام زندگی درہم برہم ہو جائے اور معاشرہ کی بنیاد گر جائے ہمارے معروضات قرآن کی رہنمائی پر مبنی ہیں۔

ہماری گفتگو کا پہلا نقطہ انسان کا معاشرتی ہونا ہے اور اس پر خداوند متعال کا یہ ارشاد رہنمائی کرتا ہے:

یا أیّہا الناس إنا خلقناکم من ذکر و انثیٰ وجعلناکم شعوبًا

وقبائل لتعارفوا ۔۔۔۔۔[۲]"

"اے لوگو ہم نے تمہیں مرد و زن سے پیدا کیا پھر تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔"

اگر انسان فطرتاً معاشرہ پسند نہ ہوتا اور اسے اکیلا زندہ رہنا ہوتا تو وہ گروہوں اور قبیلوں کی تشکیل کا محتاج نہ ہوتا اور اس صورت میں اسے ایسے تعارف کی ضرورت نہ ہوتی جو ایسے معاشرتی روابط پر مبنی ہو جو ختم ہونے والے ہیں۔

ہماری گفتگو کا دوسرا مرحلہ ہے کہ انسان کے درمیان جھگڑوں کا وجود ضروری ہے اور اس بات پر خداوند عالم کے یہ ارشادات دلالت کرتے ہیں۔

ولوشاء ربك لجعل الناس امۃً واحدۃً ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك ولذلك خلقھم ۔۔[۳]"

"اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا حالانکہ وہ مسلسل جھگڑتے رہتے ہیں، سوائے ان لوگوں کے جن پر اللہ نے رحم کیا ہے اور اس نے ان لوگوں کو اسی لیے خلق کیا ہے۔

"وعلی اللہ قصد السبیل ومنھا جائر ولوشاء لھداکم اجمعین"[۴]

"اور عدل و عقیدت کا بیان خدا کے لیے ضروری ہے اور کچھ راستے ظلم و ستم کے راستے ہیں، اگر خدا چاہتا تو تم سب لوگوں کو زبردستی راہ ہدایت پر لگا دیتا"

اس لیے ان کا ایک امت بنا دیا جانا صحیح نہیں تھا کیونکہ جبر، ان کی ذمے داری بلکہ ارتقائی عمل کے خلاف تھا، اس سے بڑی بات یہ تھی کہ اس کا ایک امت ہونا، یعنی بالکل اتحاد حکمت کی مخالف سمت لے جاتا۔ کیونکہ یہ اختلاف اسی طرح مفید ہے جس طرح ترازو کے دونوں پلڑوں کا جدا جدا ہونا کہ اسی کے ذریعے عدل قائم ہوتا ہے اور ظلم و حق تلفی سے بچاؤ ہوتا ہے۔

اور یہ اختلاف مقدس اور ممدوح ہے کیونکہ مذموم اختلاف وہ مخصوص اختلاف ہے جو گمراہی کے مقابلے میں ہدایت کی وضاحت اور حق کی توضیح کے بعد ابھرے۔

خداوند عالم نے ان دونوں قسموں کے اختلاف کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے؛

"کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین مبشرین ومنذرین وانزل معھم الکتاب بالحق لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ الا الذین اوتوہ من بعد ماجاءتھم البینٰت بغیا بینھم فھدی اللہ الذین آمنوا لما اختلفوا فیہ من الحق باذنہ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔"

"لوگ ایک امت تھے چنانچہ اللہ نے بشارت دینے والے اور ڈرانے والے نبی بھیجے اور ان پر کتاب نازل کی جو حق تھی تاکہ وہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلاف میں فیصلے کریں چنانچہ ان فیصلوں میں سوائے ان کے کسی نے اختلاف نہیں کیا جنھوں نے دلیلیں پہنچنے کے بعد آپس میں سرکشی کی۔ پھر اللہ نے ان لوگوں کو ہدایت دی۔"

آیت کا آغاز ہی بتاتا ہے کہ پہلا انسان، عقائد میں حق پرست اور فطرت میں سلیم، غلط خواہشات اور کج روی سے دور خلق کیا گیا تھا اور اگرچہ وہ اپنے ہم نوع انسانوں سے زندگی کے بعض معاملات میں اختلاف کرتا تھا مگر اس قسم کے امور میں اختلاف اس کی زندگی کے بعض معاملات میں اختلاف کرتا تھا مگر اس قسم کے امور میں اختلاف اس کی زندگی کے راستے میں چار ناچار ضروری ہے کیونکہ وہ کمال کی طرف بڑھنے کے لیے خلق کیا گیا ہے اور یہ اس کے ارتقا میں دخل رکھنے والی چیزیں ہیں۔

چنانچہ ان اختلافات میں ہم آہنگی اور میانہ روی پیدا کرنے، نیز جھگڑوں کے موقع پر حق کی وضاحت کے لیے اللہ نے ایسی کتاب نازل کی جو حق کی حامل تھی تاکہ لوگ اپنی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھال لیں۔

چنانچہ ایسے موقع پر حق کی تشریح اور توضیح کے مقابلے میں لوگ دو قسموں میں بٹ گئے بعض ایمان لے آئے اور کتاب جو کچھ لے کر آئی تھی انھوں نے اس کی پیروی کی اور بعض بغاوت اور دشمنی کے سبب ایمان نہیں لائے ۔۔ یہ عقیدے کا اختلاف ہے جو قابل نفرین و مذمت ہے۔

ہماری گفتگو کا تیسرا نکتہ اختلافات کے حل کی خاطر ضوابط کا تعین ہے، جس پر خداوند عالم کا یہ ارشاد رہنمائی کرتا ہے:

"بل کذبوا بالحق لما جاءهم فهم فی أمرٍ مریج"

اس آیت میں اللہ عز اسمہ نے ان لوگوں کے معاملات میں بدنظمی کی مذمت فرمائی ہے یہ لوگ حق کو جھٹلا کر حرج مرج میں گرفتار ہو گئے۔ اب ان کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ حق کی طرف رجوع کریں۔ بے نظمی پیدا کرنے سے بچیں اور نظم ضبط کی حفاظت کریں۔

اسلام نے اس قسم کے اختلافات کو دور کرنے کے لیے تعلیم و تربیت اور تہذیب اور صفاء نفس کا اہتمام کیا اور اللہ کی رسی سے وابستہ رہنے اور ایسے جھگڑوں سے بچنے کی تاکید کی جو کمزوری کا باعث ہیں، پھر اس نے مومنین کے درمیان محبت و اخوت پیدا کی، وہ آپس میں الفت و ہمدردی اور منکرین حق کے لیے سخت رویہ رکھتے ہیں۔ اُن کی صفت یہ بیان کی ہے کہ وہ باطل کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں آپس میں ایک دوسرے کو بھلائی کی نصیحت کرتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ انھیں اسلام کے مقابلے میں پوری طرح فرماں بردار ہونے کی دعوت دیتے ہیں (السلم) اور اسلام کے دائرے سے بال برابر ادھر ادھر نہیں نکلنے دیتے، کیونکہ انسانی حلقے سے نکلنے والا شیطان کا حصہ ہے جیسے گلے سے نکل بھاگنے والی بکری بھیڑیے کا حصہ ہے۔

اللہ نے ان لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنے ان بھائیوں کے لیے استغفار کرتے ہیں جو ایمان میں ان پر سبقت لے گئے ہیں اور ان کو یوں پہچنوایا ہے کہ وہ لوگ اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کے دلوں میں مومنین کے لیے دشمنی نہ رہنے دے اور اس کے علاوہ بہت سی ایسی خوبیاں ہیں جو ایسے اختلافات کو روکتی ہیں، جو ان کے نشو و نما اور ارتقاء و ترقی کے لیے رکاوٹ بنتی ہیں۔ پھر اللہ عز اسمہ نے ان افراد معاشرہ کو ہوشیار کیا ہے کہ اللہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو انھوں نے اپنے نفوس میں چھپا رکھی ہیں اور ان کو بھی جانتا ہے جو وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کرتے ہیں۔

اور اس قسم کے اختلاف کو — اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹانے اور اس سے

حکم طلب کرنے، باہمی رنجشوں میں اس کو حاکم بنانے، اس کے بجائے کسی دوسرے کی طرف رخ نہیں کرتے، اور اس کے فیصلے کو جھگڑوں کے خاتمے اور اختلافات کے حل کی خاطر آخری عدالت عالیہ تسلیم کرنے اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے حق فیصلہ کے سامنے کسی کو کوئی اختیار نہیں ہے ـــ یہ سب کچھ نظام کی حفاظت اور اتحاد کی مضبوطی کے لیے ہے۔

وجہ یہ ہے کہ "قضا" (عدالتِ اسلام) عادلانہ نظام کے انطباق و نفاذ کی ضامن ہوتی ہے۔ وہی معاملات میں بدنظمی کو روکتی ہے وہی ہر چیز کو اس کی جگہ دلاتی، حق کو حق دار تک پہنچاتی اور حق دار کو اس کا حق دلاتی ہے۔

اسی قضا کی نسبت کی مناسبت سے "قضیہ" (عدالت کے مقدمہ) کو قضیہ کہا جاتا ہے۔ کیونکہ محمول کی وضع اور موضوع کے اعتبار سے اثباتی یا سلبی حکم جب تک واضح نہیں ہوتا۔ آدمی تردد میں گرفتار اور اطمینان سے دور رہتا ہے، وہ ایک قدم آگے بڑھاتا، دوسرا قدم پیچھے ہٹاتا ہے۔ یہاں تک کہ راہ راست، ٹیڑھی راہ اور صحیح بات غلط فیصلے سے ممتاز ہو جائے۔

عقل خاص عمل کا حکم اور مخصوص فیصلے کا فرمان جاری کرتی ہے۔ اس کے بعد اطمینان نفس حاصل ہو جاتا ہے، شک باقی نہیں رہتا، اور پورا معاملہ اپنے تصوراتی اجزا کے لحاظ سے "قضیہ" اور نفسانی صورت اپنے مقدمات کے زاویے سے "تصدیق" کا نام پاتی ہے۔

دوسری فصل

قضاء کا معیار

گذشتہ فصل میں بیان ہو چکا کہ قضاء حدود اور نظام کی حفاظت کے لیے ضروری ہے۔ اس فصل میں ہم قضاء کے معیار اور اس کی میزان اور پیمانے کی شناخت پر گفتگو کریں گے۔

بظاہر، یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں انسانی عقل مستقل ہے اور اس کا دارومدار افکار ہیں جن تک سوچنے والا انسان آسمانی کتابوں کی طرف رجوع کیے بغیر پہنچ سکتا ہے

بلکہ اسے سرے سے کسی خارجی چیز کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

لیکن قضاء کی ضرورت کی دلیل پر اگر گہری نظر ڈالی جائے اور اچھی طرح سوچا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں انسانی عقل کافی نہیں ہے اور وہ میزان قضاء کے تعین اور اس کے مدارک کی تجدید سے قاصر ہے۔ اس کی وجہ انسان کا اپنے نوع سے اختلاف رائے و نظر ہے، ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ اس کی رائے صحیح اور دوسرے کی رائے نادرست اور نقصان رساں ہے۔

نتیجہ میں فکری مناقشے جنم لیتے اور علمی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ جذبہ کہ ہر شخص اپنی ذات، اپنی قوم اور اپنے گروہ کے مفادات کو مقدم کرتا اور دوسرے پر برتر قرار دیتا ہے۔ یہ عمل قانون کی وضع و تطبیق پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔

نتیجہ:

وہی اختلاف جو ضرورت قضاء و عدالت کا سبب بنتا ہے وہی حل اختلاف کا سبب نہیں بن سکتا۔ یہیں سے ہم نتیجہ حاصل کر سکتے ہیں کہ عقل انسانی بذات خود انسانی معاشرے میں سعادتوں اور بھلائیوں کو فروغ نہیں دے سکتی بلکہ وہ فقط ایسا چراغ جو راستے روشن کرتا ہے اور اس راستے پر چلنے والے کو معین منزل تک پہنچاتا ہے۔ یہاں راستے سے ہماری مراد وہ راستہ ہے جس کی جانب وحی الٰہی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

اور جب انسانی عقل اپنی علمی نارسائیوں اور نفسانی خواہشات کے دباؤ کے سبب میزان قضا کے تعین کے لیے ناکافی ہو تو ضروری ہو جاتا ہے کہ اس بات پر تحقیق کی جائے کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کا معیار صحیح و کامل کیا ہے؟ یہ بات دو نکتوں پر غور کرنے سے مکمل ہوتی ہے۔

پہلا نکتہ: انسانی فکر کی کمزوری اور معیارِ قضاء کے بیان تک اس کی نارسائی ہے۔

دوسرا نکتہ: وحی الٰہی کا ظہور اور نظام قضا میں اس کی صلاحیت و تاثیر ہے، وحی کا تعلق امداد غیبی سے ہے وہ ناموسِ طبیعت کو چاک بھی کر سکتی ہے۔ انشاء اللہ۔ یہ بات آگے چل کر واضح ہو جائے گی۔

تو، پہلا نکتہ: جس کی توضیح درجِ ذیل آیات سے ہوتی ہے:

"رسلاً مبشرین ومنذرین لئلا یکون للناس علی اللہ حجۃ بعد الرسل وکان اللہ عزیزاً حکیماً"[8]

اس آیت سے رہنمائی ہوتی ہے کہ تنہا عقل کہاں تک پہنچانے اور صحیح راستے کی طرف ہدایت کرنے کے لیے کافی نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو عقل کے ذریعے حجت تمام ہو جاتی اور اس کی ہدایت کی طرف استناد صحیح ہوتا۔ لوگ گناہ اور باطل کی اطاعت کرتے تو اللہ کی حجت ان پر قائم ہو کر انھوں نے حکم عقل کے خلاف عمل کیوں کیا اور عقل کی پیروی کیوں نہیں کی اور اس کی مخالفت کیوں کی؟ اس حجت کے بعد ان کی نافرمانی و گناہ پر عذاب دینا صحیح ہوتا۔

لیکن قرآن کریم انبیاء کے بھیجنے سے پہلے عذاب دینے کو صحیح اور جائز قرار نہیں دیتا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

"وما کنا معذبین حتی نبعث رسولاً"[8]

اور ہم عذاب رسول کے بھیجنے سے پہلے نہیں کریں گے۔

اور

"ولو انا اھلکناھم بعذاب من قبلہ لقالوا ربنا لولا ارسلت الینا رسولاً فنتبع آیاتک من قبل ان نذل ونخزی"[9]

اور اگر ہم عذاب کے ذریعے انھیں پہلے ہی تباہ کر دیتے تو وہ کہتے، پروردگارا! تونے ہمارے پاس اپنے رسول کیوں نہ بھیجے، وہ آتے ہم اپنی ذلت و ناکامی و رسوائی سے پہلے ان کی بات ہی کیوں نہ مان لیتے۔

یہ آیات بتاتی ہیں کہ اللہ کی سنت یہ نہیں کہ وہ بندوں کو رسول بھیجنے سے پہلے عذاب میں مبتلا کرنے یا انبیاء بھیجنے سے پہلے ان کو ذلت و رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دے۔ اس کی نظر میں ان لوگوں کو احتجاج کا حق حاصل تھا، یہ حق احتجاج اس نے وحی و رسالت کے ذریعے پورا کر دیا۔

فکر انسانی کی نارسائی کی دلیل اور یہ کہ وہ تمام اچھائیوں برائیوں کا احاطہ نہیں کر سکتی، اس کا قریب ترین معاملہ ہے۔ ترکے کی تقسیم اور خاص حصہ وارثین کے سلسلے میں ارشاد باری ہے:

"لاتدرون ایھم اقرب لکم نفعاً"

تم کیا سمجھ سکتے ہو کہ تمہارے زیادہ نفع کی چیز کیا ہے۔

اور اسی طرح وہ مقام جہاں پروردگار عالم نے وحی پر ایمان لانے کو لازم اور اس سے منہ موڑنے کو ناجائز قرار دیتے ہوئے ایک اور رہنمائی کی ہے:

فلما جاءتھم رسلھم بالبیّنات فرحوا بما عندھم من العلم وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزؤن"،

"جب ان کے پاس ان کے پیغمبر آگئے تو (بخیال خود) اپنے علم کی وجہ سے وہ خوش ہوئے اور جس (عذاب) کی ہنسی اڑاتے تھے اسی نے انھیں گھیر لیا۔"

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کے پاس جو علم ہے وہ سعادت کی فراوانی کا ضامن نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس پر اکتفاء مذموم نہ ہوتی اور فقط یہی نہیں بلکہ وہ انسان کو وہاں تک پہنچانے سے بھی قاصر ہے جس کا وہ محتاج ہے۔ اس لیے اسی پر بھروسہ اور انبیاء کی لائی ہوئی باتوں سے اعراض قابل مذمت بات ہے۔

اور درج ذیل آیت دلالت کرتی ہے کہ انسان عقل کے ذریعے قسط وانصاف کے قیام اور قضاء کے عادلانہ معیار کے تعین پر قادر نہیں ہے:

"لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط وانزلنا الحدید فیہ بأس شدید ومنافع للناس ولیعلم اللہ من ینصرہ ورسلہ بالغیب إن اللہ قوی عزیز"

یقیناً، ہم نے اپنے پیغمبروں کو معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب نازل کی اور ترازو۔ تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا نازل کیا جس کے ذریعے سخت لڑائی اور لوگوں کو بہت فوائد ہیں، تاکہ اللہ دیکھ لے کہ اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کون کرتا ہے۔ اور اللہ قوی و عزیز ہے۔

توحید ۱۴

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسولوں کو بینات کے ساتھ بھیجنے اور ان پر کتابیں نازل کرنے کا مقصد لوگوں کے درمیان قسط کی برقراری تھا کیونکہ اگر انسان اپنی عقل کے ذریعے وحی کے بغیر قسط (انصاف) کے قیام پر قادر ہوتا تو اس کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اور معیار قضاء کے تعین پر انسان کے قادر نہ ہونے کا راز یہ ہے کہ:

انسان ایک ایسا موجود ہے کہ جس کی بہت سی دنیائیں عوالم ہیں، بہت سے درجے ہیں، بہت سے منازل ہیں وہ ایک عالم سے دوسرے عالم اور ایک مرتبے سے دوسرے مرتبے میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ انسان ایک ایسا دائمی موجود ہے، جو فنا نہیں ہوتا، وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے اس لیے اس کے ارتقا کی خاطر ایسے قانون کی ضرورت ہے جو لازوال اور لافانی ہو جس سے نہ تو اس کی دنیا کو نقصان پہنچے نہ آخرت کو۔

ایسے قانون کے تعین کے لیے ایسے علم کی ضرورت ہے جو انسانیت کے تمام حقائق اور ان تمام رموز و نکات پر محیط ہو جو اسے بلند درجات تک پہنچاتے یا نچلے درجات تک گرا سکتے ہیں۔ ایسا قانون اس آدم زاد کے لیے بنانا کیسے ممکن ہو سکتا ہے جس کو بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔ وہ اکثر ایسی باتوں کا ادراک ہی نہیں کر سکتا، جو اس کے لیے نفع بخش یا نقصان دہ ہیں؟

اس گفتگو کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ وحی الٰہی کے علاوہ کوئی اور چیز نظام قضا کے استحکام کی صلاحیت نہیں رکھتی ۔ ارشاد باری عز اسمہ ہے:

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون" [13]

اور جو شخص، اللہ کی طرف سے نازل شدہ احکام کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

"من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون" [14]

اور جو شخص اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ ظالم ہے۔

"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون" [15]

اور جو اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا وہ فاسق (بدکار) ہے۔

پھر کفر اور دوسری برائیوں کے درمیان جو فرق موجود ہے وہ قضاء کے دوران اور کھل جائے گا۔ چنانچہ ارشاد ہے :

"افحکم الجاھلیۃ یبغون ومن احسن من اللہ حکماً لقوم یوقنون[۱۶]۔"

"کیا تم جاہلیت کے فیصلے چاہتے ہو اور یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر حکم دینے (فیصلہ کرنے) والا کون ہے۔"

آیت سے یہ عقلی کلیہ ثابت ہوتا ہے کہ حکم و فیصلہ و قضاء سے بچا نہیں جا سکتا، اب یہ حکم یا اللہ کا ہو اور حکم الٰہی وحی ہوتا ہے۔ یا جاہلیت کا حکم تمام احکام اور قوانین جن کی انسان پیروی کرتے ہیں انہیں دونوں قسموں کے ذیل میں آتے ہیں خواہ انھیں "سول لا" کہا جائے یا نہ کہا جائے خواہ سب لوگ انھیں قبول کریں یا بعض لوگ قبول کریں یا سب رد کر دیں۔

اس میں راز یہ ہے کہ حق کے بعد گمراہی کے علاوہ کچھ ہے بھی نہیں، اور جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں ہے وہ اس صراط مستقیم سے دوری کا سبب بنتی ہے جو دارالسلام تک پہنچاتا ہے چنانچہ راستے فقط دو ہی ہیں اور تیسرا راستہ کوئی نہیں ہے، خواہ راستوں کے نام کچھ بھی رکھ دیئے جائیں؛

اللہ کا راستہ، سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

اور

طاغوت کا راستہ ـــــ جو بدترین منزل میں پھینک دیتا ہے۔

اس بارے میں الفاظ قرآن کریم یہ ہیں :

"وما اختلفتم فیہ من شئ فحکمہ الی اللہ ذالکم اللہ ربی علیہ توکلت والیہ انیب[۱۷]"،

اور تم لوگ جس چیز میں جھگڑتے ہو، اس کا فیصلہ اللہ ہی کے حوالے ہے، وہی اللہ، میرا رب ہے اسی پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اختلاف کے حل کا صرف اور صرف ایک ہی مرجع ہے جو حکم خدا ہے خواہ وہ حقوقِ اموال سے متعلق اختلافات ہوں یا کسی اور چیز سے اسی سلسلے کے ایک آیت ہے:

"فاحکم بینہم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم عما جاءك من الحق" [۱۸]

ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو، حق کے آجانے کے بعد۔

یہاں اللہ نے فیصلہ کا محور فقط اور فقط وہ چیز قرار دی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ بھی جتنی آیتیں میزانِ قضاء پر بحث کرتی ہیں وہ سب یہی بتاتی ہیں کہ فیصلے کا معیار وحی الٰہی میں محصور ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جاہلیت اور طاغوت ہے، دین خدا کے علاوہ کوئی چیز قبول نہیں ہوگی اور نہ صرف یہ کہ مومنین کے راستوں کے علاوہ دوسرے راستے رضوان اور دارالسلام کی طرف ہدایت نہیں کرتے بلکہ وہ انسان کو غضب خدا اور جہنم یعنی دارالبوار تک پہنچاتے ہیں جو بدترین ٹھکانا ہے۔ کیونکہ وہ ایسے راستے نہیں ہیں جو مقصد تک پہنچا سکیں چنانچہ جو لوگ وحی اور رسولِ خدا سے منہ پھیرنے والے ہیں اللہ ان کو متنبہ کرتا اور ارشاد فرماتا ہے،

"فاین تذھبون، ان ھو الا ذکر للعالمین" [۱۹]

کہاں جاؤ گے؟ یہ تو صرف عالمین کے لیے یاد دہانی ہے۔

اس موقع پر اس "علم" کا مفہوم بھی واضح ہو گیا جس پر اللہ عز اسمہ نے زور دیا ہے اور فرمایا ہے کہ وہ نہ کہو جس کا تم علم نہ رکھتے ہو اور اس کو نہ جھٹلاؤ جس کا تمھیں علم نہ ہو اور اصرار کیا ہے کہ ہماری تصدیق اور تکذیب بہر صورت علم پر مبنی اور اثبات و نفی بصیرت کے ساتھ ہونا چاہیے چنانچہ اس نے علم کے بغیر حکم جھٹلانے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

"بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم تاویلہ" [۲۰]

بلکہ انھوں نے اسے جھٹلا دیا جس کا انھیں علم بھی نہ تھا اور ابھی تک اس کی

معنی بھی وہ نہ سمجھے تھے۔

"الم یوخذ علیھم میثاق الکتاب ان لا یقولوا علی اللہ الا الحق"[۱۹]

کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا گیا تھا کہ وہ اللہ کے بارے میں ہمیشہ حق اور سچ ہی کہا کریں۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ قول علم و تصدیق اور بصیرت پر ہی مبنی ہونا چاہیے جس کا مزید ثبوت یہ آیت ہے کہ:

"ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفؤاد کل اولئک کان عنہ مسئولا"[۲۰]

اور جس کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔ بلاشبہ کان اور آنکھ اور دل ہر ایک سے سوال کیا جائے گا۔

یہ "علم" جہاں جہاں بھی مذکور ہوا ہے اس سے مراد وہ علم ہے جس کا تعلق سعادت اور حیات طیبہ سے ہے اور جو اللہ کی جانب سے رسولؐ پر نازل کی جانے والی وحی کے مطابق ہے کیونکہ وہی علم ہے جو انسان کو جہل و نسیان و طغیان جیسی آفتوں سے محفوظ رکھتا ہے اور خود بھی جہل کے سایے سے دور ہے۔ یہی "علم" قضا کے لیے درکار اور یہی عدالت اسلامی کا معیار ہے۔

جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو وہ اصول دین میں مستقل ہے اور اس کی ہدایت سے اللہ عزاسمہ کی معرفت اس کی تصدیق نیز اس کے زائد صفات کی نفی اور اسی طرح رسول کی معرفت ان کی عصمت کا لزوم اور میدان تبلیغ میں گناہوں اور خطاؤں سے ان کی دوری، نیز اصلِ معاد، یعنی انسان کا اپنی روح و بدن کے ساتھ دوبارہ زندہ ہونا کہ یہاں عقل کی رہنمائی ضروری ہے۔ اسی سے مدد لینا چاہیے۔ مگر یہ بھی طے ہے کہ باوجود اس کی قوت رہنمائی کے وہ بہت سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ یا بہت سے اقدامات و افعال، سنن و آداب میں چھپی ہوئی حکمتوں اور مقاصد کا ادراک نہیں کر سکتی۔

جب ہی تو وہ ہمیشہ اپنے ادراک کی صحت و سقم کو معلوم کرنے کے لیے وحی کی محتاج ہے۔

اسے ایک ایسے "علم" کی ضرورت ہے جو اسے خود بخود حاصل نہیں ہوسکتا، اسی "علم" کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا:

"ویعلمکم مالم تکونوا تعلمون"[23]

اور اس نے تمہیں اس علم سے باخبر کیا جس کو تم نہیں جانتے تھے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ:

معیارِ قضاء وحی اور وہ علم ہے جو اللہ نے وحی کے ذریعے نازل کیا اور اسے لوگوں کے لیے اس خاطر وضع کیا کہ وہ اپنے درمیان قسط و عدل کو نافذ کریں۔

تیسری فصل

قاضی کے آداب و اوصاف

یہ بات تو واضح ہو چکی کہ:

قضاء انسان کے معاشرتی نظام کی حفاظت کے لیے ضروری ہے اور یہ کہ:

میزانِ قضاء فقط اور فقط وحی ہے۔

اب ہم اس فصل میں اس کے خارجی تحقق اور اس بات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ "قضاء" کو اس صورت میں وجود پذیر دیکھ سکیں جو وحی و علم حقیقی کے مطابق ہو۔

انسانی معاشرے میں عدل کا فروغ، صرف ایسے ہی قاضی کے ذریعے ممکن ہے جو قضاء کے الٰہی معیار و موازین کا عالم ہو، اور اس کے تقاضوں پر عمل کرتا ہو کیونکہ اگر علم اور ایمان اور عمل ساتھ ساتھ نہ ہو تو معیارِ قضاء کا مؤثر ہونا مشکل ہوگا، اس علم کی مثال ایسے چراغ کی ہوگی جو اندھے کے ہاتھ میں ہو کہ نہ خود چراغ لے کر چلنے والا اس سے فائدہ اٹھا سکے نہ دوسرے کو فیض حاصل ہو، اور چراغ بہ دست ہونے کے باوجود خطرے سے محفوظ نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ چراغ ٹوٹ جائے یا بے خبری سے بجھ جائے۔ اب اس کے علاوہ کوئی صورت ممکن نہیں ہے کہ براہِ راست

قضاوت کرنے والا قاضی عالم بھی ہو اور عادل بھی ۔ عالم باعمل ہو ۔

انسان میں تین بہت اہم قوتیں ہیں، ان قوتوں سے سعادت و شقاوت کے شگوفے پھوٹتے ہیں ۔ وہ قوتیں یہ ہیں :

عقل ۔ شہوت (خواہش) ، غضب ۔

عقل ۔ جس کے ذریعے انسان معاملات کا ادراک کرتا ہے ۔

شہوت ۔ جس کے ذریعے وہ اپنے لیے اشیا کی خواہش و طلب کرتا اور انھیں حاصل کرتا ہے ۔

غضب ۔ جس کے ذریعے وہ ہر اس چیز کو اپنی ذات سے دور کرتا ہے جو اسے ناپسند ہو ۔

ان تینوں قوتوں میں علم و عدل کی فرمان روائی ضروری ہے یہاں تک کہ حکم دینے والے قاضی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ حق کے راستے سے ذرّہ برابر ادھر اُدھر ہو ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ عقل قاضی کو ہمیشہ اس بات کی طرف متوجہ رہنا چاہیے کہ وہ ان حقیقتوں تک پہنچے جن کو انبیاء طے کر گئے اور جن کی انبیاء نے تعلیم دی تاکہ ہوا و ہوس اس کو گمراہ نہ کر سکے کیونکہ دین میں ذاتی رائے کا کوئی دخل نہیں اور جس نے اپنی رائے سے حقیقت کو دیکھا وہ ہلاک ہو گا ، اور جس نے اللہ کی کتاب اور نبی کے قول کو ترک کیا وہ کافر ہو گیا اور جس کی جائے پناہ اس کی نفسیاتی الجھنوں کے علاوہ کچھ نہ ہو وہ گمراہ ہے ، اور جس نے اپنی رائے کے سلسلے میں مبہم باتوں پر بھروسہ کیا گویا اس نے انھیں اپنا رہنما بنا لیا ۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی شہوت عادل اور میانہ رو ہو ، وہ کسی خاص معاملے یا معین شخص کی محبت یا مال و جاہ و منصب کے لالچ اور ان جیسی چیزوں کی خاطر فیصلہ نہ کرے جو اس کے نفس کی باطل تمنائیں ہوں ۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا غضب بھی معتدل ہو تاکہ وہ کسی بات سے بغض یا کسی شخص پر دست درازی نہ کر دے ، کسی کی تہدید سے نہ ڈر جائے ، کسی کی دہشت میں نہ آجائے ۔ غرض ، غصہ معتدل اور قوت عادلہ کے ماتحت ہو اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھنے دے جو غضب یا بغض

کے کسی پہلو کے ضمن میں شمار ہو سکے۔

جو شخص اپنی عقل میں وحی الٰہی کی تعلیم کے مطابق اعتدال پیدا کر لے اور اس پر ایمان رکھے اور شہوت اور غضب میں اس قدر اعتدال حاصل کر لے کہ اس کا حب و بغض فقط اللہ کی خاطر ہو جائے تو وہ شخص لوگوں کے جھگڑوں میں حق کے ساتھ قضادت کرنے کے قابل ہے۔

چنانچہ تہذیب نفس کے معاملہ میں ـــ خاص طور سے قضاء کے موقع پر قرآن کریم نے ان تینوں قوتوں کی تعدیل اور میانہ روی پر بہت زیادہ توجہ دی ہے۔

قرآن مجید میں پہلی قسم ان آیتوں کی ہے جو عقل کی تعدیل اور وحی کے تعلیمات سیکھنے اور انبیاءؑ کی لائی ہوئی باتوں پر غور و فکر کرنے کے لزوم پر دلالت کرتی ہیں اور یہ بتاتی ہیں کہ جو اللہ کے نازل کیے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہیں دے گا وہ کافر ہے اور چونکہ اس کی تفصیل دوسری فصل میں گذر چکی ہے اس لیے ہم اس کا اعادہ نہیں کریں گے۔

دوسری قسم ان آیتوں کی ہے جو محبت کی تعدیل پر دلالت کرتی ہیں۔

"یا ایھا الذین آمنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علیٰ انفسکم او الوالدین والاقربین ..."[24]

ایمان لانے والو! انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو، اور خدا لگتی گواہی دو، خواہ وہ گواہی تمہارے یا والدین اور رشتے داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو...

اللہ نے مومن کو حکم دیا ہے کہ وہ (عدل و) قسط پر قوام رہے اور قوامیت قسط اور عدل کے برپا کرنے اور اس کے قیام سے بہت زیادہ اونچے درجے کی چیز ہے۔ اللہ نے حکم دیا ہے کہ مومن کی شہادت اللہ ہی کے لیے ہونا چاہیے خواہ وہ خود اس کی ذات یا اس کے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یعنی اپنی ذات یا عزیزوں سے اس کی محبت، قسط اور عدل کے قیام یا اللہ کی خاطر شہادت دینے میں رکاوٹ نہ بنے۔ یعنی وقت آنے پر اپنی ذات کے خلاف گواہی دینا حق کے اظہار کی خاطر ضروری ہے، یا کبھی حق کا قیام اس بات کا تقاضا کرے کہ وہ اپنے نزدیک ترین رشتہ داروں کے خلاف شہادت دے تو وہ اس شہادت سے رکے نہیں، یوں اس کی شہوت میں عدالت اور میانہ روی پیدا ہو جائے گی اس کی محبت

اللہ کے لیے خالص ہو جائے گی اور وہ اللہ کا مجذوب ہو کر کسی ایسی چیز سے دل نہ لگا سکے گا جس سے اللہ راضی نہ ہو اور نہ کوئی ایسی چیز لے سے للچا سکے گی جو اللہ کو ناپسند ہو پھر وہ نہ تو باطل سے دلچسپی رکھے گا اور نہ مہملات کی طرف دھیان دے سکے گا۔ اس کی شہوت کے لیے اس پر تسلط ناممکن ہو جائے گا۔

تیسری قسم ان آیتوں کی ہے جو تعدیلِ غضب پر دلالت کرتی ہیں جیسا کہ ارشاد رب العزت ہے:

"یاایھا الذین آمنوا کونوا قوامین للہ شھدآء بالقسط ولایجرمنکم شنئان قوم علی الا تعدلوا، اعدلوا ھو اقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما تعملون"[۲۵]

ایمان لانے والو! اللہ کے ثابت قدم رہو، قسط (انصاف) سے گواہی دو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل سے منحرف نہ کردے۔ عدل برتو، وہی تقویٰ سے زیادہ قریب ہے اور اللہ سے ڈرو، بلاشبہ اللہ تمہارے ہر کام سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس آیت میں خداوندِ عالم نے مومن کو حکم دیا ہے کہ وہ اللہ کے لیے قوام بنے اور قسط کا شاہد ہو۔ یہ آیت بھی گذشتہ آیت کی طرح قسط و عدل پر بے پناہ توجہ دہانی سے لبریز ہے خداوندِ عالم نے مؤمن کو اس بات سے منع بھی کیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی اور عداوت، زیادتی، عدل کو چھوڑ دینے اور قضاء پر بغض کے غالب آنے سے بچے۔

ان نکات کی روشنی میں ضروری ہے کہ قاضی آدابِ الٰہی سے مؤدّب ہو یعنی اس کا غضب فقط اللہ کے لیے ہو، کسی گروہ سے اس کا بغض اسے غلط حکم دینے پر مجبور نہ کردے۔ یاد رہے کہ اگر قاضی کی قوتِ غضبیہ میں اعتدال پیدا ہو گیا تو اسے خدا کے علاوہ کسی کا خوف نہ رہے گا وہ مخلوق سے ہرگز نہ ڈرے گا۔

جب آدمی اپنے نفس پر قابو حاصل کرتے کے اس مرحلے تک پہنچ جائے اور علم و عدل کی صفتوں سے یوں آراستہ ہو جائے یعنی اس کی عقلی اور عملی قوتیں اعتدال پر آجائیں تو اس کے لیے

کرسی قضا پر بیٹھنا زیب دے گا۔ وہ اس منصب کا اہل ہوگا جو انبیاء و اوصیا کا خاص منصب ہے کیونکہ یہ شخص نبی تو نہیں ہے نہ اسے خصوصی طور پر وصایت ملی ہے۔ جو ائمہ معصومین کو حاصل ہے مگر وہ عمومی نصوص اور روایات عامہ کے ذیل میں شمار ہونے کی وجہ سے وصی قرار پاجاتا ہے۔

اس قسم کے قاضی کو اپنے علم کے مطابق عمل کرنے کا حق ہے، کیونکہ تمام امارات (شرعی دلیلیں) علم کی بدولت حجت قرار پاتی ہیں اور علم بجائے خود حجت ہے۔ اب عادل قاضی کو جب بھی حق کا علم ہوجائے وہ حجت ہے، تو جب عادل قاضی کو حق کا علم ہوجائے تو اپنے علم کے مطابق عدل کی بنیاد پر فیصلہ کا حکم دینے والی آیتوں کی روشنی میں فیصلہ کرے۔ اس مرحلے میں اگر اس کے علم کے خلاف کوئی دلیل قائم ہوجائے یا منکر اس کے علم کے خلاف قسم کھالے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود فیصلہ نہ دے بلکہ مقدمے کو دوسرے قاضی کے پاس بھیج دے اور اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ اگر بینہ اور یمین دونوں اس کے علم کے خلاف یکجا ہوں تو وہ اپنے علم کے خلاف حکم دے۔

قاضی کے فیصلہ کو توڑنا اور اسے رد کرنا درست نہیں ہے کیونکہ اس کو رد کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے معصوم کا فیصلہ رد کیا اور امام معصوم کے فیصلہ کو رد کرنے والا اللہ کے حکم کا رد کرنے والا ہے اور وہ کفر اعتقادی کے بجائے کفر عملی اور شرک کی حد پر ہے کیونکہ کفر اعتقادی اصول دین میں سے کسی اصل کے بواسطہ یا بلا واسطہ انکار کو کہا جاتا ہے جب کہ اس میں رجوع کا امکان ہوتا ہے۔

قاضی کے آداب میں سے اہم ترین ادب و ضابطہ یہ ہے کہ وہ فیصلے کے سلسلے میں رشوت نہ لے کیونکہ یہ سحت اور غلول اور تعدّی ہے اور اللہ نے قرآن کریم میں اس سے منع کیا ہے۔

"ولا تاكلوا اموالكم بالباطل وتدلوا بها الى الحكام لتاكلوا فريقا من اموال الناس بالاثم وانتم تعلمون"[26]

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ، اور نہ مال کو فیصلہ کرنے والوں کو بطور رشوت دو تاکہ لوگوں کے مال میں سے جو کچھ ہاتھ لگے ناحق خورد برد کر جاؤ۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔

اس آیت میں لوگوں کو منع کیا گیا ہے کہ وہ حکام کو ظالمانہ اور غیر عادلانہ فیصلوں پر

آمادہ کرنے کی خاطر پیسے نہ دیں "الا دلاء" کے معنی کنویں کی گہرائی تک ڈول کے پہنچانے کے ہیں تاکہ اس کی تہہ میں جو پانی ہو اس کو نکالا جاسکے۔

آیت میں ادلاء کا مشتق (تدلوا) بتاتا ہے کہ رشوت اس ڈول کے مانند ہے جو قاضی کے باطن میں پہنچ کر ظلم و جور سے متعلق اس کی پوشیدہ کمزوریوں کو ابھارتا اور نکالتا ہے۔

لہٰذا ضروری ہے کہ قاضی طہارتِ باطن اور پاکیزگیٔ ضمیر سے آراستہ ہو تاکہ نہ تو وہ مال کی طرف جھکے اور نہ قہر و غضب اس کو دبوچ سکے۔ قرآن مجید نے ان دونوں خصلتوں سے منع کیا ہے:

"فلا تخشوا الناس واخشونِ ولا تشتروا بآیتی ثمناً قلیلاً"

"لوگوں سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اور میری آیتوں کو تھوڑی سی قیمت پر نہ بیچو۔"

آیت کا پہلا ٹکڑا باطل کے خوف سے ممانعت کرتا ہے اور قوتِ غضبیہ کو مہار دینے کا حکم دیتا ہے دوسرے حصہ میں یہ رہنمائی ہے کہ قوت شہویہ کو جھوٹے اور غلط جذبات سے روکو۔ اور آخر میں دنیا کی بے بضاعتی اور متاعِ قلیل کی یقین دہانی ہے۔ غلط کار قاضی کو غلط فیصلے کے لیے اگر پوری دنیا بھی مل جائے تو وہ کم ہے کیونکہ وہ دولت چند روز میں تمام ہو جائے گی اور زائل ہونے والی چیز زیادہ ہونے کے باوجود کم ہے۔

رشوت ۔ جس سے روکا گیا ہے وہ معین چیز ہی نہیں ہے یعنی روپیہ پیسہ، نہیں۔ رشوت ہر وہ منفعت اور نفع بخش یا لذت آفرین چیز ہے جو قاضی کو خوش کر کے اس کی توجہ اپنی طرف موڑ سکے، یہ قول و فعل دونوں سے ہو سکتا ہے، دولت، تحفہ یا ہدیہ اسی طرح مدح وثنا، تعظیم و تکریم جس سے وہ متأثر ہو۔ یہ سب حرام ہے۔ کیونکہ یا اس موضوع رشوت ثابت ہوتا ہے یا حکم موضوع سے ملحق ہوتا ہے۔

" آدابِ المتخاصمین" (مدعی و مدعیٰ علیہ کے آداب) کے ذیل میں ہم بتائیں گے کہ رشوت لینا اور دینا دونوں حرام ہیں۔

گذشتہ گفتگو سے واضح ہو گیا، قاضی کو خیانت کا طرفدار ہونے سے بچنا چاہیے۔ خواہ وہ قبول باطل کے طور پر ہو یا جھوٹ کے دفاع کے انداز میں ہو۔ اس کی دلیل درج ذیل آیت ہے:

"إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا" [29]

ہم نے تم پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ تم لوگوں میں اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تم کو دکھایا بتایا ہے اور خیانت کار لوگوں کے طرفدار نہ بنو۔

قاضی کو خائن کے وکیل صفائی بننے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ خائن خود اپنی ذات سے خیانت کرتا ہے۔ لہٰذا اللہ اس کو پسند نہیں کرتا۔ بہرحال حاکم خیانت کار کی طرف نہ جھکنا چاہیے اسے ظالم کے پہلو میں کھڑے ہونے اور مظلوم کو دھکے دینے سے بچنا لازم و واجب ہے۔

گفتگو کا نتیجہ :

نظامِ قضا میں مرکزی نقطۂ توجہ قاضی کی صفتِ عدالت کبریٰ ہے۔ جو اس کی قوت عاقلہ کو حکمت، قوت شہویہ کو سخاوت و عفت سے، اور قوت غضبیہ کو شجاعت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد "قضا" بظاہر ظلم کی ملاوٹ اور باطل کی نجاست اور مکر کی گندگی سے دور ہو جاتی ہے۔ اور قاضی کو وہ "خیر" مل جاتا ہے جس کے مقابلے میں دوسری نیکیاں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

قضا کے مسنون اعمال میں ایک بات ہے قاضی کا تحقیق مکمل کرتے اور فیصلہ دینے سے پہلے، فریقین سے سوال و جواب سننے، ارشاد باری ہے :

إِنَّ هَٰذَا أَخِي لَهُ تِسْعٌ وَتِسْعُونَ نَعْجَةً وَلِيَ نَعْجَةٌ وَاحِدَةٌ فَقَالَ أَكْفِلْنِيهَا وَعَزَّنِي فِي الْخِطَابِ قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ إِلَىٰ نِعَاجِهِ وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَّا هُمْ وَظَنَّ دَاوُودُ أَنَّمَا فَتَنَّاهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهُ

خَرَّ راكعًا وانابَ[۳۰]"

یہ میرا بھائی ہے، اس کے پاس ننانوے دنبیاں ہیں، اور میرے پاس صرف ایک دنبی ہے پھر بھی یہ دنبی مجھ سے مانگتا اور بات چیت میں مجھ سے سختی کرتا ہے، داؤدؑ نے (مدعی علیہ سے پوچھے بغیر) کہہ دیا کہ یہ جو تیری دنبی اپنی دنبیوں میں مانگ کر ملانا چاہتا ہے تو یہ تجھ پر ظلم کرتا ہے اور اکثر شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو ایمان دار اور عمل صالح کرنے والے ہیں اور وہ ہیں بہت تھوڑے، اور اب انھیں معلوم ہوا کہ ہم نے ان کا امتحان لیا، وہ فوراً جھکے اور گر پڑے اور گڑگڑائے اور رب سے مغفرت مانگنے لگے۔

آیت میں اشارہ ہے کہ بہتر یہی ہے کہ مجرم اور ظالم کی تعریف و تعارف میں جلدی نہ کی جائے چاہے ذمہ داری و آداب و ضوابط کی رسمی تکمیل ہو چکی ہو۔

آیت میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے جس سے مقامِ نبوّت کی نسبت سے داؤدؑ نبی نے دل میں کوئی بات محسوس کی ہو، کیونکہ یہ واقعہ سورۃ "ص" میں داؤد علیہ السلام کی دو تعریفوں کے درمیان مذکور ہے۔ یعنی اس سے پہلے ہے:

"وآتیناہ الحكمة وفصل الخطاب"

اور ہم نے انھیں حکمت اور فصل "خطاب" دیا

بعد میں ہے:

"یا داؤد انّا جعلناك خليفة بين الناس بالحق"

اے داؤد، ہم نے تمہیں لوگوں میں حق کے ساتھ خلافت عطا کی۔

واضح سی بات ہے کہ جس نبی کو حکمت اور فصلِ خطاب عطا کی گئی ہو، اسے زمین پر خلیفہ بنایا گیا ہو اور اسے یہ حکم دیا گیا ہو کہ وہ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کرے وہ یقینی طور پر تحقیق مکمل ہونے سے پہلے حکم میں جلدی نہیں کر سکتا، لازمی طور پر جو بات حضرت داؤد علیہ السلام سے صادر ہوئی وہ مشروط اور معلق تھی کہ اگر اس سوال کی صحت فرض کر لی جائے تو یہ ظلم ہوگا۔

خداوندِ عالم نے نبی کے واسطے سے قاضی کو پابند کر دیا کہ ایسے مقامات پر بھی احتیاط کریں اور کسی قسم کے فیصلے میں عجلت سے کام نہ لیں۔ اسی طرح قاضی پر فرض و واجب ہے کہ وہ نگاہ و گفتگو میں بھی فریقین کو برابر سمجھے اور یہ سمجھے کہ اس کی زبان آگ کے بھڑکتے شعلوں کے درمیان اور وہ اس کے دل کے پیچھے ہے اگر بات حق کے موافق ہو تو کہے اور خلاف ہو تو رک جائے

اگر قاضی الٰہی آداب سے مؤدب نہ ہو تو اگرچہ اس کا فیصلہ درست ہی کیوں نہ ہو قضاوت کا اہل نہیں ہے۔ کیونکہ فیصلے کے نافذ ہونے میں دو باتیں معتبر ہیں،

حسنِ فعلی : کہ فیصلہ حق کے مطابق ہو۔

حسنِ فاعلی : یعنی فیصلہ ایک پاکیزہ ذات اور ایمان سے مطمئن دل سے جاری کیا جائے، وہ شخصیت جو اللہ کی راہ میں ملامت کرنے والوں کی ملامت سے خوف زدہ نہ ہو۔ کیونکہ قاضی چار قسم کے ہیں، جن میں سے تین جہنمی ہیں، ایک جنتی ہے۔ اور جنتی وہ ہے جو فیصلہ حق کے ساتھ کرے اور یہ جانتا بھی ہو کہ وہ حق ہے بھی۔[31]

حواشی:

[1] "قضا" و "قضاوت" ۔ فیصلہ اور فیصلہ کرنا۔ قاضی :۔ جج ۔ آداب :۔ رسم و رواج، قانون قاعدے۔ اوصاف، کوالیفکیشن ۔ (مترجم)

[2] قرآن کریم، سورۃ الحجرات/۱۳ [3] ہود/۱۱۸ [4] النحل/۹ [5] البقرہ/۲۱۳ [6] ق/۵

[7] النساء/۱۶۵ [8] اسراء/۱۵ [9] طٰہٰ/۱۳۴ [10] النساء/۱۷ [11] المؤمن/۸۳

[12] الحدید/۲۵ [13] المائدہ/۴۵ [14] المائدہ/۴۶ [15] المائدہ/۴۷

[16] المائدہ/۵۰ [17] الشوریٰ/۱۰ [18] المائدہ/۴۷ [19] التکویر/۲۶ و ۲۷

[20] یونس/۳۹ [21] الاعراف/۱۶۹ [22] الاسراء/۳۶ [23] البقرہ/۱۵۱ [24] النساء/۱۳۵

[25] المائدہ/۸ [26] البقرہ/۱۸۸ [27] المائدہ/۴۴ [28] سید کاظم طباطبائی، العروۃ الوثقی ص۳

[29] النساء/۱۰۵ [30] ص/۲۳ و ۲۴ [31] الوسائل، باب ۴ من ابواب صفات القاضی۔

جناب شیخ محمود قانصوه

تقابلی مطالعہ

شیعہ سنی کتب میں مشترک روایات

فصل سوم

احکام روزہ

سترہ باب :

(۱) ـــــ روزہ و افطار رویت پر موقوف ہے۔
(۲) ـــــ دو عادلوں کی گواہی معتبر ہے۔
(۳) ـــــ مہینہ کم و زیادہ ہوتا ہے۔
(۴) ـــــ مطلع ابر آلود ہو تو تیس دن پورے کرو۔
(۵) ـــــ دن کو چاند دیکھنے سے روزہ افطار نہیں کیا جا سکتا۔
(۶) ـــــ قبل زوال رویت ہو تو افطار نہیں کیا جا سکتا۔
(۷) ـــــ تفصیل، قبل زوال رویت ہو تو افطار۔

(۸)—— اگر انتیس دن روزے رکھے ہیں تو ایک دن کا روزہ قضا رکھے۔
(۹)—— رات نیت کیے بغیر دن کو روزہ رکھنا صحیح ہے۔
(۱۰)—— زوال کے بعد بھی آغاز روزہ جائز ہے۔
(۱۱)—— سنتی روزے کا افطار جائز ہے۔
(۱۲)—— سابقہ روزوں کی کیفیت۔
(۱۳)—— آغاز روزہ کا وقت۔
(۱۴)—— وقت افطار۔
(۱۵)—— فجر کے وقت کھانے پینے والا رمضان کے دنوں میں روزہ رکھے گا اور بعد رمضان قضا رکھے۔
(۱۶)—— صبح عیاں ہونے تک کھانا پینا جائز ہے۔
(۱۷)—— رمضان میں افطار کرنے والے کا کفارہ۔

باب اوّل

روزے کا آغاز و افطار رویت پر موقوف ہے

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمد بن الحسن، بإسناده عن علي بن مهزيار، عن محمد بن أبي عمير، عن أبي أيوب وحماد، عن محمد بن مسلم، عن أبي جعفر (ع) قال: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فافطروا، وليس بالرأي ولا بالتظني ولكن بالرؤية... الحديث[1]. ورواه في الكافي عن أحمد، عن علي بن الحكم، عن أبي أيوب، عن محمد بن مسلم مثله[2]. ورواه الفقيه بإسناده، عن محمد بن مسلم مثله[3].

۱۔ محمد ابن حسن.......... امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا: چاند دیکھ کر روزہ رکھو چاند دیکھ کر روزہ کھولو، اس میں رائے اور گمان نہیں رویت ...... کافی ... من لا یحضر...

۲ ــ محمد بن الحسن عن عبدالله بن علي بن القاسم البزاز، عن جعفربن عبدالله المحمدي، عن الحسن بن الحسين، عن عمروبن الربيع البصري، قال: سُئل الصادق (ع) عن الأهلة، قال: هي أهلة الشهور، فاذا رأيت الهلال فصم، فإذا رأيته فافطر الحديث[4]. ورواه الكافي، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، عن محمدبن يحيى، عن أحمد بن محمد جميعاً، عن ابن عمير، عن حماد، عن الحلبي[5]. ورواه الإستبصار بإسنادين قد تقدَّم ذكرهما.

۲۔ محمد ابن حسن.......... امام صادق علیہ السلام سے کسی نے پوچھا، اَھِلّہ (چاند دیکھنا) کیا ہے؟ فرمایا: مہینوں کی رویت، جب چاند دیکھ لو، تو روزہ رکھو اور جب رویت (شوال) ہو جائے تو افطار ہے.........................

۳ ــ محمدبن الحسن بإسناده عن محمد بن أحمد بن داود القمي، عن أحمدبن محمدبن سعيد، عن محمدبن عبدالله بن غالب، عن الحسن بن علي، عن عبدالسلام بن سالم، عن أبي عبدالله (ع) أنه قال: إذا رأيت الهلال فصم، فإذا رأيت الهلال فافطر[6].

۳۔ محمد ابن حسن.............. ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: جب چاند دیکھ لو، روزہ رکھو، اور چاند دیکھ کر روزہ کھولو۔

روایاتِ اہلِ سنّت:

۱ ــ أخبرنا أبوبكر محمدبن محمدبن أحمدبن رجاء، حدثنا أبوالحسن محمدبن محمدبن الحسن الكارزي، أنبأ علي بن عبدالعزيز، حدثنا القعنبي، قال: قرأت على مالك (ح و أخبرنا) أبوزكريا بن اسحاق المزكي، حدثنا أبوعبدالله محمدبن يعقوب الشيباني، حدثنا محمدبن نصر وجعفربن محمد، قالا: حدثنا يحيى بن يحيى قال: قرأت على مالك عن نافع، عن ابن عمر، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه

ذكر رمضان، فقال: لا تصوموا حتى تروا الهلال ولا تفطروا حتى تروه، الحديث[7]. ورواه مسلم، عن يحيى بن يحيى، عن مالك مثله[8]. ورواه البخاري، عن يحيى بن بكير، عن الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب، عن سالم، عن ابن عمر نحوه، وأخرجه عن عبدالله بن مسلمة، عن مالك مثله[9]، وروى ابن ماجة نحوه، عن أبي مروان، عن ابراهيم بن سعد، عن الزهري، عن سالم، عن ابن عمر[10]، ورواه النسائي، عن محمد بن سلمة والحارث بن مسكين، عن ابن القاسم، عن مالك مثله[11]، وأخرجه عن عمرو بن علي، عن يحيى، عن عبيدالله عن نافع مثله[12]، ورواه مالك مثله، وعن ثور بن زيد، عن ابن عباس[13]، ورواه الدارمي، عن عبيدالله بن عبدالمجيد، عن مالك مثله[14].

۱۔ ابوبکر محمد ابن محمد ابن احمد ابن رجا .... نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب چاند نہ دیکھو روزہ نہ رکھو اور جب تک چاند نہ دیکھو روزہ نہ کھولو......

٢ ـ وأخبرنا أبوطاهر الفقيه، أنبأ أبو حامد بن بلال، حدثنا أبو الأزهر، حدثنا عبدالمجيد بن عبدالعزيز بن أبي رواد، حدثنا أبي، عن نافع، عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ الله تبارك وتعالى جعل الأهلّة مواقيت، فإذا رأيتموه فصوموا، وإذا رأيتموه فافطروا، الحديث[15] ورواه عبدالرزاق عن عبدالعزيز بن أبي رواد، عن نافع مثله[16] وأخرج النسائي نحوه بسندين عن أبي هريرة[17] ورواه الحاكم، عن مكرم القاضي، عن أحمد بن حيان، عن أبي عاصم، عن عبدالعزيز بن أبي رواد مثله[18] ونقله الهيثمي عن أحمد، والطبراني في الكبير، عن طلق بن علي[19].

۲۔ ابوطاہر فقیہ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: اللہ نے رویت کو "مواقیت" قرار دیا ہے، تو جب چاند دیکھو روزہ رکھو اور دیکھنے کے بعد ہی افطار کرو۔ ....

۳ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، حدثنا محمدبن يعقوب، حدثنا محمدبن شاذان الأصم، حدثنا علي بن حجر، حدثنا اسماعيل، عن أيوب (ح وأخبرنا) أبوالحسن علي بن محمد المقري، أنبأ الحسن بن محمد بن اسحاق، حدثنا يوسف بن يعقوب، حدثنا سليمان بن حرب، حدثنا حمادبن زيد، عن أيوب، عن نافع، عن ابن عمر قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنما الشهر تسع وعشرون فلا تصوموا حتى تروه ولا تفطروا حتى تروه، الحديث[۲۰] ورواه مسلم، عن زهير بن حرب، عن اسماعيل مثله[۲۱]. ورواه الدارقطني، عن ابراهيم بن حماد وجعفر بن محمدبن مرشد، عن الحسن بن عرفة، عن اسماعيل بن عُلية مثله[۲۲]. وأخرجه الدارمي، عن سليمان مثله[۲۳].

أقول: وينفع في هذا الباب بكلا الطريقين مايأتي في الأبواب التالية:

۳- ابوعبداللہ حافظ .... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مہینہ کے انتیس دن ہیں۔ چاند دیکھے بغیر روزہ نہ رکھو اور چاند دیکھے بغیر افطار نہ کرو..........

اقول: اس باب کی روایتیں آئندہ ابواب کے لیے بھی مفید ہیں۔

باب دوم
دو عادلوں کی گواہی معتبر ہے

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمدبن يعقوب، عن علي بن ابراهيم، عن أبيه، وعن محمدبن يحيى، عن أحمدبن محمد جميعاً، عن ابن أبي عمير، عن حمادبن عثمان، عن الحلبي، عن أبي عبدالله (ع) إن علياً (ع) كان يقول: لا أجيز في الهلال إلا شهادة رجلين عدلين. ونحوه في حديث آخر، عن ابن أبي عمير، عن حماد بن عثمان، عن أبي عبدالله (ع)، عن علي (ع)

بزيادة، ولاتجوز شهادة النساء في الهلال[24]. ونحوه أيضاً عن حمادبن عثمان، عن عبيدالله بن علي الحلبي، عن أبي عبدالله (ع) عن علي (ع)[25]. ورواهما الفقيه بإسناده، عن الحلبي، عن الصادق[26].

۱۔ محمد بن یعقوب .... ابوعبداللہ علیہ السلام سے روایت ہے، حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: میں چاند جائز نہیں قرار دیتا جب تک دو عادل مردوں کی گواہی نہ ہو..... .... اضافہ ہے کہ چاند کے بارے میں عورتوں کی گواہی کافی نہیں ....

٢ ـ أحمدبن محمد بن عيسى في نوادره، عن أبيه رفعه قال: قضى رسول الله (ص) بشهادة الواحد واليمين في الدين، وأما الهلال فلا إلّا بشاهدي عدل[27].

۲۔ احمد بن عیسیٰ نے کتاب النوادر میں اپنے والد سے مرفوع روایت کی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گواہ اور ایک قسم پر قرض کا فیصلہ فرمایا، مگر چاند کے لیے دو عادل گواہ لازمی قرار دیے۔

روایات اہل سنت:

١ ـ أخبرنا أبوعلي الروذباري، أنبأنا أبوبكر بن داسة، حدثنا أبوداود، حدثنا محمدبن عبدالرحيم أبويحيى البزاز، حدثنا سعيدبن سليمان، حدثنا عباد ـ يعني ابن العوام ـ عن أبي مالك الأشجعي، حدثنا حسين بن الحارث الجدلي جديلة قيس أن أمير مكة خطب ثم قال: عهد إلينا رسول الله (ص) أن ننسك للرؤية فإن لم نره وشهد شاهدا عدلٍ نسكنا بشهادتها فسألت حسين بن الحارث من أمير مكة؟ قال: لاأدري، ثم لقيني بعد ذلك، فقال: هوالحارث بن حاطب أخو محمدبن حاطب، ثم قال الأمير: إن فيكم من هو أعلم بالله ورسوله مني وشهد هذا من رسول الله (ص) وأومأ بيده الى رجل قال الحسين، فقلت لشيخ الى جنبي من هذا الذي أومأ اليه الأمير، قال: هذا عبدالله بن

عمر (الحديث)[٢٨].

أقول: وعن بعض اللغويين أن النسك قد أختص في الحج فيتوقف استنباط الحكم هاهنا على القياس فتدبر، ورواه الدارقطني، عن أبي بكر النيسابوري، عن ابراهيم بن هاني، عن سعيد مثله، وروى مثله أيضاً باختلاف يسير عن الحسين بن اسماعيل، عن يوسف بن موسى، عن سعيد[٢٩].

۱۔ ابو علی رودباری .... حسین ابن حارث جدیلہ قیس کے بقول امیر مکہ نے خطبہ میں کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے عہد لیا کہ ہم رویت پر "منسک" کریں اور اگر ہم چاند نہ دیکھیں اور دو عادل گواہی دیں تو ہم ان پر "منسک" کریں گے۔ میں نے حسین ابن حارث سے پوچھا، امیر مکہ کون؟ انھوں نے کہا: معلوم نہیں۔ کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو امیر کا نام بتایا "حارث ابن حاطب برادر محمد بن حاطب۔ پھر امیر نے کہا: آپ لوگوں میں مجھ سے زیادہ اللہ و رسولؐ کو جاننا اور اس حدیث کو سننے والا شخص ہے۔ ایک آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ حسین (راوی) نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے بڈھے سے پوچھا، یہ کون ہے؟ جس کی طرف امیر نے اشارہ کیا۔ اس نے کہا: یہ عبد اللہ بن عمر ہیں ....

نوٹ: اہل لغت کہتے ہیں "نُسُک" کا استعمال حج کے لیے خاص ہے۔ لہٰذا موضوع زیر نظر میں اس سے استدلال قیاس ہے ....

٢ ــ وأخبرنا أبونصر عمر بن عبدالعزيز، أنبأ أبوالحسين محمد بن عبدالله بن محمد القهستاني، حدثنا محمد بن أيوب، أنبأ حفص بن عمر، حدثنا شعبة، عن سليمان الأعمش، عن أبي وائل قال: كتب الينا عمر ونحن بخانقين: إنَّ الأهلّة بعضها أعظم من بعض، فإذا رأيتم الهلال أول النهار فلا تفطروا حتى يشهد شاهدان ذوا عدلٍ أنها رأياه بالأمس[٣٠].

أقول: ولا يخفى أن المراد هو هلال آخر رمضان كما نصَّ الشيخ على ذلك في هذا الحديث بسندٍ آخر. ورواه عبدالرزاق، عن معمر، عن

الأعمش مثله[31]، وعن الدار قطني بسنده، أن أصحاب الرسول (ص) حدثوا أن الصوم والفطر والنسك بشهادة ذوي عدل، وروى كتاب عمر بسنده الى أبي وائل[32].

۲۔ ابو نصر عمر ابن عبد العزیز .... ابو وائل کے بقول حضرت عمر نے انہیں خانقین خط میں لکھا: چاند ایک دوسرے ماہ سے بڑا ہوتا ہے، لہٰذا جب اوّلِ روز میں چاند دیکھو تو اس وقت تک افطار نہ کرنا جب تک دو عادل گواہ شب گذشتہ چاند دیکھنے کی گواہی نہ دیں..

نوٹ: ظاہر ہے کہ یہاں ہلالِ آخر رمضان ہی مراد ہے .... دارقطنی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حدیث بیان کرتے ہیں کہ صوم، فطر اور نسک، دو عادل گواہوں کی بنیاد پر انجام پا سکتے ہیں ....

باب سوم

مہینہ کم و زیادہ ہوتا ہے

روایات اہل بیتؑ:

١ ــ محمدبن الحسن، عن أحمد بن محمد، عن محمدبن أبي غالب، عن علي بن الحسن الطاطري، عن محمدبن زياد، عن اسحاق بن جرير، عن أبي عبدالله (ع) قال: إنَّ رسول الله (ص)، قال: إنَّ الشهر هكذا وهكذا. يلصق كفيه ويبسطها، ثم قال: وهكذا وهكذا وهكذا. ثم يقبض إصبعاً واحدة في آخر بسطه بيديه وهي الإبهام. فقلت: شهر رمضان تام أبداً أم شهر من الشهور؟ فقال: شهر من الشهور[33].

توحید ٦٣

۱۔ محمد ابن حسن.............. ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: مہینہ یوں.... آپ مٹھیاں کھولتے اور بند کرتے جاتے تھے پھر فرمایا: اس طرح... آخری مرتبہ جب مٹھی کھولی تو انگوٹھا دبالیا۔ میں نے پوچھا (راوی) رمضان کا مہینہ ہمیشہ تیس دن کا ہوتا ہے؟ فرمایا، وہ بھی دوسرے مہینوں میں سے ایک مہینہ ہے۔

۲ ــ محمدبن الحسن، عن عثمان بن عيسى، عن سماعة، قال: صيام شهر رمضان بالرؤ ية، وليس بالظن، وقد يكون شهر رمضان تسعة وعشرين يوماً، و يكون ثلا ثين، و يصيبه ما يصيب الشهور من التمام والنقصان[34].

۲۔ محمد ابن حسن .... فرمایا: صیام ماہ رمضان رویت پر ہے، گمان پر نہیں۔ ماہ رمضان کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے کبھی تیس دن کا، دنوں کی کمی زیادتی دوسرے مہینوں کی طرح اس میں بھی ہوتی ہے۔

۳ ــ محمدبن الحسن، عن عمروبن عثمان، عن المفضل وعن زيد الشحام جيعاً، عن أبي عبدالله (ع)، أنه سُئل عن الأهلة، فقال: هي أهلة الشهور، فإذا رأيت الهلال فصم، واذا رأيته فافطر: قلت: أرأيت إنْ كان الشهر تسعة وعشرين يوماً أقضي ذلك اليوم؟ فقال: لا... الحديث[35]. وفي سند الإستبصار اختلاف فهو (عن علي بن مهزيار، عن عمروبن عثمان، عن المفضل، عن زيد الشحام، عن أبي عبدالله (ع))، ورواه في الإستبصار بسنده عن الحسين بن سعيد، عن محمدبن فضيل، عن أبي الصباح وصفوان، عن ابن مسكان، عن الحلبي جيعاً، عن أبي عبدالله (ع)[36] ونقله في البحار، عن العياشي، عن زيد أبي أسامة قال مثله[37].

۳۔ محمد ابن حسن .... حضرت ابوعبداللہ علیہ السلام سے چاند کے بارے میں پوچھا گیا، آپ نے فرمایا: مہینہ چاند پر موقوف ہے۔ چاند دیکھ لو روزہ رکھ لو۔ اور جب رویت ہو تو افطار کر لو۔ میں نے سوال کیا: آپ کے نزدیک اگر مہینہ انتیس کا ہو تو ایک دن کی قضا کر دوں؟

فرمایا، نہیں ....

روایات اہل سنّت :

١ ــ أخبرنا أبوزكريا بن أبي اسحاق، حدثنا أبو عبدالله محمد بن يعقوب الشيباني، حدثنا ابراهيم بن عبدالله، أنبأ محمد بن عبيد، حدثنا عاصم بن محمد عن أبيه، عن عبدالله بن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الشهر هكذا وهكذا وهكذا. ثلاث مرات بيديه، ثم قبض في الثالثة إبهامه... فإنْ غمَّ عليكم فأتموا ثلا ثين[٣٨]، وروى مسلم نحوه، عن ابن أبي شيبة، عن أبي اسامة، عن عبيدالله، عن نافع، عن ابن عمر، وكذا باسنادين آخرين، فراجع[٣٩]، وروى النسائي نحوه بأسانيده، عن سعد بن أبي وقاص[٤٠].

١- ابوزکریا ابن ابی اسحاق .... عبداللہ ابن عمر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: مہینہ یوں... تین مرتبہ ہاتھ سے سمجھایا، آخری دفعہ، انگوٹھا پکڑ لیا۔ ...... اگر بادل ہوں تو تیس روز پورے کرو۔ ....

٢ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ وأبوزكريا بن أبي اسحاق المزكي، قالا: حدثنا أبوعبدالله محمد بن يعقوب، حدثنا جعفر بن محمد، حدثنا يحيى بن يحيى، أنبأ اسماعيل بن جعفر، عن عبدالله بن دينار أنه سمع ابن عمر، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: الشهر تسع وعشرون ليلة. لا تصوموا حتى تروه، ولا تفطروا حتى تروه، إلّا أن يغم عليكم (الحديث)[٤١]. ورواه مسلم، عن يحيى بن يحيى ويحيى بن أيوب وقتيبة بن سعد وابن حجر، جميعاً عن اسماعيل مثله[٤٢]. ورواه الدارقطني[٤٣].

٢- ابوعبداللہ حافظ .... عبداللہ ابن عمر کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا: مہینہ انتیس راتوں کا ہوتا ہے۔ روزہ چاند دیکھے بغیر نہ رکھو اور چاند دیکھے بغیر

نہ کھولو۔ بادل ہو تو مع اور بات ہے۔ . . . .

۳ ــ أخبرنا أبوالحسن علي بن أحمد بن عبدان، أنبأ أحمدبن عبيد الصفار، حدثنا أحمدبن عبيدالله النرسي، حدثنا روح بن عباده، حدثنا مالك، عن عبدالله بن دينار، عن ابن عمر أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: الشهر تسع وعشرون. لا تصوموا حتى تروه، ولا تفطروا حتى تروه... الحديث[۴۴] وأخرجه البخاري، عن عبدالله بن مسلمة، عن مالك مثله[۴۵]، وأخرج النسائي نحوه، عن أبي داود، عن هارون، عن ابن المبارك ، عن يحيى، عن أبي سلمة، عن أبي هريرة[۴۶] وأخرجه أبو داود، عن سليمان بن داود العنكي، حدثنا حماد، حدثنا أيوب، عن نافع، عن ابن عمر[۴۷].

۳۔ ابوالحسن علی ابن احمد ابن عبدان . . . . ابن عمر کے بقول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مہینہ انتیس دن کا ہوتا ہے۔ روزہ چاند دیکھے بغیر نہ رکھو۔ اور چاند دیکھے بغیر افطار نہ کرو۔ . . . .

باب چہارم

مطلع ابرآلود ہو تو تیس دن پورے کرو

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمدبن الحسن بإسناده عن أبي غالب الزراري، عن أحمدبن محمد، عن أحمدبن الحسن، عن أبان، عن عبدالله بن جبلة (جبلة)، عن علا، عن محمدبن مسلم، عن أحدهما يعني أباجعفر وأبا عبدالله عليها السلام قال: شهر رمضان يصيبه ما يصيب الشهور من النقصان، فإذا صمت تسعة وعشرين يوماً ثم تغيمت السماء فأتم العدة ثلاثين[۴۸].

۱- محمد ابن حسن .... امام محمد باقرؑ یا امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ماہ رمضان بھی دوسرے مہینوں کی طرح کم ہوتا ہے۔ انتیس روزوں کے بعد مطلع ابر آلود ہو تو تیس کا عدد پورا کرو۔

٢ ــ محمدبن الحسن بإسناده عن علي بن الحسن بن فضال، عن الحسين (الحسن) بن نصر، عن أبيه، عن أبي خالد الواسطي، عن أبي جعفر (ع) في حديث قال: إنَّ رسول الله صلى الله عليه وآله قال: «وإذا خفي الشهر فأتموا العدة شعبان ثلا ثين يوماً ...» الحديث[٤٩].

۲- محمد ابن حسن .... ابوخالد واسطی نے ابوجعفر (محمد باقر علیہ السلام) سے ایک حدیث کے ذیل میں روایت کی ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر (رمضان کا) مہینہ مخفی رہ جائے تو شعبان کے تیس دن تمام کرلو۔

٣ ــ محمد بن الحسن، عن محمد الأشعري، عن أبي خالد، عن ابن بكير (أبي بكر)، عن عبيد بن زرارة، عن أبي عبدالله (ع) قال: شهر رمضان يصيبه ما يصيب الشهور من الزيادة والنقصان، فإنْ تغيمت السماء يوماً فأتموا العدة[٥٠].

۳- محمد ابن حسن .... عبید ابن زرارہ کی روایت ہے، ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: ماہ رمضان میں بھی اسی طرح دنوں کی کمی زیادتی ہوتی ہے، جیسے دوسرے مہینوں میں، لیکن اگر اس دن آسمان ابر آلود ہو تو تیس دن پورے کرو۔

روایات اہل سنت :

١ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ، أخبرني عبدالرحمن بن الحسن القاضي، حدثنا ابراهيم بن الحسن، حدثنا آدم، حدثنا شعبة، حدثنا محمدبن زياد، قال: سمعت أبا هريرة يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم، أو قال أبوالقاسم صلى الله عليه وسلم: صوموا لرؤيته،

وافطروا لرؤيته، فإنْ غمَّ عليكم الشهر فعدوا ثلاثين يوماً، يعني عدوا شعبان ثلاثين[٥١] ورواه مسلم، عن عبيدالله بن معاذ، عن أبي، عن شعبة مثله[٥٢]، وروى عبدالرزاق نحوه، عن معمر، عن الزهري، عن أبي سلمة وابن المسيب ـــ أو أحدهما ـــ، عن ابي هريرة[٥٣] وأخرجه البخاري، عن آدم مثله[٥٤] وأخرجه النسائي، عن مؤمل بن هشام، عن اسماعيل، عن شعبة، وكذا عن محمد بن عبدالله، عن أبي، عن ورقاء، عن شعبة[٥٥] وأخرج النسائي مثله، عن أحمد بن حبان بن هلال، عن حماد بن سلمة، عن ابن دينار، عن ابن عباس. وأيضاً عن محمد بن عبدالله بن يزيد، عن سفيان، عن عمرو بن دينار، عن محمد بن حنين، عن ابن عباس[٥٦] ورواه الدار قطني، عن محمد بن مخلد، عن علي بن داود، عن آدم مثله[٥٧] وأخرجه أوب داود الطيالسي، عن عمران القطان، عن قتادة، عن الحسن، عن أبي بكر، وعن ابن سعد، عن الزهري، عن سالم، عن ابن عمر وعن أبي سعد، عن الزهري، عن سعيد، عن أبي هريرة وعن أبي عوانة، عن سماك، عن عكرمة، عن ابن عباس[٥٨] ورواه الدارمي ضمن حديث، عن عبدالله بن سعيد، عن اسماعيل بن عُليَّة، عن حاتم بن أبي صغيرة، عن سماك، عن عكرمة، عن ابن عباس ورواه عن هاشم بن القاسم، عن شعبة مثله[٥٩] وأخرجه البزار أول حديث عن محمد بن المثنى وعمرو بن علي، عن أبي داود، عن عمران، عن قتادة، عن الحسن، عن أبي بكرة.

۱۔ ابوعبداللہ حافظ . . . . بروایت ابوہریرہ، رسول اللہ یا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: چاند دیکھ کر روزہ رکھو۔ چاند دیکھ کر (عید) فطر کرو۔ اگر مہینہ تم پر واضح نہ ہو تو تیس دن شمار کرو۔ یعنی شعبان کو تیس دن کا (مہینہ) مانو۔ . . مسلم . . . بخاری . . . نسائی . . . دارقطنی . . . ابوداؤد . . . . دارمی . . . . .

۲ ـــ وأخبرنا أبونصر محمد بن أحمد بن اسماعيل الطابراني بها، أنبأ عبدالله بن أحمد بن منصور الطوسي، حدثنا محمد بن اسماعيل

الصائغ، حدثنا روح، حدثنا زكريا بن اسحاق، حدثنا أبو الوزير أنه سمع جابر بن عبدالله يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إذا رأيتم الهلال فصوموا، وإذا رأيتموه فافطروا، فإنْ أغمي عليكم فعدوا ثلاثين يوماً[٦٠] وأخرجه ابن ماجة، عن أبي مروان العثماني، عن ابراهيم بن سعد، عن الزهري، عن سعيد ابن المسيب، عن أبي هريرة[٦١] وأخرجه النسائي، عن محمد بن يحيى، عن سليمان بن داود، عن ابراهيم، عن محمد بن مسلم، عن سعيد مثل ابن ماجة[٦٢] ونقله الهيثمي، عن أحمد وأبي يعلى والطبراني في الأوسط، وذكر أن رجال أحمد رجال الصحيح[٦٣].

۲۔ ابونصر محمد ابن احمد ابن اسماعیل طابرانی ... جابر بن عبداللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھ لو تو (عید) افطار کرو۔ پھر اگر مشتبہ ہو تو تیس دن پورے کرو ....

٣ ــ أخبرنا أبو بكر محمد بن الحسن بن فورك، أنبأ عبدالله بن جعفر، حدثنا يونس بن حبيب، حدثنا أبو داود، حدثنا شعبة، أخبرني عمرو بن مرة قال: سمعت أبا البختري قال: أهللنا رمضان ونحن بذات عرق، فأرسلنا رجلاً الى ابن عباس يسأله، فقال ابن عباس: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنَّ الله قد مده لرؤيته، فإنْ أغمي عليكم فأكملوا العدة[٦٤] وروى مسلم نحوه، عن أبي بكر بن أبي شيبة، عن محمد بن فضيل، عن حصين، عن عمرو، ورواه بنفسه، عن أبي بكر، عن غندر، عن شعبة (ح) وعن ابن المثنى وابن بشار ومحمد بن جعفر، عن شعبة مثل البيهقي[٦٥]. ورواه الدار قطني، عن محمد بن مخلد، عن علي بن داوود، عن آدم، عن شعبة[٦٦]. أقول وينفع في هذا الباب بكلا الطريقين ما تقدَّم في الأبواب السابقة.

۳۔ ابوبکر محمد ابن حسن ابن فورک .... بروایت ابن عباس، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے اس (شعبان) کو رویت تک بڑھایا ہے، اگر چاند واضح نہ ہو تو

(شعبان کے تیس دن پورے کرو ۔ . . . .

باب پنجم

دن کی رویت سے افطار نہیں ہو سکتا

روایات اہل بیتؑ:

۱ ــ محمدبن الحسن، عن النضربن سويد، عن القاسم بن سليمان، عن جراح المدائني، قال: قال أبوعبدالله (ع): من رأى هلال شوال بنهار في شهر رمضان، فليتم صيامه[67].

۱۔ محمد ابن حسن .... بروایت جراح مدائنی ۔ ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: جو شخص دن کو شوال کا چاند ماہِ رمضان کے دن کو دیکھے وہ اپنا روزہ پورا کرے۔

۲ ــ محمدبن مسعود العياشي في تفسيره، عن القاسم بن سليمان، عن جراح، عن أبي عبدالله (ع) قال: قال الله: «وأتموا الصيام الى الليل» يعني صوم رمضان، فمن رأى الهلال بالنهار فليتم صيامه[68].

۲۔ محمد ابن مسعود عیاشی نے تفسیر...... ابوعبداللہ علیہ السلام نے فرمایا: ارشاد باری ہے " اور روزہ رات تک مکمل کرو " یعنی رمضان کا روزہ ۔ جو شخص دن کو چاند دیکھے وہ اپنا روزہ پورا کرے ۔

روایات اہل سنت:

۱ ــ أخبرنا أبوزكريا بن أبي اسحاق وأبوبكربن الحسن القاضي، قالا: حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا بحربن نصر،

قال: قرئ علي بن وهب، أخبرك يونس بن يزيد، عن ابن شهاب، عن سالم بن عبدالله أن أناساً رأوا هلال الفطر نهاراً، فأتم عبدالله بن عمر صيامه الى الليل، وقال: لا، حتى يرى من حيث يرى بالليل[٦٩].

۱۔ ابوزکریا ابن ابی اسحاق .... سالم بن عبداللہ نے کہا، کچھ آدمیوں نے دن کے وقت روز فطر کا چاند دیکھ لیا، تو عبداللہ بن عمر نے رات تک روزہ باقی رکھا اور کہا: نہ، جب یوں دکھائی نہ دے جیسے رات کو دکھائی دیتا ہے۔

٢ ــ أخبرنا أبوعبدالله الحافظ وأبوسعيد بن أبي عمرو، قالا: حدثنا أبوالعباس محمدبن يعقوب، حدثنا هارون بن سليمان، حدثنا عبدالرحمن بن مهدي، عن سفيان، عن منصور، عن أبي وائل، قال: جاءنا كتاب عمر ونحن بخانقين: إنَّ الأهلة بعضها أكبر من بعض فإذا رأيتم الهلال نهاراً فلا تفطروا حتى تمسوا إلّا أن يشهد رجلان مسلمان أنهما أهلاه بالأمس عشية[٧٠]. أقول ولم أجد في الباب حديث عن النبي (ص) من طرق أهل السنة.

۲۔ .... ابو وائل کہتے ہیں ہمارے پاس حضرت عمر کا خط آیا اور ہم ان دنوں خانقین میں تھے، (خط میں تھا) پہلی کے چاند کبھی بڑے ہوتے ہیں کبھی چھوٹے۔ جب دن کو چاند دیکھ لو تو شام تک روزہ نہ کھولنا، سوائے اس صورت کے جب دو مسلمان گواہی دیں کہ ان دونوں نے چاند دیکھا ہے۔

اقول: میں نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث باسند، اہل سنت کے یہاں نہیں پائی۔

باب ششم

قبل زوال چاند دیکھنا اور افطار نہ کرنا

روایات اہل بیتؑ:

۱ ـ محمدبن الحسن، عن محمدبن جعفر، عن محمدبن أحمدبن يحيى، عن محمد بن عيسى، قال كتبت اليه (ع): جعلت فداك ربما غم علينا شهر رمضان فنرى من الغد الهلال قبل الزوال وربما رأيناه بعد الزوال فترى أن نفطر قبل الزوال إذا رأيناه أم لا، وكيف تأمر في ذلك؟ فكتب (ع): تتم الى الليل فانه إنْ كان تاماً رؤي قبل الزوال[۷۱] ورواه في الإستبصار، عن علي بن حاتم، عن محمدبن جعفر.

۱۔ .... محمدابن عیسیٰ کہتے ہیں، میں نے امامؑ کو خط لکھا:

آپ پر قربان! کبھی ماہ رمضان کا چاند یقینی طور پر نہیں دکھائی دیتا مگر صبح کو زوال سے پہلے دیکھا جاتا ہے، اور اکثر زوال کے بعد بھی دیکھا گیا ہے۔ آپ کا حکم کیا ہے، زوال سے پہلے افطار کریں؟ یا نہیں؟ آپ کیا ارشاد فرماتے ہیں؟

امام نے جواب میں لکھا:

روزہ رات تک تمام کرو، کیونکہ چاند اگر تمام ہوتا تو قبل از زوال نظر آتا۔

استبصار میں یہ حدیث علی بن حاتم سے محمد بن جعفر نے .....

روایات اہل سنت:

۱ ـ أخبرنا أبوبكر بن الحارث الفقيه، أنبأ علي بن عمر الحافظ، أنبأ أبوبكر النيسابوري، حدثني يوسف بن سعيد بن مسلم، حدثنا حجاج بن محمد (ح قال وحدثنا) أبوبكر، حدثنا أحمدبن سعيد

بن صخر، حدثنا النضربن شميل (ح قال وحدثنا) أبوبكر، حدثنا محمدبن ابراهيم أبوأمية والعباس بن محمد ومحمد بن أحمد بن أحمدبن الجنيد، قالوا: حدثنا روح، حدثنا شعبة، عن سليمان، عن أبي وائل قال: أتانا كتاب عمر بخانقين: إنّ الأهلة بعضها أعظم من بعض، فإذا رأيتم الهلال من أول النهار فلا تفطروا حتى يشهد شاهدان أنهما رأياه بالأمس[72]. أقول ولم أجد في الباب حديثاً عن النبي (ص) من طريق أهل السنة.

.... ابی وائل کے بقول وہ خانقین میں تھے کہ وہاں حضرت عمر کا خط آیا: پہلی کے چاند کبھی بڑے ہوتے ہیں اور کبھی چھوٹے، اگر دن کے ابتدائی حصہ میں نظر آجائے تو افطار نہ کرو یہاں تک کہ دو شاہد گواہی دیں کہ انہوں نے کل چاند دیکھا تھا۔

اقول: اس سلسلہ میں برادران اہل سنت کے یہاں پیغمبر اسلام سے کوئی روایت نہیں ملتی۔

حواشی

١ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٨٢. الإستبصار ج ٢، ص ٦٣.
٢ ــ الكافي ج ٤، ص ٧٧.
٣ ــ الفقيه ج ٢، ص ٧٦.
٤ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٨٦.
٥ ــ الكافي ج ٤، ص ٧٦.
٦ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٨٦.
٧ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٤.
٨ ــ مسلم ج ٣، ص ١٢٢.
٩ ــ البخاري ج ٣، ص ٣١، ٣٣.

١٠ ــ ابن ماجة ج ١، ص ٥٢٩.
١١ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٤.
١٢ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٤.
١٣ ــ موطأ مالك بشرح الحوالك ج ١، ص ٢٦٩. وليس في الأول ذكر رمضان.
١٤ ــ الدارمي ج ٢، ص ٣.
١٥ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٥.
١٦ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤، ص ١٥٦. وفيه زيادة (للناس) بعد مواقيت.
١٧ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٣. وليس فيه ذكر الأهلة.
١٨ ــ المستدرك ج ١، ص ٤٢٣.
١٩ ــ مجمع الزوائد ج ٣، ص ١٤٥.
٢٠ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٤.
٢١ ــ مسلم ج ٣، ص ١٢٢.
٢٢ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٦١.
٢٣ ــ الدارمي ج ٢، ص ٤.
٢٤ ــ الوسائل ج ٧، ص ٢٠٧. ونحوه في الكافي ج ٤، ص ٧٧.
٢٥ ــ الوسائل ج ٧، ص ٢٠٨، الكافي ج ٤، ص ٧٦.
٢٦ ــ الفقيه ج ٢، ص ٧٧.
٢٧ ــ الوسائل ج ٧، ص ٢١١.
٢٨ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٤٧. وأبوداود ج ٢، ص ٣٠١.
٢٩ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٦٧.
٣٠ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٤٨.
٣١ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤، ص ١٦٢. وفيه اختلاف في اللفظ يسير ونقيصة صدره (ان الأهلة) وبدل (أول النهار) نهاراً.
٣٢ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٦٧ و١٦٩.
٣٣ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٨٩.
٣٤ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٩٠ ــ الإستبصار ج ٢، ص ٦٣.
٣٥، ٣٦، ٣٧ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٩٠ ــ الإستبصار ج ٢، ص ٦٢ و٦٣ ــ والبحار ج ٩٣، ط.ح ص ٣٠٠.
٣٨ ــ البيهقي ج ٧، ص ٢٠٥.
٣٩ ــ مسلم ج ٣ ص ١٢٢.
٤٠ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٨، ١٣٩.

٤١ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٥.
٤٢ ــ مسلم ج ٣، ص ١٢٣.
٤٣ ــ راجع باب الصوم والإفطار بالرؤية.
٤٤ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٥.
٤٥ ــ البخاري ج ٣، ص ٣٣.
٤٦ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٩ بزيادة: ويكون ثلاثين.
٤٧ ــ أبوداوود ج ٢، ص ٢٩٧.
٤٨ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٨٩ ــ الإستبصار ج ٢، ص ٦٢.
٤٩ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٩٢.
٥٠ ــ الوسائل ج ٧، ص ١٩١.
٥١ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٥.
٥٢ ــ مسلم ج ٣، ص ١٢٤.
٥٣ ــ مصنف عبدالرزاق ج ٤، ص ١٥٦.
٥٤ ــ البخاري ج ٣، ص ٣٣.
٥٥ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٣.
٥٦ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٥. وفي الثاني زيادة.
٥٧ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٦٢.
٥٨ ــ منحة المعبود ج ١، ص ١٨٢. وفي الأخير اختلاف في اللفظ وزيادة في آخره.
٥٩ ــ الدارمي ج ٢، ص ٣. وفيه زيادة في آخره واختلاف في اللفظ.
٦٠ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٦.
٦١ ــ ابن ماجة ج ١، ص ٥٣٠.
٦٢ ــ النسائي ج ٤، ص ١٣٣.
٦٣ ــ مجمع الزوائد، ج ٣ ص ١٤٥.
٦٤ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢٠٦ ــ ومنحة المعبود ج ١، ص ١٨٢.
٦٥ ــ مسلم ج ٣، ص ١٢٧.
٦٦ ــ الدارقطني ج ٢، ص ١٦٢ وبسند آخر ص ١٧١.
٦٧ ــ الوسائل ج ٧، ص ٢٠١ ــ الإستبصار ج ٢، ص ٧٣.
٦٨ ــ الوسائل ج ٧، ص ٢٠٣.
٦٩ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٣.
٧٠ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٣.
٧١ ــ الوسائل ج ٧، ص ٢٠٢ ــ الإستبصار ج ٢، ص ٧٣.
٧٢ ــ البيهقي ج ٤، ص ٢١٣.

استاد شہید مرتضیٰ مطہری

الٰہیات و ماوراء الطبیعیات

نہج البلاغہ کی روشنی میں

توحید و معرفت

الٰہیات و مابعد الطبیعت سے گفتگو، نہج البلاغہ کی بنیادی و اساسی بحثوں میں سے ایک اہم بحث ہے، خطبات، مکتوبات اور کلمات قصار میں تقریباً چالیس مقامات پر اس سلسلہ میں گفتگو ہوئی ہے۔ بعض مقامات کے سوا جہاں مختصر جملوں پر اکتفا کی گئی ہے، اکثر یہ بحثیں چند سطروں یا چند صفحات پر مشتمل ہیں۔

نہج البلاغہ کی توحید سے متعلق بحثیں اس کی حیرت انگیز بحثوں میں شمار کی جاسکتی ہیں۔ تخلیق نہج البلاغہ کے عصر اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے کہ یہ بحثیں حد اعجاز کو پہنچی ہوئی ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں مختلف انداز اور نوعیت سے بحثیں کی گئی ہیں، اس کی کچھ بحثیں مخلوقات و آثار صنع و حکمت الٰہی کے مطالعہ سے تعلق رکھتی ہیں، اس حصہ میں کبھی خود زمین و آسمان کے کلی نظام سے بحث ہوئی ہے اور کبھی کسی خاص مخلوق جیسے چمگادڑ، مور، یا چیونٹی کو موضوع سخن قرار دیا گیا ہے اور آثار تخلیق یعنی ان مخلوقات کی تخلیق میں تدبیر کی کارفرمائی اور مقصد کی طرف توجہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بطور نمونہ "چیونٹی" کے سلسلہ میں حضرت[ع] کے

خطبہ ۱۸۳/۱۷۷ کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیں :

الا ینظرون الی صغیر ما خلق کیف احکم خلقہ و اتقن ترکیبہ وفلق لہ السمع و البصر وسوّی لہ العظم والبشر انظروا الی النملۃ فی صغر جثتھا و لطافۃ ھیئتھا لا تکاد تنال بلحظ البصر و لا بمستدرک الفکر کیف دبّت علیٰ ارضھا و صُبّت علی رزقھا تنقل الحبّۃ الیٰ جحرھا و تُعِدّھا فی مستقرھا تجمع فی حرّھا لبردھا و فی وردھا لصدرھا مکفولۃ برزقھا مرزوقۃ بوفقھا لا یغفلھا المنّان ولا یحرمھا الدّیان، ولو فی الصفا الیابس والحجر الجامس ولو فکرت فی مجاری اکلھا فی علوّھا و سفلھا وما فی الجوف من شراسیف بطنھا وما فی الرأس من عینھا و اُذنھا لقضیت من خلقھا عجباً [1]

کیا وہ لوگ ان چھوٹے چھوٹے مخلوقات کے بارے میں غور و فکر نہیں کرتے کہ کس طرح ان کی آفرینش کو استحکام بخشا ہے اور ان کے جوڑ بند کو باہم استواری سے ملایا ہے، ان کو دیکھنے اور سننے کی طاقت عطا کی، ہڈی اور کھال کو پوری مناسبت سے درست کیا ... ؟

ذرا اس چیونٹی کی طرف اس کے جثہ کے اختصار اور شکل و صورت کی باریکی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے نظر کرو، اتنی چھوٹی کہ گوشۂ چشم سے بمشکل دیکھی جا سکے، اور نہ ہی فکروں میں سماتی ہے۔ دیکھو تو کیونکر زمین پر رینگتی پھرتی ہے اور اپنے رزق کی طرف لپکتی ہے۔ دانے کو اپنی بل کی طرف لئے جاتی ہے اور اسے اپنی قیام گاہ میں مہیا رکھتی ہے، گرمیوں میں جاڑے کے موسم کے لیے اور قوت و توانائی کے زمانہ میں عجز و درماندگی کے دنوں کے لیے ذخیرہ کر لیتی ہے۔ ایسی مخلوق کی روزی کا ذمہ اس طرح لیا جا چکا ہے، اور اس کے مناسب حال رزق اسے پہنچا رہتا ہے، خدائے کریم اس سے تغافل نہیں برتتا، صاحب عطا و جزا اسے محروم نہیں رکھتا اگرچہ یہ خشک پتھر اور جمے ہو

سنگ خارا کے اندر ہی کیوں نہ ہو، اگر تم اس کی غذا کی نالیوں اور اس کے بلند و پست حصوں اور اس کے خول میں پیٹ کی طرف جھکے ہوئے پسلیوں کے کناروں اور اس کے سر میں چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور کانوں کی ساخت کے بارے میں غور و فکر کرو گے تو اس کی آفرینش پر تمہیں تعجب ہوگا۔

لیکن توحید کے بارے میں نہج البلاغہ کی زیادہ تر بحثیں، عقلی و فلسفی بحثیں ہیں اور نہج البلاغہ کی غیر معمولی معراج انہی بحثوں میں نمایاں ہوتی ہے، نہج البلاغہ کی عقلی توحیدی بحثوں میں تمام دلائل و نتائج کی بنیاد، "اطلاق"، "لاحدی"، "احاطہ ذاتی" اور "قیومی" حق ہے، حضرت علیؑ نے جس انداز سے اس سلسلہ میں گفتگو کی ہے، ویسی گفتگو نہ آپ سے پہلے کسی نے کی اور نہ آپ کے بعد کوئی کر سکا ہے۔

ایک دوسرا مسئلہ جس سے اس حصہ میں بار بار بحث ہوئی ہے وہ "بساطت مطلقہ" ہر قسم کے تکثر و تجزیہ سے انکار اور ذات و صفات حق کے درمیان ہر قسم کی غیریت کی نفی ہے۔

بعض ایسے نہایت عمیق مسائل بھی بیان ہوئے ہیں جن کی مثال نہج البلاغہ سے پہلے کہیں نہیں ملتی، جیسے "اولویت حق عین آخریت حق ہے"، "اس کی ظاہریت عین باطنیت ہے"، "زمان و عدد پر اس کا تقدم" اور یہ کہ "اس کا قدم زمانی قدم اور اس کی وحدت عددی وحدت نہیں"، "علو و سلطان و غنای ذاتی حق"، "اس کی "مبدعیت" اور یہ کہ "اس کے لیے ایک حالت دوسری حالت سے سدِ راہ نہیں بنتی"، "اس کا کلام عین فعل ہے"، اس کے ادراک پر عقل کی حدود توانائی، اور معرفت حق عقل پر اس کی تجلی کی ایک قسم ہے نہ کہ کسی معنی و مفہوم پر احاطۂ ذہن کی قسم، اس سے سلب جسمیت و حرکت و سکون و تغییر و مکان و زمان و مثل و ضد و شریک و شبیہ و استخدام آلت و محدودیت و معدودیت نیز اس کے علاوہ بھی بہت سارے مسائل ہیں ان شاء اللہ بطور نمونہ ہر ایک مسئلہ سے بحث کی جائے گی۔

یہ وہ مباحث ہیں جو اس معجز نما کلام میں بیان ہوئے ہیں اور فلاسفہ قدیم و جدید کے افکار و نظریات سے باخبر فلسفی کو سخت حیرت و تعجب میں غرق کر دیتے ہیں۔

نہج البلاغہ میں بیان شدہ تمام مسائل سے تفصیلی گفتگو کے لیے ایک مفصل کتاب درکار ہے ایک یا دو مقالہ میں اس کی وضاحت ناممکن ہے، لہٰذا ہم صرف اجمالی اشارے پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں، لیکن نہج البلاغہ کے اس حصہ سے اجمالی گفتگو کے لیے بھی بطور مقدمہ کچھ نکات کی جانب

اشارہ ضروری ہے۔

تلخ اعتراف

ہم شیعوں کو یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ دوسروں سے زیادہ خود ہم نے اس شخص کے حق میں ظلم یا کم از کم کوتاہی کی ہے جس کی پیروی کے ہم دعویدار ہیں، سچ تو یہ ہے کہ ہماری کوتاہیاں بھی ایک طرح کا ظلم ہے، ہم علی علیہ السلام کو پہچان نہ سکے یا پہچاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ ہماری زیادہ تر کوششیں حضرت علیؑ کے متعلق پیغمبر اکرمؐ کی احادیث اور ان لوگوں پر سب و شتم کے سلسلہ میں تھیں جنھوں نے ان احادیث کو نظر انداز کر دیا تھا، ہم نے مولا علیؑ کی حقیقی و عینی شخصیت کو سمجھنے کے لیے کوئی خاص کوشش نہ کی، ہم اس نکتہ سے غافل رہے کہ جس "مشک" کی تعریف "عطار" کر رہا ہے۔ اس میں خود ہی دلاویز خوشبو موجود ہے، بس ضرورت مشام کو اس خوشبو سے آشنا کرنے کی ہے، خود آشنا ہوں اور دوسروں کو آشنا کرائیں، عطار الہٰی کی تعریف کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس خوشبو سے آشنا ہوں نہ یہ کہ اس سے آشنائی کی کوشش کرنے کے بجائے عطار کے قول پر اکتفا کرتے ہوئے اپنی ساری کوشش تعریف عطار پر بحث و گفتگو میں صرف کر دیں۔

سچ بتائیں! اگر نہج البلاغہ کا تعلق کسی اور شخصیت سے ہوتا تو کیا اس سے یہی سلوک کیا جاتا؟ ایران مرکز شیعیان علیؑ ہے، ایرانیوں کی زبان فارسی ہے، ذرا آپ نہج البلاغہ کے ترجموں اور شرحوں پر ایک نظر ڈال لیئے اس کے بعد اپنے کارنامے کے بارے میں خود فیصلہ کیجئے۔

مجموعی طور پر شیعوں کے اخبار و احادیث اور اسی طرح شیعوں کی دعائیں، معارف الہٰی اور دوسرے مضامین کے لحاظ سے غیر شیعہ مسلمانوں کے مجموعۂ احادیث و اخبار اور دعاؤں سے قابل موازنہ نہیں، اصول کافی، توحید صدوق یا احتجاج طبرسی میں جو مسائل بیان ہوئے ہیں وہ کسی غیر شیعہ کتاب میں نظر نہ آئیں گے ان موضوعات پر غیر شیعی کتب میں جو کچھ پایا جاتا ہے ان میں ایسے مسائل بھی ہیں جن کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جعلی ہیں، کیونکہ وہ نصوص و اصول قرآنی کے سراسر خلاف ہیں، ان سے تجسیم و تشبیہ کی بو آتی ہے،

ہاشم معروف حسینی کا اپنی کتاب "دراسات فی الکافی للکلینی والصحیح للبخاری" میں ایک عمدہ اور نیا کام یہ ہے کہ الٰہیات سے متعلق صحیح بخاری اور کافی کی روایتوں کا موازنہ کیا ہے۔

شیعی عقل

ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی زبانی الٰہیات کے بارے میں گفتگو اور ان مسائل پر سیر حاصل بحث جس کا بہترین نمونہ نہج البلاغہ ہے، باعث ہوئی کہ ابتدا ہی سے اسلام سے شیعی عقل نے فلسفی عقل کا روپ اختیار کر لیا، اور یہ کوئی نئی چیز یا اسلام میں بدعت نہیں ہے، بلکہ یہ وہی راستہ ہے جس کی تعلیم مسلمانوں کو خود قرآن مجید نے دی ہے اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام نے قرآنی تعلیمات کی اتباع میں تفسیر قرآن کے عنوان سے ان حقائق کو بیان کیا ہے، اگر مذمت کی جا سکتی ہے تو ان لوگوں کی جنہوں نے اس راستہ کو نہیں اپنایا اور ایک اچھے وسیلہ کو ہاتھ سے کھو دیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ صدر اسلام ہی سے شیعہ، دوسروں سے زیادہ ان مسائل سے دلچسپی رکھتے تھے، اہل سنت میں گروہ معتزلہ جو شیعوں سے زیادہ قریب تھا اس طرف رجحان تو رکھتا تھا لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے جماعت کے اجتماعی مزاج نے اسے پسند نہ کیا اور تقریباً تیسری صدی کے بعد یہ گروہ مٹ گیا۔

احمد امین "مصری" "ظہر الاسلام" کی جلد اول میں اس کی تصدیق کرتے ہیں، وہ مصر میں شیعہ فاطمیوں کی سرپرستی میں فلسفی تحریک کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ولذالك كانت الفلسفة بالتشيع الصق منها بالتسنن نرى ذالك في العهد الفاطمي والعهد البويهي، وحتى في العصور الاخيرة كانت فارس اكثر الاقطار عناية بدراسة الفلسفة الاسلامية ونشر كتبها، ولما جاء جمال الدين الافغاني مصر في عصرنا الحديث وكان فيه نزعة تشيع وقد تعلم الفلسفة الاسلامية بهذا الاقطار الفارسية كان هو الذي نشر هذه الحركة في مصر."

"فلسفہ سنیوں سے زیادہ شیعوں سے قربت رکھتا ہے، اور یہ چیز ہمیں مصر میں فاطمیوں اور ایران میں آل بویہ کے دور میں نظر آتی ہے حتی کہ عصر اخیر میں بھی دوسرے اسلامی ملکوں سے زیادہ ایران میں جو ایک شیعہ ملک ہے فلسفہ پر توجہ دی جاتی ہے، سید جمال الدین افغانی نے جو شیعی رجحان کے مالک ہیں اور انھوں نے ایران میں فلسفہ کی تعلیم حاصل کی تھی، مصر میں قدم رکھتے ہی وہاں فلسفی تحریک شروع کردی۔"

لیکن احمد امین یہ جاننے کے لیے کہ کیا وجہ ہے کہ شیعہ غیر شیعوں سے زیادہ فلسفی رجحان رکھتے تھے عمداً یا سہواً غلطی کر بیٹھتے ہیں وہ کہتے ہیں:

"عقلی و فلسفی بحثوں سے شیعوں کی زیادہ دلچسپی کا سبب ان کی باطنیت اور تاویل کی جانب رجحان ہے، وہ اپنی باطنیت کی توجیہ کے لیئے فلسفہ کا سہارا لینے پر مجبور تھے۔ اسی لیے فاطمی مصر، نیز بوبہی، صفوی اور قاجاری ایران تمام اسلامی ملکوں سے زیادہ فلسفی رجحانات کا حامل رہا ہے۔"

احمد امین کی یہ بات مہملات کے سوا کچھ بھی نہیں، شیعوں میں یہ رجحان ائمہ شیعہ نے ایجاد کیا ہے، یہ ائمہ شیعہ تھے جنھوں نے اپنے احتجاجات میں اپنے خطبوں میں اپنے روایات و احادیث میں اور اپنی دعاؤں میں حکمت الٰہی کے باریک ترین و معانی خیز ترین مسائل بیان کیے ہیں، نہج البلاغہ اس کا ایک نمونہ ہے، حتی کہ احادیث نبوی کے سلسلہ میں بھی شیعہ کتب و روایات میں پیغمبر اسلامؐ سے ایسی اعلیٰ احادیث نقل ہوئی ہیں جو غیر شیعہ روایات میں نظر نہیں آتیں، شیعی عقل صرف فلسفہ ہی سے مخصوص نہیں ہے، کلام و فقہ و اصول فقہ میں بھی شیعوں کو خاص امتیاز حاصل ہے اور سب کا سبب ایک ہی چیز ہے۔

بعض لوگوں نے اس فرق کو "شیعہ قومیت" سے نسبت دی ہے، ان کا کہنا ہے کہ "چونکہ شیعہ ایرانی تھے اور ایرانی شیعہ تھے، اور ایرانی حضرات متفکر و باریک بیں تھے لہٰذا انھوں نے اپنی مضبوط فکر و عقل کے ذریعہ شیعی معارف کو ارتقا بخشا اور اسے اسلامی رنگ دیدیا۔

برٹرنڈ رسل نے "تاریخ فلسفہ عرب" کی دوسری جلد میں اسی بنیاد پر اظہار نظر کیا ہے، رسل اپنی خصلت یا عادت کے مطابق بے ادبی کے ساتھ اس مطلب کو بیان کرتے ہیں

البتہ وہ اپنے دعوے میں معذور ہیں کیونکہ وہ اسلامی فلسفہ سے بالکل نابلد ہیں، وہ اسلامی فلسفہ کی الف ب سے بھی واقف نہیں، اس کے مبداء و منشاء کے بارے میں اظہار نظر تو دور کی بات ہے۔

ہم اس طرز خیال کے حامیوں سے یہ کہتے ہیں کہ اولاً، سارے شیعہ ایرانی تھے نہ سارے ایرانی شیعہ، کیا محمد بن یعقوب کلینی و محمد بن علی بن حسین بن بابویہ قمی اور محمد بن ابی طالب مازندرانی ایرانی تھے لیکن محمد بن اسماعیل بخاری، ابوداؤد سجستانی اور مسلم بن حجاج نیشاپوری ایرانی نہ تھے؟ کیا سید رضی جنھوں نے نہج البلاغہ کو اکٹھا کیا ہے ایرانی تھے؟ کیا فاطمیین مصر ایرانی تھے؟ کیا وجہ ہے کہ فاطمیوں کے عہد میں مصر میں فلسفیانہ طرز فکر میں جان آجاتی ہے اور ان کے زوال کے بعد ایک مدت تک وہ فکر مفقود نظر آتی ہے اور پھر ایک ایرانی شیعہ سید کے ذریعہ حیات نو پاتی ہے؟!

حقیقت یہ ہے کہ اس طرز فکر اور اس کے رجحانات کے اصل محرک و باعث ائمہ اہل بیتؑ تھے، تمام اہل سنت محققین اعتراف کرتے ہیں کہ علی علیہ السلام حکیم اصحاب تھے اور دوسروں کی عقل کے مقابلہ میں آپ کی عقل کچھ اور ہی قسم کی تھی، ابو علی سینا کہتے ہیں:

> کان علیؑ بین اصحاب محمد صلی اللہ علیہ و آلہ کالمعقول بین المحسوس
>
> "علی اصحاب رسول خداؐ کے درمیان ویسے ہی تھے جیسے "کلی" "جزئیات محسوسہ" کے درمیان یا جیسے "عقول قاہرہ" "اجسام مادّیہ" کی بہ نسبت۔"

ظاہر ہے کہ ایسے امام کے ماننے والوں کے افکار دوسروں سے ممتاز ہوں گے۔

احمد امین اور کچھ دیگر حضرات ایک دوسرے وہم کے بھی شکار ہوتے ہیں، ان لوگوں نے اس قسم کے کلمات کو حضرت علیؑ کا کلام قرار دینے میں شک و شبہ کا اظہار کیا ہے اور کہتے ہیں کہ عرب، فلسفہ یونان سے آشنائی کے پہلے اس قسم کی بحثوں اور موشگافیوں سے نابلد تھے، فلسفۂ یونان کے ماہروں نے بعد میں اس قسم کی باتیں گڑھ کر امام علی بن ابی طالبؑ سے منسوب کردی ہیں!

ہم بھی کہتے ہیں کہ عرب اس قسم کی باتوں سے آشنا نہ تھے، نہ صرف یہ کہ عرب آشنا نہ تھے بلکہ غیر عرب بھی ان سے واقف نہ تھے۔ یونان اور فلسفۂ یونان کو بھی اس کی خبر نہ تھی، جناب احمد امین

پہلے تو حضرت علیؑ کو فکر و نظر کے اعتبار سے ابو سفیان اور ابو جہل جیسے عربوں کی سطح تک نیچے لاتے ہیں اس کے بعد صغریٰ کبریٰ ترتیب دیتے ہیں۔ ذرا بتائیے، عرب قرآن کے پیش کردہ معانی و مفاہیم سے کب آشنا تھا؟! کیا پیغمبر اکرمؐ نے خاص طریقہ سے حضرت علیؑ کو تربیت نہیں دی تھی؟ کیا پیغمبرؐ نے حضرت علیؑ کو اعلم اصحاب کا لقب نہیں دیا ہے؟ اس بات کی کیا ضرورت ہے کہ بعض صحابہ کی شان بڑھانے کی خاطر جو عام سطح سے تعلق رکھتے تھے، ایک ایسے شخص کی شان گھٹانے کی کوشش کریں جو برکت اسلام سے اعلیٰ ترین مقام عرفانی و افاضہ باطنی پر فائز تھا، اس کے مقام و منزلت کا اعتراف کر لینے میں کیا حرج ہے؟!

جناب احمد امین کہتے ہیں کہ فلسفہ یونان سے پہلے عرب ان معانی و مفاہیم سے واقف نہ تھا جو نہج البلاغہ میں پائے جاتے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ نہج البلاغہ میں پائے جانے والے معانی و مفاہیم سے فلسفہ یونان کے بعد بھی لوگ آشنا نہ ہو سکے، نہ صرف یہ کہ عرب ان سے نابلد رہے بلکہ غیر عرب مسلمان بھی نہ سمجھ سکے، کیونکہ فلسفہ یونان کو بھی اس کا علم نہ تھا، یہ محض اسلامی فلسفہ کا خاصہ ہے، یعنی اسلام کا خاصہ ہے نہ کہ یونانی فلسفہ کا، اسلامی فلسفیوں نے اسلامی مبادی سے کسب فیض کرتے ہوئے رفتہ رفتہ ان مفاہیم کو اپنے فلسفہ میں داخل کیا ہے۔

ماوراء طبیعی مسائل میں فلسفی تعقلات کی اہمیت۔

بیان ہو چکا کہ نہج البلاغہ میں الٰہی مسائل دو طریقوں سے بیان ہوئے ہیں: ایک قسم میں اس دنیائے محسوس اور اس میں پائے جانے والے نظم کو ایک ایسے آئینہ کے طور پر مورد بحث قرار دیا گیا ہے جو اپنے خالق کے علم و کمال کی غمازی اور اسے منعکس کرتا ہے، اور دوسری قسم میں خالص تعقلی افکار اور فلسفی اصول کے ذریعہ بحث کی گئی ہے، نہج البلاغہ کی اکثر بحثیں خالص فلسفی استدلال اور افکار تعقلی محض سے تشکیل پائی ہیں، ذات حق کے صفات جلالیہ و کمالیہ کے سلسلہ میں صرف دوسرے طریقہ کا سہارا لیا گیا ہے۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں اس قسم کی بحثوں کی قدر و قیمت اور اس طرز فکر کے استعمال میں

شکوک و شبہات بھی پائے جاتے ہیں، ہر زمانہ میں ایسے افراد رہے ہیں اور ہیں جو اس قسم کی بحثوں کو عقلاً یا شرعاً یا دونوں جہتوں سے جائز نہیں سمجھتے، ہمارے زمانے میں بھی کچھ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ اس قسم کے تجزیے اور استدلالات روح اسلام کے منافی ہیں، مسلمانوں نے یونانی فلسفہ سے متاثر ہو کر اس وادی میں قدم رکھا ہے۔ اس میں قرآنی ہدایات کو کوئی دخل نہیں، اگر وہ قاعدے سے قرآنی تعلیمات کو پیش نظر رکھتے تو اس قسم کی پیچیدہ بحثوں میں نہ الجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہج البلاغہ کی اس قسم کی بحثوں کو حضرت علی علیہ السلام کی جانب نسبت دینے میں شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں۔

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں کچھ لوگوں نے شرعی نقطۂ نظر سے اس قسم کی بحثوں کی مخالفت کی، ان لوگوں کا دعویٰ تھا کہ جو کچھ ظواہر الفاظ سے عام افراد کی سمجھ میں آتا ہے اسی کے پابند رہیں، ہر قسم کا سوال و جواب اور چون و چرا بدعت ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص آیہ قرآن "الرحمن علی العرش استوی" کے بارے میں سوال کرتا تو خفا ہو جاتے اور اس قسم کے سوال کو ناجائز سمجھتے تھے، وہ کہتے تھے: "الکیفیۃ مجهولۃ والسوال بدعۃ" "حقیقت ہم سے پوشیدہ ہے اور سوال بدعت ہے"![1]

یہ گروہ جسے بعد میں اشاعرہ کے نام سے یاد کیا جانے لگا تیسری صدی میں معتزلہ پر جو اس قسم کے تعلقات کو جائز سمجھتے تھے، فتحیاب ہو گیا، اور اس کامیابی نے اسلام کی حیات عقلی کو سخت چوٹ پہنچائی۔ خود ہمارے اخباری، دسویں صدی سے چودھویں صدی تک خاص کر دسویں اور گیارہویں صدی میں اشعری طرز فکر کے پیرو تھے۔

یہ تو شرعی نقطہ نظر سے تھا، اب رہی بات عقلی نقطہ نظر سے: تو اس وقت جبکہ یورپ میں، طبیعیات میں قیاسی منہاج پر حسی و تجربی منہاج کے غلبہ کے بعد اس فکر نے جنم لیا کہ تعلقی منہاج نہ صرف یہ کہ طبیعیات میں قابل اعتماد نہیں بلکہ کسی جگہ بھی قابل اعتبار نہیں ہو سکتی، قابل اعتماد فلسفہ صرف حسی فلسفہ ہے، اس طرز فکر کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ الٰہی مسائل کو مشکوک و ناقابل اعتماد قرار دیدیا جائے، کیونکہ وہ تجربی و حسی مشاہدات کی حدود سے باہر ہیں۔

ایک طرف سے دنیائے اسلام میں اشعریت کے ساتھ اور دوسری طرف سے طبیعیات میں حسّی و تجربی منہاج کی پے درپے حیرت انگیز کامیابیوں نے کچھ غیر شیعہ مسلمان قلمکاروں کو بری طرح سے برانگیختہ کر دیا اور ایک ملے جلے تلفیقی نظریہ کے وجود میں آنے کا باعث بنا جس نے شرعی و عقلی دونوں جہتوں سے الٰہیات میں تعقلی منہاج کے استعمال پر پابندی عائد کر دی۔ شرعی نقطۂ نظر سے انھوں نے دعویٰ کیا کہ قرآن کی رو سے خداشناسی کا واحد ذریعہ حسّی و تجربی منہاج یعنی تخلیق و آفرینش کا مطالعہ ہے، اس کے سوا ہر راستہ غلط و عبث ہے، قرآن مجید نے دسیوں آیتوں میں لوگوں کو نہایت واضح اور کھلے ہوئے الفاظ میں مظاہر طبیعت کے مطالعہ کی دعوت دی ہے اور مبداء و معاد کے رموز کو طبیعت میں نہاں بتایا ہے۔ عقلی نقطۂ نظر سے ان لوگوں نے یورپ کے حسّی فلاسفہ کے اقوال کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں منعکس کیا ہے۔

فرید وجدی، کتاب "علی اطلال المذہب المادی" میں، سید ابوالحسن ندوی ہندی کتاب "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" میں، نیز سید قطب جیسے "اخوان المسلمین" کے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں اس نظریہ کی ترویج کرتے ہوئے مخالف نظریہ پر سخت تنقید کی ہے۔

ندوی صاحب فصل "عبور مسلمان از جاہلیت بہ اسلام" میں "محکمات و بیّنات در الٰہیات" کے عنوان سے لکھتے ہیں:

"پیغمبروں نے لوگوں کو ذات و صفات خدا، دنیا کے آغاز و انجام اور انسانوں کے مآل کار سے آگاہ کیا، بلا اجرت انسانوں کو اس سلسلہ میں معلومات فراہم کیں، اور انھیں ان مسائل میں بحث و گفتگو سے جس کے مبادی و مقدمات ان کے بس میں نہیں ہیں (کیونکہ یہ علوم ماوراء حس و طبیعت سے تعلق رکھتے ہیں اور انسان کے علم و فکر کا دائرہ محسوسات میں محدود ہے) بے نیاز کر دیا لیکن لوگوں نے اس نعمت کی قدر نہ جانی اور ان مسائل میں چھان پھٹک شروع کر دی جو تاریک و مجہول میدانوں میں قدم رکھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔"[۲]

یہی مصنف زوال مسلمین کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اپنی اسی کتاب کی ایک دوسری فصل میں "مفید علوم کی ناقدری" کے ذیل میں علماء اسلام پر ان الفاظ میں تنقید

کرتے ہیں :

"اسلامی دانشوروں اور مفکروں نے جس قدر مابعد الطبیعہ مسائل کو، جسے انھوں نے یونان سے حاصل کیا تھا، اہمیت دی اور بحث و تمحیص کا موضوع قرار دیا، اس قدر تجربی و عملی علوم کو اہمیت نہ دی، مابعد الطبیعہ اور یونانی الٰہی فلسفہ، بت پرستی کے عقائد کے سوا کچھ بھی نہیں، بس اس پر فنی ملمع چڑھا دیا گیا ہے، یہ مفروضات، حدس اور لفاظیوں کا مجموعہ ہے جس کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ مفہوم، خداوند عالم نے اپنی آسمانی تعلیمات کے ذریعہ مسلمانوں کو ان مسائل میں تحقیق و تفتیش سے جو کیمیاوی تجربے سے مماثلت رکھتی ہے، بے نیاز کردیا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے اس نعمت عظمیٰ پر ناشکری کی اور اپنی قوت ذہنی کو ان مسائل میں صرف کیا۔"

شک نہیں کہ فرید وجدی اور ندوی وغیرہ کے یہ خیالات، اشعریت ہی کی ایک قسم کی باز گشت ہے، بس اسے ماڈرن شکل و صورت یعنی "فلسفہ حسی" کے بھیس میں پیش کیا گیا ہے۔

ہم فی الحال تعقلات فلسفی کی اہمیت و قدر و قیمت کے بارے میں فلسفی نقطہ نظر سے گفتگو نہیں کرنا چاہتے، کتاب "اصول فلسفہ و روش رئالیسم" کے مقالہ "پیدائش کثرت در ادراک" و مقالہ "ارزش معلومات" میں اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو ہو چکی ہے، یہاں صرف قرآنی نقطہ نظر سے بحث کرنی ہے کہ کیا قرآن مجید الٰہیات میں تحقیق کے لیے صرف مطالعہ طبیعت کو صحیح اور دیگر تمام طریقوں کو غلط سمجھتا ہے یا دوسرے ذرائع کو بھی تسلیم کرتا ہے؟

شروع بحث سے پہلے اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے کہ اشعری و غیر اشعری کا اختلاف یہ نہیں ہے کہ آیا الٰہی مسائل میں مصادر کتاب و سنت سے استفادہ جائز ہے یا نہیں؟ بلکہ اختلاف شیوہ و طریقہ استفادہ میں ہے، اشعریوں کے نظریہ کے مطابق قرآن و سنت سے استفادہ صرف تعبداً ہونا چاہئے، یعنی ہم خداوند عالم کو وحدت و علم و قدرت اور دیگر اسماء حسنیٰ سے متصف صرف اس لیے مانتے ہیں کہ شریعت نے ہمیں اس کی تعلیم دی ہے، ورنہ ہمیں نہ علم ہے اور نہ ہی جان سکتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان اوصاف کا مالک ہے یا نہیں؟ کیونکہ

اس کے اصول و مبادی ہمارے بس سے باہر ہیں، لہٰذا ہمیں یہ مان تو لینا چاہئے کہ خدا ایسا ہے لیکن ہم خود سے نہیں سمجھ سکتے کہ خدا ایسا کیوں ہے۔ دینی نصوص کا اس سلسلہ میں صرف اتنا کردار ہے کہ ہمیں یہ بتا دے کہ ہمیں کس طرح سوچنا چاہئے تاکہ ویسے ہی فکر کریں، ہمیں کس طرح کے عقائد کا حامل ہونا چاہئے تاکہ ویسا ہی عقیدہ رکھیں۔

لیکن ان کے مخالفوں کا کہنا ہے تمام عقلی و استدلالی مسائل کی طرح یہ چیزیں بھی قابل فہم ہیں، کچھ ایسے اصول و مبادی موجود ہیں کہ اگر انسان ان اصول و مبادی کا عرفان حاصل کرلے تو ان چیزوں کو سمجھ سکتا ہے۔ شرعی و دینی نصوص اس کی عقل و فکر کو بیدار کرتی ہیں، اس کے افکار کو حرکت میں لاتی ہیں، اس کے لیے ضروری و قابل ادراک اصول و مبادی فراہم کرتی ہیں۔ بنیادی طور پر فکری مسائل میں تعبد کوئی معنی و مفہوم ہی نہیں رکھتا، کسی کے حکم یا فرمائش کے مطابق غور و فکر یا فیصلہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے انسان کسی قابل دید شے کو کسی کی فرمائش کے مطابق دیکھے، فرمائش کنندہ سے پوچھے کہ اس شے کو کیسا دیکھوں؟ چھوٹا یا بڑا؟ سفید، کالا یا نیلا؟ خوبصورت یا بدصورت؟ تعبداً غور و فکر کا مطلب اصلاً عقل و فکر سے کام نہ لینا اور بلا سوچے سمجھے کسی چیز کو تسلیم کر لینے کے سوا کچھ بھی نہیں۔

مختصر یہ کہ بحث یہ نہیں ہے کہ آیا اولیاء وحی کی تعلیمات سے آگے قدم بڑھایا جا سکتا ہے یا نہیں! معاذ اللہ ان کی تعلیمات سے آگے بڑھنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جو کچھ وحی و خاندان وحی نے بتا دیا وہی ارتقاءِ معارف الٰہی کی آخری حد ہے، ہماری بحث تو انسانی عقل و فکر کی استعداد و صلاحیت میں ہے کہ آیا وہ ان مسائل کے اصول و مبادی فراہم کر کے علمی و عقلی سفر کر سکتی ہے یا نہیں تھے؟

اب رہی یہ بات کہ قرآن مجید نے مطالعہ کائنات کی دعوت دی ہے اور آفاق و انفس و دنیائے بے رنگ و بو کو معرفت خدا اور ماورائے طبیعت کے ادراک کا ذریعہ بتایا ہے، شک نہیں کہ انسان کو مطالعہ کائنات اور تخلیقی مناظر میں غور و فکر کی جانب متوجہ کرنا قرآنی تعلیمات کا ایک بنیادی اصول ہے، قرآن مجید کا غیر معمولی اصرار ہے کہ لوگ زمین و آسمان، جمادات و نباتات، حیوان و انسان کا بنظر غائر جائزہ لیں اور علمی انداز سے اس میں جستجو کریں اور اس میں بھی شک

نہیں کہ مسلمانوں نے کما حقہ اس وادی میں قدم نہیں بڑھایا، شاید اس سستی کی بنیادی وجہ وہی فلسفہ یونان ہو جو قیاسی و عقلی محض تھا یہاں تک کہ طبیعیات میں بھی اسی منہاج کو استعمال کرتا تھا، البتہ تاریخ علم گواہ ہے کہ اسلامی دانشوروں نے یونانیوں کی طرح سے مکمل طور پر تجربی منہاج سے اجتناب نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کا شمار تجربی منہاج کے ابتدائی موجدوں میں ہوتا ہے، برخلاف مشہور، یورپ اس منہاج کا بانی و موجد نہیں بلکہ مسلمانوں کا مقلد و پیرو ہے۔

آثار و آیات میں غور و فکر کی اہمیت

ان تمام باتوں کے باوجود یہ نکتہ قابل غور ہے کہ کیا زمینی و آسمانی مخلوقات کے مطالعہ کے سلسلہ میں قرآن مجید کے اہتمام عظیم کا یہ مطلب ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے اس کے علاوہ سارے منہاج اور راستے باطل ہیں؟ یا جس طرح سے قرآن نے مطالعہ آیات الٰہی کی دعوت دی ہے اسی طرح سے ایک دوسرے قسم کے غور و فکر کی بھی دعوت دی ہے؟ بنیادی بات یہ ہے کہ آفاق و انفس کا مطالعہ ان معارف کو سمجھنے میں کس حد تک ممد و معاون ہو سکتا ہے جو مطلوب قرآن ہے اور جسے اس عظیم آسمانی کتاب میں اشارۃً یا صراحتاً بیان کیا گیا ہے اور اس لحاظ سے اس مطالعہ کی کتنی اہمیت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ آثار تخلیق کا مطالعہ اتنا ممد و معاون ثابت نہیں ہو سکتا اور ان مسائل کی نسبت اس کا فائدہ ناچیز ہے جنھیں قرآن مجید نے صراحتاً و آشکاف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ الہیات سے متعلق قرآن نے ایسے ایسے مسائل بیان کئے ہیں جنھیں طبیعت و خلقت میں مطالعہ کے ذریعہ سمجھنا ناممکن ہے۔

مطالعہ آثار تخلیق کا صرف اتنا ہی فائدہ ہے کہ اس سے یہ حقیقت واضح طور پر آشکار ہو جاتی ہے کہ اس کائنات کو ایک مدبر و حکیم و علیم طاقت چلا رہی ہے، حسی و تجربی نقطۂ نظر سے کائنات کا آئینہ ہونا صرف اسی حد تک ہے کہ اس طبیعت کے ماوراء بھی کچھ ہے اور ایک دانا و توانا ہاتھ اس کائنات کو چلا رہا ہے۔

لیکن قرآن مجید انسان کے لئے صرف یہی جان لینا کافی نہیں سمجھتا کہ اس دنیا کو

ایک دانا، توانا اور حکیم ہاتھ چلا رہا ہے، یہ بات شاید دیگر آسمانی کتابوں پر صادق آئے لیکن قرآن مجید جو کہ آخری آسمانی کتاب ہے جس نے خدا و ماوراطبیعت کے بارے میں بہت سارے مسائل بیان کئے ہیں اس کے بارے میں یہ بات قطعاً درست نہیں ۔

تعقلی محض مسائل

پہلا بنیادی مسئلہ جسے مطالعہ آثار تخلیق تن تنہا حل کرنے سے عاجز ہے خود اس ماوراً طبیعی طاقت کا "واجب الوجود" ہونا اور "مخلوق" نہ ہونا ہے۔ آئینہ کائنات زیادہ سے زیادہ یہ دکھا سکتا ہے کہ ایک دانا و توانا ہاتھ ہے جو اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ لیکن خود وہ "ہاتھ" کون ہے، کیا ہے؟ وہ خود بھی کسی کا مسخر ہے یا قائم بالذات ہے، اگر کسی دوسرے ہاتھ کا مسخر ہے تو وہ دوسرا کون اور کیا ہے؟ قرآن کا مقصد صرف یہ جان لینا نہیں ہے کہ ایک دانا و توانا ہاتھ اس کائنات کو چلا رہا ہے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہم یہ بھی جان لیں کہ کار ساز اصلی "اللہ" ہے اور "اللہ" "لیس کمثلہ شیٔ" کا مصداق ہے، ذات مستجمع کمالات ہے، دوسرے لفظوں میں "کمال مطلق" ہے اور خود قرآن کے الفاظ میں "لہ المثل الاعلیٰ" ہے۔ مطالعہ طبیعت کس طرح ہمیں ان مفاہیم سے آشنا کر سکتا ہے؟

ایک دوسرا مسئلہ وحدانیت خداوند عالم ہے، قرآن مجید نے اسے استدلالی انداز میں پیش کیا ہے اور (منطق کی زبان میں) "قیاس استثنائی" کی صورت میں بیان کیا ہے۔ قرآن نے جو برہان قائم کیا ہے وہ وہی ہے جسے اسلامی فلسفہ "برہان تمانع" کے نام سے یاد کرتا ہے کبھی "تمانع علل فاعلی" کی صورت میں بحث شروع کرتا ہے: لو کان فیہما الٰھۃ الا اللہ لفسدتا[1] اور کبھی "تمانع علل غائی" کی شکل میں: "ما اتخذ اللہ من ولد وما کان معہ من الٰہ اذا لذھب کل الٰہ بما خلق ولعلا بعضھم علی بعض[2]"

قرآن مجید نے جس طرح سے وجود خالق ماوراء کی معرفت کے لیے نظام خلقت میں مطالعہ کو ذریعہ بتایا ہے اور اس کی تاکید کی ہے۔ اسے معرفت وحدانیت خدا کا وسیلہ بنانے کی ہرگز دعوت نہیں دی ہے، اور یہ دعوت صحیح بھی نہیں ہے ۔

قرآن میں اس طرح کے مسائل بیان ہوئے ہیں:

لیس کمثلہ شئ۔ وللہ المثل الاعلی۔ لہ الاسماء الحسنی والامثال العلیا۔ الملک القدوس السلام المؤمن المھیمن العزیز الجبار المتکبر۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔ وھو اللہ فی السمٰوات وفی الارض۔ ھو الاول والآخر والظاھر والباطن۔ الحی القیوم۔ اللہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد۔ ولم یکن لہ کفواً احد۔

قرآن نے ان مسائل کو کیوں بیان کیا ہے؟ آیا اس کا مقصد یہ تھا کہ انسانوں کے سامنے ایسے ناقابل فہم وادراک مسائل پیش کئے جائیں جس کے اصول ومبادی بقول "ندوی" انسان کے بس سے باہر ہیں، اور انسانوں کو یہ حکم دیا جائے کہ وہ ان مسائل کو سمجھے بوجھے بغیر تعبداً مان لیں یا یہ کہ قرآن مجید یہ چاہتا ہے کہ لوگ واقعاً خداوند عالم کو ان صفات سے متصف و آراستہ سمجھائیں؟ اگر وہ چاہتا ہے کہ خداوند عالم کو ان صفات کے ساتھ پہچانا جائے تو اس کا راستہ کیا ہے؟ کیونکر ممکن ہے کہ مطالعہ طبیعت ہمیں ان معارف سے آشنا کردے۔ مطالعہ مخلوقات ہمیں بتاتا ہے کہ خدا علیم ہے، یعنی جو کچھ اس نے بنایا ہے، علم وعقل کی روسے بنایا ہے، لیکن قرآن ہم سے صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ جو کچھ خداوند عالم نے بنایا ہے از روئے علم وعقل بنایا ہے، بلکہ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ:

انہ بکل شئ علیم۔ لا یعزب عن علمہ مثقال ذرۃ۔ قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی

علم خدا لامتناہی ہے، اس کی قدرت لامتناہی ہے، کیسے اور کیونکر مخلوقات کے عینی وحسی مشاہدہ سے پروردگار کے علم وقدرت کی لامتناہیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید میں اور بھی بہت سے مسائل بیان ہوئے ہیں جیسے:

کتب علوی، لوح محفوظ، لوح محو واثبات، جبر واختیار، وحی واشراق وغیرہ جو مخلوقات کے حسی مطالعہ کے ذریعہ قابل تحقیق نہیں ہیں۔

قرآن مجید نے یقیناً ان مسائل کو بطور درس بیان کیا ہے اور افلا یتدبرون القرآن

ام علی قلوب اقفالھا کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ جیسی آیتوں کے ذریعہ ان اسباق میں غور و فکر کی تاکیدی طور پر دعوت دی ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ان حقائق کے ادراک کے لیے کوئی منہاج و طریقہ بھی معین کیا گیا ہو کیونکہ یہ چیزیں ناقابل فہم مجہولات کے عنوان سے بیان نہیں ہوئی ہیں۔

قرآن نے ماوراء الطبیعی مسائل کے ذیل میں جن چیزوں کو بیان کیا ہے ان کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے کہ انھیں مادی مخلوقات کے مطالعہ سے حل کیا جا سکے، ان ہی چیزوں نے مسلمانوں کو مجبور کیا کہ وہ ان مسائل کو سمجھنے کے لئے کبھی سیر و سلوکِ روحی کا سہارا لیں اور کبھی سلوکِ عقلی و فکری کو ذریعہ بنائیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن نے الٰہی مسائل کے ادراک کے لیے صرف مطالعہ مخلوقات کو کافی سمجھا ہے، وہ قرآن مجید میں بیان ہونے والے ان مختلف و متنوع مسائل کے بارے میں کیا کہیں گے جو اس مقدس آسمانی کتاب کا خاصہ ہیں؟

گذشتہ مذکورہ مسائل کو بیان کرنے کے سلسلہ میں حضرت علیؑ کا محرک و الہام بخش، صرف اور صرف تفسیر قرآن مجید ہے، اگر حضرت علیؑ نہ ہوتے تو شاید قرآن مجید کے عقلی معارف ہمیشہ کے لیے تشنہ تفسیر رہ جاتے۔

اب جبکہ ان بحثوں کی قدر و قیمت پر کسی حد تک روشنی پڑ چکی، لہٰذا اس سلسلہ میں نہج البلاغہ کے کچھ نمونے انشاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کئے جائیں گے۔

حاشیہ:

۱۔ فیض الاسلام ص ۴۳۶ ۲۔ اصول فلسفہ و روش رئالیسم۔ مقدمہ جلد پنجم ۳۔ ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، طبع چہارم ص ۹۷ ۴۔ گذشتہ ماخذ ص ۱۳۵ ۵۔ اصول فلسفہ و روش رئالیسم، مقدمہ جلد پنجم کا مطالعہ کیجیے۔ ۶۔ الانبیاء/۲۲ ۷۔ اصول فلسفہ جلد ۵ ۸۔ المومنون/۹۱

●●

جناب محمد خامنہ ای

اپیل۔

اسلامی نظام عدل میں

حقوق اور قانون سے تعلق رکھنے والے دنیا کے تمام مکاتب فکر اور اکثر ممالک کے عدالتی قوانین میں، عدالت کے فیصلہ پر نظر ثانی کی کم و بیش گنجائش پائی جاتی ہے، ہارنے والے فریق کو عدالت کے فیصلوں کے خلاف اپیل کرنے کا حق اس لیے حاصل ہے کہ، جج یا قاضی انسان ہے، اور اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے جج نے اپنی کم علمی یا اخلاقی کمزوری یا جسمانی و نفسیاتی عارضے یا بعض دوسرے حالات کی بنا پر عدل و انصاف سے دور غلط فیصلہ سنا دیا ہو، لہٰذا عوام کے حقوق ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کی خاطر ضروری ہے کہ مدعی یا مدعی علیہ یا دونوں کی درخواست پر ماتحت عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کر کے حقیقت واضح کی جائے۔

ایران کے شاہی و آمرانہ دور میں "اپیل" کا دستور تھا، اور ماتحت عدالت کے فیصلے پر نظر ثانی کے لیے۔ استیناف۔ تمیز۔ اعادۂ دادرسی۔ دادخواہی۔ کی مختلف صورتوں میں اپیل کی جاتی تھی، یہ دستور ابھی تک باقی ہے۔

نظام جمہوری اسلامی کے قیام اور عدالتی، سماجی اور انتظامی امور پر اسلامی قوانین کے اثر انداز ہونے کے بعد عدالتی حلقوں میں یہ سوال اٹھا کہ کیا اسلام کے عدالتی نظام میں بھی اپیل اور نظر ثانی کی گنجائش ہے؟ یا جس طرح اسلام میں فیصلہ ایک ہی مرحلہ میں قطعی ہو جاتا ہے اسی طرح عدالت کے فیصلوں میں بھی نظر ثانی ممکن نہیں ہے؟

اسی سوال کے پیش نظر میں نے اس سلسلہ میں تحقیق شروع کی، نتیجے میں یہ ثابت ہوا کہ اسلام کے عدالتی نظام میں نہ صرف یہ کہ نظرثانی کی گنجائش، بلکہ اپیل کرنا واجب ہے۔ اس بارے میں پہلے مسئلے میں مخالف رائے رکھنے والوں کے دلائل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مخالف دلائل

جو لوگ اسلامی عدالتی نظام میں نظرثانی کے قائل نہیں ہیں ان کا کہنا ہے کہ جس طرح قاضی کے احکام، قطعی ہوتے ہیں اور ان کا نفاذ ضروری ہے۔ اسی طرح اس کے فیصلوں کے خلاف اپیل اور نظرثانی بھی ممکن نہیں، کیونکہ جامع الشرائط قاضی، جب مقدمہ کی سماعت اور فیصلہ سناتے وقت قضاوت کے تمام اصولوں کی نگہداشت کر لیتا ہے۔ وہ مقدمے کے تمام رخ دیکھتا اور حقیقت حال سمجھ لیتا ہے پھر عدل و انصاف، نیز تقوے کی اساس پر اپنے اجتہاد یعنی کتاب و سنت کے مطابق فیصلہ سنا دیتا ہے، جس کا نفاذ فوری اور ضروری ہے۔ تو پھر کسی دوسری عدالت کو اس کے احکام اور فیصلوں کو نقص یا منسوخ کرنے کا حق نہیں رہتا۔

دوسری دلیل حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے عمر بن حنظلہ کی ایک حدیث ہے:

"اگر (قاضی) ہمارے احکام کے مطابق فیصلہ کر دے اور لوگ اسے نہ مانیں تو گویا انھوں نے خدا کے احکام کی توہین کی ہے اور ہمیں ٹھکرا دیا۔ جس نے ہمیں ٹھکرایا، اس نے خدا کو ٹھکرا دیا اور عمل شرک باللہ تک پہنچتا ہے۔"

وہ کہتے ہیں کہ فیصلۂ قاضی کے خلاف، مدعی و مدعیٰ علیہ کی اپیل دراصل قاضیِ اول کے فیصلے پر عدم اعتماد کا اظہار اور اسے کالعدم یا منسوخ کرنے کی سعی ہے جو حکم ٹھکرا دینے کے مترادف ہے اور یہ اقدام حدیث کی تنبیہ کے ذیل میں آتا ہے۔ لہٰذا "اپیل" جائز نہیں ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ قاضی کے حکم سے حق ثابت ہو جاتا ہے اور یہ بار بار قابل اعادہ نہیں ان کی بقیہ دلیلیں یہ ہیں:

- حکم قاضی کا ایک اثر یہ ہے کہ اس کے حکم کو ٹھکرانا حرام اور اس کی نگہداشت و تعمیل، اصل وضع اور اصل شرعی ذمے داری اور قانونی فریضہ کے طور پر واجب ہے۔

- حکم قاضی، صحت و حقانیت کی دلیل (امارہ) ہے۔
- عدالت کا مقصد جھگڑوں کو رفع دفع کرنا ہے، جو پہلے قاضی کے حکم سے حاصل ہوجاتا ہے۔
- قاضی کے احکام کی منسوخی معاشرے میں بدنظمی اور افراتفری کا باعث ہوگی۔
- اصل یہ ہے کہ حکم کا اثر باقی ہے۔
- اصل یہ ہے کہ حکم نقض نہیں ہوا ہے۔
- پہلے فیصلے کو صحت پر حمل کرنا واجب ہے۔
- متعارض احکام سے اجتناب ضروری ہے۔
- ایسے مکرر مقدمات کی روک تھام ضروری ہے جن کا لازمی نتیجہ عدلیہ کا تزلزل اور صاحبانِ حق کی حیرانی و سرگردانی ہے۔
- عدالت کے فیصلے، نئی صورت حال اور نئے قانونی سلسلے پیدا کر دیں گے .... وغیرہ۔

جواب

ان دلائل کے جوابات یوں دیئے جاسکتے ہیں:

(۱) ـــــ احکام قاضی کے قطعی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے احکام پر نظر ثانی ناممکن ہے احکامِ قاضی کی قطعیت، نظر ثانی کے منافی نہیں، دلیلیں اور فتوے دونوں ہی نظر ثانی کے کے حق میں موجود ہیں۔

(۲) ـــــ حدیث عمر بن حنظلہ کا مقصد یہ ہے کہ مدعی و مدعیٰ علیہ یہ جانتے ہوئے کہ قاضی اہل و باصلاحیت ہے، فیصلہ بھی صحیح ہے اس کے بعد توہینِ عدالت یا حکم خدا سے فرار کی غرض سے فیصلہ کو ٹھکرا دیں تو غلط ہوگا۔ لیکن اگر یہ منکشف ہو جائے کہ قاضی نااہل یا اس کا فیصلہ غلط ہے یا جن چیزوں کو قاضی نے دلیل بنایا ہے وہ غلط ہیں، اس صورت میں حکم قاضی کی مخالفت، حدیث عمر بن حنظلہ کی مصداق نہ ہوگی۔ درحقیقت ایسے مواقع پر نظر ثانی کا مطلب فیصلۂ قاضی کو قولِ امام "فاذا حکم بحکمنا" سے مطابق کرنا اور یہ دیکھنا ہے کہ قاضی نے حکمِ امام کے مطابق فیصلہ دیا ہے یا نہیں؟

(۳)ــــ قاضی کے فیصلہ پر ثبوتِ حق کا دعویٰ مصادرہ ہے (یعنی جو دعویٰ ہے اسی کو دلیل قرار دینا ہے) نہ کہ استدلال، جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ حقیقت و واقع تک پہنچنے کے لیے قاضی کا حکم طریقیت رکھتا ہے نہ کہ موضوعیت، نظر ثانی کرنے والا قاضی بھی ثبوتِ حق ہی کے لیے اپیل کو منظور یا خارج کرے گا۔

(۴)ــــ قاضی کے اس فیصلے کو ٹھکرانا حرام ہے جو مطابق حکمِ خدا اور مصداق "حکم بحکمنا" ہو نہ کہ ہر فیصلہ۔

(۵)ــــ قاضی کے فیصلے کا "صحیح ہونے کی امارت (دلیل یا شرعی علامت" ہونا ہی تو بحث طلب ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا ممکن ہوگا کہ یہ امارت دوسرے دلائل و امارات کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

(۶)ــــ قضاوت، صرف جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ قضاوت واقعیت یا کم از کم حکم اللہ کے مطابق ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہا علمِ قاضی کو بَیِّنَہ (دلیل) سے برتر سمجھتے ہیں۔

(۷)ــــ قاضی کے خلاف واقع اور غلط فیصلے میں تو نظام غیر واقعی و باطل کا خلل ضرور ہے۔ مگر اس کے نقص اور مشتبہ فیصلوں پر نظر ثانی میں قاضیوں کے لیے "عدالتی امن" پیدا کرنا ہے اور یہ عمل حق و قسط کے نفاذ، نیز نظام کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔

(۸)ــــ "بقاءِ اثرِ حکم"۔ "عدمِ نقضِ حکم"۔ "حمل بر صحت"۔ جیسے اصول، صرف شک کی صورت میں جاری کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ اگر حکمِ خدا کے مطابق نہ ہونے پر دلیل قائم ہو جائے تو ظاہر ہے کہ یہ اصول معتبر نہ ہوں گے۔

ان نکات سے گذشتہ دلائل کی تردید اور بقیہ قیاسات کی رد ہو جاتی ہے۔

موافق دلائل

ایک قاضی کا دوسرے قاضی کے فیصلے پر نظر ثانی کرنا جائز ہے یا ضروری ہے۔ اس دعوے کے حق میں چند دلائل یہ ہیں:

۱۔ جب قاضی کو معلوم ہو جائے کہ اس کا فیصلہ خلافِ حق یا اس کا اجتہاد غلط ہے تو اس

فرض ہے کہ اپنے حکم وفیصلہ کو منسوخ قرار دیدے، لہٰذا اس قول کے مطابق جس طرح قاضی کو خود اپنے فیصلہ کو منسوخ کرنے کا حق ہے اسی طرح وہ بطلان اجتہاد کے انکشاف کی صورت میں دوسروں کے فیصلے کو بھی منسوخ کر سکتا ہے، ان دونوں میں کسی قسم کا فرق نہیں۔

۲۔ غلط اجتہاد کا لازمہ "حکم بہ غیر ما انزل اللہ" اور "ادخال مالیس من الدین فی الدین" ہے اور اس کی مخالفت قاضی پر واجب ولازم ہے، ورنہ وہ فاسق اور قضاوت کی اہلیت سے محروم ہو جائے گا۔ "فمن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون"۔ (جو اللہ کے نازل کردہ دستور کے مطابق فیصلہ نہ کرے گا وہ فاسق لوگوں میں سے ہے) سورۂ المائدہ کی سینتالیسویں آیت اس کی دلیل ہے۔

۳۔ قاضی کا فیصلہ غلط ثابت ہو جانے کی صورت میں چونکہ حکم خدا نہیں ہوتا اس لیے اس کی تعمیل واجب نہیں، بلکہ اس فیصلے کے بجائے حکم خدا کو نافذ کرنا واجب ہوگا اور یہ سابقہ فیصلہ پر نظر ثانی نیز اسے منسوخ کئے بغیر ناممکن ہے۔

۴۔ فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر اپنے خلاف فیصلہ سننے والا سمجھتا ہو کہ اس قاضی نے اس پر ظلم کیا ہے اور فیصلہ غلط ہے تو اس ابتدائی قاضی کے فیصلہ پر نظر ثانی واجب ہے، کیونکہ ہر مدعی کے دعوے کی سماعت واجب ہے، اور وجوب مطلق وعام ہے، اس کے عموم واطلاق سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری عدالت پر بھی مقدمے کی سماعت واجب ہے[۱]۔ اسی کو اپیل اور اس کی سماعت کہتے ہیں۔

۵۔ مجہول افراد کے احوال واحکام، نیز غیر صحیح فیصلوں پر نظر ثانی کا مسئلہ فقہاء مسلم الثبوت جانتے اور بحث طلب نہیں مانتے[۲]۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم قاضی کو نظر ثانی کا اہل تسلیم کرلیں۔ بات کو واضح اور موافقین ومخالفین کے دلائل کی مزید وضاحت کے لیے اصل بحث شروع کرنے سے پہلے بطور مقدمہ چند نکتوں کی وضاحت ضروری ہے:

اوّل۔ یہ کہ نظر ثانی یا اپیل کا باعث حسب ذیل چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ہو سکتی ہے:

الف۔ "قاضی کی نااہلی"۔ یہ اس وقت ہے جب یہ دعوی کیا جائے کہ قاضی میں شرائط قضاوت نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً اجتہاد (قاضی) اور اگر اعلمیت شرط مانی جائے تو اس کی اعلمیت) کا انکار

کیا جائے۔ یا یہ ثابت کیا جائے کہ قاضی بوقت فیصلہ عدل سے دور تھا (یا اس پر وہ کیفیات طاری تھیں جن کی موجودگی میں سماعت و فیصلہ کرنا مکروہ ہے، جیسے غصہ، بھوک، پیاس، غم، خوشی وغیرہ بشرطیکہ یہ چیزیں فیصلے میں مؤثر واقع ہوئی ہوں)

ب۔ عدالت کی نا اہلی ۔ یہ اس صورت میں ہے جب قاضی، مجتہد متجزی ہو، اور اس کی قضاوت کے حدود محدود ہوں، یا اسے صرف کسی خاص جگہ پر سماعت و فیصلہ کا حق ہو (جسے اصطلاح میں صلاحیت ذاتی و محلی سے تعبیر کیا جاتا ہے) اور وہ اپنی حدود سے تجاوز کر جائے۔

ج۔ فیصلۂ قاضی مسترد کرنے کے مقامات ۔ اگر قاضی، مدعی یا مدعیٰ علیہ کسی ایک سے قرابت یا عداوت رکھتا ہو (بشرطیکہ اسے نفاذ حکم سے مانع تصور کیا جائے)

د۔ واضح غلط فیصلہ ۔ قاضی، کتاب و سنّتِ متواترہ و اجماع کے خلاف فیصلہ دے، بالفاظ دیگر شرعی دلیلوں کے برخلاف فیصلہ دے جو قابلِ اجتہاد و اختلافِ فقہا نہ ہوں، چاہے اس کا یہ فیصلہ مخالفتِ قانون ہو یا قانون سمجھنے میں لغزش ہو گئی ہو اور یا جان بوجھ کر غلط تشریح کی ہو۔

ھ۔ تشخیص موضوع میں واقعی مثبت دلائل کو نظر انداز کر دیا ہو اور غیر مثبت دلیلوں کو قانونی سمجھتے ہوئے ان ہی کی بنیاد پر فیصلہ کیا ہو۔

و۔ قاضی نے کتاب و سنّت کی روشنی میں اپنے صحیح اجتہاد کے مطابق عمل کرتے ہوئے دوسرے قاضی کے فتوے یا رائے کے خلاف فیصلہ دیا ہو (اگر یہ اختلاف، اجتہادی نظریات میں اختلافات سے مماثلت رکھتا ہو)

ز۔ اجتہاد میں کمی یا کوتاہی ۔ زیر نظر صورت حال سے پہلے قاضی کا اجتہاد فاسد تھا یا استدلال میں غلط فہمی تھی یا مقدمات (تنقیحات) اور دلیلوں کے غلط ہونے یا صحیح مقدمات سے غلط نتائج اخذ کرنے یا موضوع حکم نہ ہونے کی صورت میں حکم دیا ہو یا دلیل نہ ہونے کی وجہ سے فیصلے ہونے کے بعد نئی دلیل مل گئی یا پھر کوئی اور اسباب تھے جس کی وجہ سے وہ اجتہاد میں کوتاہی کر گیا۔

دوم۔ یہ کہ قضات کو شرعی و قانونی احکام سے واقفیت کے لحاظ سے تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ **مجتہد مطلق** : مطلق سے مراد یہ ہے کہ قاضی / مجتہد تمام پیش آمدہ مسائل میں ادلۂ اربعہ (قرآن، سنت، عقل، اجماع) کی روشنی میں حکم الٰہی معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۲۔ **مجتہد متجزی** : تجزی سے مراد وہ قاضی / مجتہد ہے جو صرف بعض مسائل میں کتاب و سنت کے ذریعہ حکم خداوندی کے استنباط کی صلاحیت رکھتا ہو۔

بعض علماء تجزی اجتہاد کے قائل نہیں ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر آپ کا مقصد ملکۂ اجتہاد میں تجزی ہے تو یہ معقول نہیں اور اگر مراد تمام احکام و مسائل میں ملکہ اجتہاد کا بالفعل موجود نہ ہونا ہے تو اس طرح مجتہد مطلق بھی تعریف اجتہاد سے خارج ہو جائے گا۔

لیکن اگر تجزی سے مراد کچھ خاص ابواب فقہ میں مہارت مراد لی جائے تو یہ اعتراضات پیدا نہ ہوں گے۔

۳۔ **غیر مجتہد** : (= مقلد) جو شخص دوسروں کے فتووں کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

اس تشریح کے بعد گذشتہ بیان پر دوبارہ نظر ڈالیے اور حکم قاضی پر نظر ثانی کے اسباب وعلل کا جائزہ لیجیے :

الف۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ فیصلہ کے وقت شرائط قضاوت میں سے ایک یا چند شرائط مفقود ہونے کی وجہ سے قاضی میں قضاوت کی اہلیت موجود نہ تھی۔ بعض فقہا کے فتوے کے مطابق چاہے اس کا فیصلہ مطابق اصول، اور واقعیت پر مبنی ہی کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ اس کے فیصلہ کو منسوخ اور مقدمہ کو اہل عدالت میں پیش کرنا ضروری ہے، اور یہ اسی عدالت میں ثابت ہوگا جسے ہم "اپیل کورٹ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

محقق اردبیلیؒ سے منقول ہے کہ اہلیت قضات کے بارے میں چھان بین کرنا جائز نہیں ہے "کیونکہ قاضی، امین امام ہے اور اس باب کا کھل جانا احکام کے عدم نفاذ، حکام پر طعن و تشنیع اور ان کے احکام کی مخالفت کا باعث ہوگا۔"

فاضل نراقی محقق اردبیلی (قدس سرھما) کی بات بیان کرنے کے بعد جواب دیتے ہیں کہ قاضی کے امین ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اہلیت قضاوت بھی رکھتا ہو، ثبوت فسق کی صورت میں وہ امینِ امام نہیں بن سکتا اس کے علاوہ قاضیوں کے خلاف شکایات کی شنوائی

باعث ہوگی کہ قضات عیب و خطا سے بچنے کی کوشش کریں۔

ب ۔ جب متجزی قاضی اپنے اجتہادی حدود سے بڑھ کر فیصلہ کرے (اس صورت میں وہ شرط اجتہاد سے عاری ہے) تو (الف کی طرح) اس کا فیصلہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ اس میں ایک بات سے استثنا بھی ممکن ہے وہ یہ ہے کہ اس نے فیصلہ کسی دوسرے مجتہد کے مطابق فیصلہ کیا ہو۔ (بشرطیکہ مقلد کے لیے قضاوت جائز مانی جائے)

ہاں اگر قاضی مجتہد ہو لیکن اس کا دائرہ کار کسی شہر یا محلہ میں محدود ہو اور اس نے اپنے دائرہ کار سے باہر کوئی فیصلہ سنایا ہو تو اس کے فیصلہ کے منسوخ کئے جانے کا امکان واضح نہیں ہے۔

ج ۔ "موارد رد قاضی" کے سلسلہ میں اختلاف ہے، لیکن جب یہ مان لیا جائے کہ جن مقامات پر شاہد کی شہادت قابل سماعت نہیں ہوتی وہاں قاضی کا فیصلہ بھی نافذ نہیں ہوتا، اس صورت میں قاضی کے فیصلہ پر نظر ثانی بھی جائز ہوگی۔

مذکورہ صورتوں میں مقدمہ کی دوبارہ سماعت سے پہلے قاضی یا عدالت کی صلاحیت کا جائزہ لیا جائے گا اور نااہلی ثابت ہو جانے کی صورت میں سابقہ فیصلہ اور اس کے اثرات کو منسوخ کر کے ازسرنو مقدمہ کی سماعت کی جا سکتی ہے۔

د ۔ اگر قاضی کا فیصلہ کتاب و سنت متواتر، اجماع اور ضروریات فقہ کے برخلاف ہو (کچھ لوگوں نے منصوص العلت یا معتبر حدیث کو بھی بیان کیا ہے) مختصر یہ کہ ان یقینی و قطعی دلائل کے برخلاف ہو جن میں اجتہاد کی گنجائش نہیں تو ایسی صورت میں فقہا کے درمیان مشہور تو یہ ہے کہ اس فیصلہ کو نقض کرنا واجب ہے، اور بدیہی ہے کہ نقض حکم اسی وقت ممکن ہے جب مقدمہ پر نظر ثانی کی جائے اور یہ دونوں ہی اپیل کورٹ کی تشکیل پر موقوف ہیں۔

بعض علماء اہل سنت کا کہنا ہے کہ حکم قاضی سے اس وقت نقض ہو سکتا ہے جب وہ خلاف اجماع ہو۔

ھ ۔ اگر فیصلہ میں غلطی کا باعث تطبیق موضوع میں غلطی ہو (صغریٰ میں غلطی ہو) مثلاً غیر محفوظ مال کی چوری کو محفوظ مال کی چوری سمجھ لیا۔ یا اصل مجرم کے بجائے کسی اور شخص کو سزا دے دی ہو تو اس کا شمار ضمن "د" میں ہوگا، اور وہاں قانون کی رہنمائی موجود ہے۔

د۔ قاضی نے اپنے اجتہادی استنباط میں کسی غفلت کے بغیر سنجیدگی سے صحیح اجتہادی فیصلہ کیا مگر اس کا حکم دوسرے فقہا کے حکم و فتاویٰ کے خلاف ہو تو اس صورت میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے کہ آیا اس کا فیصلہ مسترد کیا جا سکتا ہے؟ اور کیا دوسرے قاضی پر واجب ہے کہ اس کے حکم کو کالعدم قرار دے؟ یا بحث و نظر کا حق کسی کو حق ہے بھی یا نہیں؟ متعدد اقوال پائے جاتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ "اس کا حکم کالعدم نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس کا حکم ادلۂ ظنیہ پر استوار ہے اور ظنی دلیلیں اگرچہ احکام واقعی کو کشف نہیں کرتیں اس کے باوجود اپنی پوری کوشش بروئے کار لانے والے قاضی کا حکم قابل نقض نہیں[۵۶]۔

یہ نظریہ اس ضابطے پر استوار ہے کہ احکام ظاہری حکم واقعی کے کشف ہو جانے کی صورت میں بھی نافذ (مجزی) ہیں۔ حالانکہ خود اس مسئلہ میں بجائے خود فقہا کے درمیان اختلاف ہے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خطاء اجتہادی معلوم ہو جانے کی صورت میں بھی حکم ظاہری پر عمل کرنا جائز ہے پھر بھی عبادات جیسے انفرادی اعمال اور قضاوت میں جو لوگوں کی جان و مال، عزت و آبرو سے تعلق رکھتی ہے، دونوں میں فرق کرنا چاہیے۔

صاحب جواہر قدس سرہ کے بقول "اس سے بڑھ کر تو نہیں ہے کہ اس نے اپنی نظر میں ایسے بینہ کی روشنی میں فیصلہ کیا ہے جو یقین پیدا کرنے کے لیے کافی ہو۔ مگر وہی بینہ دوسرے کے لیے اثبات حق نہ کرے[۵۷]۔

بہر حال اس مسئلہ میں نقض حکم کے عدم جواز کے سلسلہ میں فتوے موجود ہونے کے باوجود محقق حلی نے "شرائع الاسلام" میں، شہید نے "مسالک" میں، شیخ نے "مبسوط" و "خلاف" میں، علامہ نے "تحریر" اور "قواعد" و "ارشاد" میں (اور مفتاح الکرامۃ کی روایت کے مطابق) محقق کاشانی نے "مفاتیح" میں، ابن حمزہ نے "وسیلہ" میں، ابن سعید نے "جامع" کی روایت کے مطابق) اور بہت سے دوسرے فقہا نے بطور مطلق نظر ثانی کے وجوب پر فتویٰ دیا ہے۔

شیخ الطائفہ قدس سرہ کتاب "مبسوط" میں فرماتے ہیں:

اگر قاضی کے فیصلہ دینے کے بعد اس کی غلطی آشکار ہو جائے یا پہلے قاضی کے فیصلہ میں اسے خامی نظر آئے تو سابقہ حکم کو کالعدم قرار دے کر نیا حکم سنانا واجب ہے

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اگر خطاء ان مقامات پر ہوئی ہے جہاں اجتہاد کی گنجائش نہیں مثلاً قاضی نے کتاب و سنت، اجماع یا اس دلیل کے برخلاف حکم دیا ہو جس کے ایک سے زیادہ معنی نہ نکلتے ہوں تو اس حکم کو نقض کرنا واجب ہے لیکن کچھ لوگ صرف اس صورت میں نقض کو جائز سمجھتے ہیں جب اجماع کی مخالفت کی گئی ہو ..... اور ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ جب بھی قاضی کو اپنے حکم یا انفاذ میں کوئی خامی نظر آئے، اور اسے جب بھی یہ علم ہو کہ اس کا فیصلہ خلافِ حق تھا، تو اس پر واجب ہے کہ اس فیصلے کو کالعدم قرار دے اور نیا فیصلہ سنائے۔ یہ قانون گذشتہ تمام مسائل پر لاگو ہوتا ہے....

جو لوگ مجتہد قاضی کے حکم کو اس لیے قابل نقض نہیں سمجھتے کہ اس نے یہ حکم اجتہاد کر کے دیا ہے، شیخ الطائفہ ان کے جواب میں لکھتے ہیں ؛

وهذا لا يصح على مذهبنا لان الحكم بالاجتهاد لا يصح وانما يحكم الحاكم بما يدل الدليل عليه

اسی طرح شیخ طوسی موضوعیت اجتہاد کو رد کرتے ہوئے اسے صرف حصول حق کا ذریعہ اور کشف کا ایک طریقہ قرار دیتے ہیں ۔

کتاب قواعد میں علامہ حلی بھی فرماتے ہیں ؛

والاقرب ان كل حكم ظهر له انه خطاء سواء كان هو الحاكم او السابق فانه ينقضه ويستانف الحكم بما علمه حقا ولو زعم المحكوم عليه ان الاول حكم عليه بالجور لزم النظر فيه

"اقرب الی الحق" (مؤلف کی نظر میں قریب ترین حق) یہ ہے کہ جس فیصلے کے بارے میں یہ علم ہو جائے کہ وہ غلط ہے، خواہ خود وہی حاکم ہو یا کسی گذشتہ قاضی کا، اسے کالعدم قرار دیا جائے اور جسے وہ حق جانتا ہو وہ فیصلہ کرے اور اگر محکوم علیہ کو یہ علم ہو کہ پہلے شخص نے جور کیا ہے تو اس فیصلے پر نظر ثانی لازمی ہے۔

"جواہر" کی روایت کے مطابق "ارشاد" میں ہے ؛

وكل حكم ظهر بطلانه فانه ينقضه سواء كان هو الحاكم او غيره

وسواء کان مستند الحکم قطعیا او اجتھادیا"

جس حکم کے بارے میں علم بطلان ہو جائے اسے ختم کرے خواہ وہ خود حاکم ہو یا کوئی دوسرا قاضی ہو خواہ حکم کا مستند و حوالہ قطعی ہو یا اجتہادی۔

صاحب جواہر نے بھی "بل الاقوی نفوذ حکمہ (= قاضی ثانی) وان اقتضی نقض الاول ولو لدلیل اجتہادی یعذر فیہ"

"اقوی یہ ہے کہ دوسرے قاضی کا حکم نافذ ہو اگرچہ اس سے پہلے فیصلے کا خاتمہ ہو اور خواہ وہ کسی ایسی دلیل اجتہادی پر مبنی ہو جس کے بعد وہ معذور رہے۔" لکھ کر اسے جائز قرار دیا ہے (گو دوسرے مقام پر فرماتے ہیں کہ یہ صرف اس صورت میں جائز ہے جب مدعی و مدعیٰ علیہ دونوں راضی ہوں اور اس قول کو متفق علیہ قرار دیا ہے) ایک دوسری عبارت میں کتاب "مسالک" میں شہید اور دوسرے فقہا کے نزدیک نظر ثانی کے وجوب کو مسلّم الثبوت و مفروغ عنہ بتا دیا ہے[11]۔

شہید نے مسالک میں فرمایا ہے کہ: جب کبھی دوسرے قاضی کو پہلے قاضی کے حکم کے غلط ہونے کا علم ہو جائے تو نقض حکم واجب ہے مطلقاً (چاہے دلیل قطعی کے خلاف ہو یا دلیل ظنی کے خلاف ہو)۔

صاحب مفتاح الکرامۃ ان فقہا کا قول جو دلیل ظنی کی مخالفت کی صورت میں نقض حکم کو جائز نہیں سمجھتے اور ان فقہا کے قول کے درمیان پل باندھنے کے لیے کتاب دروس میں شہید کے قول کا سہارا لیتے ہوئے کہتے ہیں:

"جو لوگ پہلے قاضی کے حکم کے نقض کو بطور مطلق واجب قرار دیتے ہیں ان کا مقصد وہ صورت حال ہے جب اس حکم کا فساد و بطلان عیاں ہو گیا ہو اور جو لوگ دلیل قطعی و دلیل ظنی میں فرق کرتے ہیں کہ اگر حکم قاضی اول دلیل قطعی کے خلاف ہو تو نقض واجب ہے وگرنہ نہیں، ان کی مراد وہ صورت مسئلہ ہے جب ان کے لیے دلیل ظنی سے مخالفت کا فساد عیاں نہ ہو جیسا کہ ہر اجتہاد کی یہی شان ہے[12]۔"

ف۔ اس شق کا حکم شق (د) سے ظاہر ہے[13]۔ اس سلسلہ میں اور بھی بہت سی بحثیں ہیں جن کے بیان کا یہ مقام نہیں۔

اجازت یافتہ قاضی

بحث ان قاضیوں کے سلسلہ میں ہو رہی تھی جو بذات خود مجتہد ہوں، لیکن اگر قاضی خود مجتہد نہ ہو، اس میں شریعت کی جانب سے متعینہ شرائط اجتہاد موجود نہ ہوں، بلکہ اسے امام یا جانشین امام نے قضاوت کی اجازت دی ہو تو اس کے فیصلہ پر نظر ثانی کی ضرورت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جن فقہا کا یہ نظریہ ہے کہ امام یا ولی امر، بنا بر مصلحت ایسے افراد کو بطورِ قاضی معین کر سکتا ہے جن میں تمام شرائطِ قضاوت موجود نہ ہوں، انھوں نے اس بات کی بھی تاکید کی ہے کہ امام یا ولیِ امر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اجازت یافتہ قاضیوں کے احکام کے نفاذ میں شریک اور اس کی نگرانی کرتا رہے، جیسے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے "شریح" کو قاضی بناتے وقت حکم دیا تھا کہ فیصلہ جاری کرنے سے پہلے اپنے تمام فیصلوں کو امامؑ کی خدمت میں پیش کر دیا کریں، اس کی سند ہشام بن سالم کی وہ حدیث ہے جسے انھوں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے:

"لما ولی امیر المومنینؑ شریحا القضا اشترط علیہ ان لا ینفذ القضا حتی یعرضہ علیہ"

جب حضرت علی علیہ السلام نے شریح کو قاضی بنایا تو اس سے شرط لے لی کہ وہ اس وقت اپنا فیصلہ نہ سنائے گا جب تک حضرت کو نہ دکھا لے گا۔

اور حدیث سلمہ:

"... ایاک ان تنفذ قضیۃ فی قصاص او حد من حدود اللہ او حق من حقوق المسلمین حتی تعرض ذالک علی انشاء اللہ" [۱۱]

..... خبردار! قصاص، یا حد (حدود الہی میں سے) یا مسلمانوں میں سے کوئی حق اس وقت تک فیصلہ سنا کر نافذ نہ کرنا جب تک مجھے نہ دکھا دینا۔

اس میں تاکید ہے کہ منصوب قاضی کے فیصلوں میں حتی محکوم علیہ کی درخواست کے بغیر بھی نظر ثانی و نگرانی کا حق موجود ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ قاضی بالا و ولی امر کی نظر ثانی کے بغیر اس کا فیصلہ قابل اجرا ہی نہیں ہے۔

خلاصہ

گذشتہ بحثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ:

اولاً: اپیل کورٹ کی نہ صرف یہ کہ ممانعت نہیں ہے بلکہ بعض ان مقامات پر جہاں صحت حکم اور صلاحیت حاکم کے بارے میں تحقیق شرعاً لازم ہے۔ اپیل کورٹ بعنوان مقدمیت ضروری ہے۔

ثانیاً: اپیل کورٹ کا لازمہ ردّ و نقض احکام نہیں، لہذا مجتہد قضات کے احکام کی قطعیت کے منافی بھی نہیں ہے۔ اپیل کورٹ میں صرف قاضی کی نا اہلی یا آداب قضاوت کی خلاف ورزی یا استنباط و استنتاج کے سلسلہ میں شکایات کا جائزہ لیا جائے گا، اور شکایت صحیح نہ ہونے کی صورت میں حکم قاضی اسی طرح قطعی و لازم الاجراء باقی رہے گا۔

حاشیہ

۱۔ حدیث ۱۔ باب ۱۱۔ صفات قاضی۔ وسائل الشیعہ ج ۱۸ — "قلت کیف یصنعان قال ینظران من کان منکم ممن قد روی حدیثنا ونظر فی حلالنا وحرامنا وعرف احکامنا فلیرضوا به حکما فانی قد جعلته علیکم حاکما فاذا حکم بحکمنا فلم یقبل منه فانما استخف بحکم الله وعلینا رد، والراد علینا راد علی الله وهو علی حد الشرک بالله۔"

۲۔ جواہر الکلام۔ کتاب القضاء۔ المسألة الرابعة ج ۴۰ ص ۱۰۳

۳۔ جواہر الکلام جلد ۴۰ ص ۹۴

۴۔ فاضل نراقی۔ مستند الشیعہ۔ کتاب القضاء

۵۔ فاضل نراقی۔ مستند الشیعہ۔ کتاب القضاء

۶۔ مستند الشیعہ۔ کتاب قضا۔

۷۔ "لان اقصاه الزام الخصم بمقتضی البینة التی قامت عنده مثلا لا یکون مثبتا للحق عند غیره ...."

۸۔ مبسوط ج ۸ ص ۱۰۱ و ۱۰۲

"اذا اقضی الحاکم بحکم ثم بان له انه لخطاء او بان له ان حکما کان قبله قد اخطا فیما حکم وجب ان ینقض حکمه عندنا ولیستأنف الحکم بما علمه حقا لا یسوغ له غیر ذالک فقال قوم: ان بان انه اخطاء فیما یسوغ فیه الاجتهاد مثل ان خالف نص کتاب او سنة او اجماعًا او دلیلا لا یحتمل الا معنی ولمدا فانه ینقض حکمه ویبطله وقال آخرون ان خالف نص او سنة لم ینقض حکمه وان خالف الاجماع نقض حکمه ..... وقد قلنا ما عندنا فی ذالک وهو انه متی بان له الخطا فیما حکم به او فعله وعلم ان الحق فی غیره نقض الاول واستأنف الحکم بما علمه حقا و کذلک فی جمیع المسائل التی تقدم ذکرها واشباهها"

۹ـ مبسوط ـ ج ۸ ـ ص ۹۳

۱۰ـ قواعد الاحکام علامه ص ۲۳۶

۱۱ـ جواهر الکلام ـ ج ۴۰ ص ۹۳، ۹۶

۱۲ـ مفتاح الکرامة ـ کتاب القضاء ـ ص ۵۳

۱۳ـ صاحب مفتاح الکرامة فرماتے ہیں:

"ثم اعلم ان ھناک فرعا قد یشتبه حاله من ای الامرین هو وذالک ما اذا اخطا الحکم لاستناد فی الاجتهاد الی دلیل ظهر انه لیس بدلیل فی نفسه ولم یظهر له برهان علی فساد هذا الحکم بل ظهر فساد مستنده فهل یجب نقضه ام لا؟ احتمالان والحق ان یقال: ان کان ظهر علیه فساد المستند وحصل له دلیل ظنی علی خلاف ذلک الحکم الذی استند الی الدلیل الفاسد فالواجب نقضه فان لم یحصل له دلیل ظنی بل اقصاه انه ظهر له فساد مستند الحکم لا غیر فلا ینقض" ص ۵۳

۱۴ـ وسائل الشیعه ـ باب ۳ آداب القاضی، حدیث نمبر ا، وباب نمبر ا آداب القاضی ـ حدیث نمبر ا

●●

علامہ صالح النیفر - تیونس
ترجمہ: جناب محمد سعید حیدری

تشکیل حکومت اسلامی
ایک نظر ایک زاویہ

کیا انسان کو دین کی ضرورت ہے؟ اس سوال پر اچھی خاصی گفتگو ہو چکی ہے مگر اس ضرورت کا داعی کیا ہے؟ اس بارے میں لوگ متفق الرائے نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دین ایک پناہ گاہ ہے۔ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے اور جب طاقت جواب دے جاتی ہے، یا کوئی لاعلاج مرض جو شدید حملہ آور ہوتا جسکو برداشت کرنا ممکن نہیں ہوتا، یا ایسا حادثہ کہ اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، ایسے وقت لوگ دین کی طرف رخ کرتے ہیں، اور دین کے سائے میں پناہ لیتے ہیں۔ خلاصہ کے طور پر ایک ہی لفظ میں یوں کہا جائے کہ لوگ ایسے خطرات میں دین کے قلعے میں پناہ لیتے ہیں جب ان سے مقابلہ ناممکن ہو۔

لیکن دین اسلام پناہ گاہ نہیں، اسلام ایک متحرک آئین اور جد و جہد کا درس اور سختی برداشت کرنے کی تربیت دینے والا دین ہے۔

اسلام اپنے پرستاروں کو تمام دبستانوں سے الگ کرکے اپنے انداز اور اپنے راستے کی رہنمائی کرتا ہے۔ اسلام کا تمام نظام عملی اور عین زندگی و حرکت و فکر ہے۔ سنجیدگی ہو یا مزاح، خوشی ہو یا غم، بدنصیبی ہو یا خوشحالی، ایک مسلمان اپنی رفتار کی سمت الہامی اور الہٰی شریعت سے حاصل کرتا ہے۔ وہی وہ خدا ہے جو زندہ کرتا ہے اور پھر مار ڈالتا ہے، ہنساتا ہے اور پھر رلاتا ہے اور صرف وہی نجات دینے والا ہے اس کے علاوہ

کوئی پناہ گاہ نہیں۔

ذالك الـدين القيم   یہ ہے مضبوط دین۔

دین اسلام ہی وہ دین ہے کہ جو فطری اور طبعی ہے جس کی نظر میں زندگی کے تمام نظام اور اس کے قواعد کی اصطلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک کہ اصول فطرت پر اعتدال پسندی کے اصول کو نہ اپنایا جائے۔

فطرت و طبیعت ہی ہے جو آدمی کو طہارت کے لیے ابھارتی ہے، پاک و پاکیزہ ہو کر سوئے اور بیدار ہونے کے بعد دوبارہ طہارت کرے۔ اگرچہ نیند سے پہلے پاک و پاکیزہ ہی کیوں نہ رہا ہو۔ اور یہ طبیعی فطرت ہی ہے کہ جو انسان کو صاف ستھرے لباس اور پاک و پاکیزہ بدن اور اچھے گھر میں رہنے پر اکساتی ہے، جس کے نتیجے میں انسان صحیح و تندرست رہ سکے۔ جب انسان ان اصولوں کے خلاف اپنی مرضی پر عمل کرنے لگتا ہے تو گویا وہ فطرت کے خلاف عمل کرتا ہے۔ حالانکہ اسے ایسے رجحانات کچلنا چاہیے کیونکہ فطرت اصلاح چاہتی ہے اور انسانی رجحانات غلط روی کی طرف بلاتے ہیں۔ یوں ہی دین اسلام ہمیشہ پاک و پاکیزگی اور طبیعت کے تقاضوں سے ہم آہنگ اصول دیتا اور اس سے ہٹ کر چلنے سے منع کرتا ہے۔ پاکیزگی اگرچہ انسان کو تھوڑی تکلیف اٹھانے پر مجبور کرتی ہے مگر صحت و تندرستی کے لیے بہت ضروری چیز ہے اسلام اس کو ایک مرد مسلمان کے لیے لازم اور قابل برداشت سمجھتا ہے۔ ارشاد باری ہے:

فطرة الله التي فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم

یہ فطرت اللہ ہے کہ جس پر اس نے تمام لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی خلقت میں کوئی تبدیلی نہیں، یہ دین استوار ہے۔

تباہی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنے خواہشات نفسانی کا قلع قمع کرے اور وجود انسانی کو باقی رکھے۔ اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے مگر تجاوز اور انتقام کے لیے نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

وقاتلوا في سبيل الله الذين يقاتلونكم ولا تعتدوا

خدا کی راہ میں تم ان لوگوں سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کریں مگر ان پر تجاوز نہ ہونے پائے۔

یہ اسلام ہی ہے جس نے جنگ میں ایسے جائز و ناجائز کی حدیں قائم کی ہیں جہاں ذاتی جذبات کو کچلنا اور دوسروں کو نوازنا پڑتا ہے، یہاں تک کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام نے جنگ میں رحم دلی کو غالب کر دیا ہے۔ مثلاً اگر عورت میدان میں ہو اور عورت جنگ نہ کرے تو قتل نہیں ہو سکتی اور اسی طرح سے (اسلام نے) بچوں اور بوڑھوں کو قتل کرنا بھی جائز نہیں جانا ہے۔ اسلام نے انسان کو اجازت دی ہے کہ اگر کوئی شخص اس کے ساتھ ظلم کرے تو اس کا جواب دیا جائے مگر انسانی ضوابط کے مطابق۔

ذالك خلق فی البشر

میرے بشری آداب یہ ہیں۔

البتہ انتقام لینے سے روکا اور حسن سلوک کی طرف بلایا ہے۔ ارشاد خداوند عالم ہے:

وجزاء سیئۃ سیئۃ مثلها فمن عفیٰ واصلح فاجرہ علی اللّٰہ

کسی ایک گناہ (بدی) کی جزا اس کے مثل ہے۔ پھر جو اس کو بخش دے تو اس کا اجر خدا پر ہے (جو انعام جسے چاہے مرحمت فرمائے)

انسان شریعت الٰہی پر چلنے کی کوشش کرے اور یہ سمجھے کہ خدا اس کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

خداوند عالم فرماتا ہے:

وکان اللّٰہ علیٰ کل شیء رقیبا

اور اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

واعلموا ان اللّٰہ یعلم ما فی انفسکم فاحذروہ

یاد رکھو! جو کچھ تمہارے دلوں میں (پوشیدہ) ہے خدا اس کو بھی جانتا ہے، پس اس سے ڈرتے رہو۔

پوری دنیا کے مسلمانوں کو الٰہی قوانین نافذ کرنے کی سعی پیہم جاری رکھنا چاہیے۔ ایک طرف ہم دیکھتے ہیں کہ عرب مے نوشی کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ شراب انکی زندگی کا ایک جزء ہو چکی تھی۔ ایسی حالت میں جب شراب کی حرمت پر آیت نازل ہوئی تو انھوں نے شراب کے برتنوں کو توڑ ڈالا اور قیمتی شراب پھینک دی۔ اس وقت شہر مدینہ میں نہ کوئی پولیس تھی، نہ کوئی جیل خانہ۔ اور دوسری طرف ہم

دیکھتے ہیں کہ امریکہ جس کو اپنی پولیس اور انتظامیہ پر غرور ہے جب اس کی پارلیمنٹ نے نشہ آور چیزوں کے خلاف قانون پاس کیا تو وہ اس قانون کو نافذ کرنے سے عاجز و بے بس دکھائی دینے لگے اور وہ بھی ایسے حالات میں جب کہ ان کو نشہ آور چیزوں کے استعمال سے پیش آنے والے خطرات اور تباہیوں کا پورا پورا احساس تھا۔

جب لوگ لذات دنیا کی طرف بڑھ رہے ہوں اور علماء خراب اور فاسد ہو گئے ہوں اور بادشاہ اور اس کے مصاحب فتنہ ظلم و بربریت کی طرف بڑھ رہے ہوں اور فطرت سے بغاوت کر کے فتنے برپا کر رہے ہوں، اسلام سے دوری ہو۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے دلوں میں اسلام کی نگہداشت اور اسلام کا عشق ان کی رگوں اور خون میں موجود رہتا ہے۔ مسلمان عدالت اسلامی سے عشق رکھتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ جب امت اسلام سے منحرف ہوئی اور اس کے اندر ایمان کی کمزوری آئی اور خدا کا خوف دلوں سے جاتا رہا تو بادشاہانِ وقت کا ظلم و ستم ان پر روز افزوں ہوتا گیا سنت اللہ ہے، وہ اسلام کے نور کو تیز کرتا اور جوانوں میں قوت پیدا کرتا ہے اور ان میں بیداری اور احکام عدالت الٰہی کی جستجو میں آگے بڑھنے کی توفیق بخشتا ہے۔

خدا کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ ہمیشہ خدا کی مدد و نصرت کے سہارے جابر و ظالم اور دشمن خدا کے مقابلوں میں نکلتا اور ان کے سروں کو کچلتا رہا۔ اور اسی بنا پر ایک بہت بڑا واقعہ پیش آیا اور مسلمانوں کی سرزمین میں اتنی بڑی جمہوری اسلامی حکومت وجود میں آئی جس کا تار و پود اسلام سے تیار ہوا ہے۔ اس کی بدولت روزانہ ایک اچھی امید دلوں میں ابھرتی رہتی ہے اور کیوں نہ ہو یہ مسلمانوں پر خدا کے فضل و کرم کا ایک نمونہ تھا کہ اسلام کی آواز پوری دنیا میں گونج اٹھی۔ بڑی بڑی کانفرنسیں اور بڑے بڑے جلسے ہو رہے ہیں کہ اسلام کی جڑوں کو کاٹ دیا جائے اور اس کے راستے میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کر دی جائیں مگر سب بے سود ثابت ہوتا چلا آتا ہے۔ مستشرقین نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو سنا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خالفهم حتی یأتی امر الله۔"

یعنی میری امت سے ایک گروہ حق پر ثابت رہے گا اور مخالفین انھیں نقصان نہ پہونچا سکیں گے یہاں تک کہ حکم خدا نافذ اور انجام پذیر ہو۔

دشمن جانتے ہیں کہ سب مسلمان یا ان کا کوئی گروہ ہمیشہ اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ ایک ایسی حکومت قائم کی جائے جو صرف شریعت اور قانون الٰہی کے مطابق ہو۔ اس سلسلے میں وہ کبھی نہیں تھکتے، وہ ہمیشہ خداوند عالم کی مدد اور تائیدات پر بھروسہ کرتے ہیں اور پست و بے قیمت لوگوں کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ اس گروہ نے اپنے راستے کے اصول اور قوانینِ حکومت کو اس آیت میں تلاش کیا ہے:

"ما فرطنا فی الکتاب من شیئ" و کلّ شیئ فصّلناہ تفصیلاً ان الحکم الا للہ الا تعبدوا الا ایاہ"

"ہم نے (کسی) کتاب میں کوئی (افراط و) تفریط نہیں کی ہے۔ اور ہر شیئ کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ حکم تو صرف خدا کا ہے۔ خبردار! صرف اسی کی عبادت کرنا!

اور وہ لوگ حکومت کے امور میں رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی اقتدا کرتے اور انھیں کی سنّت کی پیروی کرتے ہیں یعنی جس طرح مدینۂ منوّرہ میں اسلامی حکومت قائم کی گئی تھی اسی طرز پر وہ آئین و قوانین وضع کرتے ہیں، انھیں قرآن مجید نے درس دیا ہے کہ:

"لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃٌ حسنۃ" لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر"

تمہارے لیے ذات رسول اکرمؐ میں اسوہ حسنہ ہے جو خدا کو اور روز آخرت کو حاصل کرنا چاہے۔

ولتکن منکم امّۃ یدعون الی الخیر

تم میں ایک گروہ کو چاہیے کہ خیر کی طرف بلائے۔

تو کیا حکومت اسلامی کا مقصد خیر کی طرف دعوت دینا نہیں ہے؟ کہ عوام صحنِ عالم میں عدالت کا پھیلاؤ دیکھیں اور اس کے گواہ بنیں اور معاشرتی انصاف کی نعمت سے فائدہ

اٹھاسکیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہم سے پہلے لوگ ایک مدت تک فائدہ اٹھاتے رہے۔ ا
قومیں جاہلیت کے مختلف ظلموں کے پنجوں سے نکل کر عدالت مسلمین کے زیر سایہ پناہ گزیں
ہوئیں۔ اسی طرح ہر مسلمان ہر وقت یہی آرزو کرتا ہے۔

یہ گروہ جو قانون الٰہی کی روشنی میں حکومت کر رہا ہے اور عدل الٰہی کے پھیلانے اور
اس کو وسیع تر کرنے میں مصروف ہے اس کا پہلا فریضہ ہے کہ تمام انسانوں کو، اپنی قوم
افراد اور اپنے ہم سایہ لوگوں کو بتائیں کہ قانون اسلام کا انسانی فطرت سے چولی دامن کا سا
ہے۔ اور کلام خدا اور سنت رسولؐ کو خوب اچھی طرح بیان کرے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کس طرح
اُسے (تمام عالم میں) عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔

تدبیر منزل انسانی طبیعت و فطرت سے ہے۔ انسان کیا، حیوان بھی یہ تقاضا اور عمل رکھ
ہیں۔ اسلام گھریلو سیاست سے آفاقی ریاست تک رہنمائی کرتا ہے۔ اسلامی قانون، سر
اوّل یعنی باپ اور اس کی جانشین یعنی ماں کی اطاعت کو لازم وضروری گردانتا ہے جیسا
حدیث میں ہے:

"والرجل راع فی اھلہ ومسئول عن رعیتہ والمراۃ راعیۃ فی بیت
زوجھا ومسئولۃ عن رعیتھا وکلکم راع ومسئول عن رعیتہ"

شوہر اپنے اہل وعیال کا نگہبان ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ
ہونا پڑے گا (اسی طرح) بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے اور اسکو اس کی
رعیت کے بارے میں جواب دہ ہونا پڑے گا، تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے
اور اپنی رعایا (زیر دست افراد) کے بارے میں جواب دہی کرنا ہے۔

بزرگوں کو اپنے سے چھوٹوں پر رحم و مروت سے پیش آنا چاہیے اور چھوٹوں کو چاہیے کہ
اپنے بزرگوں کا احترام واکرام کریں۔

اپنے داخلی وخارجی امور کی صحیح دیکھ بھال اور تمام معاملات میں مستعدی وہم آہنگی
میں حکومت کی مثال ایک بڑے گھر اور اس کے سربراہ جیسی ہے۔ قرآن میں ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

ایمان لانے والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول و اولی الامر کی اطاعت کرو، جو تم میں سے ہیں۔

اس آیت میں اطاعت کامل صرف اللہ سے مخصوص ہے پھر اس کے بعد کلمۂ امر (اطیعوا) پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت کے لیے دوبارہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن اولی الامر کے لیے (جو حکومت اسلامی کے نمایندے ہیں) تیسری مرتبہ استعمال نہیں ہوا۔ علماء کا اس آیت کے بارے میں یہ خیال ہے کہ مخلوق کی اپنے خالق کی اطاعت کے سلسلے میں کوئی قید و شرط نہیں ہے اسی طرح سے رسولؐ خدا کی اطاعت بھی مطلق بیان ہوئی ہے یعنی اس میں بھی کوئی قید و شرط نہیں پائی جاتی مگر حکومت اسلامی کی اطاعت جس کو مستحکم کرنے، مدد کرنے اور اطاعت کرنے کے عوام پابند کیے گیے ہیں وہ حکم خدا و رسولؐ کے دائرے میں قائم و محدود ہوتی ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اطاعت اور فرماں برداری کی، اس نے خداوند عالم کی اطاعت اور فرماں برداری کی۔ اور یہ اطاعت اس حد سے تجاوز نہیں کرتی۔

حدیث میں آیا ہے:

انما الطاعۃ فی المعروف

معروف ۔ دستورِ خدا ۔ میں اطاعت ہونا چاہیے۔

حکومت اسلامی، جس کے قانون، شریعت الٰہی کی روشنی میں مرتب کیے جاتے ہیں، خداوند کریم کی شریعت کو پھیلاتی ہے اس کے سلسلے میں تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنی پوری کوششوں سے اس کی پائداری اور مضبوطی کے لیے جدوجہد کریں۔ چاہے ان کے فرعی مسائل میں اختلاف کیوں نہ ہو۔ بشرطیکہ دین کی اساس اور قوانین کا متن آسیب کی زد سے باہر ہو۔ روایت میں آیا ہے کہ ایک فرمانروا (حاکم) نے ٹھان لی کہ زبردستی لوگوں کو مجبور کرے کہ مالک بن انس کے مذہب کی پیروی کریں۔ مالک نے بلا کر اس سے کہا کہ "اے امیر المومنین! ایسا نہ کریں کیونکہ اصحاب رسولؐ جو علمی اعتبار سے بہت اہم منزل پر فائز ہیں۔ مختلف شہروں میں پھیلے ہوئے ہیں۔" یعنی مسلک کے اختلاف کو جبر سے نہ روکا جائے۔ مگر فساد بھی راہ نہ پائے۔

دوسرے ملکوں سے اسلامی حکومت کا لگاؤ (ربط) بھی حق و انصاف معاہدوں کی پابندی اور استقامت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ حسن کردار، راستی گفتار اور عہد استوار پر اطمینان کے نتیجے میں غیر مسلم متاثر ہوں گے اور ان کو دشمنی کا کوئی پہلو نہ مل سکے گا اسی طرح مشرق و مغرب کے مسلمانوں سے لگاؤ بھی محبت و مروت و مہربانی اور ضعیفوں اور محروموں کی مدد کے عنوان سے ہونا چاہیے۔ آخر وہ لوگ برادری کا حصہ ہیں:

انما المؤمنون اخوة

تمام مومنین آپس میں بھائی ہیں۔

اسلامی حکومت کے اس رویے سے مسلمان کمزور اور سست روی کا شکار نہ ہونے پائیں گے۔ حکومت اسلامی کو انتہائی ہمدردی اور نہایت گرمجوشی کا برتاؤ رکھنا چاہیے۔ خواہ ان کے درمیان جغرافیائی فاصلہ زیادہ ہی کیوں نہ پایا جاتا ہو۔

●●

جناب شیخ محمد توری
سینیگال - افریقہ
ترجمہ : جناب خادم حسین ام-اے علیگ

اسلامی حکومت صفات اور خصوصیات

(۱) اسلامی حکومت کا تصوّر :

جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر چیز پر چھائی ہوئی اپنی رحمت کا خصوصی مظاہرہ کرنا چاہا تو مخلوقات کو شرف وجود بخشا اور ان میں سے انسان کو چنا، اپنی روح اس میں پھونکی، زمین پر اسے اپنا خلیفہ مقرر کیا، ملائکہ سے اس کو سجدہ کرایا - آدمؑ کو خاص طور پر عقل و ادراک کے زیور سے آراستہ کرکے صاحب اختیار بنایا، اس کے بعد انسان نے وہ عظیم بوجھ اٹھایا جس کی تاب زمین و آسمان اور پہاڑ نہ لا سکے - اللہ تعالیٰ نے ان سب کو انسان کے لیے مسخر کر دیا - مشیت ایزدی کا تقاضا تھا کہ وہ عرش سے فرش پر آئے اور خلیفۃ اللہ فی الارض کا عہدہ سنبھالے - لیکن وہ عاجز ہے، خالق مطلق کی عنایت شامل حال نہ ہو تو خود بخود ہدایت پا نہیں سکتا - اسی وجہ سے رحمٰن و رحیم نے انسانوں کی ہدایت کے لیے انہیں میں سے سب سے زیادہ قریب، پاک اور منزہ ترین افراد کا انتخاب کیا کہ وہ خالق اور بندے کے مابین واسطہ رہیں، تمام منتخب افراد، مشعل راہ ہدایت، صراط مستقیم کے راہنما اور ایسے عدل پرور حاکم تھے جو باہمی نزاع عدل و انصاف کی بنیاد پر ختم کراتے تھے . . . . .

"فاما یأتینکم منی ھدی فمن تبع ھدای فلاخوف علیھم ولا ھم یحزنون" (البقرہ/۳۸)

اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے تو اس کی پیروی کرنا کیوں کہ جو لوگ میری ہدایت پر چلیں گے ان پر قیامت میں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔

فمن اتبع ھدای فلا یضل ولا یشقی (طہٰ/۱۲۳)

جو شخص میری ہدایت پر چلے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پھنسے گا۔

لقد ارسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔ (الحدید/۲۵)

ہم نے یقیناً اپنے پیغمبروں کو واضح و روشن معجزے دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ ساتھ کتاب اور (انصاف کی) ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں

جب انسان اپنے رشد و ارتقا کے مراحل طے کر چکا اور انبیاء علیہم السلام نے عدل و انصاف کی رہ دکھا دی تو پروردگار کی حکمت کا تقاضا ہوا کہ انبیاء علیہم السلام (جنھوں نے اپنے فرائض انجام دینے میں بہترین کردار ادا کیا) کو بھیجنے کی مہم روک دی جائے ....کیوں کہ:

وما علی الرسول الا البلاغ (النور/۵۴)

اور رسولؐ پر تو صرف صاف طور پر (احکام کا) پہنچا نا فرض ہے۔

اور انہوں نے پہنچایا:

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔ (المائدۃ/۳)

آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے (اس) دین اسلام کو پسند کیا۔

مذکورہ باتوں سے ہر صاحب عقل و شعور اندازہ لگا سکتا ہے کہ مشیت الٰہی کے مطابق، عدل و انصاف کے تقاضوں پر مبنی، نہ مشرق و مغرب کی جانبدار نہ شمال و جنوب کی ظلمت سے

نور میں لانے والی اور مصیبتوں سے نکال کر خوشی و سعادت مہیا کرنے والی حکومت اگر ہو سکتی ہے تو وہ اسلامی حکومت ہی ہو سکتی ہے، جس کا سرچشمہ شریعت محمدیؐ اور تمام گذشتہ پیاموں کا نچوڑ ہے کہ.....

إن الحكم إلا لله۔ (یوسف/۴۰)

حکومت تو بس خدا ہی کے واسطے خاص ہے۔

إن الدين عند الله الاسلام۔ (آل عمران/۱۹)

دین تو خدا کے نزدیک یقیناً (بس یہی) اسلام ہے۔

اسلامی حکومت کے اس تصور نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی حکومت کی ضرورت اور اس کے اصول، محض اسلامی مذاہب سے منسلک فقہا کے اجماع کی بنا پر نہیں، بلکہ فلاح و بہبودی کا واحد راستہ یہی الٰہی روش ہے۔

تمام انبیاء و رسل (علیہم السلام) نے اسی عقیدے کو عملی شکل دینے کی کوششیں کیں، جب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی باری آئی تو آپ نے اس منصوبے کو عملی صورت دے کر الٰہی احکام کو دینی و دنیوی اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں میں کارآمد ثابت کر دیا اور اس کی ضرورت پر زور دیا۔ تدریس علوم دین سے لے کر باجماعت نماز کی امامت، مقدمات و اختلافات میں قضاوت، اعلان جنگ، فوج کی قیادت، دوسرے ملکوں میں سفراء اور نمایندوں، امیروں اور سربراہوں کا تعین، بادشاہوں سے خط کتابت، سرداروں قبائل سے داخلی خارجی معاہدے جیسے فرائض آنحضرتؐ نے بذات خود انجام دیئے۔

ان تمام شواہد کے بعد کسے جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے عدم جواز و ضرورت کو قرآن سے ثابت کر سکے؟

جان بوجھ کر عدم جواز و ضرورت کی بات جاہل یا اسلام دشمن آلۂ کار کے سوا اور کوئی کہہ نہیں سکتا۔ امام خمینی حفظہ اللہ نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے وہ عین حقیقت ہے:

جو شخص اس کی حمایت میں رائے دیتا ہے جس کے نزدیک اسلامی حکومت کے قیام کی ضرورت نہیں، اسلامی حکومت کے قیام کی عدم ضرورت سے اتفاق

رکھتا ہے، وہ اسلامی احکام کے نفاذ کا مخالف اور اس کی راہ میں رخنہ پیدا کرنے والا ہی نہیں، بلکہ دین حنیف اسلام کی آفاقیت و جاودانی کا بھی منکر ہے۔"

۲ حکومت الٰہی:

"اِنِ الحکم اِلّا للّٰہ"

حکومت تو بس خدا ہی کے واسطے خاص ہے۔

انسان خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو، مگر اس کی فطرت ہے کہ وہ اپنے ماحول سے متأثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تنگ ماحول سے نکلنے کی کوشش کے باوجود نکل نہیں پاتا، کہنے والے نے یہ بات کہہ کر (انسان اپنے ماحول کا پروردہ ہے) خالق مطلق کے حق میں گستاخی کی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان ساخت کے اعتبار سے کمزور ہوتا ہے، جب حقیقت مطلق و مجرّد کو خود بخود نہیں سمجھ سکتا تو حکومت بھلا کیسے کرسکتا ہے۔ یہ بات دنیا کے تمام مذاہب، نظریات، اعتقادات اور انسانی نظام ہائے حیات میں مسلّمہ اصول کے طور پر مانی جاتی ہے کہ انسان میں عیب ہے۔ اُس کی سوچ کا دائرہ محدود ہے اور بشریت کا حیاتی نظام خواہ کتنا ہی جدید یا قدیم کیوں نہ ہو اپنے ذاتی مفاد اور تنگ ماحول کے دائرے سے باہر نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہو سکتی ہے جس نے افلاطون کو فلاسفہ (جو اس کی نظر میں سب سے بہتر تھے) کی حکومت قائم کرنے پر مجبور کیا۔

لہٰذا ہر شیئے کے بارے میں علم رکھنے والا صرف وہ واحد و یکتا ہے، جو ازلی، حی و قیوم، خبیر و بصیر اور حکیم جیسی صفات کا مالک اور والد و ولدیت و مصاحب و محاسب کے لوث سے پاک و پاکیزہ ہے:

"وما یعزب عن ربك من مثقال ذرۃ ...."

"تمہارے پالنے والے سے ذرّہ برابر کوئی شیئ پوشیدہ نہیں"۔ وہی انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے، اس لیے کہ وہی لائق حمد و ستائش غنی و بے نیاز ہے۔

۳ بیعت یا انتخاب:

زیر بحث اسلامی حکومت، ان احکام کی پیروی کرتی ہے جو خدا کی طرف سے نازل اور

قرآن وسنّت نبویؐ یا امت مسلمہ کے علماء دین (جو قرآن وسنّت کے پابند ہیں) کے اجماع سے مطابقت رکھتے ہوں۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ (فاطر/۲۸)

اس کے بندوں میں خدا کا خوف کرنے والے تو بس علماء ہیں۔

نوعیت کے اعتبار سے یہ حکومت کوئی علماء دین کی حکومت، نورموکراٹیک (NORMOCRATIC) ڈیموکراٹک (DEMOCRATIC)، آٹوکراٹیک (AUTOCRATIC)، استبدادی یا شاہی حکومت نہیں، بلکہ وہ اسلامی حکومت ہے جو مذکورہ تمام نظام ہائے حکومت کی برائیوں سے دور اور خوبیوں کی ضامن ہے۔ علماء دین صحیح معنوں میں انبیاء ورسل کے وارث ہیں، اور یہی لوگ (علماء دین) جس طرح ارباب حل وعقد کی پرانی اصطلاح کے مطابق صاحب اختیار یا مجتہد یا علماء ورؤسا کا گروہ یا اہل علم وفضیلت ودرایت کہلائے جاتے تھے، اسی طرح ماوردی، بغدادی، صاحب منتخب، شیخ شلتوت اور علامہ مودودی نے بھی انھیں ناموں سے یاد کیا ہے ......

یہ وہی لوگ ہیں جو علم وعدل کی شرط پر حکومت کے اصلی حقدار، عوام کے ذریعے منتخب ہونے والے نمائندوں کا تعین کرتے ہیں۔ اس گروہ میں شامل ہونے کے لیے تقویٰ، عدل، علم، درایت اور حکمت شرط ہے۔ اور اگر اس گروہ کے ممبران اور ممبران مجلس (شوریٰ) (ممبران پارلیمنٹ) نیز صدر مملکت کا تعین براہ راست قرعہ کشی کے ذریعہ انجام پاتا ہے، تو شرعی طور پر کوئی قباحت نہیں، اس لئے کہ اس بات پر اعلیٰ درجے کے معاصر علمائے نے اتفاق رائے کا اظہار کیا ہے[1]

(۴) امّت مسلمہ کی اولویت، اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے:

بے شک امّت مسلمہ کو مکمل آزادی کے ساتھ اپنے نمائندوں، ذمہ داروں اور وکیلوں کا انتخاب کتاب کے مطابق (یا موجودہ زمانے میں رائج اصولوں کے ذریعہ) کرکے امّت کے مفاد میں عمل کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ بنیادی طور پر امّت مسلمہ کا ہر فرد محمدی تحریک کا وارث ہے:

[1] اجماع کی حجیت اور اس کے اصولی مباحث، علماء فقہ میں محل اختلاف ہیں۔ مثلاً کیا اجماع بذاتہ دلیل ہے یا کشف سنّت کا سبب ہے۔ اگر کشف رائے معصوم کا سبب ہے تو حجیت ہے ورنہ نہیں۔ یونہی بیعت سبب قیام حکومت اسلامی محل نظر ہے۔

اس بات کی تائید پہلے رازی اور اس کے بعد شیخ محمد عبدہ نے کی ہے۔اس کے علاوہ شہید محمد باقر صدر کی تالیفات سے بھی اور جمہوری اسلامی ایران کے طرز عمل میں مشاہدہ بھی کی جاسکتی ہے۔لہٰذا اس اعتبار سے معنوی و مستقل شخصیت کی حامل امت، امت مسلمہ ہے جو قرآن میں یوں مخاطب قرار پائی ہے:

"یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول....."

اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔

اے لوگو! فساد نہ پھیلاؤ، خدا کا شریک نہ ناؤ، نماز قائم کرو اور زکات دیا کرو.....

"کونوا قوامین بالقسط" عدل و انصاف پر قائم رہو۔"ولا ترکنوا الی الذین ظلموا" اور ظالموں کی پشت پناہی اختیار نہ کرو۔احکام و قوانین الٰہی کے نفاذ اور ان کو بہترین انداز میں کام میں لانے کی ذمہ دار امت مسلمہ ہے اور اللہ کی جانب سے اسلامی حکومت میں حق اولویت کی مالک ہے، البتہ نوعیت کے اعتبار سے یہ اولویت نہ مطلق ہے نہ ذاتی بلکہ مالک کون و مکان کی طرف سے دی ہوئی نعمت ہے۔اور اسلامی حکومت کی ایک ایسی خصوصیت ہے جو اسلامی حکومت کو ڈیموکراسی سے ممتاز کرتی ہے۔لہٰذا امت مسلمہ کا فرض ہے کہ وہ مجلس شوریٰ (مشاورت) کے ذریعہ نمائندوں کے انتخاب کی کیفیت اور مدت انتخاب وغیرہ کا تعین کرے۔

(۵) اسلام میں حکومت کی ذمہ داریاں:

اسلامی حکومت قائم کرنے کی اصلی غرض اور ضرورت یہ ہے کہ وہ ان فرائض کو ادا کرنے کا ذریعہ بن سکے جو مجموعی اعتبار سے پوری امت مسلمہ پر عائد ہوتے ہیں۔

فرائض و ذمہ داریاں:

- ان اداروں کو قائم کرنے کی تدبیر، جو اسلامی سرزمینوں پر الٰہی احکام کو نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔
- لڑائی جھگڑے اور اختلافات ختم کرانے میں عدل و انصاف کی بنیادوں پر فیصلہ کرنا۔

- نصرت و تبلیغ دین۔
- دین و دارالاسلام کی حفاظت، اس کی عزت و استقلال کا تحفظ و قیام، جس میں غیروں کا سہارا نہ ہو۔
- عوام خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ان کی جان، مال حقوق اور عزت و آبرو کی حفاظت۔
- عوام کے درمیان امتیاز کیے بغیر اسلامی اصول وضوابط کے تحت آزادی و مساوات برقرار رکھنا۔
- وطن، دین اور قومیت کو مدنظر رکھے بغیر دنیا کے تمام مظلوم و مستضعف افراد کی حمایت کرنا۔
- آیۂ شریفہ

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر (آل عمران)

"اور تم میں سے ایسے گروہ (ایسے لوگوں کو بھی) تو ہونا چاہیے جو (لوگوں کو) نیکی کی طرف بلائیں اور اچھے کام کا حکم دیں اور بُرے کاموں سے روکیں۔"

کے مطابق، مستقل ادارے کی تشکیل، جو امر بہ معروف اور نہی عن المنکر کرے۔

امر بہ معروف و نہی عن المنکر کا شمار ان عظیم فرائض میں ہے جس پر دنیا کی فلاح و بہبود اور حکومت و معاشرے کا عدم انحراف قائم ہے۔ معتزلہ فرقے نے اسے ان پانچ اصولوں میں سے ایک مانا ہے جن کے بغیر ایمان کامل نہیں ہو سکتا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ" (الانفال/۲۵)

اور اس فتنہ سے ڈرتے رہو جو خاص انہی لوگوں پر نہیں پڑے گا جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا (بلکہ تم سب کے سب اس میں مبتلا ہوگے۔

اور حدیث ہے:

"ان اللہ لا یعذب العامۃ بعمل الخاصۃ، حتی یروا المنکر بین ظہرانیھم وھم قادرون علی ان ینکروہ فلا ینکروہ"

"کچھ بدکار لوگوں کے اعمال کے بدلے، اللہ تعالیٰ عام لوگوں کو عذاب میں مبتلا نہیں کرتا، مگر یہ کہ وہ لوگ بدکاری ہوتے ہوئے دیکھیں اور روک سکنے کے باوجود نہ روکیں۔"

حدیث میں یہ بھی ہے:

"ما أقر قوم المنكر بين أظهرهم إلا عمهم الله بعذاب محتضر"
جس قوم نے منکرات کو روک سکنے کے باوجود نہیں روکا، اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے خاص و عام کو تباہ کر دیا۔

اسی طرح:

- دینی، دنیوی اور ثقافتی تعلیم مفت فراہم کرنا اور ....
- صحیح اسلامی تربیت کے امکانات کی فراہمی کا شمار حکومت کے فرائض میں ہے۔

(ابن عابدین کا خیال ہے کہ یہاں علم سے مراد وہ علم ہے جو دنیاوی امور کے قیام سے بے نیاز ہو)

- اسی طرح اصلاح اراضی اور عمرانیات پر توجہ کرنا حضرت علی ابن ابیطالب (علیہ السلام) کے قول اور اسلامی اصول (الارض لمن یزرعھا) کے مطابق حکومت کا فرض ہے۔
- پیشہ ور، تاجر، صنعت کار اور صاحبان حرفہ و فن کو رعایت دینا، ان کے کارناموں کو سراہنا اور مشہور و معروف قرآنی اصول (مال صرف اس مالک مطلق کی ملکیت ہے، جس نے انسانوں کے لیے پیدا کیا، اور مال کے موجودہ مالک اس خدا کے وارث کے سوا کچھ بھی نہیں جس نے تمام پیدا کی ہوئی چیزوں کا حصہ دار و وارث انسان کو قرار دیا) پر عمل کرنا۔
- احتکار، اسراف، ذخیرہ اندوزی کا سدباب کرنا۔
- عوام کے لیے ٹیکس کا معقول بندوبست کرنا اور معاشرتی سطح پر معاشرے کو خود کفیل بنانے کی ذمہ داری حکومت پر عائد ہوتی ہے۔

آخری بند کو علماء شریعت نے مسلمانوں سے نقصان دور کرنے اور ذمی افراد کی ضمانت سے متعلق قرار دیا ہے اور صاحب منھاج نے مثال (ننگے کو لباس اور بھوکے کو کھانا دینا) کے ذریعے مزید وضاحت کی ہے۔

"من بات شبعاناً واخوہ جائع وھو یعلم فلیس منا"

جو شخص یہ جانتے ہوئے کہ اس کا بھائی بھوکا ہے، کھا پی کر سو جائے وہ ہم میں سے نہیں

خاص طور پر کسان، مزدور، نوکر اور پھیری والے جنھیں حضرت علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں پسماندہ افراد کے عنوان سے یاد کیا ہے، ان کے حق میں خاص توجہ مبذول کرنا حکومت کا فرض ہے ..... مذکورہ وجوہات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی نظام، دوسرے مذاہب اور نظاموں کے مقابلے میں ممتاز ہے۔ اس لیے کہ دوسرے مذاہب انسان کو محض حیوان ناطق کی نظر سے دیکھتے اور صرف اس کی مادّی و دنیاوی خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا فرض اولین یہ ہے کہ وہ دینی امور رائج کرنے کا خاص اہتمام کرے اور ایسے امکانات فراہم کرے جن کے ذریعے ہر فرد بہترین انداز میں اللہ کا حق ادا کر سکے، اور وہ اس لیے کہ اسلامی نظام، دین و دنیا اور جسم و روح میں نہ صرف فرق کا قائل نہیں بلکہ دونوں کے درمیان وحدت اور ہم آہنگی کا خواہاں ہے۔

"لیس منا من ترک دنیا، لآخرتہ ولا آخرتہ لدنیاہ"

جو کوئی دنیا کو آخرت کی خاطر اور آخرت کو دنیا کی خاطر چھوڑتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔

⑥ اسلامی حکومت کے سربراہ، امام کی شرائط:

جن شرائط کا حامل امام کو ہونا چاہیے، وہی شرائط حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں، وزیروں اور ارباب حل و عقد میں بھی ہونا چاہیے۔ اس اعتبار سے جو شخص آغاز ہی سے ان شرائط کا حامل نہ رہا ہو، اسے امیدوار کی حیثیت سے نامزد کرنا مناسب نہیں، اور اتفاقاً اگر ایسا شخص صاحب ولایت و منصب ہو جائے تو ولایت باطل ہے، اسی طرح جس میں ولایت میں کوئی ایک شرط، والی ہونے کے بعد بھی کم رہ جاتی ہے، اس کی ولایت پر اطلاق باطل واجب بلکہ واجب قرار پاتا ہے۔ بعض علماء و فقہا جیسے "بغدادی" اور "ابن خلدون" نے ان شرائط کو چار، "ماوردی" نے سات اور "غزالی" نے اپنی کتاب "احیاء" میں دس شرطیں قرار دی ہیں۔ لیکن بنیادی شرائط جن پر سب نے اتفاق کیا ہے

ان میں سب سے پہلی شرط وسیع معنوں پر مشتمل علم کی ہے، خاص طور پر وہ علم جو شریعت اس کے مقاصد احکام اور ان کے مآخذ سے متعلق ہو۔ بغدادی، غزالی، رملی اور ابن خلدون نے اس پر اتفاق ظاہر کیا ہے کہ حاکم کو کم سے کم درجۂ اجتہاد پر فائز ہونا چاہیے، اور صاحب موافقات کا کہنا ہے کہ امام کو تفسیر، حدیث، تاریخ تشریع، تاریخ اسلامیہ، اصول، منطق اور لسانیات پر مکمل عبور حاصل ہونا چاہیے۔ بغدادی اور ایجی کا خیال ہے کہ مذکورہ باتوں کے علاوہ سیاسی، فوجی، اقتصادی اور وسیع پیمانے پر انتظامی شعور و صلاحیت کا مالک بھی ہونا چاہیے۔ امام ہونے کی دوسری شرط نفسانی و جسمانی صحت و صلاحیت، جس کی تعبیر ماوردی نے شجاعت و ہمت سے کی ہے اور دونوں کو محافظ اسلام نیز دشمن سے مقابلہ کرنے والے اوصاف کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ جہاں تک جسمانی صحت و صلاحیت کی بات ہے، اس سے مراد اعضاء و جوارح اور حواس کی سلامتی لی جاتی ہے۔ لیکن سب سے اہم شرائط جن پر حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے خط میں زیادہ زور دیا ہے اور جس کا خلاصہ عدالت (انصاف) کے عنوان سے امام خمینی مدظلہ العالی نے کیا ہے، صحیح معنوں میں تقویٰ، پرہیزگاری اور عفت پر مشتمل ہیں، انصاف کے تقاضے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی طرح کا ظلم نہ کرے، بلکہ امام خمینی کی وضاحت کے مطابق، اس میں ظلم کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہونا چاہیے۔ مال کے سلسلے میں ہو، عوام کی آزادی سے متعلق ہو یا رعایا کے کسی حق سے متعلق ہو۔ خواہ وہ قول و فعل اور اقرار کی صورت میں کیوں نہ ہو ظلم، ظلم محسوب ہوگا۔ یہی وہ صفت ہے جو اس سے امامت، وزارت اور امارت کے عہدے پر فائز ہونے کی صلاحیت سلب کر لیتی ہے، لہٰذا امامت کے لیے اسی کو امیدوار کے طور پر نامزد کرنا چاہیے جس میں ولایت کی تمام شرائط پائی جاتی ہوں (اسلام، آزادی، مردانگی، بلوغ اور عقل) مسجد رسول میں جب لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت قبول کر لی تو انہوں نے فرمایا:

> وقد علمتم انه لاینبغی أن یکون الوالی علی الفروج والدماء والمغانم والاحکام، وامامة المسلمین البخیل، فتکون فی اموالهم نهمته، ولا الجاهل فیضلهم بجهله، ولا الجافی فیقطعهم بجفائه، ولا الحائف للدول فیتخذ قوماً دون قوم، ولا المرتشی

فی الحکم فیذھب بالحقوق ویقف بھا دون المقاطع ولا المعطل للسنۃ فیھلک الامۃ"

تم لوگ یہ جانتے ہو کہ لوگوں کی جان، عزت، ناموس، مال غنیمت اور اسلام کے احکام پر حکم فرمانیز مسلمانوں کا امام بخیل نہ ہونا چاہیے، جو ان کی ثروت و دولت اکٹھا کرنے کے لالچ میں پھنسا رہے، نہ جاہل۔ جو اپنی نادانی کی بنا پر انہیں گمراہ کرے، نہ ظالم، جو اپنے ظلم و جور سے انھیں پریشان کرے، نہ بدلتے ہوئے حالات سے ڈرنے والا جو ایک گروہ کے ساتھ ہو کر دوسرے کو ذلیل و خوار کرے (سرمایہ داروں کا ساتھ دے اور غریبوں کو بھول جائے)، نہ رشوت خور جو (مال لیکر حق کو باطل اور باطل کو حق قرار دے) لوگوں کا حق ضائع کر کے حکم شرع بیان کرنے سے گریز کرے اور نہ مخالف سنت و سیرت رسولؐ۔ جو امت کو تباہ و ہلاک کرے۔

⑦ اسلامی حکومت میں قومیت:-

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے قومیت یا صحیح معنوں میں امت مسلمہ کے درمیان آپسی اخوت وبرادری کا تعین خود قرآن مجید میں کیا ہے۔ ارشاد ہے:

"یاایھا الذین آمنوا۔ انما المومنون اخوۃ"

اے ایمان لانے والو! بے شک تمام مؤمنین ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اس طرح سے تصور قومیت نہیں بلکہ اسلامی عقیدے میں قومیت کا تعین مضمر ہے۔ لہذا جو شخص کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان رکھتا ہو، ایمان، اسلام اور شریعت کے احکام کے مطابق عمل کرتا ہو، اسے اسلامی قومیت کے حق سے بہرہ ور ہونا چاہیے۔ مردوں کی طرح خواتین بھی قومیت میں برابر کی شریک ہیں، مختلف عہدوں اور منصبوں کے لیے عضویت و حق انتخاب سے مستفیض ہو سکتی ہیں، سوائے صدارت یا محکمۂ مظالم جس کے لیے مرد ہونا شرط ہے۔ یہی حال ذمیوں کا ہے جو غیر مسلم ہوتے ہوئے

اسلامی حکومت میں رائج قومیت قبول کرتے، جزیہ دینے کے ساتھ ساتھ احکام و قوانین کے تابع رہتے اور دین اسلام اور اس کی حرمت کا پاس و احترام کرتے ہیں۔

⑧ فرمان روا حکومت اسلامی کے حقوق :

اگر امام یا فرمانروا میں مذکورہ شرطیں پائی جاتی ہوں اور وہ شریعت حکومت کے احکام و قوانین کا پابند ہو، تو امت مسلمہ پر دو بلکہ کہا جاتا ہے تین ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اطاعت نصرت اور نصیحت جو سب سے زیادہ فرض ہے، ان شروط کے حامل امام کے حکم کی خلاف ورزی کا مطلب بغاوت ہے، جس کے معنی، ناجائز طور پر امام یا حکومت سے ٹکر لینے کے ہیں۔ اس طرح کے باغی سے ٹکراؤ کی صورت میں، اسلامی حکومت کے تمام باشندوں کا فرض موکد ہے کہ وہ امام کی نصرت کریں۔

پیغمبر اسلام نے ارشاد فرمایا ہے :

"من اتاکم و أمرکم جمیع، یرید أن یفرق جماعتکم فلضربوہ بالسیف أو فاقتلوہ"

جو شخص آکر تم سب کو حکم دے اور تمہارے درمیان پھوٹ ڈالنا چاہے، اسے تلوار سے مارو یا قتل کردو۔

نصرتِ امام کی ایک روش نصیحت ہے، جس کا شمار باب امر بہ معروف اور نہی عن المنکر میں ہوتا ہے۔

رسول اللہ نے فرمایا :

"الدین النصیحہ قیل لمن یارسول اللہ ؟ قال للہ ولرسولہ و لکتابہ، ولائمۃ المسلمین وعامتہم"

دین نصیحت ہے، کہا گیا، کس کے لئے اے رسول اللہ ؟ آنحضرت نے فرمایا، خدا اور اس کے رسول، اس کی کتاب (قرآن)، ائمہ مسلمین اور تمام مسلمانوں کے لیے۔

آنحضرت نے یہ بھی فرمایا :

ثلاث لا یغل علیھن قلب مسلم: اخلاص العمل، ومناصحة ولاة الامر، ولزوم جماعة المسلمین

تین چیزوں سے مسلمان کا دل پھر نہیں سکتا: خلوصِ عمل، نصیحت حکام، اور اتحاد بین المسلمین کی ضرورت۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا، امام، امت مسلمہ کے سامنے جواب دہ ہے جس نے اسے انتخاب کیا، اور اس کی حیثیت نمائندے کے سوا کچھ بھی نہیں، لہٰذا امت مسلمہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کے طرز عمل، کام اور رویّہ کے بارے میں اس سے باز پرس کرے، اسے اور اس کے ساتھیوں کو معمولی عدالت قائم کرکے عام آدمی کی طرح مقدمہ چلائے اگر اس نے حق سے انحراف کیا ہو، ظلم کیا ہو، رفتار بدلی ہو، یا الٰہی حدود سے چشم پوشی و غفلت اختیار کی ہو یا شرع کی مخالفت کی ہو، تو اس کی برطرفی واجب ہے، اور اگر نہ مانے تو زبردستی ہٹا دیا جائے۔ یہ اکثر علماء کی رائے ہے۔ تفتازانی نے "شرح عقائد نسفیہ" میں روایت درج کی ہے، جس میں امام شافعی نے کہا ہے:

"انّ الامام یعزل بالفسق والجور۔"

امام، فسق و فجور اور ظلم کے نتیجہ میں برطرف ہوتا ہے۔

شہرستانی کا کہنا ہے:

"وان اظھر بعد ذلک جوراً اوضلالاً أو کفراً انخلع منھا اوخلعنا"

(نھایۃ الاقدام۔ صفحہ ۴۹۶)

اور اگر اس کے بعد (امام بننے کے بعد) وہ کسی طرح کے ظلم، گمراہی یا کفر کا مرتکب ہو، تو خود بخود برطرف ہوجائے گا، یا ہم برطرف کریں گے۔

امام غزالی کا کہنا ہے:

"السلطان الظالم علیہ أن یکفّ عن ولایتہ وھو اما معزل أو واجب العزل" (احیاء علوم الدین / جلد ۲، صفحہ ۱۱۱)

ظالم فرمانروا کو اپنی ولایت سے دست بردار ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ

اس کی حیثیت معزول یا واجب العزل کی ہے۔
رازی، آیہ مبارکہ "لا ینال عہدی الظالمین" کی تفسیر میں لکھتے ہیں :
"اِنّ الظالمین غیر مؤمنین علی اوامر اللّٰہ" (مفاتیح الغیب، جلد ا ص۱۴۳)
ظالم و ستمگر افراد اللہ تعالیٰ کے احکام پر ایمان نہیں رکھتے
اور اس سلسلے میں صاحبِ المواقف کا کہنا ہے :
"و یجب علی الامۃ خلع الامام الجائر و عزلہ" (المواقف، جلد ۸، ص۲۵۳)
جابر و ظالم امام کو برطرف کرنا امتِ مسلمہ کا فرض ہے۔
ابن حزم کی کتاب "الملل والنحل" میں یوں بیان ہوا ہے۔
فإن زاغ فی شئٍ منہا منع و أقیم علیہ الحدّ والحق، فإن لم یؤمن أذاہ إلّا بخلع خلع۔"
اور اگر احکام کے نفاذ میں (امام) ذرہ برابر کوتاہی یا انحراف اختیار کرے اسے منع کر دینا چاہیے، اگر نہ مانے تو مکمل طور پر برطرفی اس کی سزا ہے۔
قریب قریب تمام مذاہب کے فقہا نے اس طرح کے امام کی برطرفی اور عدم اطاعت پر اتفاق ظاہر کیا ہے۔ اسی طرح امر بہ معروف نہی عن المنکر کے سلسلے میں بھی سب نے متفقہ طور پر کہا ہے کہ اگر منکرات، تلوار کا سہارا لیے بغیر ختم نہ ہوں تو سہارا لینا واجب ہے۔ ابن حزم نے زور دے کر کہا ہے کہ یہ اہل سنّت اور بہت سے تابعین کا مذہب ہے۔ ان میں سے انس بن مالک، سعید بن جبیر، حسن البصری، الشعبی، محمد بن الحسن اور ان کے بھائی ابراہیم کا تذکرہ کرتے ہوئے مزید اضافہ کیا ہے :
یہ بھی وہی مسلک ہے جس پر امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور داؤد جیسے فقہا کی باتیں دلالت کرتی ہیں اور اس امر میں ہرگز اختلاف نہیں کہ جس چیز کی اجازت شریعت نہ دے اس کی اطاعت جائز نہیں۔
ارشاد خاتم المرسلین ہے :
السمع والطاعۃ علی المرء المسلم فیما احبّ او اکرہ مالم

یؤمر بمعصیة. فاذا امر بمعصیة فلا سمع ولا طاعة"
جس بات میں گناہ و معصیت کا حکم نہ ہو، خواہ وہ پسند ہو یا نہ ہو، مسلمان فرد پر اس کا سننا اور اطاعت کرنا واجب ہے لیکن اگر معصیت کا حکم ہو تو نہ سننا چاہیے اور نہ اطاعت کرنا چاہیے۔

اسی طرح:

"لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق۔"
جس حکم میں معصیتِ خالق ہو، مخلوق پر اس کی اطاعت واجب نہیں۔

غزالی نے اپنی کتاب "احیا" جلد دوم۔ صفحہ ۱۱۲، میں بیان کیا ہے:

"إنّ لك مع الامراء والعمال الظلمة ثلاثه احوال: الحالة الاولیٰ: وهی شرها۔ أن تدخل علیهم. والثانیة وهی: دونها، ان یدخلوا علیك. والثالثه وهی الأسلم: أن تعتزل عنهم فلاتراهم ولا یرونك۔"

جابر و ظالم امراء و حکام کی صحبت تمہارے لیے تین باتوں میں سے ایک بات کا اثر ضرور کرتی ہے۔ پہلی بات جو سب سے بری ہے وہ یہ کہ تم ان سے ملو۔ دوسری بات اس سے بڑھ کر ہے، وہ یہ کہ، وہ تم سے ملیں، تیسری بات جس میں سلامتی ہے، وہ یہ کہ تم ان سے اتنا دور ہو جاؤ کہ نہ تم ان سے اور نہ وہ تم سے مل سکیں۔

غزالی نے ظالم و جابر حکمرانوں کے بارے میں نبی کریمؐ سے منسوب حدیث شاہد کے طور پر نقل کی ہے:

"فمن نابذهم نجا، ومن اعتزلهم سلم أو كاد یسلم، ومن وقع معهم فی دنیاهم فهو منهم"
جس نے ان سے دوری اختیار کی اسے نجات مل گئی، اور جس نے انھیں چھوڑ دیا وہ بچ گیا یا بچ جائے گا، اور جو ان کی دنیا میں کھو گیا وہ انھیں میں شمار ہوگا۔

ظالم امام، اللہ عزاسمہ کے سامنے جوابدہ اور قیامت کے روز ملعون و مطعون ہے
حضرت خاتم الانبیاءؐ نے فرمایا ہے:
"کلکم راع و کل راع مسئول عن رعیتہ"
تم سب حاکم ہو اور ہر حاکم سے اس کی رعایا کے بارے میں جواب دہ ہونا ہے۔
ارشاد باری تعالیٰ ہے:
"..... فاحکم بین الناس بالحق ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ
ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید۔"
(سورہ ص/۲۶)
تم لوگوں کے درمیان بالکل ٹھیک فیصلہ کیا کرو اور نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو ورنہ یہ پیروی تمہیں خدا کی راہ سے بہکا دے گی۔ اس میں شک نہیں کہ جو لوگ خدا کی راہ سے بھٹکتے ہیں ان کی بڑی سخت سزا ہو گی۔
اور حدیث میں وارد ہوا ہے:
"مامن وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ"
ارشاد رب العزت ہے:
"ومن لم یحکم بما انزل اللہ فأولئک ھم الظالمون"
(المائدہ /۴۵)
اور جو شخص خدا کی نازل کی ہوئی (کتاب) کے موافق فیصلہ نہ دے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔

(۹) حکومت پر رعایا کے حقوق:

والیانِ امر کو چاہیے کہ وہ انفرادی و اجتماعی صورتوں میں رعایا کے خدمت گار کے طور پر اپنے فرائض انجام دیں، تقویٰ کی بنیاد پر بلا امتیاز سب رعایا کے حقوق

گی نگہداشت کریں اور ان میں انصاف قائم رکھیں۔ مرد ہوں یا خواتین حکومت سب کے لیے وہ امکانات فراہم کرے، جن کے ذریعے لوگ اپنی گھریلو، سماجی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی سرگرمیاں جاری رکھ سکیں نیز جائز آزادی کا لطف اٹھا سکیں۔ عوام میں سے ہر فرد کو اس من پسند کام یا نوکری انتخاب کرنے کا حق حاصل ہو، جس سے اس کی زندگی سنور سکے اور وہ عزت، سکون اور چین کے ساتھ زندگی گذار سکے۔ اسی طرح اچھی تربیت و تعلیم اور امن وامان کے امکانات فراہم کرنا چاہیے۔ علم کا حصول اور اس کی اشاعت ہر صاحب استطاعت پر فرض ہے اور فقیر، مسکین، بے روزگار افراد کے لیے روزی، روٹی، کپڑا، مکان، یہاں تک کہ نقل و انتقال کا مفت انتظام کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اسی طرح عوام میں سے ہر فرد کو "لا تظلمون ولا تظلمون"۔ "لاضرر ولاضرار" اور "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کی رو سے یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار، اپنی شخصیت، عزت، ثروت، مقام و مرتبے کی حفاظت کر سکے تاکہ زندگی اور اس کے بعد تک اس کی انسانیت محترم شمار ہوتی رہے۔

(۱۰) غیر مسلم افراد کے حقوق:

عام انسانی اخوت و برادری کے اصول (جس کو سب سے پہلے اسلام نے وضع کر کے اعلان کیا اور لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول کرائی) کے مطابق اسلامی حکومت میں غیر مسلم افراد کو اپنے مسلمان بھائیوں کی طرح شخصی، مذہبی، سیاسی، اقتصادی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیاں جاری رکھنے کی آزادی حاصل ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اسلام کی حرمت، تقدس اور ہیبت پر اثر انداز نہ ہوں۔ وہ لوگ حکومت کے وضع کردہ قوانین کے دائرے میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھ سکتے ہیں۔ صدارت اور اعلیٰ عہدے (جن کا تعلق حکومت کے امن و امان سے ہے) کے علاوہ ہر طرح کے کام اور نوکریوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے ملی ہوئی آزادی، حقوق اور امن وامان کے بدلے انھیں امداد کے طور پر حکومت کو زکاۃ کی جگہ جزیہ دینا ہوگا۔ غیر مسلم افراد سے متعلق اسلامی قانون کے مطابق تمام غیر مسلم افراد جزیرۂ عرب کے علاوہ (جس کے بارے میں روایت ہے: لایجتمع دینان فی الجزیرۃ العربیۃ " اپنی مذہبی سرگرمیاں جاری،

عبادت گاہیں قائم اور رسومات بجالانے کی اجازت ہے بشرطیکہ دین حنیف اسلام کی حرمت یا عظمت وہیبت پر آنچ نہ آنے پائے۔ غیر مسلم افراد کے معتقدات کی بھی اپنی حرمت ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں یوں ہوا ہے :

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا"

(الانعام/۱۰۸)

اور یہ (مشرکین) جو اللہ کے سوا (خدا سمجھ کر) عبادت کرتے ہیں انھیں تم برا نہ کہا کرو ورنہ یہ لوگ بھی خدا کو بے سمجھے بوجھے عداوت کی بنا پر برا بھلا کہہ بیٹھیں گے۔



جناب سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

فقہ جعفری کی اساس و ہیئت اور اجتہاد

اسلام میں حاکمیت کا حق صرف اللہ کو ہے اور مسلمان صرف احکام خدا کی اطاعت کو دینی طور پر واجب جانتا ہے غیر اللہ کی اطاعت جرم ہی نہیں بلکہ کہیں کفر ہے کہیں نفاق ہے۔ کہیں عصیان و نافرمانی ہے اللہ ہی خالق و مالک اور وہی حاکم و مولیٰ ہے۔ سورۃ الاعراف کی آیت نمبر ۵۴ ہے:

الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العالمین

اللہ کی خصوصیات و امتیازات ہی میں سے نہیں بلکہ صرف اور صرف اسی کے ساتھ مختص ہے۔ وہ رب العالمین ہے اور برکت والا ہے۔ حاکمیت الٰہیہ کی تفصیلات قرآن مجید میں موجود ہیں مسلمان ان تمام تعلیمات کو تسلیم کرنے کے بعد کہتا ہے لا الہ الا اللہ۔ کوئی معبود، کسی کلی یا جزوی اطاعت کے قابل نہیں، بلکہ کوئی کسی طرح کا معبود ہے ہی نہیں۔

معبود و قابل اطاعت کاملہ صرف وحدہٗ لاشریک اللہ ہے۔ سورۂ یوسف میں دو جگہ اور سورۂ انعام میں واضح طور پر فرمایا: ان الحکم الا للہ اور سورۂ انعام ہی کی آیت نمبر ۶۲ میں یہی بات دوسری تنبیہ و تاکید میں یوں آئی ہے: "الا لہ الحکم وھو اسرع الحاسبین"۔

"یاد رکھو توجہ اور دھیان دو حکم صرف اللہ ہی کا ہے۔ وہ بہت جلد اور بہت تیزی سے حساب لینے والا ہے۔"

اللہ نے اپنی حاکمیت کے قیام و دوام کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا، اور قرآن نازل کیا اس لیے نہیں کہ وحی لوگوں کو سنا کر اور پیغام الٰہی پہنچا کر چلے آئیں۔ آپ کا فرض منصبی آیات

سنانا ضمیر و نفسیاتِ انسانی کو پاک بنانا قرآن مجید کی تعلیم دینا اور حکمت سے آشنا کرتا تھا۔

لقد من اللہ علی المؤمنین اذ بعث فیھم رسولا انفسھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکیھم ویعلم الکتاب والحکمۃ وان کانوا لفی ضلال مبین (۶۴)

ترجمہ: یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا، کہ ان میں ایک رسول خود ان میں سے بھیجا، وہ ان کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت فرماتا، انھیں پاکیزہ بناتا اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ لوگ پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

محمد رسول اللہ ۔۔۔ کا مطلب ۔۔۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فقط پیغام رساں ہونا ہی نہیں بلکہ وہ اللہ کے آخری نمائندۂ خاص اور حکومت الٰہیہ کے سربراہ ہیں۔

انا انزلنا علیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (۱۰۵)

ترجمہ: ہم نے تم پر کتاب برحق نازل کی تاکہ تم لوگوں میں فیصلہ کرو جو اللہ نے تمھیں دکھایا، اس کی روشنی میں۔

امورِ حکومت بلکہ ہر معاملے میں آپ کی بات کو اپنی بات قرار دے کر نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک کو تمام بندوں سے بلند ترین اور تقرب خاص کی عظیم ترین منزل پر سرفراز فرمایا۔

وماینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی (النجم ۳-۹)

ترجمہ: وہ خواہش سے تو بات کرتا ہی نہیں، اس کی بات تو فقط وہی وحی ہے جو اسے خدا کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔

اور ہم سب کے بارے میں سورۃ النساء میں ایک کلیہ بتایا:

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم، ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (۶۵)

ترجمہ: تو، قسم ہے تیرے رب کی۔ جب تک وہ اپنے باہمی اختلافات میں تجھے اپنا حکم نہ مان لیں اور تیرے کئے ہوئے فیصلے پر تنگی دل محسوس نہ کریں اور کماحقہٗ اسے تسلیم نہ کریں اس وقت تک وہ مومن ہی نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے:

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء، آیت ۶۴)

ترجمہ: اور ہم نے کسی رسول کو بھیجا ہی نہیں مگر اس لیے کہ حکمِ خدا سے اس کی فرمانبرداری کی جائے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

ترجمہ: اور (اس) رسول کی جو بھی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

پھر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو اپنی آخری کتاب، اپنے کامل و اکمل دین اور اپنی حاکمیتِ مطلقہ کو نافذ و غالب بنانے کے لیے بھیجا:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔ (الصف ۹)

ترجمہ: وہی ہے جس نے اپنے اس رسول کو ہدایت اور دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ تمام ادیان پر اسے غلبہ دے۔ خواہ مشرک اس بات کو ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔ اور حکم عام دیا:

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران/۳۱)

ترجمہ: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو میری (محمدؐ) کی اطاعت کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا (الحشر ۷)

ترجمہ: اور رسولؐ جو بھی تمہیں دیں وہ قبول کرو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔ اس کے بعد ہر فیصلے میں حکمِ خدا کے خلاف اور قرآنِ حکیم سے روگردان رائے دینا کفر و ظلم ہے۔ مسلمان کا طریقہ گردن جھکانا اور فرمانِ خدا بجالانا ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (المائدہ/۴۴)

ترجمہ: اور جس نے بھی اللہ کے نازل کردہ (احکام) کے خلاف فیصلہ کیا وہ ظالم لوگ ہیں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون (المائدہ/۴۵)

ترجمہ: اللہ کے نازل کردہ احکام کے خلاف جس نے بھی فیصلہ کیا وہ ظالم ہے، اور اسی سلسلے کی یہ آیت بھی اصولی اور آئینی حیثیت رکھتی ہے:

لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون (ھود/۱۱۳)

ترجمہ: جن لوگوں نے ظلم کیا، ان کی طرف نہ جھکو پھر تم کو آتشِ جہنم پکڑے گی، اور اللہ کے علاوہ تمہارے مددگار بھی نہیں۔

ان آیات سے کم از کم یہ بات ضرور معلوم ہوئی کہ غیر اسلامی افکار، فلسفہ اور قانون کی طرف جھکاؤ اور غیر اللہ کے بتلائے ہوئے قانون کی طرف استناد مسلمان کا شیوہ نہیں، جب اسے جامع اور کامل نظامِ حکمرانی مل چکا، جب اسے ہمہ جہاتی فلسفہ، فکر و عمل دے دیا گیا، جب اس کے پاس بے عیب و خلل قانون موجود ہے تو پھر غیر اللہ کی طرف جھکنا کیسا؟ اور غیر از رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کسی کی بات ماننے کے لیے جواز کیا ہے؟ بلاشبہ انسان اور معاشرہ، ضروریات اور افکار کا پھیلاؤ دن بہ دن بڑھ رہا ہے اور اسلام ان پر بندش بھی نہیں باندھتا۔ اس نے ترقی سے کب روکا ہے، وہ تو انسان کو نفس و آفاق کی وسعتوں کا حامل جانتا اور ہر آن مطالعہ و مشاہدہ کی دعوت دیتا ہے۔ لیکن دنیا کے کسی دانشور نے دنیا کے کسی نظام نے، دنیا کے کسی منکرِ ربوبیت فلسفے نے بھی یہ نہیں کہا کہ آدم زاد شترِ بے مہار ہے۔ جن لوگوں کی نظر مادی فلسفے پر مبنی نظامہائے زندگی و حکومت پر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس نظام میں انسان کو لمحے لمحے اپنے دائرے سے باہر قدم نکالنے کا بھی حق حاصل نہیں ہے۔

اسلام تا قیامت رہنے والا دین ہے۔ اس میں ہر تبدیلی کا خیر مقدم، ہر علمی اور سائنسی عمل کا جواز اور ہر قسم کی معلومات حاصل کرنے کی ہمت افزائی ہے۔ پذیرائی، اجازت اور تشویق کے ساتھ اصولوں کی نگہداشت اور قوانین کی پابندی نہ ہوتی تو نظام و فلسفہ باطل ہو جاتا۔ دستور و قانون کی عملداری برقرار رکھنے، عجلت پسندی، لذت دوستی، اپنی بھلائی چاہنے، اور دوسروں کے حقوق چھین لینے کی ہوس پر کڑی نظر رکھنے، ہر شخص کے آقا بننے اور دوسروں کو غلام بنانے کی روک تھام کے لیے نظامِ عدل کو جاری رکھنے اور اللہ کی حکومت برقرار رکھنے کے لیے تفقہ فی الدین۔ دین فہمی۔ اور اجتہاد کی اجازت دی۔ اور ماحول و ضروریات کی تبدیلی کے وقت صحیح فیصلہ کرنے اور نئی اقدار پر ہر چیلنج قبول کرنے بلکہ خود چیلنج کرنے کو ایک انجمن، ایک ٹیم، ایک گروہ اور ایک جماعت ہر زمانے کو ہمہ وقت تعلیم و تعلم کا پابند کیا۔

فہمِ دین اور دین شناسی کا عمل ایک لمحے کے لیے معطل نہیں ہو سکتا۔ پھر دین شناسی ایک ذات یا چند افراد کا نجی عمل نہیں بلکہ اس کی ذمہ داری اس کے علم کا ابلاغ، حکم کی ترویج اور قانون کا نفاذ اجتماعی

ذمہ داری ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۱۲۲ :

وما کان المؤمنون لینفروا کافۃ فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

ترجمہ: مومنوں کے لیے یہ مناسب نہیں کہ سب کے سب جہاد کے لیے نکل پڑیں اور (بقیہ لوگ اس لیے) رہ جائیں کہ دین کے معلومات (دین شناسی) حاصل کریں۔ اور جب (جانے والے) واپس آئیں ان کے پاس تو یہ اپنی قوم کو (محرمات اور برے کاموں سے) ڈرائیں تاکہ وہ بچتے (اور احتیاط کرتے) رہیں۔

جنگ جیسی ہنگامی حالت میں تفقہ فی الدین کی خاطر کچھ لوگوں کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں رہنا اور دین کو سمجھنا، پھر فوج کی واپسی پر انہیں امر و نہی، تعلیم و تنبیہ، سیاست و ریاست کے معاملات اور قابلِ احتیاط امور سے متنبہ کرنا اس آیت کا حکم ہے۔ اس سے اجتہاد کا رجحان اور مجتہد کا منصب معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ ہادیِ امت، رسولِ اعظم، نبیِ خاتم، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دن رفیقِ اعلیٰ کے پاس جانا تھا۔ اس لیے آپ نے تعلیمات کی علمی اور عملی توضیح و تشریح کے لیے شریعت کو تحریف و تخریب سے بچانے کے لیے ایک ذمہ دار فرد ایک تربیت یافتہ شخص یعنی اپنا خصوصی ترجمان اپنی فکر و روح کا متبادل امت کو نگرانی کے لئے چھوڑنا چاہیے تھا۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

"فاطمۃ بضعۃ منی"۔ "یا علی انت منی وانا منک" اور امام حسنؑ کے لیے فرمایا "ھذا منی" امام حسینؑ کے لیے فرمایا "حسین منی وانا من الحسین"۔ لہٰذا ہم ان حضرات کو نمائندۂ سنت جانتے ہیں اور عینِ سنت مانتے ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اسلامی قانون مستمر و جاری ہے، کائناتی تغیرات اور معاشرتی عروج و زوال سے پیدا ہونے والے مسائل کے لیے قانون کے قطعی اصول موجود ہیں جن کی بنیاد پر حلِ مسائل ہر لمحے آسان ہے۔ لہٰذا اجتہاد زندہ اور اس کا عمل مسلسل ہے اس عمل کے بنیادی مآخذ اور ان سے استنباط کی نوعیت کا تعارف یہ ہے :

مآخذ، تعارف و حدود

کتاب ۔ قرآنِ مجید بلاشک و شبہ احکامِ خدا کا پہلا سرچشمہ اور اولین مآخذ، کتاب خدا ہے علماء کے اندازے میں تقریباً چھ سو آیتیں احکام پر مشتمل ہیں۔ فقہاء نے ان آیتوں کی تفسیر فقہی لکھی ہے مشہور کتابوں میں قطب الدین، ابوالحسن، سعید بن ہبۃ اللہ راوندی (م ۵۷۳) کی فقۃ القرآن اور فاضل مقداد سیوری کی "کنز العرفان" اور مقدس اردبیلی ملا احمد بن محمد (متوفی ۹۹۳) کی "آیات الاحکام" قابلِ توجہ ہیں۔ تمام فقہا استنباطِ احکام اور دلائلِ فتویٰ میں قرآن کو سب سے پہلے دیکھتے ہیں اور اس سے رجوع کرتے ہیں۔

سنت ۔ گفتار و کردار، عمل و تائیدِ معصوم۔ یعنی اگر یہ ثابت ہو جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی حکم دیا، یا کوئی کام انجام دیا۔ یا کوئی عمل معین انداز سے کیا۔ یا لوگوں نے کوئی کام انجام دیا اور حضورؐ نے اس پر ٹوکا نہیں بلکہ بظاہر اس پر راضی رہے تو یہ بات ہر مسلمان کے لیے حجت اور حکم قطعی کی حیثیت رکھتی ہے۔

سنت کے تین مراحل ہیں:

(الف) قول و فعل و تقریر (تصدیق و تائید) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

(ب) نقل، قول و فعل و تقریرِ رسول اللہ از معصوم و ائمہ اہل بیت علیہم السلام۔

(ج) قول و فعل و تقریرِ معصومینؑ

پہلی صورت بلا اختلاف سند ہے۔ قرآنِ مجید کے واضح حکم اور احادیث و عمل صحابہ و اہل بیتؑ اس پر دلیل ہے۔

دوسری صورت بھی عموماً تسلیم کی گئی ہے۔

تیسری صورت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت فاطمہ زہراؑ نیز ائمہ اثناعشر علیہم السلام کی حدیث؟ تو قرآن و حدیث نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کا واجب الاتباع ہونا ثابت ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم (النساء ۵۹)

ترجمہ: ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور اولی الامر کی جو تم میں سے ہیں۔

(الف) ائمہ اہل بیتؑ کی عصمت، کیونکہ وہ قرآن مجید کے ساتھی ہیں اور دونوں میں جدائی ممکن نہیں۔

(ب) قرآن کی طرح ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے تمسک واجب ہے ان کی بات سچی اور ان کا کام قرآن کا ترجمان ہے۔ ان کی تعلیمات پر عمل فرض ہے۔ لہذا ان کے الفاظ یا قرآن سے مربوط ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے، خود ائمہ علیہم السلام نے بھی یہی فرمایا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے ارشاد فرمایا میری حدیث میرے والد کی حدیث ہے اور میرے والد کی حدیث میرے جدّ بزرگوار کی حدیث، ان کی حدیث امام حسینؑ کی حدیث امام حسینؑ کی حدیث امیر المومنینؑ کی حدیث اور انکی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے۔ اور حضورؐ کی حدیث خداوند عالم کی بات ہے۔ (اصول کافی جلد ۱، باب روایۃ الکتب)

سنّت مسلسل سند اور راویوں کے ذریعے ہم تک پہنچی اور ہم احکام میں بے چون و چرا ان روایتوں پر مکمل اعتماد کرتے ہیں جو قطعی اور متواتر ہوں ظنی خبر یعنی خبر واحد حجت ہے یا نہیں؟ خبر واحد سے حکم خدا اور رسولؐ ثابت ہو سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک بحث طلب بات ہے۔ ہمارے علماء کا طریق کار یہ ہے کہ وہ حدیث صحیح و مؤثق پر بھروسہ کرتے ہیں۔ حدیث کے بہت سے مجموعے ماخذ و مصدر کے طور پر موجود ہیں۔ ہر روایت راوی کی انفرادی صفات اور متن کی ساخت کے لحاظ سے چھانی پھٹکی اور کسوٹی پر کسی جاتی ہے۔ فقیہ کے لیے ضروری و لازم ہے کہ وہ فنِ درایت و علم رجال سے کماحقہ واقف ہو، اور حدیث پر عبور رکھتا ہو، فہم قرآن کی طرح فہم حدیث بھی انتہائی نازک و دشوار ہے۔ فہم قرآن مجید کے لیے لغت و معانی و بیان و صرف و نحو جیسے مقدماتی علوم سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد چند دوسرے مقدمات کا اضافہ مطالعہ حدیث کے لیے ناگزیر ہے۔ درایت و روایت، رجال و سند پر نظر کے بعد الکافی، من لایحضرہ الفقیہ۔ تہذیب الاحکام۔ الاستبصار فیما اختلف من الاخبار۔ اور۔ وسائل الشیعہ الی مسائل الشریعۃ ـــ مصادرِ مہمہ کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ حدیث کے مجموعے اور سنّت کے جوامع فقہیہ مانے گئے ہیں۔ لیکن مجتہد انھیں پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ ہر وقت حدیث کو تلاش اور ان پر بحث و نظر کرتا رہتا ہے۔ موضوع، مسائل اور دلائل کی جستجو اس کا منصب ہے۔

اجماع : قرآن و سنّت کے بعد فتویٰ کا تیسرا مآخذ، اصولِ فقہ میں تیسری دلیل شرعی اجماع ہے۔ چونکہ حقِ تشریع صرف اللہ کو ہے۔ تشریح و تعینِ احکام رسول کا کام ہے۔ اس لیے ایک شخص کوئی ذاتی فیصلہ کرے یا قوم مل کر اتفاقِ رائے کرے دونوں طرح، حلالِ خدا حرام اور حرامِ خدا حلال نہیں ہو سکتے۔ اور کسی طرح قانونِ خدا پر بالادستی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ قرآن و سنّت کے مقابلے میں حکم کا سوال نہیں، البتہ جہاں ہمیں حکمِ مسئلہ کتاب و سنت سے نہ ملے وہاں کلیاتِ کتاب و سنّت دستگیری کرتے ہیں۔ .... اس زاویے سے کتاب و سنّت سے سند نہ ملے تو علماءِ اسلام کا ایسا اتفاق جس سے شارعِ اسلام کی تائید کا انکشاف ہوتا ہو، علمائے اسلام کا ایسا اتفاق ممکن ہی اس وقت ہوگا جب نبی یا امام کا اشارہ ہو اور ایسا نہ ہو تو اجماع بے سود۔ ہمارے فقہا و اصولیین نے اس کے وقوع و عدمِ وقوع امکان و عدمِ امکان اور اقسام پر طویل اور نتیجہ خیز بحث کی ہے۔ اساسِ قبول استناد الی المعصوم ہی ہے اور:

الف۔ اجماعِ علماء وہی حجت ہے جو پیغمبر یا امام کے زمانے میں ہو، اگر ہمارے زمانے میں کسی مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو بعد والوں کے لیے حجت نہیں ہوگا۔

ب، اجماع بحیثیت اتفاقِ آراءِ علماء حجت نہیں اس کی حجیّت کاشفِ قولِ نبی و امام کی بنیاد پر ہے۔

عقل : فقہی مسائل کو حل کرنے اور حکمِ خدا و رسول معلوم کرنے کا چوتھا ذریعہ عقل ہے۔ لیکن عقلِ سادہ کار، عقلِ ہوس پیشہ، اور عقلِ عام و عوام کے بجائے عقلِ تربیت یافتہ، عقلِ پختہ کار، علومِ قرآن و حدیث۔ وہ عقل جو قرآن و سنت میں زیرِ نظر ہے۔ وہ عقل جس کی تعریف خدا اور رسول نے کی ہے جیسے نزاکتوں کا احساس، اور بندگی کا ادراکِ تام ہو۔ جو حسن و قبحِ اشیاء میں مسلکِ معصومین کو مانتی اور جبر و اختیار میں راہِ حق پر چلتی ہو۔ جو کتاب و سنّت کے زیرِ اثر رہ کر خود انہی دو سندوں سے کلیات و اصول مانگ کے جزئیات کی تطبیق کرے۔ اسی پس منظر میں "دلیل عقلی" کی تعریف یہ ہے:

بالفاظ محمد تقی الحکیم :

"حکم عقلی یوصل بہ الی الحکم الشرعی و ینتقل من العلم بالحکم الی العلم بالحکم الشرعی" (الاصول العامۃ للفقہ المقارن ص ۲۸۰)

ڈاکٹر رشدی کے الفاظ میں :

والدلیل العقلی ھو عبارۃ عن کل حکم للعقل یوجب القطع بالحکم الشرعی او کل حکم عقلی یتوصل بصحیح النظر فیہ الی حکم شرعی۔

(العقل عند الشیعہ الامامیہ ص ۳۳۳)

بالفاظ شہید مرتضی مطہریؒ:

اگر در موردی عقل یک حکم قطعی داشت آن حکم بہ حکم این کہ قطعی و یقینی است حجت است (آشنائی با علوم اسلامی، اصول فقہ، فقہ ص ۱۶)

یعنی وہ حکم عقل جس سے حکم شرع کے بارے میں قطع و یقین کامل حاصل ہو یا ہر وہ حکم عقلی جو صحیح بحث و نظر کے ذریعے علم و حکم شرعی تک پہنچائے حجت ہے۔

ظاہر ہے کہ عقل معطل نہیں ہے۔ اصول دین عقل سے مانے جاتے ہیں اور فہم معانی کتاب و سنت عقل پر موقوف ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ فقہ میں عقل کو دینے سے روکا جائے جس طرح ہر علم و فن میں اختیارات عقل محدود ہیں، اسی طرح فقہ میں استدلال و برہان عقلی سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ فلاں مقام پر حکم وجوب ہے یا حکم تحریم یا فلاں حکم کیونکر ہے اور کیونکر نہیں ہے۔ علم اصول فقہ میں عقل سے مربوط اصول دو حصوں میں بانٹے گئے ہیں:

(۱) فلسفہ احکام — یعنی ملاکات و مناطات احکام۔

(۲) لوازم احکام — یعنی ایک حکم اور کچھ عمل اصل حکم کی تعمیل سے پہلے یا بعد انجام دینے کا عقل مطالبہ کرتی ہے۔

۱۔ چونکہ شیعوں کے نزد احکام شرعی تابع سلسلہ مصالح و مفاسد اور واقع میں ہر حکم شرعی ایک لازم الاستیفا پر مبنی ہے۔ اور ہر شرعی ایک مفسدۂ لازم الاحتراز کی خبر دیتی ہے۔ انسانی سعادت کے لئے اللہ نے حقیقی مصلحتوں کا ایک سلسلہ واجب یا مستحب قرار دیا۔ اور ایک سلسلہ مفاسد سے دور رکھنے کے لیے حرام و مکروہ قرار دیا ہے۔ اگر وہ مصالح و مفاسد حقیقی نہ ہوتے تو امر و نہی نہ ہوتی امر و نہی کو اصل حکمت اگر انسان کو معلوم ہو جائے تو ہر عاقل شخص اس کے بارے میں وہی حکم دے جو شریعت میں دیا گیا ہے۔

علماء و کلام دونوں کہتے ہیں، چونکہ احکام شرعی حکمت و مصلحت و مفسدہ کے تابع ہیں خواہ

ان کا تعلق جسم سے ہو یا جان سے۔ فرد سے ہو یا معاشرے سے، حیات باقی سے ہو یا حیات فانی سے لہذا جہاں حکمت ہوگی وہاں اسی کی بنیاد پر حکم بھی ہوگا جہاں وہ حکمتیں نہ ہوں گی وہاں احکام شرعی بھی نہ ہونگے فرض کیجئے مورد ایسا ہے جہاں (کتاب و سنت کی) دلیل نقل موجود نہیں اور حکم شرعی معلوم کرنا ہے۔ اس موقع پر عقل سے رجوع کریں گے۔ عقل جب مصالح مفاسد اور مورد (مسئلہ زیر بحث) میں ایک حکمت دریافت کر لیتی ہے تو ہم ایک دلیل عقلی قائم کریں گے۔

الف ۔ فلاں مسئلہ میں فلاں مصلحت لازم الاستیفا موجود ہوتی ہے ۔ (صغریٰ)

ب ۔ جہاں مصلحت لازم الاستیفا موجود ہوتی ہے۔ شارع وہاں خاموش نہیں رہتا اور اسے حاصل کرنے کا حکم دیتا ہے۔

ج ۔ لہذا مسئلہ زیر نظر میں امر موجود ہے ۔ (نتیجہ)

مثلاً شارع کے زمانے میں افیون کی عادت نہ تھی اس کا استعمال معلوم نہ ہوا تھا ہمارے پاس ادلّہ نقلیہ موجود نہیں ہیں۔ لیکن مشاہدہ سے عقلی و تجرباتی طور پر اس کے مفاسد معلوم ہو چکے ہیں دوسرے لفظوں میں ہمارے علم و عقل نے ایک "ملاک" یعنی مفسدۂ لازم الاحتراز دریافت کر لیا ہے، یعنی انسان کے لئے جو شئے مضر اور مفسدہ ہو شرعی طور پر حرام ہے ۔ اگر سگریٹ کے لیے ثابت ہو جائے کہ سرطان پیدا کرتی ہے تو مجتہد حکم عقلی کی بنا پر سگریٹ کی حرمت کا فتویٰ دے سکتا ہے۔ لیکن یہ حکم اس کا ذاتی حکم نہیں ہوگا بلکہ حکم شارع ہوگا۔ شرط یہی ہے کہ عقل مصلحت لازم الاستیفا یا مفسدہ لازم الاحتراز قطعی و یقینی طور پر معلوم کرے اور "ملاک" "مناط" میں شک و شبہ محسوس نہ کرے۔ اگر ظن و تخمین ظنی خیال ہو تو وہ مقام قیاس ہے محل حکم عقلی ہیں اور شیعہ ایسے مسئلہ میں ایسی دلیل کو دلیل نہیں مانتے۔ جس طرح مناط حکم (مصلحت) معلوم کر کے حکم دریافت کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مصلحت کا تعین کیا جاتا ہے۔ اور عقل حکم کرتی ہے ۔ اگر مصلحت نہ ہوتی تو فلاں چیز حرام اور فلاں عمل واجب نہ ہوتا حکم شرعی مصلحت یا مفسدہ کا انکشاف کرتا ہے۔ خواہ اس کی تہہ کو نہ پہنچ سکیں۔

(۳) استعمال دلیل عقلی کے مسائل و احکام کا دوسرا حصہ لوازم احکام ہے ۔ یعنی حاکم عاقل جو حکم دیتا ہے۔ اس کی بجا آوری کے لیے لوازم کا مہیا کرنا عقلی طور پر واجب ہے ۔ حج واجب کیا گیا شارع نے اس سلسلے میں پاسپورٹ، ویزے، ٹکٹ، راستے ۔ ٹیکے، کرنسی کو تبدیلی کے لیے الگ الگ حکم نہیں دیئے

مگر شارع کی اطاعت تسلیم کرنے والی عقل بطور قطعی حکم دیتی ہے، کہ مندرجہ بالا لوازم و مقدمات کا حکم بھی پہلے حکم کے ضمن میں ہوگا یہ کام بھی عقل کا ہے کہ اصل حکم کے لوازم کا تعین کرے کہ فلاں چیز لوازم میں ہے یا نہیں۔

واجب میں لوازم کا حکم کیا ہے۔ حرام میں لوازم و مقدمات کا حکم کیا ہے عقیدہ واجب اور مقدمہ حرام حرام ہے یا نہیں۔

ایک اور مسئلہ دیکھئے.... انسان بیک وقت دو متضاد کام نہیں کرسکتا۔ مثلاً نماز صبح اور تطہیر مسجد۔ نماز بھی واجب اور معلوم شدہ نجس مسجد کی تطہیر بھی واجب ہے۔ اور وقت اتنا ہے کہ ایک کام ہی کرسکتا ہے۔ بلکہ ایک کام مستلزم ترک دیگر ہے۔ لہٰذا عقل فیصلہ کرے گی کہ امر شئی مستلزم نہی ضد ہے یا نہیں اور ایک کا حکم اضداد کے لیے نہی کا حکم چاہتا ہے یا نہیں۔

تیسرا مورد۔ دو واجب بجالانے میں اور دونوں ایک وقت میں ادا نہیں ہوسکتے تاہم مجبور نہیں کہ دو میں سے ایک بجالائیں اس صورت میں اگر ایک اہم ہے اور دوسرا واجب اہم تر تو کس کا انتخاب اور کس پر عمل کیا جائے؟ اور اہم تر سے تکلیف متعلق ہونے کی صورت میں اہم کی تکلیف ساقط ہوجائے گی؟ یا سقوط تکلیف بہ اہم اس وقت ہے جب اہم تر کو بجالانے میں مصروف ہوجائیں؟ اس بحث عقلی سے ایک اور اساسی مسئلہ وابستہ ہے کہ اگر ہم دونوں واجب بجا نہ لائے تو دو گناہ ہوئے یا ایک گناہ کیا مثلاً دو شخص ڈوب رہے ہیں ہم دونوں کو نہیں بچاسکتے ایک کا بچانا ممکن ہے ایک متقی خدا ترس ہے دوسرا فاسق، موذی دونوں کی جان محترم ہے۔ اب مومن و متقی اور خدمت گذار خلق کو بچائیں کہ اس سے پاس پڑوسیوں کو فائدے پہنچتے ہیں یا دوسرے کو ایک اہم اور دوسرا اہم تر ہے، اگر غفلت برتی اور دونوں ڈوب گئے تو دونوں خون کیے یا ایک مومن کی جان ضائع ہونے کا جرم لکھا جائے گا اور دوسرے شخص کی ہلاکت میں مقصر نہ قرار پائیں گے۔

چوتھا مسئلہ: ایک کام دو مختلف زاویوں سے واجب بھی ہوسکتا ہے اور حرام بھی یا نہیں؟ جب کہ ایک عمل ایک جہت اور ایک زاویے سے حرام و واجب نہیں ہوسکتا ہے۔ مثلاً مال غیر میں بغیر اجازت تصرف اس حیثیت سے کہ مال غیر ہے حرام و واجب دونوں ہو ممکن نہیں لیکن ایک صورت اور بھی ہے، جیسے نماز پڑھنا واجب ہے۔ لیکن یہ نماز آدمی کی زمین پر بغیر اجازت تصرف مال غیر کی حیثیت سے حرام ہے یا نہیں؟ ابھی یہ بات زیر بحث نہیں کہ شارع نے جائے نماز کے مباح ہونے

کی شرط لگائی۔ زاویۂ بحث نماز اور تصرف و مال غیر میں ہے۔

ان چاروں مسائل میں فقہا نے بڑی دقیق بحث کی ہے اور ان کے لیے جو عقلی کلیات مباحث میں ان کا مختصر حوالہ یہ ہے۔ مسئلہ اوّل کا تعلق ہے کلیّہ "امر شی مقتضی نہی عن الضد" سے ہے۔ تیسرا مسئلہ بحث مرتّب کے ذیل میں آتا ہے اور چوتھا اصول استنباط کے ضمن میں۔ مجموعی طور پر اصل دلائل دو طرح کے ہیں۔

نقل : کتاب و سنت و اجماع اور عقل جس میں صرف عقلی کلیات و مباحث داخل ہیں استنباط حکم کی دوسری شاخ اصول عملیہ ہیں۔ فقیہ استنباط حکم شرعی میں ادلّہ اربعہ سے رجوع کر کے اکثر و بیشتر تکلیف شرعی معلوم کر لیتا ہے۔ لیکن کبھی حکم خدا معلوم کرنے میں ناکام بھی رہتا ہے آخری صورت میں اسے کیا کرنا چاہیے؟ آیا شارع اور عقل یا دونوں نے اس کی تکلیف حقیقت و واقع میں متعین کی ہے، یا نہیں؟ اگر تکلیف متعین کی ہے تو وہ کیا ہے؟ شریعت اسلامیہ کے کامل و مکمل اور ابد تک رہنے کا ثبوت یہ ہے کہ شارع نے ایسے قواعد و ضوابط متعین کیے جو ہر مرحلے میں رہنمائی کرتے ہیں اور جواب دیتے ہیں کہ ہاں فریضہ معین ہے۔ کچھ ایسے مواقع ہیں جہاں عقل بھی حکم شرع کی تائید کرتی ہے۔ یعنی مستقل حکم عقل عین حکم شرع ہوتا ہے۔ اور کہیں عقل خود ساکت اور تابع شرع ہوتی ہے۔ وہ قواعد و ضوابط و دستور جو مذکورہ بالا مقامات پر رہنما اصول کا کام دیتے ہیں، چار ہیں:

۱۔ اصلِ برأتِ ذمّہ : یعنی اصولاً ہمارا ذمہ آزاد ہے۔ اور ہم پر کوئی فرض عائد نہیں ہے۔

۲۔ اصلِ احتیاط : یعنی اصولاً ہم وہ عمل کریں جو حکم واقعی و نفس الامری کے مطابق انجام پائے۔

۳۔ اصل تخییر : یعنی اصولاً مکلف دو تکلیفوں کے وقت کسی ایک کو اختیار کرنے میں آزاد ہے۔

۴۔ اصل استصحاب : یعنی اصل یہ ہے کہ جو پہلے تھا وہی حالت باقی ہے اور اس کے خلاف کوئی حالت طاری نہیں ہوئی۔

ان میں سے قاعدۂ "استصحاب" خالص شرعی ہے اور باقی تین اصول عقلی ہیں لیکن

شرعاً ان کی تائید موجود ہے۔ استصحاب کے بارے میں متعدد احادیث معتبرہ میں سے ایک حدیث ہے "لا تنقض الیقین بالشک" یقین شک سے باطل نہیں ہوتا۔

اصل برأت پر حدیث ہے:

رفع عن امتی تسعة: ما لا یعلمون، وما لا یطیقون و ما استکرھوا علیہ، وما اضطروا الیہ والخطا والنسیان والطیرۃ والحسد والوسوسة فی التفکر فی الخلق۔

ترجمہ: میری امت سے نو چیزیں اٹھائی گئی ہیں۔ جو نہیں جانتے۔ جس کی طاقت نہیں رکھتے۔ جس پر مجبور کر دیا ہو۔ جس کے لیے مجبور ہو گئے ہوں۔ خطا، نسیان، فال، حسد، تخلیق پر فکر میں وسوسہ۔

اس حدیث میں بحث مفصل اپنی جگہ ہے اس موقع پر استدلال لا یعلمون سے ہے کہ اس سے اصل برأت ذمہ ثابت ہوتی ہے یا نہیں۔ اصول اربعہ کا اطلاق کیونکر اور کہاں ہوتا ہے بڑی تفصیل طلب بات ہے۔ ہم ایک سادہ سی مثال نقل کرتے ہیں:

الف۔ ایک بچے نے زمانہ شیر خواری میں دایہ کے پستان سے کئی مرتبہ دودھ پیا، یہ بچہ جوان ہوا اور اس کی خواہش ہے کہ اس کی لڑکی سے عقد کرے۔ صورت یہ ہے کہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس لڑکے نے دایہ کا دودھ لگاتار پیا ہے یا ایک شب و روز۔ یا اس قدر پیا ہے کہ جس سے اس کا گوشت بنا ہو۔ جیسا کہ منصوص ہے یا یہ شرط پوری نہیں ہوئی۔ اس محل پر اصل استصحاب جاری کریں گے، کیونکہ اس کے فرزند رضاعی ہونے میں شک ہے۔ اصل استصحاب کا مطلب یہ ہوگا کہ اس صورت حال سے پہلے وہ عورت اس کی رضاعی ماں نہ تھی۔ لہذا وہی حالت اب بھی باقی ہے۔ شک کا اعتبار نہیں۔

ب۔ وضو کیا اونگھ آگئی، شک یہ ہے کہ نیند آئی یا نہیں (نیند آئی تو وضو ٹوٹ گیا) اس موقع پر دلیل استصحاب کے ذریعہ شک سے پہلے کی حالت یعنی وضو کا حکم برقرار رکھا جائے گا۔

ج۔ دوا کی شیشی ہے اس میں شک ہے کہ اس میں الکحل ہے یا نہیں تو اصل برأت ذمہ ہے۔

د۔ دو شیشیاں رکھی ہیں اور علم اجمالی ہے کہ ان میں ایک میں الکحل ہے۔ اصل احتیاط

جاری ہوگئی اور دونوں کا استعمال ہی کیا جانا چاہیے۔

ھ۔ ایسی جگہ پہنچے جہاں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ سامنے دو راستے ہیں جہاں موجود ہیں وہاں ٹھہرنے میں جان کا خطرہ آگے بڑھیں تو ایک راستہ محفوظ دوسرا غیر محفوظ مگر محفوظ راستہ متعین نہیں اب کیا حکم ہے؟ ٹھہرنے میں جان کا خطرہ، اور حفظ جان واجب ہے۔ دوسری طرف راستہ میں خطرہ اور جان کو خطرے میں ڈالنا حرام۔ دونوں صورتوں میں تکلیف شرعی معلوم نہیں اصل اختیار ہے۔

مصادر

- قرآن مجید
- الکافی، الاصول : ابوجعفر کلینی ، تہران، ایران طبع ۴
- الاصول العامۃ للفقہ المقارن : سید تقی الحکیم ، بغداد - عراق
- العقل عند الشیعۃ الامامیہ : بغداد، عراق
- آشنائی با علوم اسلامی، اصول فقہ : شہید مرتضی مطہری، تہران۔



جناب سید منتظر عباس ام اے
پاکستان

اخلاقیات کی نفسیاتی بنیادیں

گذشتہ ابواب میں اخلاقیات کے مابعد الطبیعاتی مسلمات، اخلاقی نصب العین سے آگاہی کے ذرائع اور اخلاقی نصب العین کی نوعیت اور حقیقت کے متعلق بحث کی گئی۔ زیر نظر عنوان کے تحت انسانی نفسیات کے ان عناصر کے تعین کی کوشش کی جائے گی جو اخلاقی عمل کے لیے محرک کا کام دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہماری اس بحث کا تعلق اس سوال سے ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کے فلسفۂ اخلاقیات میں انسانی جذبات، خواہشات اور عقل کو کیا مقام حاصل ہے؟

اس سلسلہ میں ایک بنیادی بات یاد دلا دوں کہ یہ امر پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ کائنات کی تخلیق بے مقصد نہیں ہے اور نہ کائنات کی کوئی شئے بغیر غرض و غایت کے پیدا کی گئی ہے۔ اس لیے اصولی طور پر انسان کی اساس بھی بامقصد عناصر یا دوسرے الفاظ میں خیر پر رکھی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ خدا کے عدل کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان کی تشکیل اس طرح ہو کہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے حصول خیر کی مکمل صلاحیت رکھتا ہو۔ ان مقدمات کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خیر انسان کی فطرت میں ہے۔ اس لیے خیر کی تحریک میں اسے اصولی طور پر کسی خارجی محرک کی ضرورت نہیں بلکہ حقیقی محرک خود اس کی ذات میں پنہاں ہے۔ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کہتے ہیں کہ "یاد رکھو جسے اپنے نفس کے لیے یہ توفیق نہ ہو کہ وہ خود اپنے کو وعظ و پند کرے اور برائیوں پر متنبہ کر دے تو پھر کسی اور کی بھی پند و توبیخ اس پر اثر نہیں کر سکتی۔"

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ محرکات کو تلاش کرتے وقت انسانی نفسیات کے مختلف مظاہر میں سے کسی ایک کو محرک قرار دے کر باقی تمام کی نفی کر دینا بھی درست نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس طرح ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان متعدد عناصر (جذبات، خواہشات، عقل وغیرہ) میں سے صرف ایک حصول

مقصد میں مدد دیتا ہے اور باقی غیر ضروری ہیں۔ اس صورت حال سے ہمارے اس اصول کی تردید ہو جاتی ہے جس کے تحت انسان کے تمام نفسیاتی عناصر کو اصولی طور پر بامقصد قرار دیا گیا تھا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اخلاقی عمل کے محرکات پر بحث کرتے وقت مختلف عناصر یا انسانی فطرت کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز سے ترتیب دیا جائے کہ وہ تمام کے تمام اپنا جواز ثابت کر سکیں۔ اس نکتہ کی وضاحت اس لیے بھی ضروری تھی کہ اخلاقیات کے بیشتر مکاتیب فکر عام طور پر اسی غلطی کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ البتہ بٹلر نے ایک ایسا نظام اخلاق دیا تھا جس میں انسانی فطرت کے تمام اجزاء کو مناسب مقام دینے کا خیال موجود تھا۔ ایک ایسا اخلاقی نظام جو انسانی فطرت کو خیر تسلیم کرتا ہو اس کے لیے فطرت کے کسی پہلو کو یکسر نظر انداز کر دینا ممکن نہیں ہے اور چونکہ حضرت علی علیہ السلام کا نظام اخلاق بھی اسی نقطۂ نظر سے ملتا جلتا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی فطرت انسانی کے کسی جزو کو کلیتاً نظر انداز کر دینے کی گنجائش نہیں ہے۔

پھر ایک اور اہم بات اور وہ یہ کہ جب ہم اخلاقی عمل کی نفسیاتی بنیادوں کی بات کرتے ہیں تو گفتگو کا تعلق "ہے" سے ہوتا ہے "چاہیے" سے نہیں، یعنی اس عنوان کے تحت ہم صرف یہ بتاتے ہیں کہ فعل کے محرکات کیا ہیں اور کس طرح کام کرتے ہیں۔ ہم اس مقام پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں فلاں عناصر کو محرکات ہونا چاہیے یا ان محرکات کو فلاں طریقہ سے کام کرنا چاہیے۔ درحقیقت یہ مسئلہ اخلاقیات کا مسئلہ نہیں بلکہ نفسیات کا مسئلہ ہے۔ لیکن۔ اخلاقیات میں اس پر بحث اس لیے ضروری ہو جاتی ہے کہ اس سے انسان کی اخلاقی ذمہ داری کی حدود کا تعین ہوتا ہے کیونکہ اگر نفسیاتی حقائق کے مطالعے سے یہ پتہ چلے کہ کسی عمل کے تمام محرکات مکمل طور پر انسانی فطرت میں داخل تھے یعنی انسان کے کسی عمل کے تمام پہلو اس کے نفسیاتی تقاضوں کا لازمی نتیجہ ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان کا تمام عمل میکانکی ہوتا ہے اور جہاں عمل میکانکی ہو جائے وہاں اخلاقی ذمہ داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسری طرف اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان نفسیاتی اعتبار سے اپنے عمل کا کوئی بھی فطری محرک نہیں رکھتا بلکہ بغیر کسی داخلی بنیاد کے جس وقت جو فعل چاہتا ہے کر گذرتا ہے، تو اس طرح بھی اس پر کوئی اخلاقی ذمہ داری عائد نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسے انسان کی تشکیل ہی ایسی ہوئی ہے۔ جس میں داخلی محرک کا وجود نہیں ہے۔ اگر ایک چیز اپنے مقصد تخلیق کو صرف اس لیے نہ پورا کر سکے کہ اس کے مقصد کی ساخت میں کوئی مطابقت نہ ہو تو اس صورت حال کی ذمہ داری اس چیز پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ چنانچہ صرف اخلاقی ذمہ داری کی حدود کے تعین کے لئے فلسفۂ اخلاق کے لیے

ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ فعل کے نفسیاتی محرکات کا مطالعہ کرے۔

واقعاتی اعتبار سے انسان کے تمام افعال میں دو قسم کے اجزاء پائے جاتے ہیں۔ ایک جزو عمل کے عالمگیر اور مشترک پہلو پر مبنی ہوتا ہے۔ اور دوسرا منفرد اور شخصی پہلو پر۔ مثلاً اگر میں کھانا کھاتا ہوں تو اس فعل میں کھانے کا عمل پیٹ بھرنے کی خواہش عالمگیر جزو ہیں جب کہ کھانے کی قسمیں، ان کی مقدار، کھانے کا طریقہ وغیرہ منفرد اور شخصی اجزاء ہیں اب اگر ان دونوں اجزاء کی نوعیت پر غور کیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ فعل کے عالمگیر عناصر ہمارے فطری تقاضوں پر مبنی ہوتے ہیں اور منفرد اجزاء کا تعلق ہماری عقلی سطح اور معاشرتی تربیت یا علم وغیرہ سے ہوتا ہے۔ چنانچہ دوسرے الفاظ میں ہمارے فعل کا کچھ حصہ وہبی یا فطری ہوتا ہے اور کچھ حصہ اکتسابی۔ لیکن وہبی اور اکتسابی پہلو ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں ہوتے بلکہ درحقیقت اکتسابی پہلو کا کام یہ ہے کہ وہ فرد کی معلومات اور وسائل کو اس کے فطری یا وہبی تقاضوں کی زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر تکمیل کرے چنانچہ انسان کے ہر فعل میں ایک تیسرے فرد کا بھی وجود ہو جاتا ہے جو پہلے دو اجزاء یعنی وہبی اور اکتسابی عناصر میں ربط اور رشتہ پیدا کرتا ہے۔ اصطلاحات کی زبان میں ایسے عنصر کو انسانی جبلت اور محرکات کہا جاتا ہے اکتسابی پہلو علم اور تجربہ کے نام سے موسوم ہوتا ہے اور ان دونوں کا رشتہ قائم کرنے والا عنصر عقل ہے۔ جبلتیں اور محرکات کچھ فطری قوتیں ہیں جو اپنا اظہار چاہتی ہیں۔ تجربہ اور علم لامحدود طریقوں اور ذریعوں پر مبنی ہے جن کے ذریعہ قوتوں کا اظہار ممکن ہے۔ عقل ایک طرف فطری قوتوں کی سمت اور تقاضوں کو دیکھتی ہے دوسری طرف مختلف تجربات کے نتائج و عواقب کا جائزہ لیتی ہے اور اس طرح وہ فطرت اور تجربہ کو ہم آہنگ کرکے انسانی عمل کی تخلیق کو استوار کرتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان تین عناصر میں سے اخلاقی عمل کی ذمہ داری کسی پر عائد ہوتی ہے؟ جہاں تک فطری عناصر کا تعلق ہے ہمارے مسلمات کا تقاضہ ہے کہ ان عناصر کو عین خیر قرار دیا جائے کیونکہ یہ عناصر قدرت کے ودیعت کردہ عناصر ہیں اور قدرت کی تخلیق اپنے مقصد تخلیق سے ہم آہنگ ہے علم اور تجربہ کو خیر اور شر کے پیمانے سے نہیں بلکہ کم اور زیادہ اور ناقص و کامل کے معیار سے جانچا جائے گا کیونکہ یہ ذریعہ ہیں اور خیر و شر کا تعلق مقصد یا نصب العین اور ذریعہ کے باہمی تعلق سے پیدا ہوتا ہے صرف ذریعے سے نہیں، چنانچہ اخلاقی عمل کی ذمہ داری صرف عقل پر عائد ہوتی ہے جو یہ تعلق پیدا کرتی ہے۔

جہاں تک جبلّی اور فطری محرکات کا تعلق ہے حضرت علی علیہ السلام کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے لیے فطری طور پر قابلِ خواہش دو اقدار ہیں، ایک بقا اور دوسرے تسخیر۔ دنیا اور اس میں کیے جانے والے افعال کی تعریف یا تنقیص کرتے وقت حضرت علیؑ کا بنیادی استدلال یہی ہوتا ہے کہ کوئی چیز قابلِ تعریف اس لیے ہے کہ وہ باقی رہنے والی ہے اور اس پر انسان کو اختیار حاصل ہو سکتا ہے جب کوئی چیز بری اس لیے ہے کہ وہ فنا ہو جاتی ہے اور انسان کو اپنا تابع بنا لیتی ہے۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا تیزی سے جا رہی ہے اور اس میں سے کچھ باقی نہیں رہ گیا ہے مگر اتنا کہ جیسے کوئی انڈیلنے والے برتن کو انڈیلے تو اس میں کچھ تری باقی رہ جاتی ہے۔ تم فرزندِ آخرت بنو، ابناء دنیا نہ بنو۔" "جس دنیا سے تمہیں ہمیشہ بہرہ یاب نہیں ہونا۔ اس سے وہ چیزیں لے لو جو تمہارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔" "اے لوگو! جو شخص دنیا کی آرزو کرتا ہے اور اس کی جانب کھنچتا ہے وہ اسے انجام کار فریب دیتی ہے اور جو اس کا خواہشمند ہوتا ہے اس سے بخل نہیں کرتی۔ اور جو اس پر چھا جاتا ہے وہ اس پر قابو پا لیتی ہے۔" الغرض یہ اقتباسات اور نہج البلاغہ کے بیشتر خطبات میرے اس نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں کہ حضرت علیؑ کے نزدیک یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ انسان اپنی بقاء اور کائنات کی دوسری تمام اشیاء کو اپنا تابع فرمان بنانا چاہتا ہے انسان کی اس فطری خواہش کو علیؑ برا نہیں کہتے بلکہ تمام تر قوت یہ بتانے میں صرف ہوتی ہے کہ کون سے افعال ان اقدار کے حامل ہیں اور کون کون سے ان سے خالی۔ اس صورت حال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان نفسیاتی طور پر جن چیزوں کی خواہش کرتا ہے وہ بقا اور قوت تسخیر ہیں۔

جہاں تک بقاء کا تعلق ہے یہ امر حیاتیات اور نفسیات کے مسلمات کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ نہ صرف انسان بلکہ دنیا کی ہر چیز اپنی بقا کے لیے کوشاں ہے۔ فرد اپنی ذات کی حد تک اور انواع، اجتماعی طور پر اس نصب العین کے حصول کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ فلسفی جن کے نزدیک بقاء اور ارتقائے زندگی کا نصب العین ہے۔ مثلاً ہربرٹ اسپنسر یا وہ ماہرینِ نفسیات جو زندہ رہنے کی خواہش کو ایک جبلّت قرار دیتے ہیں۔ مثلاً فرائڈ یا وہ ماہرینِ حیات جو کائنات کے حیاتیاتی تغیرات کو جہد للبقا کی کڑی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً ڈارون ـــ یہ سب اس امر پر متفق ہیں کہ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش زندہ رہنا ہے اور حقائق اس دعوے کی تائید کرتے ہیں۔ انسان کی بیشتر جبلّتیں اور محرکات اس ایک خواہش کی تکمیل کے مختلف ذرائع ہیں۔ عضوی ضروریات کی تکمیل کے لیے بھوک

پیاس جنس اور بقاء نسل کی کوشش کے لیے جنسی افعال کی ادائیگی یا خواہش جنس کے مختلف بہروپ ۔ مختلف قسم کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتماعیت کا رجحان اور غیر جنسی محبت میں یادگار اشیاء اور اعمال کا ارتکاب کے ذریعہ خود کو زندہ رکھنے کی جدوجہد نام و نمود اور شہوت و عزت کی وساطت سے حیات ابدی کی کوشش ۔ یہ تمام افعال اور محرکات اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ انسان زندہ رہنا چاہتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ طبیعی اعتبار سے اس کا زندہ رہنا ممکن نہیں تو وہ نسل اور کارناموں کی شکل میں بقا کی کوشش کرتا ہے اور یہی زندہ رہنے کی خواہش اسے ایک مابعد الطبیعاتی زندگی کا احساس دیتی ہے جہاں اس کی زندگی حوادث اور تغیرات کے چنگل سے نکل کر ابدی ہو جاتی ہے ۔ ان شواہد کی بنیاد پر بقا کو قابلِ خواہش قرار دینا صرف ایک مفروضہ نہیں رہتا ۔

دوسری طرف، غلبہ تسخیر اور اختیار بھی عین فطرت انسانی ہے ۔ انسان ہمہ وقت کائنات کے مختلف عناصر سے متصادم ہے اور صرف انسان ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر شے ایک جنگ میں مصروف ہے یہ جنگ ایک دوسرے کو مسخر کرنے کے لیے ہے ۔ حالات، حوادث، آفات، تغیرات سب جنگ کے فریق ہیں ۔ شوپنہار ہیگل، نطشے، اقبال سب مفکر اس جنگ تسخیر کے حامی اور اس کے وجود کو عین انسانی فطرت قرار دیتے ہیں ۔ نفسیاتی اعتبار سے انسان کی بہت سی جبلتیں یا محرکات اس حقیقت کی نشان دہی کرتے ہیں ملکیت کا رجحان زیر کرنے کی کوشش کائنات کی مختلف فطری اشیا کو انسان کے لیے کارآمد بنانے کی شعوری کوشش اقتدار، برتری اور قوت کے لیے جنگ اپنی عظمت کے مظاہرے وغیرہ ۔ ایسے عناصر ہیں جو واضح طور پر اس بنیادی محرک کے وجود کا احساس دلاتے ہیں ۔ انسانی ترقی کی داستان میں اس محرک نے ہمیشہ اہم کردار ادا کیا ہے ۔ ریاست کا تصور، مدنی زندگی، معاشرہ، ایجادات و اختراعات سب اسی محرک کی تخلیق ہیں اور خواہش تسخیر بھی انسان کی فطری خواہش ہے ۔

بقا اور تسخیر کے محرکات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو درحقیقت یہ دونوں قابلِ خواہش عناصر ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں ۔ زندہ رہنے کی خواہش درحقیقت موت کو مسخر کرنے کی خواہش ہے اور کائنات کو مسخر کرنے کی خواہش اپنے آپ کو بہتر طور پر زندہ رکھنے کی خواہش ہے ۔ یہ دونوں قابلِ خواہش عناصر بنیادی طور پر ایک ہی چیز ہیں ۔ اس لیے ان میں کسی قسم کا تصادم یا اختلاف نہیں ہے ۔ فرد کی خواہش اس کی بقا اور بقا کی خواہش تسخیر سے وابستہ ہے ۔ دونوں اصطلاحوں کا مفہوم ایک ہی نوعیت کا ہے یہ دونوں خواہشیں

ایک "واحد قابل حصول قدر" کے حصول کی جدوجہد ہیں اور یہ قدر اختیار ہے۔ بقا اپنی موت وحیات پر اختیار ہے اور تسخیر کائنات دوسرے تمام عناصر پر اختیار ہے۔ فرد کا اختیار جس قدر بڑھتا جائے گا، فرد اپنے ان دونوں مقاصد حیات کو حاصل کرتی جائے گی۔ انجام کار ہماری بحث ہمیں اس نتیجہ تک لے جاتی ہے کہ انسان اپنے فطری اور ذہنی رجحانات کے اعتبار سے جس منزل کے حصول کی کوشش میں مصروف ہے وہ اختیار ہے۔ چنانچہ اخلاقیات کا عقلی نصب العین اور انسان کا فطری نصب العین ایک ہی ہے اور وہ اختیار ہے۔

اب ہم عمل کے نفسیاتی محرک کے دوسرے پہلو یعنی علم اور تجربہ پر گفتگو کرتے ہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا علم اور تجربہ اکتسابی عناصر ہیں یعنی یہ عناصر انسان کی فطرت میں داخل نہیں ہوتے بلکہ انسان انہیں اپنی سعی وکوشش سے شعوری یا لاشعوری طور پر حاصل کرتا رہتا ہے۔ لیکن یہ فطری محرک حصول اختیار کی خواہش کی تکمیل کے لیے عمل کی شکل متعین کرتے ہیں۔

علم وتجربہ پر گفتگو سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ زیر نظر سطور میں ان دونوں اصطلاحات سے صرف حقائق کا مجموعہ مراد ہے۔ یہ مجموعہ مختلف واقعات اور ان کے نتائج پر مشتمل ہے فی الحال علم وتجربہ کے ان نتائج سے بحث نہیں جو انسانی کردار پر اثر انداز ہوتے ہیں یا انہیں اثر انداز ہونا چاہیے۔ یہاں حقائق، صرف حقائق کے اعتبار سے زیر بحث ہیں اثرات کے اعتبار نہیں۔

جہاں تک صرف حقائق سے آگاہی کا تعلق ہے ہمارے پاس علم کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ مشاہدہ ہے جس کے ذریعہ ہم کسی وقوعہ کا علم حاصل کرتے ہیں۔ یہ مشاہدہ تین قسم کا ہوتا ہے براہ راست خارجی مشاہدہ، بالواسطہ مشاہدہ اور مشاہدۂ باطن۔ براہ راست خارجی مشاہدہ فرد کو حواس خمسہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی اطلاعات پر مبنی ہوتا ہے اور اسی مقام یا وقت پر موجود دوسرا فرد بھی اس وقوعہ کا ادراک کر سکتا ہے۔ اس مشاہدے کا بیشتر حصہ معروضی ہوتا ہے۔ بالواسطہ مشاہدہ فرد کے اس علم پر مشتمل ہوتا ہے جو براہ راست اس کا اپنا مشاہدہ تو نہیں ہوتا لیکن کسی دوسرے فرد کے لیے وہ علم براہ راست مشاہدہ ہی ہوتا ہے اور روایت یا خبر کے طور پر منتقل ہو کر دوسرے فرد تک پہنچتا ہے۔

یہاں اس امر کی نشاندہی مناسب ہے کہ افلاطون کا یہ خیال کہ مشاہدہ ناقابل انتقال ہوتا ہے درست نہیں ہے۔ مشاہدہ کا وہ پہلو جو فرد کے احساسات اور جذبات سے تعلق رکھتا ہے وہ یقیناً بعینہ منتقل ہونا ممکن نہیں ہے، لیکن روزمرہ کی زندگی کا مشاہدہ ہے کہ ہم جزوی طور پر دوسروں کے مشاہدہ کی ہوئی صداقت کو

اپنی ذات تک منتقل جانتے مانتے ہیں مشاہدہ ان معنوں میں یقیناً ناقابلِ انتقال ہے کہ ایک فرد کا تجربہ دوسر کا تجربہ بن جائے۔ لیکن انسان کی قوتِ متخیلہ یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ کسی خبر کو تجربہ کی طرح محسوس کرے یہ ذہنی یا خیالی تجربہ اس طرح حقیقی تجربہ تو نہیں جس طرح براہ راست مشاہدہ ہوتا ہے لیکن چونکہ اس قسم کے تجربے کی بنیاد بعض براہِ راست مشاہدے میں آنے والی شہادتیں ہی ہوتی ہیں اس لیے ان شہادتوں کی صداقت کے پیمانے سے بالواسطہ مشاہدہ کی صداقت کو بھی ناپا جاسکتا ہے۔ یہاں کہا جاسکتا ہے کہ جزوی شہادتوں کو ایک صحیح تجربہ میں تبدیل کرنے کے لیے مشاہدہ کے لیے عقل کا عنصر بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے ایسے تجربے کو مشاہدہ کہنا درست نہیں ہوگا لیکن یہ اعتراض اتنا مضبوط نہیں ہے کیونکہ ایسے مشاہدے میں عقل کا عنصر ایک جزو کی حیثیت سے شامل تو ضرور ہوتا ہے لیکن اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ خبر پر مبنی مشاہدے کی بنیاد مشاہدہ ہی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ نقطۂ نظر درست ہے کہ علم مشاہدے پر مبنی ہے۔ البتہ علم کے بعض پہلوجن کا تعلق حقائق کے باہمی تعلق سے ہے یعنی وہ علم جو علت و معلول کے روابط پر مبنی ہوتا ہے وہ مشاہدہ کے ساتھ ساتھ عقل سے بھی متاثر ہوتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا۔ ان سطور میں ہم صرف اس علم کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو دو قوموں پر مشتمل ہے۔ دو قوموں کے باہمی ربط پر نہیں۔ اس لیے گفتگو کی اس سطح تک مشاہدے کو علم کا واحد ذریعہ قرار دینا غلط نہیں ہوگا۔ مشاہدے کی تیسری صورت مشاہدۂ باطن پر مشتمل ہے۔ مشاہدہ باطن سے مراد فرد کے وہ ذہنی افعال ہیں جن کا مشاہدہ حواس خمسہ سے نہیں ہوتا بلکہ وہ انسان کے شعورِ ذات کا حصہ ہونے کی حیثیت سے بغیر کسی واسطے کے ذہن تک پہنچتے ہیں۔ اس قسم کے افعال میں تاثرات، خواہشات اور امیدیں شامل ہیں۔ ذہنی افعال کا مشاہدہ ایک طرف تو فرد کے لیے سب سے زیادہ قابلِ یقین درست اور حقیقی مشاہدہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایک فرد کا مشاہدۂ باطن دوسرے کے لیے اسی قدر زیادہ ناقابلِ یقین غیر درست اور ناقابلِ تصدیق ہو جاتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ جب تک ذہنی عمل کسی ایسے فعل میں تبدیل نہ ہو جو حواس خمسہ کی وساطت سے (یعنی بصارت سماعت وغیرہ) دوسروں تک پہنچ سکے اس وقت تک اس کی حیثیت (دوسروں کے لیے) ناقابلِ علم حقیقت کی سی ہوتی ہے۔

مشاہدے کی مندرجہ بالا تقسیم بظاہر غیر ضروری ہے اور غالباً ناکافی بھی۔ لیکن اخلاقیات کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے ان کا تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ ہم اخلاقی فعل کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے

مشاہدے کی مختلف صورتوں سے حاصل ہونے والے علم پر گفتگو کرسکیں۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ فرد کے فطری تقاضے بقا اور تسخیر کے حصول کی کوشش کرتے ہیں۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ حصول علم کی ان تین صورتوں سے موصول ہونے والی صورتیں علم بقا اور تسخیر سے کسی حد تک تعلق رکھتا ہے۔

سب سے پہلے ہم اپنے روزمرہ کے مشاہدہ کا جائزہ لیتے ہیں یہاں حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کا نقطہ نظر ہے کہ ہمارے براہِ راست مشاہدہ میں جو حقیقت اثر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ طبعی دنیا کی ہر شے ہمہ وقت متغیر ہے اور تغیر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شے بھی مستقل نہیں، قائم نہیں۔ باقی نہیں۔ "دنیا میں انسان موت کی تیراندازی کا ہدف ہے اور مصیبت و ابتلاء کی غارت گری کی جولان گاہ ہے۔ جہاں ہر گھونٹ کے ساتھ اچھو اور ہر لقمہ میں گلوگیر پھندا ہے اور جہاں بندہ ایک نعمت اس وقت تک نہیں پاتا جب تک دوسری نعمت جدا نہ ہو جائے اور اس کی عمر کا ایک دن آتا نہیں جب تک کہ ایک دن اس کی عمر سے کم نہ ہو جائے۔ ہم موت کے مددگار ہیں اور ہماری جانیں ہلاکت کی زد پر ہیں، تو اس صورت میں ہم کہاں سے بقا کی امید کر سکتے ہیں؟ جب کہ شب و روز کسی عمارت کو بلند نہیں کرتے مگر یہ کہ حملہ آور ہو کر جو بنایا ہے اسے گراتے اور جو یکجا کیا ہے اسے بکھیرتے رہتے ہیں[۵]"۔ چنانچہ طبعی دنیا کی بحیثیت مجموعی صرف ایک چیز ہمارے مشاہدے میں آتی ہے اور وہ فنا ہے۔

رہا بالواسطہ مشاہدہ تو اس کا فراہم کردہ علم بھی اس سے مختلف نہیں۔ بالواسطہ مشاہدہ اس قدر قابلِ یقین نہیں ہے جتنا براہ راست مشاہدہ ہوتا ہے لیکن اگر بالواسطہ مشاہدے کے سلسلہ میں شواہد یقینی ہوں تو اس پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ "میں نے تعلیم دینے کے لیے قدم اٹھایا تاکہ تم عقلِ سلیم کے ذریعہ ان چیزوں کے قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاؤ کہ جن کی آزمائش اور تجربہ کی زحمت سے تجربہ کاروں نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اس طرح تم تلاش کی زحمت سے مستغنی اور تجربہ کی کلفتوں سے آسودہ ہو جاؤ گے اور تجربہ و علم کی وہ باتیں تم تک پہنچ رہی ہیں کہ جن پر ہم مطلع ہوئے[۶]"۔ لیکن بالواسطہ حاصل ہونے والا یہ مشاہدہ صرف ایک خبر نہیں ہے بلکہ فرد کا ذاتی تجربہ بن جاتا ہے۔ "اے فرزند! میں نے اتنی عمر نہیں پائی جتنی اگلے لوگوں کی ہوا کرتی تھی پھر بھی میں نے ان کارگزاریوں کو دیکھا، ان کے حالات و واقعات پر غور کیا اور ان کے چھوڑے ہوئے نشانات کی سیر و سیاحت کی یہاں تک کہ گویا میں بھی انہیں میں کا ایک ہو چکا ہوں، بلکہ ان سب کے حالات و معلومات جو مجھ تک پہنچ گئے ہیں ان کی وجہ سے ایسا ہے کہ گویا میں نے ان کے اول سے لے کر

آخر تک کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔ چنانچہ میں نے صاف کو گندے اور نفع کو نقصان سے الگ کر کے پہچان لیا ہے۔[۵۰] "اور جب ماضی کا مشاہدہ اس طرح کیا جائے گا تو وہی ایک نتیجہ نکلے گا کہ دنیائے طبعی اور حیات طبعی میں بقا نہیں ہے" "تمہارے پہلے والے لوگوں پر جو بیتی ہے اسے دل کو یاد دلانا۔ ان کے گھروں اور کھنڈروں میں چلنا پھرنا اور دیکھنا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا کہاں اترے اور کہاں ٹھہرے ہیں۔ دیکھو گے تو تمہیں صاف نظر آئے گا کہ وہ دوستوں سے منہ موڑ کر چل دیے ہیں اور پردیس کے گھر میں جا کر اترے ہیں[۵۱]"

اب مشاہدہ باطن کے ذریعہ ہم جن صداقتوں تک پہنچتے ہیں ان کے مطابق باطنی واردات کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ ذہنی کیفیات جو معروضی حقائق سے مطابقت رکھتی ہیں اور کسی اصول نظام یا نصب العین کی رہنمائی میں سامنے آتی ہیں۔ دوسری وہ کیفیات ہیں جو خود مقصود یا نصب العین بن جاتی ہیں۔ اول الذکر عقل و استدلال ہے اور موخر الذکر خواہشات، امیدیں اور جذباتی فیصلے ہیں۔ اول الذکر کیفیت حقائق میں تعلیل کے رشتے تلاش کرتی ہے حسن و قبیح درست و غلط اور صائب و غیر صائب کے فیصلے کرتی ہے"، اور موخر الذکر کا کام پسند اور ناپسند کی حد بندی کرنا ہے لیکن ذہنی کیفیات کی یہ تفریق اس قدر واضح نہیں ہے جتنی مندرجہ بالا سطور میں بیان کی گئی ہے۔ کوئی عقلی فیصلہ تمام تر عقلی نہیں ہوتا اور نہ کوئی جذباتی فیصلہ تمام تر جذباتی ہوتا ہے دونوں اقسام کے فیصلے ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں۔ تو صرف یہ کہ بعض اوقات عقلی یا نصب العینی فیصلے مقصود ہو جاتے ہیں اور جذبات عمل کو اس مقصود کے حصول میں ظاہر کرتے ہیں اور بعض اوقات جذبات مقصود بن جاتے ہیں اور عقل ایک ذریعے کی صورت میں جذباتی فیصلوں کی تکمیل کے لیے استعمال ہوتی ہے چنانچہ ہمارا ذہنی فیصلہ دو قسم کا ہو سکتا ہے ایک وہ جس کا مقصود کوئی معروضی نصب العین ہو اور دوسرا وہ جس کا مقصود انفرادی جذباتی فیصلہ ہو۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ مشاہدہ ان دونوں اقسام کے متعلق کیا معلومات فراہم کرتا ہے۔ ہم فی الحال صرف انفرادی جذباتی فیصلوں پر گفتگو کریں گے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ان فیصلوں کے لیے خواہشات امیدوں اور تمناؤں کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ خواہشات چونکہ خود مقصود بن جاتی ہیں اور مقصود ہی عمل کی ضرورت اور صورت کو متعین کرتا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ انسان خواہشات کو مسخر کرنے کے بجائے خود ان کے تابع ہو جاتا ہے۔ "فتنوں کے وقوع کا آغاز وہ نفسیاتی خواہشیں ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے[۵۲]" اس پیروی یا متابعت کا نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ خواہشیں حاکم بن جاتی ہیں اور انسان محکوم "اے لوگو! جو شخص دنیا کی آرزوئیں کرتا ہے، ان کی جانب کھنچتا ہے وہ اسے انجام کار فریب دیتی ہیں[۵۳]" "یہ خواہشات

فریب اس لیے دیتی ہیں کہ انسان انھیں بظاہر اپنی تابع اور شعوری اختیار کی حامل مرضی تصور کرتا ہے حالانکہ یہ خواہشات انسان پر قابو کر لیتی ہیں اور رفتہ رفتہ فرد ان خواہشات کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے وہ اپنے جسمانی تقاضوں کو مقصود حیات سمجھنے لگتا ہے اور اپنی حیاتِ طبعی کی بہتری پر اکتفا کرتا ہے۔ "اس دار دنیا سے کہ جس کے رہنے والوں کے لیے زوال امر مسلّم ہے نکلنے کا تہیہ کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ آرزوئیں تم پر غالب آجائیں اور اس (چند روزہ زندگی کی) مدت کو دراز سمجھ بیٹھو۔"[11] اگر خواہشات نفسانی اس حیات طبعی کو ہی بہتر بنا سکتیں تب بھی انھیں نصب العین بنایا جا سکتا تھا لیکن ہوتا یوں ہے کہ یہ خواہشات اس زندگی کے لیے بھی مفید نہیں رہتیں۔ "میں اس دارِ دنیا کی حالت کیا بیان کروں کہ جس کی ابتداء مشقت اور انتہا ہلاکت ہو، جس کے حلال میں حساب اور حرام میں سزا و عتاب ہو۔ یہاں کوئی غنی ہو تو فتنوں سے واسطہ اور فقیر ہو تو حزن و ملال سے سابقہ رکھتا ہے جو دنیا کے لیے سعی و کوشش میں لگا رہتا ہے اس کی دنیوی آرزوئیں بڑھتی ہی جاتی ہیں اور جو کوششوں سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے دنیا خود ہی اس سے سازگار ہو جاتی ہے۔"[12] چنانچہ "خواہشوں کی منزل میں اترنے والا ایسا ہے جیسے کوئی سیلاب زدہ دیوار کے کنارے پر کھڑا ہو کہ جو گرا چاہتی ہے وہ ہلاکتوں کا پلندہ اپنی پیٹھ پر اٹھائے کبھی اس کندھے پر رکھتا ہے کبھی اس کندھے پر اپنی رایوں کی تصدیق میں جنھیں وہ بدلتا رہتا ہے۔"[13]

خواہشات نفسانی کا انجام ہلاکت ہونا صرف واقعاتی نہیں بلکہ منطقی صداقت بھی ہے، ہم یہ تسلیم کر چکے ہیں کہ انسان کی فطرت بقا و تسخیر ہے۔ اب اگر انسان فنا کی طرف بڑھنا شروع کر دے اور تسخیر کے بجائے خود مسخّر ہونے لگے تو ظاہر ہے کہ اس کا عمل خلافِ فطرت ہوگا، اس طرح اس کے فطری تقاضوں اور موہومی خواہشوں میں تصادم ناگزیر ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ کمال حیات (بقا و تسخیر) سے محروم ہو جائے گا اور ایسی محرومی، ہلاکت کی مترادف ہے۔ "جو حق سے ٹکرائے گا حق اسے پچھاڑ دے گا۔"[14]

انسانی فطرت کا تقاضہ تسخیر و بقا ہے۔ مشاہدے کی اطلاع یہ ہے کہ طبعی دنیا کی ہر شے فانی ہے اس لیے وہ اس فطری تقاضے کی تکمیل نہیں کر سکتی اور کیفیات ذہنی میں سے نصب العین بن جانے والی موضوعی خواہشات انسان کو مسخر کر لیتی ہیں اس لیے وہ بھی ان تقاضوں کی تکمیل سے قاصر ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ کسی فعل کا ارتکاب کسی اصول کے تابع ہو۔ یہ اصول ایسی ذہنی کیفیت فراہم کرتے ہیں جسے گذشتہ سطور میں معروضی حقائق کے مطابق نصب العین کی پیروی اور حقائق میں علت و معلول کے رشتے قائم کرنے والی کیفیت کہا گیا ہے یا

جسے ہم عقل کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جذباتی فیصلوں کو بنیادی حیثیت دینے کے بعد انسان مجبور ہوتا جاتا ہے وہ ایک اندھے راہ گیر کی طرح منزل سے بے خبر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے ایسے لوگ برائی کے راستے پر ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ۔" ان لوگوں نے دنیا کو اختیار کر لیا ہے اور عقبیٰ کو پیچھے ڈال دیا ہے، صاف پانی چھوڑ دیا اور گندا پانی پینے لگے ہیں گویا میں ان کے فاسق کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ برائیوں میں رہا اتنا کہ انہیں برائیوں سے اسے محبت ہو گئی اور ان سے مانوس ہوا اور ان سے اتفاق کرتا رہا یہاں تک کہ (انہی برائیوں میں) اس کے سر کے بال سفید ہو گئے اور اسی رنگ میں اس کی طبیعت رنگ گئی، پھر یہ کہ وہ (منہ سے) کف دیتا ہوا متلاطم دریا کی طرح آگے بڑھا بغیر اس کا کچھ خیال کئے کہ کس کو ڈبو رہا ہے۔ اور بھوسے میں لگی ہوئی آگ کی طرح پھیلا بغیر اس کی پرواہ کیے کہ کون چیزیں جلا رہا ہے۔ کہاں ہیں ہدایت کے چراغوں سے روشن ہونے والی عقلیں اور کہاں ہیں تقوے کے روشن مینار کی طرف دیکھنے والی آنکھیں اور کہاں ہیں اللہ کے ہونے والے قلوب اور اس کی اطاعت پر جم جانے والے دل[۱۰]۔" اس اقتباس سے یہ واضح ہوا کہ شر ایک اندھی اور تخریبی قوت ہے جس کے ہاتھ میں انسان بے بس ہو جاتا ہے جب کہ عقل نور اور ہدایت ہے جس کی موجودگی راستے کو واضح اور اس کی دشواریوں کو نمایاں کر دیتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس ہدایت کے چراغ سے روشن عقل کی صفات خصوصیات اور طریق کار کیا ہے؟ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ کہ عقل کی اساس معروضی نصب العین ہے۔ وہ جذبات کی طرح فرد کے موضوعی فیصلوں کی بنیاد پر کسی عمل کے ارتکاب یا عدم ارتکاب کا فیصلہ نہیں کرتی بلکہ اس کے امر و نہی اس معروضی نصب العین کے مطابق ہوتے ہیں جو مقصد تخلیق کائنات ہے اس نصب العین کے لیے مذہب کی اصطلاح "ایمان" کا لفظ پیش کرتی ہے چنانچہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ "ایمان سے نیکیوں پر استدلال کیا جاتا ہے[۱۱]۔" چنانچہ استدلال ہر عقل کی عملی صورت ہے کسی عمل کے جواز یا عدم جواز کا فیصلہ فرد کی موضوعی خواہشوں کے تحت نہیں بلکہ معروضی نصب العین ایمان کے تحت کرتا ہے اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عقل کے فیصلے انفرادی نہیں بلکہ عالمگیر ہوں گے۔ یہی وجہ ہے کہ عمل خیر انفرادی اور اجتماعی دونوں اعتبار سے قابل قبول ہوتا ہے۔" اپنے اور دوسرے کے درمیان ہر معاملہ میں اپنی ذات کو میزان قرار دو۔ جو اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی دوسروں

کے لئے پسند کرو اور جو اپنے لیے نہیں چاہتے اسے دوسروں کے لیے بھی نہ چاہو، جس طرح یہ چاہتے ہو کہ تم پر زیادتی نہ ہو یونہی دوسروں پر بھی زیادتی نہ کرو۔ اور جس طرح یہ چاہتے ہو کہ تمہارے ساتھ حسن سلوک ہو یونہی دوسروں کے ساتھ بھی حسن سلوک سے پیش آؤ، دوسروں کی جس چیز کو برا سمجھتے ہو اسے اپنے میں بھی ہو تو برا سمجھو۔ اور لوگوں کے ساتھ جو تمہارا رویہ ہو اسی رویے کو اپنے لیے بھی درست سمجھو[17]۔"

چونکہ عقل کے فیصلہ کا معیار فرد کی موضوعی خواہش نہیں بلکہ نصب العین حیات ہے اس لیے ظاہر ہے کہ وہ جو فیصلہ کرے گی وہ جو اس امر کی نشاندہی کرے گا کہ کون سا فعل حصول نصب العین میں ممد اور معاون ہے اور کون سا مخالف اور مزاحم۔ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ حصول نصب العین ہی خیر ہے اور عدم حصول شر۔ اس لیے عقل کے فیصلے ہی وہ ذریعہ ہیں جو کسی فعل کے خیر و شر سے آگاہ کر سکتے ہیں۔ "عقلمند دل کی آنکھوں سے مآلِ کار دیکھتا ہے اور اپنی اونچ نیچ (اچھی بری راہوں) کو پہنچانتا ہے[18]۔" اور چونکہ اس کا قرار دیا ہوا خیر حقیقی خیر اور شر حقیقی شر ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے فیصلے یقینی ہوتے ہیں حتیٰ کہ یہ فیصلے مشاہدے جیسی تجربی حقیقت سے بھی زیادہ یقینی ہوتے ہیں۔ "آنکھوں کا دیکھنا حقیقت میں دیکھنا نہیں کیونکہ آنکھیں کبھی اپنے اشخاص سے غلط بیانی بھی کر جاتی ہیں مگر عقل اس شخص کو جو اس سے نصیحت چاہے کبھی فریب نہیں دیتی[19]۔" اس طرح عقل وہ ذریعہ ہے جو حقیقت کا مشاہدہ کر سکتی ہے اس لیے اسی کی رہنمائی صحیح رہنمائی ہے۔

عقلی فیصلے کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مقصود نصب العین کا حصول ہے اور نصب العین حیات طبعی سے نہیں بلکہ مابعد الطبیعاتی ابدی زندگی سے ہوتا ہے اس لیے یہ فوری مفادات کو نظر انداز کر دیتی ہے اور مستقبل کے حقیقی مفاد کو پیش نظر رکھتی ہے اس کے لیے حال کبھی بھی مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ حال صرف اس لیے" اہم ہوتا ہے کہ یہ مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے چنانچہ "عقلمند دل کی آنکھوں سے مآلِ کار دیکھتا ہے[20]۔" چنانچہ وہ ابدی نصب العین کے پیش نظر ایسی چیز طلب کرتا ہے جس کا جمال پائیدار ہو[21]۔ عقل لذت پرست نہیں ہے کہ فوری لذتیت کی خاطر دور رس نقصانات کو قبول کر لے چنانچہ حضرت علی علیہ السلام کا مشورہ ہے کہ" لذتوں کے ختم ہونے اور بادشوں کے باقی رہنے کو یاد رکھو[22]۔" اس کے ساتھ ساتھ" جو بات ہو کر رہنے والی اور محلِ انتظار میں ہو۔ اس کے لیے جلدی نہ کرو اور جسے" کل" اپنے ساتھ لیے آرہا ہے اس کی دوری محسوس کرتے ہوئے ناگواری ظاہر نہ کرو۔ بہتیرے لوگ ایسے ہیں کہ جو کسی چیز کے لیے جلدی مچاتے ہیں اور جب اسے پا لیتے ہیں تو پھر یہ چاہنے لگتے ہیں کہ اسے نہ ہی پاتے تو اچھا تھا۔" آج[23] آنے والے

عمل" کے اجالوں سے کتنا قریب ہے۔"[23]

پھر عقل کی ایک بڑی خصوصیت اعتدال ہے۔ اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل ان معین حدود میں رہ کر انجام دیا جائے جن کی مقصد کی تکمیل کے لیے ضرورت ہو۔ زندگی کے کسی ایک پہلو پر زور دینا باقی پہلوؤں کی نفی کرتا ہے اور اس کا یہ مطلب ہوگا کہ باقی پہلو مقصد تخلیق کی تکمیل نہیں کرتے یا دوسرے الفاظ میں انکا وجود غیر ضروری ہے لیکن چونکہ عقل مقصدیت کی علم بردار ہے اس لیے اس کے نزدیک ہر شے بامقصد ہے اور اس مقصد کا حصول ہی اس شے کا حقیقی استعمال ہے اگر کسی شے کا استعمال تکمیل مقصد سے بڑھ جائے یا یہ استعمال اتنا کم ہو کہ مقصد ادھورا رہ جائے تو یہ استعمال عقل کے نزدیک مستحسن نہیں ہو سکتا غذا کا مقصد حیاتِ طبعی کو برقرار رکھنا ہے اس مقصد کی تکمیل کے لیے بھوک کا پیمانہ انسان کو دیا گیا ہے اب غذا اتنی زیادہ کھائی جائے کہ حیاتِ طبعی کو خطرہ لاحق ہو جائے یا اتنی کم کھائی جائے کہ جان کے لالے پڑ جائیں تو دونوں صورتیں خلاف عقل ہوں گی اور یہی افراط و تفریط ہی شر ہے۔ اعتدال یا ضرورت اور مقصد کے مطابق عمل خیر ہے چنانچہ حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "دائیں بائیں گمراہی کی راہیں ہیں درمیانی راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔"[24] "جاہل کو نہ پاؤ گے مگر یا حد سے آگے بڑھا ہوا اور یا اس سے بہت پیچھے"[25] یعنی عقل کا فیصلہ اعتدال پر مبنی ہوتا ہے۔

جیسا کہ متعدد بار عرض کیا جا چکا ہے کہ عقل کا فیصلہ نصب العین کی روشنی میں ہوتا ہے اس لیے عاقل کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ "دل (کی آنکھوں) سے دیکھنے والے اور بصیرت کے ساتھ عمل کرنے والے کے عمل کی ابتدا یوں ہوتی ہے کہ وہ (پہلے) یہ جان لیتا ہے کہ یہ عمل اس کے لیے فائدہ مند ہے یا نقصان رساں۔ اگر مفید ہوتا ہے تو آگے بڑھتا ہے مضر ہوتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے۔ اس لیے کہ بے جانے بوجھے ہوئے بڑھنے والا ایسا ہے جیسے کوئی غلط راستے پر چل نکلے تو جتنا وہ اس راہ پر بڑھتا جائے گا۔ اتنا ہی مقصد سے دور ہوتا جائے گا۔ اور علم کی (روشنی) میں عمل کرنے والا ایسا ہے جیسے کوئی روشن راہ پر چل رہا ہو۔ دیکھنے والے کو چاہیئے کہ وہ دیکھے کہ آگے کی طرف بڑھ رہا ہے یا پیچھے کی طرف پلٹ رہا ہے۔"[26]

چنانچہ یہ اور اس سے پہلے کے اقتباسات سے عقل کی ایک اور خصوصیت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ عقلی فیصلہ علم پر مبنی ہوتا ہے۔ اصولاً یہ شرط ہونی بھی چاہیئے کیونکہ اگر عقل کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ نصب العین کا حصول کس طرح ممکن ہے تو اسے نصب العین مختلف اعمال ان کے نتائج اور اہمیت سے باخبر ہونا ضروری ہے اور یہی "شعور" علم ہے، جتنا زیادہ علم بڑھتا جائے گا، عقل کی قوت اور کارکردگی بڑھتی جائے گی ظن و

تخمین سے کیا ہوا فیصلہ عقلی فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ علم کی بنیاد پر ہونے والا فیصلہ ہی عقلی ہو سکتا ہے۔

چنانچہ عقل کی صفات میں معروضیت مقصدیت دوام یا اعتدال اور علم نمایاں ہیں۔ دوسری طرف ہم دیکھ چکے ہیں کہ جذباتی فیصلے ان صفات سے عاری ہیں اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی فیصلہ کر چکے ہیں کہ انسانی نفسیات کا کوئی پہلو اصولاً غلط نہیں ہے۔ اس لیے واضح سی بات یہ ہو گی کہ انسان کے جذبات کو عقل کے تابع ہونا چاہیے، ہم نہ تو جذبے کی نفی کر سکتے ہیں اور نہ اسے ختم کر سکتے ہیں اور نہ ختم کرنے کی کوشش کی تائید کر سکتے ہیں۔ جذبہ ایک قوت ہے اور قوت عقل کی رہنمائی میں استعمال ہونی چاہیے۔ اگر عقل جذبہ کے تابع ہو گی تو وہ اپنا عمل ضرور کرے گی لیکن اس طرح کہ اس کا مقصود یا نصب العین معروضی ہونے کے بجائے شخصی اور موضوعی ہو جائے گا۔ اور موضوعی نصب العین انسان کے حقیقی و فطری نصب العین کے خلاف ہے چنانچہ جذبات کی بالادستی عقل کے حقیقی فرض کو متاثر کرے گی۔ "آرزوئیں عقلوں پر سہو کا اور یاد الٰہی پر نسیان کا پردہ ڈال دیتی ہیں[۲۷]۔" صحیح طریق کار یہ ہو گا کہ جذبات عقل کے تابع ہو جائیں۔ "انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس سے فائدہ اٹھائے اس لیے کہ آنکھوں والا وہ ہے جو سنے تو غور کرے اور نظر اٹھائے تو حقیقتوں کو دیکھ لے اور عبرتوں سے فائدہ اٹھائے پھر واضح راستہ اختیار کرے جس کے بعد گڑھوں میں گرنے اور شبہات میں بھٹک جانے سے بچتا رہے اور حق سے بے راہ ہونے اور بات میں ردّ و بدل کرنے اور سچائی میں خوف کھانے سے گمراہوں کی مدد کر کے زیاں کار نہ بنے[۲۸]۔" وہ دنیا سے بھی فائدہ اٹھائے کیونکہ یہ فائدہ بخش ہے لیکن اس طرح کہ "جو شخص دنیا کو عبرتوں کا آئینہ سمجھ کر دیکھتا ہے تو وہ اس کی آنکھوں کو روشن دنیا کر دیتی ہے اور جو صرف دنیا پر نظر رکھتا ہے تو وہ اسی کو روز نابینا بنا دیتی ہے[۲۹]۔" یہی عقل کا راستہ ہے اور اسی راستہ سے انسان کا فطری نصب العین حاصل ہو سکتا ہے۔

گزشتہ سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کی با مقصد تخلیق ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی فطرت ہی اس کے اخلاقی عمل کی حقیقی بنیاد ہے اور یہ بنیاد تبدیل نہیں کی جا سکتی۔ اب اگر کسی انسانی فعل کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں ایک پہلو عالمگیر ہوتا ہے اور دوسرا انفرادی۔ عالمگیر پہلو وہبی اور فطری ہے اور انفرادی پہلو اکتسابی ہے۔ اول الذکر انسان انسان کی جبلتیں اور فطری محرکات ہیں اور موخر الذکر علم اور تجربہ۔ فطری پہلو انسانی اکتسابات

میں سے کچھ کو عمل کے لیے منتخب کرتا ہے۔ یہ انتخاب کا عمل عقل کے ذریعہ ہوتا ہے ان تینوں عناصر میں سے فطرت انسانی ہے۔ اور علم و تجربہ بذات خود نہ خیر نہ شر البتہ عقل ہی وہ ذمہ دار عنصر ہے جو فطرت کو صورت عطا کرتی ہے اس لیے اخلاقی ذمے داری عقل پر ہی عائد ہو سکتی ہے۔

علی ابن ابی طالب علیہ السلام جبلی محرکات بقا اور تسخیر کو قرار دیتے ہیں یہ دونوں محرکات نفسیات فلسفہ اور حیاتیات کے مسلمہ محرکات میں سے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ دونوں محرکات حقیقتاً ایک ہی ہیں۔ بقا موت پر اختیار ہے اور تسخیر کائنات پر۔ چنانچہ انسان کی فطرت کے سامنے صرف ایک ہی نصب العین ہے اور وہ حصول اختیار ہے۔

علم اور تجربہ صرف واقعات سے آگاہی کی حد تک مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے مشاہدہ تین قسم کا ہوتا ہے براہ راست بالواسطہ اور باطنی ہمارا براہ راست مشاہدہ ہمیں کائنات کے ہمہ تغیر اور ہمہ فنا سے آگاہ کرتا ہے۔ بالواسطہ مشاہدہ بھی اسی حقیقت کی تائید کرتا ہے۔ مشاہدۂ باطن ہماری ذہنی کیفیات سے آگاہ کرتا ہے۔ ان کیفیات کی دو قسمیں ہیں۔ جذبات اور عقل۔ اب مشاہدۂ باطن یہ بتاتا ہے کہ جذبات اگر بنیادی حیثیت حاصل کر لیں تو وہ انسان کو مسخر کر لیتے ہیں جذبات دھوکہ دیتے ہیں اور اگر راہنمائی کا کام انھیں سپرد کیا جائے تو گمراہ کر دیتے ہیں۔

عمل کا تیسرا پہلو عقل و استدلال ہے، عقل انسان کو مسخر کر کے گمراہ نہیں کرتی بلکہ یہ راہنما ہے اس کے فیصلے معروضی ہوتے ہیں اس کا ہر فیصلہ مقصدیت کا حامل ہوتا ہے۔ یہ فوری مفاد کے مقابلے میں حقیقی اور دائمی مفاد پیش نظر رکھتی ہے۔ اس کے فیصلے اعتدال پر مبنی ہوتے ہیں اور یہ علم کی روشنی میں حکم صادر کرتی ہے۔ چنانچہ عقل ہی حصول خیر کی ذمہ داری قبول کر سکتی ہے۔ اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ فطری نصب العین یعنی اختیار یا بقا تسخیر کے حصول کے لیے عقل کی رہبری میں عمل کیا جائے اور اس عمل میں جذبہ ایک محکوم قوت کی حیثیت سے عمل کرے اور علم نصب العین سے قریب تر لے جانے میں مددگار ہو۔

اشارات

۱۔ نہج البلاغہ۔ جلد ا خطبہ ۸۸ ۔ ص ۲۴۹

۲۔ نہج البلاغہ جلد ا۔ خطبہ ۴۲ ۔ ص ۱۲۹

۳۔ نہج البلاغہ جلد ۲ خطبہ ۲۲۰ ۔ ص ۲۸۸

۴۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۲۔ خطبہ ۱۷۶ ۔ ص ۱۴۳

۵۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ قول ۱۹۱۔ ص ۲۳۴

۶۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ وصیت ۳۱۔ ص ۶۴

۷۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ وصیت ۳۱۔ ص ۶۵
۸۔ نہج البلاغہ جلد ۳۔ وصیت ۳۱۔ ص ۳۱
۹۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۵۰۔ ص ۱۸۶
۱۰۔ نہج البلاغہ جلد ۱۔ خطبہ ۵۰۔ ص ۱۸۶
۱۱۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۵۳۔ ص ۱۸۹
۱۲۔ نہج البلاغہ جلد ۱۔ خطبہ ۸۰۔ ص ۲۲۰
۱۳۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۱۰۳۔ ص ۲۹۶
۱۴۔ نہج البلاغہ جلد ۳۔ قول ۴۰۹۔ ص ۳۱۰
۱۵۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۲۔ خطبہ ۱۴۲۔ ص ۵۳
۱۶۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۲۔ خطبہ ۱۵۴۔ ص ۸۱
۱۷۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ وصیت ۳۱۔ ص ۷۰
۱۸۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۲۔ خطبہ ۱۵۲۔ ص ۷۶
۱۹۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ قول ۲۸۱۔ ص ۲۷۰
۲۰۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۲۔ خطبہ ۱۵۲۔ ص ۷۶
۲۱۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ وصیت ۳۱۔ ص ۷۳
۲۲۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ قول ۳۳۴۔ ص ۲۱۸
۲۳۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۲۔ خطبہ ۱۳۸۔ ص ۶۴
۲۴۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۱۶۔ ص ۱۳۱
۲۵۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ خطبہ ۱۷۔ ص ۱۲۲
۲۶۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۳۔ خطبہ ۱۵۲۔ ص ۷۷
۲۷۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۸۴۔ ص ۷۳
۲۸۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۲۔ خطبہ ۱۵۱۔ ص ۲۲۱
۲۹۔ نہج البلاغہ۔ جلد ۱۔ خطبہ ۸۰۔ ص

●●

فہرست مجلّد دوّم مجلۂ توحید

شمارہ	موضوع	صفحہ	مقالہ نگار
۳	حکومت اسلامی	۱۳۷	سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل
۳	اسلامی حکومت اور قانون سازی	۷۷	احمد جنتی
۳	خاندان اور معاشرے میں حقوق خواتین کا مسئلہ	۹۹	شہید مرتضیٰ مطہری
۳	اخلاقی نصب العین	۱۱۳	منتظر عباس نقوی
۳	امام حسینؑ کے ارشادات کی روشنی میں ...	۱۲۷	سید طیب آغا جزائری
۳	ذکر و فکر (مشرق اور مغرب)	۱۴۱	ڈاکٹر نبی بخش قاضی
۳	کربلا۔ تاریخ اسلام کا انقلاب آفرین موڑ	۱۵۱	ڈاکٹر وحید اختر
۴	الٰہیات و ماوراء الطبیعیات ۔ نہج البلاغہ کی روشنی میں		شہید مرتضیٰ مطہری
۴	اپیل ۔ اسلامی نظام عدل میں		محمد خامنہ ای
۴	اسلامی حکومت ۔ خصوصیات و صفات		شیخ محمد توری
۴	تشکیل حکومت اسلامی ۔ ایک نظر ایک زاویہ		صالح النیقر
۴	فقہ جعفری کی اساس وہیئت اور اجتہاد		سید مرتضیٰ حسین صدر الافاضل

مجلۂ توحید (اردو) پوسٹ بکس نمبر ۳۱۹۵ / ۱۵۸۱۵

جمہوری اسلامی ایران ـ تہران

فارم ممبری

براہ مہربانی درج ذیل پتے پر مجلۂ توحید اردو ارسال فرمادیا کریں۔

نام .... کوچہ .... روڈ ______

شہر .... صوبہ .... ملک ....

تاریخ ------------------------ دستخط

بدل اشتراک

ملک	فی مجلہ	سالانہ
اسلامی جمہوریہ ایران	۱۵۰ ریال	۵۰۰ ریال
پاکستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
ہندوستان	۱۵ روپیہ	۵۰ روپیہ
بنگلہ دیش	۱۵ ٹکے	۵۰ ٹکے
متحدہ عرب امارات	۸ درہم	۳۲ درہم
سعودی عرب	۸ ریال	۳۲ ریال
قطر	۸ ریال	۳۲ ریال
کویت	۶۵۰ فلس	۲½ دینار
افریقہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
برطانیہ	۲ پونڈ	۸ پونڈ
امریکہ	۴ ڈالر	۱۶ ڈالر
کینیڈا	۴½	۱۸ ڈالر

شہید مرتضیٰ مطہری

سچی کہانیاں

آج کا انسان

اجتماعی مشکلات

ختم نبوت

اسلامی جمہوریہ

انقلاب اسلامی

نہج البلاغہ

آئین زندگی

توضیح المسائل

(اردو)

امام خمینی

تقلید

کیا ہے؟



اہلبیت اطہار

کی

مختصر سوانح حیات

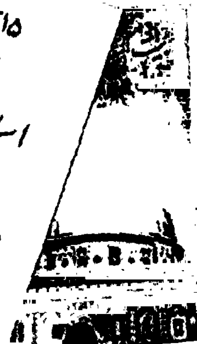
اقتصادیات

۱۵ خرداد

اسلامی انقلاب

کا

خونین آغاز



التوحيد

بالغة العربية

مجلــة

اسلاميــة ـــ فكريــة ـــ جامعــة

تُعنى بالفكر الإسلامي المعمّق،

والكلمة الهادفة الصادقة،

وكل مايهمّ الأمة من رؤىً وسلوك بنّاء.

وتفتح صدرها؛

لكل المفكرين الإسلاميين،

خدمةً لقضية التوحيد الكبرى،

وتركيزاً لخصائص الأمة الاسلامية الواحدة،

ونشراً لأضواء الثورة الاسلامية في كل أرجاء الوجود.

بعيداً عن؛

كل تعصب ذميم،

وتفريق بين المسلمين لاتحمد عقباه،

ولغوٍ من القول لا طائل تحته.

الثمن

■ ايران ١٠٠ ريال ■ لبنان ٤٠٠ ليرة ■ سوريا ٤٠٠ ليرة ■ الاردن ٤٠٠ فلس ■ الكويت ٤٠٠ فلس ■ عمان ٥٠٠ فلس ■ البحرين ٥٠٠ فلس ■ الامارات ٧ دراهم ■ السعودية ٨ ريالات ■ قطر ٨ ريالات ■ مصر ٤٥٠ مليماً ■ ليبيا ٥٠٠ درهم ■ السودان ٤٠٠ مليم ■ الجزائر ٥ دنانير ■ المغرب ٦ دراهم.

■ وفي باقي دول آسيا وأفريقيا وفي امريكا واستراليا واوروبا ٤ دولارات أو مايعادلها.

طريقة الاشتراك

■ تسدد قيمة الاشتراك في بانك ملي شعبه خشايار على رقم الحساب التالي (٩٠٠٢٥) سازمان تبليغات اسلامی ـ مطبوعات خارجي

■ يرجى ارسال الحوالات الى ادارة المجلة.

المراسلات على العنوان التالي:

الجمهورية الاسلامية في ايران ـ طهران

ص.ب (٣١٩٥ ـ ١٥٨١٥)

AL-TAWḤĪD



AL-TAWḤĪD (English), P.O.Box 41-2959
Tehran, Islamic Republic of Iran
SUBSCRIPTION FORM

Please send my copy of *Al-Tawhid* on the following address. I am enclosing a cheque/bank draft for $ towards a subscription for ( ) years.

MY ADDRESS: (Please write in capitals)

Name...

No...St..

City/Town.................................State/Area code.................................

Country...

Signature.................................